JUNE 2011

خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ





آپ سے کیا پردہ

خاتون کی ڈائری

مجھ سے ملیے

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

نظمیں غزلیں

رنگا رنگ

میری بیاض سے

پکوان

نفسیات

بیوٹی بکس

جون 2011
جلد 39 شمارہ 2
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آذر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: khawateendigest@hotmail.com , info@khawateendigest.com

مُدیرہ

خواتین ڈائجسٹ کا جون کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

بے یقینی اور بے سمتی کی کیفیت کے ساتھ گزرتے دنوں میں نا امیدی اور مایوسی کا اندھیرا گہرا ہوا ہے۔ نام ونہاد روشن خیالی کا جو راستہ اختیار کیا گیا، اس نے ہمیں معاشی لحاظ سے ہی نہیں، ذہنی طور پر بھی دوسروں پر انحصار کرنے کا عادی بنا دیا — ہم نے ان لوگوں کی سوچ کو اپنا لیا جو دنیا کے نقشے پر ہمارا وجود برداشت نہیں کر سکتے۔ ہماری اپنی سوچ اور فکر مسدود ہو گئی۔ صرف کتابوں کا مطالعہ علم تو بڑھا سکتا ہے دانش نہیں۔ شعور، حکمت اور دانائی غور و فکر سے حاصل ہوتی ہے۔ انسانی تاریخ گواہ ہے جن قوموں نے ذہنی غلامی قبول کی وہ بتدریج فنا ہوتی چلی گئیں۔

ہمیں اپنا اندازِ فکر، اپنی سوچ اور طرزِ عمل پر نظر ثانی کرنا ہوگی۔ سچائی، دانائی اور ذہانت ہی کسی قوم کی مضبوطی کی بنیاد ہوتی ہے۔ پاکستان آج مشکل ترین حالات سے گزر رہا ہے۔ اس گرداب سے نکلنے کے لیے ہمیں مؤثر حکمت عملی، دانش اور محکم طرزِ عمل کی ضرورت ہے۔ اندرونی طور پر مضبوط قوم ہی بیرونی خطرات کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ ہمیں لسانی، صوبائی، مسلک، فرقہ بندی ان تمام تعصبات کو خیرباد کہہ کر ایک قوم بن کر سوچنا ہے۔ اسی میں ہماری بقا ہے۔

اس شمارے میں،

آمنہ ریاض جانی پہچانی مصنفہ ہیں۔ ان کا شمار قارئین کی پسندیدہ مصنفین میں ہوتا ہے۔ شعاع میں ان کا سلسلہ وار ناول "ستارۂ شام" بے حد پسند کیا جا رہا ہے۔

اس ماہ ہم بہن آمنہ ریاض کا طویل مکمل ناول "مرگِ وفا" پیش کر رہے ہیں۔ آمنہ نے ایک عام موضوع کو بڑے خوبصورت انداز سے لکھا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ آمنہ کی دیگر تحریروں کی طرح قارئین یہ ناول بھی پسند کریں گی۔

- "تم سے مل کے" ۔ راحت جبیں کا مکمل ناول،
- "مصحف" ۔ نمرہ احمد کا مکمل ناول،
- بشریٰ سعید اور رمشہ خالد خان کے ناولٹ،
- رفعت ناہید سجاد کا ناول "چراغِ آخرِ شب"،
- رابعہ فیاض قادری، ام طیفور، سلویٰ علی بٹ اور راحت نذیر کے افسانے،
- ٹی وی فنکارہ صبا فیصل سے ملاقات،
- کرن کرن روشنی ۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور دیگر دلچسپیاں شامل ہیں۔

ہماری اکثر قارئین کا خیال ہے کہ ہم صرف وہی خط پڑھتے ہیں جو شائع کیے جاتے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ قارئین کی رائے جاننا ہمارے لیے سب سے اہم ہے اور ہم تمام خط جو ہمیں موصول ہوتے ہیں، پوری توجہ سے پڑھتے ہیں تاکہ آپ کی رائے سے آگاہ ہو سکیں۔ اس لیے آپ پرچا پڑھنے کے بعد ہمیں خط ضرور لکھیں۔ آپ کے خطوط کا انتظار رہے گا۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امتِ مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

پوری دنیا

حضرت عبید اللہ بن محصن انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس کی صبح اس حال میں ہوئی کہ اسے بدن میں عافیت، اپنے بارے میں امن اور دن بھر کی خوراک حاصل ہو، اسے گویا پوری دنیا جمع کر کے دے دی گئی۔"

فوائد و مسائل: جسے کوئی بیماری اور خوف نہ ہو اور دن بھر کی ضرورت کا سامان موجود ہو تو یہ بہت بڑی نعمت ہے۔

ہم زیادہ کی خواہش میں ان نعمتوں کی طرف توجہ نہیں کرتے جو ہمارے پاس موجود ہوتی ہیں جس کی وجہ سے دل میں شکر کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔

جس شخص کے پاس ایک دن کی ضروریات موجود ہیں، اسے اس دن کا شکر ادا کرنا چاہیے اور یہ امید رکھنی چاہیے کہ جب کل کا دن آئے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات بھی مہیا فرما دے گا۔

نعمت کی قدر

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"(دنیا میں) اپنے سے نیچے والے (کم مال) کو دیکھو، اپنے سے اوپر والے کو نہ دیکھو، اس سے یہ ہوگا کہ تم اللہ کی نعمت کو حقیر نہ سمجھو گے۔"

فوائد و مسائل: نیچے والے سے مراد وہ شخص ہے جو کسی نعمت میں ہم سے کم ہے اور اوپر والے سے مراد وہ شخص ہے جو کسی نعمت میں ہم سے بڑھ کر ہے۔

اپنے سے زیادہ نعمت والے کو دیکھنے سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ مجھے یہ نعمت کم حاصل ہے، اس کمی کو

شیطان اس انداز سے پیش کرتا ہے گویا یہ نعمت حاصل ہی نہیں۔ اس طرح محرومی کا احساس پیدا ہوتا ہے جس سے شکر کے بجائے اللہ سے شکوہ کرنے کو جی چاہتا ہے، جو ناشکری کی ایک بڑی صورت ہے۔

اپنے سے کم تر پر نظر ڈالنے سے حاصل شدہ نعمت کی قدر معلوم ہوتی ہے، جس سے شکر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

ہر نعمت کے بارے میں یہ کیفیت ہے کہ ایک فرد کو وہ نعمت کسی سے کم ملی ہے تو وہی نعمت اسے کسی دوسرے سے زیادہ بھی ملی ہے۔ اس معاملے کا ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ اگر ایک فرد کو ایک نعمت کسی سے کم ملی ہے تو کوئی دوسری نعمت اسے زیادہ بھی ملی ہے۔ جس طرح ایک شخص کسی سے کم دولت رکھتا ہے اور کسی سے زیادہ دولت مند بھی ہے۔ اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر وہ اس سے دولت میں کم ہے تو صحت یا قوت میں اس سے بڑھ کر ہے۔ اگر حسن و صورت میں کم ہے تو علم و فضل یا حسن سیرت میں اس سے زیادہ بھی ہے لہٰذا احساس کمتری میں مبتلا ہونے کی کوئی وجہ نہیں اور اللہ سے شکوہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور مالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ تمہارے عملوں اور دلوں کو دیکھتا ہے۔"

فوائد و مسائل : خوب صورت یا بد صورت ہونا بندے کے ہاتھ میں نہیں بلکہ یہ اللہ کی مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔ کوشش کرنی چاہیے کہ عمل اچھے ہوں تاکہ اللہ تعالیٰ کو راضی کیا جاسکے۔

اللہ کے ہاں مال دار اور بے زر برابر ہیں۔ مال دار کو محض دولت مند ہونے کی وجہ سے معافی نہیں مل سکتی اور نادار کو محض اس کی مفلسی کی بنا پر مجرم نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔

مال دار ہونا بھی اللہ کی آزمائش ہے اور مفلس ہونا دوسری طرح کی آزمائش۔ اگر مال دار شکر کرے تو اللہ کے ہاں پسندیدہ ہے اور ناشکری کرے تو ناپسندیدہ ہے۔ اسی طرح نادار آدمی صبر کرے تو اللہ کا پیارا ہے اور بے صبری کرے اور حرام کمائی کی کوشش کرے تو اللہ کے قرب سے محروم ہے۔

انسان اگر نیکی کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اس کی نیت اور خواہش ضرور رکھنی چاہیے۔ ایسی نیت پر بھی ثواب ملتا ہے۔

آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی گزران

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

"ہم آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم، مہینہ مہینہ اس حال میں گزار دیتے تھے کہ آگ نہیں جلاتے تھے۔ (ہمارا کھانا) صرف کھجوریں اور پانی ہوتا تھا۔"

فوائد و مسائل : اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زہد، استغنا، قناعت اور سادگی کا بیان ہے۔ حیات مبارکہ کے آخری سالوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سال بھر کے خرچ کے لیے کھجوریں اور جو وغیرہ اکٹھے دینا شروع کر دیے تھے لیکن امہات المومنین سخاوت سے کام لیتے ہوئے جلد ہی خرچ کر دیتی تھیں، اس لیے اکثر روٹی، سالن اور گوشت وغیرہ کے بغیر گزارہ ہوتا تھا۔ بعض اوقات کھجوریں بھی میسر نہیں ہوتی تھیں۔

گزران

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

"حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں پر مہینہ بھر اس طرح گزر جاتا تھا کہ آپ کے کسی گھر میں بھی دھواں نظر نہیں آتا تھا۔"

حضرت ابو سلمہ رحمتہ اللہ نے بیان کیا میں نے کہا۔

"پھر وہ لوگ کیا کھاتے تھے؟" ام المومنین رضی اللہ عنہا نے فرمایا۔

"دو سیاہ چیزیں کھجوریں اور پانی، البتہ ہمارے کچھ انصاری ہمسائے تھے، وہ مخلص ہمسائے تھے، ان کے گھروں میں پلنے والی کچھ بکریاں تھیں (جنہیں چرنے کے لیے چراگاہ میں نہیں لے جایا جاتا تھا، گھر لا کر چارہ دیا جاتا تھا۔) وہ ان کا دودھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف (ہمارے ہاں) بھیج دیا کرتے تھے۔"

(راوی حدیث) محمد بن عمرو رحمتہ اللہ بیان کرتے ہیں وہ نو گھر تھے۔

فائدہ : عورتوں کو چاہیے کہ حلال آمدنی میں گزارہ کریں اور خاوند کو حرام ذرائع اختیار کرنے پر مجبور نہ کریں۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

"میں نے ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو [illegible] آپ کو [illegible] کی کھجوریں بھی میسر نہ تھیں جن سے پیٹ بھر [illegible]"

فائدہ : اس میں امت کے لیے سبق ہے کہ وہ تنگ دستی کی حالت میں صبر اختیار کریں، حرام کمائی کا خیال بھی دل میں نہ لائیں۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کئی بار یہ فرماتے سنا ہے۔

"قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے! آج محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گھر والوں کے پاس ایک صاع غلہ ہے نہ ایک صاع کھجوریں۔"

ان دنوں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نو بیویاں تھیں۔

فائدہ : صاع کا مطلب ٹوپا ہے جو غلہ ناپنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اہل مدینہ کا صاع تقریباً ڈھائی کلو گرام کا ہوتا تھا۔

جہاد

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا، ہمیں رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک جہادی مہم پر) روانہ فرمایا۔ ہم تین سو افراد تھے۔ ہم اپنی غذائی اشیاء اپنی گردنوں پر اٹھائے ہوئے تھے۔ (مہم کے دوران میں) ہماری خوراک ختم ہو گئی حتیٰ کہ ایک ایک آدمی کے حصے میں ایک ایک کھجور آتی تھی۔" کسی نے کہا۔

"ابو عبداللہ! ایک کھجور سے آدمی کا کیا گزارہ ہوتا ہوگا" انہوں نے فرمایا۔ "اس کا احساس ہمیں اس وقت ہوا جب وہ (ایک ایک کھجور) بھی نہ رہی۔ (آخر) ہم سمندر پر پہنچے تو اچانک ایک بڑی مچھلی نظر آئی، جسے سمندر نے (پانی سے باہر) پھینک دیا تھا۔ ہم (سارا لشکر) اس میں سے اٹھارہ دن تک کھاتے رہے۔

فوائد و مسائل : 1۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ نے ہر قسم کے حالات میں جہاد کیا، خواہ ان کے پاس سواریاں اور راشن وغیرہ بھی نہ ہوتا۔

2۔ مچھلی مری ہوئی بھی حلال ہے۔

3۔ جہاد میں اللہ کی طرف سے غیر متوقع انداز سے مدد حاصل ہوتی ہے۔

تعمیر اور ویرانی

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا، ہم لوگ اپنی ایک جھونپڑی کی مرمت کر رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس سے گزرے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"یہ کیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "ہماری جھونپڑی کمزور ہو گئی ہے ہم اسے ٹھیک کر رہے ہیں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "میرے خیال میں تو معاملہ اس سے جلد واقع ہونے والا ہے۔"

فوائد و مسائل : 1۔ معاملے کی جلدی سے

مراد یہ ہے کہ معلوم نہیں موت کب آجائے۔ شاید مرمت کیے ہوئے گھر میں رہنا نصیب ہو یا نہ ہو۔

2۔ نصیحت میں موقع محل کی مناسبت کا خیال رکھنا چاہیے۔

3۔ سر چھپانے کے لیے مکان کی ضرورت تو ہے لیکن موت کو نہیں بھولنا چاہیے۔ جس طرح دنیا کی ضرورت کے لیے کوشش کرتے ہیں، اس سے زیادہ آخرت کے گھر کی فکر ضروری ہے۔

4۔ بے جا تکلفات سے ہر ممکن حد تک بچنا چاہیے۔

بلا ضرورت خرچ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک گول خیمے کے پاس سے گزرے جو ایک انصاری صحابی کے دروازے پر بنا ہوا تھا۔ آپ نے فرمایا۔

"یہ کیا ہے؟"

لوگوں نے کہا "گول خیمہ ہے جو فلاں نے بنایا ہے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو مال بھی اس طرح (بلا ضرورت خرچ) ہو وہ قیامت کے دن اپنے مالک کے لیے وبال کا باعث ہوگا۔"

انصاری کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کا علم ہوا تو اس نے وہ خیمہ ہٹا دیا۔ بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے گزرے تو وہ خیمہ نظر نہ آیا۔ آپ نے اس کے بارے میں پوچھا تو بتایا گیا کہ انصاری کو آپ کے فرمان کا علم ہوا تو اس نے اسے ہٹا دیا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ اس پر رحمت فرمائے۔"

فائدہ :

"قبہ (خیمہ) اس چھوٹے سے گھر کو کہتے ہیں جو گول شکل میں ہوتا ہے۔" گھر کے آگے اس قسم کا خیمہ لگانا غالباً امارت و ثروت کا اظہار ہوتا تھا اور صرف فخر کے لیے اس قسم کی زینت جائز نہیں۔

ضرورت کے مطابق

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا "جب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتا تھا (اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم حیات تھے) تو میں نے یہ کیفیت بھی دیکھی کہ میں نے ایک کمرہ بنایا جو مجھے بارش سے محفوظ رکھ سکے اور دھوپ سے بچا سکے۔ اس کی تعمیر میں میری کسی شخص نے مدد نہ کی۔"

فوائد و مسائل :

1۔ گھر کا اصل مقصد بارش اور دھوپ سے بچاؤ، اپنی نجی زندگی کا تحفظ اور پردے کا اہتمام ہے۔ یہ فائدہ معمولی گھر سے بھی اسی طرح حاصل ہوتا ہے جس طرح مزین اور خوب صورت کوٹھیوں سے حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا بے فائدہ ہے۔

2۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ذاتی ضروریات کے لیے سادہ سے سادہ اہتمام کرتے تھے اور باقی مال اللہ کی راہ میں اور دوسرے مسلمانوں کی مدد کے لیے خرچ کر دیتے تھے۔ یہی سادگی مسلمان کی اصل شان ہے۔

3۔ کسی کے مدد نہ کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی مدد کے لیے تیار نہیں تھے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اتنا معمولی گھر تھا کہ خود ہی بنا لیا، کسی سے مدد لینے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔

مٹی میں خرچ

حضرت حارثہ بن مضرب رحمتہ اللہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا "ہم لوگ حضرت خباب رضی اللہ عنہ کی بیمار پرسی کے لیے ان کے ہاں حاضر ہوئے تو انہوں نے فرمایا۔

"میری بیماری لمبی ہو گئی ہے۔ اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرمان "موت کی تمنا نہ

کرو۔" نہ سنا ہوتا تو میں ضرور موت کی دعا کرتا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا۔

"بندے کو اپنے تمام (جائز) اخراجات کرنے کا ثواب ملتا ہے مگر جو مٹی میں خرچ کیا جائے۔"

یا فرمایا "عمارت بنانے میں خرچ کیا جائے (اس کا ثواب نہیں ملتا)۔"

فوائد و مسائل :

1۔ بیمار کی عیادت کرنا مسلمان کا مسلمان پر حق ہے۔

2۔ موت کی دعا کرنا منع ہے بلکہ اللہ سے مصیبت دور ہونے کی دعا کرنی چاہیے۔

3۔ بندہ اپنی جان اور صحت کے لیے جو خوراک استعمال کرتا ہے یا بیوی بچوں وغیرہ کو خوراک مہیا کرتا اور ان کی دوسری لازمی ضروریات پوری کرتا ہے، یہ اس کا [illegible] فریضہ بھی [illegible] ثواب بھی ملتا ہے۔

4۔ رہائش کے لیے گھر پر صرف اس حد تک خرچ کرنا چاہیے جس سے ضرورت پوری ہو جائے۔ بے ضرورت رقم ضائع کرنا مناسب نہیں۔

توکل اور یقین

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ فرما رہے تھے۔

"اگر تم لوگ اللہ پر اس طرح بھروسا کرو جیسے اس پر بھروسا کرنے کا حق ہے تو وہ تمہیں اس طرح رزق دے جیسے پرندوں کو رزق دیتا ہے۔ وہ صبح (گھونسلوں سے) بھوکے روانہ ہوتے ہیں اور شام کو سیر ہو کر آتے ہیں۔"

فوائد و مسائل :

1۔ پرندوں کا توکل یہ ہے کہ وہ رزق جمع کر کے نہیں رکھتے بلکہ انہیں یقین ہوتا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمیں آج رزق دیا ہے، اسی طرح کل بھی دے گا۔

2۔ انسان عام طور پر اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے اس لیے گھبراتا ہے کہ وہ مستقبل کے بارے میں فقر و فاقہ سے ڈرتا ہے۔ اسے یقین رکھنا چاہیے کہ جس طرح اللہ نے اسے اب رزق دیا ہے، مستقبل میں بھی دے گا۔

3۔ توکل کا مطلب یہ نہیں کہ جائز اسباب اختیار نہ کیے جائیں۔ پرندے بھی گھونسلے چھوڑ کر نکلتے ہیں اور تلاش کر کے رزق کھاتے ہیں۔ اسی طرح انسان کو حرص سے بچتے ہوئے جائز ذرائع سے رزق حاصل کرنا چاہیے۔

ناامید

حضرت حبہ بن خالد رضی اللہ عنہ اور حضرت سواء بن خالد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

"ہم لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی چیز کی مرمت کر رہے تھے۔ ہم نے اس کام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب تک تمہارے سر حرکت کرتے رہیں، رزق سے ناامید مت ہونا۔ انسان کو اس کی ماں جنتی ہے تو وہ (گوشت کے لوتھڑے کی طرح) سرخ ہوتا ہے، جس پر (مضبوط) کھال بھی نہیں ہوتی، پھر بھی اللہ عزوجل اسے رزق مہیا فرماتا ہے۔"

غزل

انشاء جی

ہمیں تم پہ گمانِ وحشت تھا، ہم لوگوں کو رسوا کیا تم نے
ابھی فصلِ گلوں کی نہیں گزری، کیوں دامنِ چاک سیا تم نے

اس شہر کے لوگ بڑے ہی سخی، بڑا مان کریں درویشوں کا
پر تم سے تو اتنے برہم ہیں، کیا ان سے مانگ لیا تم نے

کن راہوں سے ہو کر آئی ہو، کس گل کا سندیسہ لائی ہو
ہم باغ میں خوش خوش بیٹھے تھے، کیا کر دیا آ کے صبا تم نے

غمِ عشق میں کاری دوا نہ دعا، یہ ہے روگ کٹھن، یہ ہے درد بُرا
ہم کرتے جو اپنے سے ہو سکتا، کبھی ہم سے بھی کچھ نہ کہا تم نے

وہ جو قیس غریب تھے، ان کا جنوں سب ہی کہتے ہیں ہم سے رہا ہے فزوں
ہمیں دیکھ کے ہنس تو دیا تم نے، کبھی دیکھے ہیں اہلِ وفا تم نے؟

اب رہروِ ماندہ سے کچھ نہ کہو، یونہی شاد رہو، آباد رہو
بڑی دیر سے یاد کیا تم نے، بڑی دور سے دی ہے صدا تم نے

اِک بات کہیں گے انشاء جی، تمہیں ریختہ کہتے عمر ہوئی
تم ایک جہان کا علم پڑھے، کوئی میر سا شعر کہا تم نے؟





ٹی وی فنکارہ

صبا فیصل سے ملاقات

شاہین رشید

"ہمارا خیال ہے کہ جو فنکارائیں ماں کا رول کرتی ہیں ان کے پاس کام کی کبھی کمی نہیں ہو سکتی، کیونکہ ہر ڈرامے میں "ماں" کا رول ضرور ہی ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرے کی جیتی جاگتی کہانیاں ڈرامے کی شکل میں پیش کی جاتی ہیں اور ہمارے ہاں والدین اور خصوصاً" ماں کا رول بہت اہمیت رکھتا ہے اور ماں کے رول کے لیے جو چند اچھی فنکارائیں ہیں، ان میں ایک صبا فیصل بھی ہیں جن پر امیر، غریب اور ماڈرن ماں کا رول جچتا ہے۔

"صبا! کیا حال ہے۔ ہر وقت آپ سفر میں رہتی ہیں۔ آدھی زندگی تو آپ کی ٹریولنگ میں ہی گزری ہے اور مزید بھی گزرے گی۔ اتفاق کرتی ہیں اس بات سے؟"

"بالکل اتفاق کرتی ہوں..... دو چار دن

کبھی کہیں تو کبھی کہیں۔ اگرچہ کام میں مزا بھی آتا ہے مگر تھکن بھی ہو جاتی ہے۔"

"کبھی دل چاہا کہ چھوڑ دوں اس فیلڈ کو؟ آرام کروں۔"

"ہرگز نہیں کبھی نہیں.... اور آرام کرنے کے بارے میں تو میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ کام ہی سے تو زندگی ہے اور کام سے ہی تو خوش حالی ہے.... جب میں اپنے اردگرد نظر دوڑاتی ہوں اور لوگوں کو بے روزگار دیکھتی ہوں' فارغ دیکھتی ہوں تو پھر تھکن کے وقت جب میں تھکن کا اظہار کرتی ہوں تو اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتی ہوں کہ اے اللہ میں ناشکری نہیں کر رہی بلکہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے ہمیں روزگار سے لگایا ہوا ہے اور ہم کما کر ایک اچھی زندگی گزار رہے ہیں۔"

"واقعی آج کے دور میں جو بھی روزگار سے لگا ہوا ہے اسے اپنے رب کا شکر ادا کرنا چاہیے اور آپ تو ان فنکاراؤں میں سے ہیں جنہوں نے بے شمار ڈراموں میں کام کیا مگر جنہیں دیکھ کر کبھی کسی نے یہ نہیں کہا ہو گا کہ لو یہ بھی اس ڈرامے میں موجود ہیں' کیونکہ آپ ہر قسم کی ماں کا روپ دھار لیتی ہیں۔"

"یہ آپ سب کی محبت ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ میرا بھی دل چاہتا ہے کہ کام میں ورائٹی دوں تاکہ لوگ بور نہ ہوں اور یہ نہ ہو کہ یہ تو ایک ہی طرح کے رول کرتی ہیں کیونکہ آج کل اتنے ڈھیر سارے چینلز آ گئے ہیں اور اتنا زیادہ کام ہو رہا ہے کہ جن کو کام نہیں بھی آتا وہ بھی مصروف ہیں اور اس دور میں اپنی پہچان کروانا بہت مشکل ہے اور جو لوگ اپنی پہچان کروا لیتے ہیں وہ بہت خوش قسمت ہیں اور ان میں ایک میں بھی ہوں کہ جس نے اتنی بھیڑ میں اپنی پہچان کروائی ہے۔"

"ظاہر ہے کہ جو محنت کرے گا وہ اپنی پہچان ضرور کروائے گا۔"

"وہ تو آپ کی بات ٹھیک ہے' لیکن میں نہیں سمجھتی کہ مجھے اداکاری آتی ہے۔ میں نہیں سمجھتی کہ میں بہت اچھی آرٹسٹ ہوں یہ سب ترقی اور عروج میری ماں کی دعاؤں یا میری نیت کی وجہ سے ہے.... اللہ تعالیٰ مجھ پر بہت مہربان ہے۔ جب میں بازار جاتی ہوں یا کسی تقریب میں جاتی ہوں۔ تو لوگ انتہائی محبت سے ملتے ہیں۔"

"آپ بھی تو رسپانس اچھا دیتی ہوں گی' ورنہ تو عموماً" فنکار برا مان جاتے ہیں' چھپنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"نہیں نہیں.... میں ایسا ہرگز نہیں کرتی۔ بہت اچھا رسپانس دیتی ہوں اور اسی پیار محبت سے ملتی ہوں جیسے وہ مل رہے ہوتے ہیں۔"

"بچے اور میاں صاحب' تعاون کرتے ہیں' کوئی لڑائی جھگڑا' کوئی روک ٹوک؟"

"نہیں کوئی روک ٹوک نہیں ہے' میرے میاں میرے ماموں زاد ہیں۔ وہ بہت زیادہ کوآپریٹو ہیں۔ بچے اب بڑے ہو گئے ہیں اور ہر بات کو سمجھتے ہیں اس لیے وہ بہت تو اپنے ہوتے ہیں اور [illegible] بات تو یہ ہے کہ میں نے اپنے بچوں کو اتنا مصروف کر دیا ہے کہ اگر کوئی ان سے کہے کہ آپ کی مما آپ کو ٹائم نہیں دیتیں تو انہیں عجیب سی شرمندگی ہوتی ہے اور وہ کہتے ہیں اچھا.... ہمیں تو یہ لگتا ہے کہ ہم اپنی اماں کو ٹائم نہیں دے پاتے کیونکہ ہم اتنے مصروف ہیں کہ ان کو وقت نہیں دے پاتے۔"

"کیا مصروفیات ہیں ان کی؟"

"ماشاء اللہ میری ایک بیٹی اور دو بیٹے ہیں۔ سب اپنی پڑھائی میں اتنے مصروف رہتے ہیں کہ انہیں کچھ اور سوچنے کی فرصت ہی نہیں ہے۔"

"اپنے بارے میں کچھ بتائیں آپ؟"

"میں 13 جنوری کو لاہور میں پیدا ہوئی۔ میرے والد جن کا انتقال ہو چکا ہے وہ ایک پرائیویٹ کمپنی میں ملازمت کرتے تھے۔ ہم چھ بہن بھائی ہیں۔ شوبز سے صرف میرا ہی تعلق ہے۔ میں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے گریجویشن کیا ہے۔ بہن بھائیوں میں ہم تین بہنیں اور تین بھائی ہیں۔"

"فیلڈ میں کیسے آنا ہوا' جبکہ آپ کے گھر میں کوئی اور اس فیلڈ میں نہیں ہے؟"

"میں اسکول کالج کے زمانے میں غیر نصابی سرگرمیوں میں بہت حصہ لیا کرتی تھی۔ ٹیبل ٹینس اور باسکٹ بال کی بہترین کھلاڑی تھی۔ میری خواہش تھی کہ میں کچھ ایسا کام کروں کہ میرا نام ہو۔ میں نے ٹی وی میڈیا کو زیادہ بہتر سمجھا' آڈیشن دے دیا اور کامیاب ہو گئی۔"

"کس فیلڈ کے لیے؟ غالباً" نیوز کاسٹر کے لیے کیونکہ آپ نے کافی عرصہ نیوز پڑھی ہے؟"

"نہیں میں نے بحیثیت نیوز کاسٹر اپنی فنی زندگی کا آغاز نہیں کیا بلکہ بحیثیت اناؤنسر کیا۔ اس کے بعد نیوز کاسٹر' پھر نیوز رپورٹر' پھر اینکر' کمپیئر اور ان سب شعبوں میں اپنی کارکردگی دکھانے کے بعد میں ڈرامہ کی فیلڈ میں آئی اور اب کافی عرصہ سے لوگ مجھے بحیثیت ایک اداکارہ دیکھ رہے ہیں۔"

"اس سے آگے کیا کرنے کا ارادہ ہے اور کسی ایک شعبے میں مستقل مزاجی سے کام نہ کرنے کی وجہ؟"

"اب اداکاری میں مستقل مزاجی سے کام کر رہی ہوں اور اس سے آگے جانے کا خیال اس لیے نہیں آیا کہ اس کام میں اتنی گنجائش ہے' اتنی ورائٹی ہے کہ اس کے بعد کہیں اور جانے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔"

"دیگر فیلڈز جن کو آپ چھوڑ آئی ہیں کیا ان میں آپ کو ورائٹی نظر نہیں آتی تھی؟"

"نہیں کوئی خاص نہیں۔ ہر فیلڈ میں میں کچھ ہی عرصے کے بعد اکتا جاتی تھی اور فیلڈ تبدیل کر دیتی تھی' لیکن ایکٹنگ کی فیلڈ میں مجھے سات آٹھ سال ہو گئے ہیں۔ اس میں اکتاہٹ اس لیے نہیں کہ ہر روز نیا سیٹ ہوتا ہے۔ کچھ نئے لوگ ہوتے ہیں ان سے بات چیت ہوتی ہے۔ کردار کے لیے اپنی شخصیت کو نگیٹو کرنا پڑتا ہے اور ہمارے معاشرے میں اتنے کردار ہیں کہ ہم ہر کردار کو کرنا چاہتے ہیں اور اندر کی صلاحیت کو باہر لانا چاہتے ہیں۔"

"ایک فنکار کی یہی خوبی ہوتی ہے کہ وہ مشکل رول بھی آسانی سے کر لے۔"

"جی بالکل! اور میں اس لحاظ سے بہت خوش قسمت ہوں کہ میں نے کافی مشکل کردار بھی کیے ہیں۔ ایک ڈرامے میں میں نے پاگل کا رول کیا تھا اور اسی طرح کے کئی مشکل رول میں کر چکی ہوں۔"

"آپ نے بتایا کہ آپ لاہور میں پیدا ہوئیں اور وہیں پڑھی لکھیں' مگر آپ کی اردو بہت صاف ہے۔"

"جی میں پکی لاہورن ہوں اور واقعی میں جب کراچی آتی ہوں تو سب میری اردو کی تعریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ کی اردو بہت پرفیکٹ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں خبریں پڑھتی تھی جہاں زبان و بیان کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔ شوق انسان سے بہت کچھ کروا لیتا ہے اور جب آپ ایک مرتبہ یہ سوچ لیتے ہیں کہ آپ یہ بھی کر لیں گے وہ بھی کر لیں گے تو پھر واقعی آپ کر لیتے ہیں۔ شادی سے پہلے والدین اور بہن بھائیوں کی سپورٹ رہی اور شادی کے بعد میاں صاحب نے بہت سپورٹ کیا۔"

"کتنے سال ہو گئے ہیں آپ کو اس فیلڈ میں؟"

"کافی سال ہو گئے ہیں۔ میں نے میٹرک کے بعد ہی پی ٹی وی جوائن کر لیا تھا' اسی دوران میں نے ایف اے اور پھر گریجویشن بھی کیا اور اس فیلڈ میں رہتے ہوئے ہی شادی ہو گئی.... میرے میاں فیصل سلیم نے میرے ساتھ بہت تعاون کیا۔ اگر وہ تعاون نہ کرتے تو میں مسلسل اس فیلڈ میں کام نہ کر رہی ہوتی۔"

"تنقید کرتے ہیں یا تعریف یا اپنے بزنس میں مگن رہتے ہیں؟"

"تنقید اور تعریف دونوں کرتے ہیں۔ جب نیوز میں تھی تب بھی بہت غور سے نیوز سنتے تھے اور بتاتے تھے کہ کہاں کیا پڑھا اور پھر جب ڈرامہ کی فیلڈ میں آئی تب بھی کہتے ہیں کہ فلاں رول میں ایسی لگ رہی تھیں فلاں میں اچھی لگ رہی تھیں۔ انہیں میرے نگیٹو رول زیادہ پسند ہیں۔"

"آپ نے بتایا کہ آپ کے گھر والوں نے آپ کو سپورٹ کیا۔ آپ گھر کی واحد لڑکی تھیں جو اس فیلڈ

میں آئیں‘ کچھ مشکلات ہوئیں اس فیلڈ میں آنے کے لیے یا خوشی خوشی اجازت مل گئی؟“

”نہیں مجھے کوئی مشکل نہیں ہوئی۔ گھر والوں نے دیکھا کہ لڑکی بولڈ ہے‘ کچھ کرنا چاہتی ہے تو انہوں نے خوشی خوشی اجازت دے دی۔ ہاں جب میری منگنی ہو گئی تو گھر والوں نے کہا کہ چھوڑ دو‘ ایسا نہ ہو کہ سسرال والے اعتراض کریں‘ لیکن میرے منگیتر نے ہی کہہ دیا کہ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے تو پھر چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔“

”کچھ کا خیال ہے کہ شوبز کا ماحول لڑکیوں کے لیے ٹھیک نہیں‘ جبکہ کچھ کہتے ہیں کہ ایسی کوئی بات نہیں۔“

”کوئی بھی فیلڈ ہو اگر احترام کریں گے‘ عزت کریں گے تو احترام اور عزت لیں گے۔ مجھے اتنے سال ہو گئے ہیں اس فیلڈ میں لیکن اللہ کا شکر ہے کہ میرے ساتھ کوئی الٹی سیدھی بات نہیں ہوئی‘ ہر فیلڈ میں اچھے برے لوگ ہوتے ہیں یہاں تو اچھوں کے ساتھ لوگ اچھے ہیں اور بروں کے ساتھ برے ہیں۔“

”ٹائم ٹیبل کے ساتھ چلتی ہیں اور گھر واپسی کب ہوتی ہے؟“

”کوشش تو ہوتی ہے کہ ٹائم ٹیبل کے ساتھ چلوں مگر ٹائم آگے پیچھے ہو ہی جاتا ہے اور جہاں تک گھر واپسی کی بات ہے تو کوشش یہی ہوتی ہے کہ رات گیارہ بجے تک گھر پہنچ جاؤں‘ مگر یہ فیلڈ ایسی ہے کہ پابندی ہو نہیں سکتی۔“

”اس فیلڈ میں کیا کشش ہے‘ پیسے کی یا شہرت کی؟“

”دونوں کی‘ پیسہ بھی ہے اور شہرت بھی..... لیکن جب میں اس فیلڈ میں آئی تو پیسے کا کوئی لالچ نہیں تھا صرف شوق اور کچھ کر کے دکھانے کی تمنا تھی‘ لیکن جب پیسے بھی آنے لگے اور گھر کے کئی مسائل با آسانی حل ہونے لگے تو پھر سب کچھ اچھا لگنے لگا۔“

”گویا..... انسان کی زندگی میں پیسہ بہت اہمیت رکھتا ہے؟“

”شاید کچھ سال پہلے اتنا ضروری نہیں تھا لیکن اب بہت ضروری ہو گیا ہے کیونکہ آج کل جتنی زیادہ مہنگائی اور انسان کی ضروریات ہیں اس کے لیے پیسہ بہت ضروری ہے اور ویسے بھی جب سکھ کی اور آرام کی عادت پڑ جائے تو پھر کم پیسوں میں گزارہ کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔“

”صبا! آپ کی لو میرج ہے اور ماشاءاللہ آپ ایک خوشگوار زندگی گزار رہی ہیں۔ کیا اپنے بچوں کو بھی اجازت دیں گی پسند کی شادی کی؟“

”بالکل اجازت دوں گی۔ ان کی پسند شامل ہو گی لیکن ان کو گائیڈ کرنا ہمارا کام ہے کہ ”بیٹا جی یہ ٹھیک ہے اور یہ غلط ہے“ بتانا ہمارا فرض ہے اور اگر وہ ہماری بات کو سمجھ لیں گے تو ان کا فائدہ ہے اور اگر نہیں سمجھتے تو پھر تجربہ کر کے دیکھ لیں‘ ویسے آج کل کے بچے تو کہتے ہیں کہ ہم خود تجربہ کر کے دیکھیں گے۔ کچھ چیزوں میں تو تجربہ بہتر ہوتا ہے اور کچھ چیزوں میں خود سے تجربہ کرنے کا مطلب ہوتا ہے کہ آپ کی لائف سفر (suffere) کر رہی ہے۔ اس Relation میں اگر تجربہ نہ ہی کیا جائے تو بہتر ہے..... بے شک بچوں کی پسند ہو اور والدین کا تجربہ ہونا چاہیے‘ ویسے تو آپ کو پتہ ہی ہے کہ شادی ایک جوا ہے اس میں دو زندگیاں نہیں ہوتیں‘ دو خاندان انوالو ہوتے ہیں۔“

”آپ کی شادی آپ کے ماموں زاد سے ہوئی گو کہ آپ اپنے ماموں کے گھر آئیں لیکن پھر بھی کوئی فرق لگا آپ کو گھر کے ماحول اور سسرال کے ماحول میں؟“

”مجھے تو بالکل بھی فرق نہیں لگا۔ میری ساس سسر اور دو نندیں تھیں۔ اب تو ساس سسر اور دو نندوں کا بھی انتقال ہو گیا ہے۔ میرے سسر خاندان میں سخت مزاج مشہور تھے۔ جب میں خبریں پڑھتی تھی‘ تب وہ مجھے اخبار دیتے تھے کہ بیٹا! ذرا پڑھ کر سناؤ اور وہ بہت خوش ہوتے تھے کیونکہ نیوز کے شعبے کو بہت ہی باعزت پروفیشن سمجھا جاتا تھا اور ہے بھی۔ جب میں نیوز سے ایکٹنگ کی طرف آئی تو میرے بھائی ناراض ہوئے کہ تم نیوز پڑھتی تھیں تو ہم سب کو بہت فخر سے بتاتے تھے کہ یہ ہماری بہن ہے‘ اب تم آرٹسٹ بنو گی اداکارہ

[illegible] ہو گی۔

”غصہ آتا تھا یا بات دل کو لگتی تھی؟“

”نہیں غصہ نہیں آتا تھا بلکہ میں ان کو یہ کہتی تھی کہ آپ جس فیلڈ میں ہیں وہاں آپ پر منحصر ہے کہ آپ اپنے آپ کو کس طرح carry کرتے ہیں۔ مجھے الحمدللہ اس شعبے میں بھی اتنی عزت ملی ہے کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتی..... میں جب آئی تو سب مجھ سے پوچھتے تھے کہ آپ کو صبا آپا کہیں یا صبا جی کہیں یا کیا کہیں‘ تو میں نے کہا کہ آپ کا جو دل چاہے کہیں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

”قدم پھونک پھونک کر رکھا یا سب کچھ سیٹ ہو گیا؟“

”جب آپ یہ سوچ کر آتے ہیں کہ آپ ایک فیملی سے آئے ہیں اور آپ کے ہر اچھے اور برے عمل کا اثر آپ کی فیملی پر ہوتا ہے تو پھر آپ ہر قدم پھونک پھونک کر [illegible] یقین کریں کہ میں نے قدم پھونک کر بھی نہیں رکھا کیونکہ مجھے شروع سے ہی اتنی عزت ملی کہ مجھے کوئی مشکل پیش نہیں آئی اور اس کے لیے میں اپنے رب کا جتنا شکر ادا کروں اتنا ہی کم ہے کہ مجھے اس فیلڈ میں عزت‘ شہرت اور پیسہ سب کچھ ہی ملا ہے۔“

”یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ شوبز کی کمائی میں برکت نہیں ہوتی؟“

”ہاں..... میں نے اکثر لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ شوبز کی کمائی میں برکت نہیں ہوتی لیکن میں کہتی ہوں کہ ایسا نہیں ہے کیونکہ ہم بھی بہت محنت کر کے کماتے ہیں‘ کچھ عرصہ پہلے میں نے اپنی اس کمائی سے اپنے لیے ایک گاڑی خریدی اور گاڑی شو روم سے باہر نکلے اور ڈاکو آ جائیں اور وہ گاڑی نہ لے جائیں یہ کیسے ممکن ہے آپ یقین کریں انہوں نے میرے ہاتھ سے چابی لی اور گاڑی اسٹارٹ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن ان سے گاڑی اسٹارٹ نہیں ہوئی اور وہ چلے گئے۔“

”سنجیدہ سین کے لیے گلیسرین کا استعمال تو کرتی ہوں گی؟“

”کبھی نہیں۔ میں آپ کو بتاؤں کہ ایسے سنجیدہ سین کے لیے مجھے کبھی گلیسرین کا سہارا نہیں لینا پڑا۔ جب میری شادی ہوئی تو میں رخصتی کے وقت بہت روئی اور اب جب ڈراموں میں رخصتی کے سین ہوتے ہیں بیٹیوں کے تو مجھے خود بخود رونا آ جاتا ہے۔ بس یہ قدرتی بات ہے کہ جذباتی سین میں مجھے رونا آ جاتا ہے۔“

”بچت کی عادت ہے؟“

”ہاں کوشش تو ہوتی ہے لیکن میری فیلڈ ایسی ہے کہ مجھے کپڑوں پر زیادہ خرچ کرنا پڑتا ہے ویسے ہمارا شروع سے ہی سیٹ اپ ایسا رہا کہ ہمیں کبھی پیسوں کی کمی نہیں ہوئی۔ مجھے ایسا کوئی شوق بھی نہیں تھا اور نہ ہے کہ میں ڈائمنڈ خریدوں یا ڈیزائنرز کے کپڑے پہنوں۔ میرے نزدیک ان چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ میں نے جو پہنا ہے تو مجھے وہ ڈائمنڈ ہی ہے اور میں نے جو کپڑے پہنے ہیں وہ ڈیزائنر ہی کے ہیں‘ میں چاہے 400 والا جوتا پہنوں یا 4000 ہزار والا‘ مجھے کوئی کچھ نہیں کہے گا کیونکہ میں ان چیزوں پر یقین نہیں کرتی‘ نہ ہی ان کے لیے احساس برتری یا احساس کمتری کا شکار ہوں میں محفل میں بتا بھی دیتی ہوں کہ میں نے 70 ہزار کا جوتا نہیں پہنا ہوا بلکہ 700 کا پہنا ہوا ہے۔“

”گھرداری میں کیسی ہیں؟“

”بہت ماہر ہوں۔ نہ صرف میرا گھر صاف ستھرا رہتا ہے بلکہ قرینے سے سجا ہوا ہے‘ پھر مجھے کوکنگ بہت اچھی آتی ہے اور سب کو میرے ہاتھ کے پکوان بہت پسند آتے ہیں‘ سلائی کڑھائی بھی بہت اچھی آتی ہے اور اپنے کپڑے تو میں زیادہ تر خود ڈیزائن کرتی ہوں۔“

”اور مزاجاً کیسی ہیں؟“

”غصہ جلدی آتا ہے اور جلدی اتر بھی جاتا ہے۔ ویسے نرم مزاج ہوں۔“

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے صبا فیصل سے اجازت چاہی۔



نادرہ خاتون

خط بھجوانے کے لیے پتا

خواتین ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی.

Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

آسیہ مقصود ۔۔۔۔ ملتان

نمرہ احمد : پہلی قسط میں ایک عام گھریلو سیاست پر مشتمل لگنے والا یہ ناول آج ہمیں دینِ اسلام کی روح پرور حقیقتوں سے روشناس کروا رہا ہے۔

عنیزہ سید : بھی کافی عرصہ بعد نظر آئیں اور ہمیشہ کی طرح انہوں نے ایک معاشرتی المیہ کو موضوع بنایا اور خوب بنایا۔

ان کی کہانی کا نچوڑ (میری ناقص رائے کے مطابق) ان ہی کے الفاظ میں بیان کر رہی ہوں۔ "اگر اللہ کی طرف سے آئے حادثوں پر صبر کر کے زندگی کو اس کے پورے حق کے ساتھ گزارنے کا موقع ملے تو ضرور گزارنا چاہیے۔"

"سفال گر" کی تعریف کے لیے تو میرے پاس الفاظ بہت کم ہیں۔ ایسی تحریریں تو سالوں میں کہیں لکھی جاتی ہیں' اسے پڑھتے پڑھتے ہم اس ناول کی فضا میں ہی کہیں سانس لینے لگتے ہیں۔

کنیز نبوی نے تو اس بار کمال ہی کر ڈالا۔ کھوکھلی عورت' پڑھتے ہوئے بار بار بشریٰ رحمن بہت یاد آئیں۔

نکھر گئے گلاب' ایک ہلکی پھلکی تحریر لگی۔ وہ انگریزی کا ایک محاورہ ہے نا۔

Old wine in a new bottle خیر مزا تو آیا۔

آج کے اس معاشی' سیاسی' سماجی و اخلاقی بحران کے ماحول میں چہرے مسکراہٹوں کو ترسے ہوئے ہیں تو شگفتہ تحریریں تازہ ہوا کے جھونکے کی مانند محسوس ہوتی ہیں۔

نبیلہ عزیز کا مکمل ناول محبت' رقابت اور قربانی کی مثلث پر مشتمل ایک خوب صورت تحریر تھی۔

راشدہ رفعت کے افسانے "درد آشنا" کے بارے میں یہی لکھوں گی کہ ایک اچھی اور سبق آموز تحریر تھی۔

ج : آسیہ! تفصیلی تبصرے کا شکریہ۔ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔ آئندہ بھی اپنی رائے سے نوازتی رہیے گا۔

صبا افضل بٹ ۔۔۔۔ رسالہ نورو

ان سب رائٹرز کا شکریہ جو کہانی کو خوب صورت دلفریب اور منفرد الفاظ سے ترتیب دیتی ہیں اور حقیقت سے قریب تر اور اسلامی اقدار کو ملحوظ رکھ کر لکھتی ہیں۔ خاص کر عائشہ فیاض! ان کو بیٹے کی بہت مبارک باد۔ سرورق کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ جس ماڈل کو دیکھو' آنکھوں میں لینس لگائے ہوئے ہے۔ کیا ان کی اپنی آنکھیں اچھی نہیں ہیں؟ کرن کرن روشنی' اس سلسلے کے پڑھنے سے ہماری زندگی میں روشنی سی ہو جاتی ہے۔ یہ ایک بہت ہی خوب صورت سلسلہ ہے۔ اس بار تصویر سی بناتے جائیں نہ پا کر افسوس ہوا۔ "لفظ روشنی ہیں" پڑھ کر اچھا لگا "ہمارے نام" سلسلہ مجھے بہت پسند ہے۔ سب کی رائے پڑھ کر بہت ہی مزا آتا ہے۔

"معجزہ" روحی بانو کی زندگی پر لکھی جانے والی کہانی پڑھ کر دکھ ہوا لیکن انجام بہت اچھا تھا۔ عنیزہ سید نے کہانی کو بہت ہی خوب صورت انداز میں تحریر کیا ہے۔ ایسے

لوگ بہت کم ہیں جو دوسروں کو زندگی کی طرف لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ "سفال گر" بھی اس بار بہت اچھا رہا۔ بشریٰ بہت اچھا لکھتی ہیں آج کل کے دور میں جہاں انگلش بولنے کا رواج ہو گیا ہے وہاں اتنی گاڑھی اردو پڑھ کر اچھا لگا۔

مکمل ناول میں نمرہ احمد کا "مصحف" واہ! اس سے آگے الفاظ ختم ہوتے محسوس ہوتے ہیں۔ پھر بھی' نمرہ! بہت خوب صورت اندازِ تحریر ہے تمہارا۔ نمرہ نے اب یہ انکشاف کر دیا کہ فرشتے اور محمل بہنیں ہیں اور یہ بہت عجیب بات لگی کہ سب کو معلوم ہے' اس بارے میں بے خبر ہے تو صرف محمل۔ یہ تو وہی بات ہو گئی "جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے۔" نبیلہ عزیز کا ناول "مائے نی میں کینوں آکھاں" بہت اچھی اسٹوری تھی لیکن موموکا انجام پڑھ کر افسوس ہوا۔ "نکھر گئے گلاب سارے" مریم ساجد کی کہانی اچھی تھی لیکن بسمہ کی کہانی اچھی نہیں لگی۔ باقی سب افسانے ۔۔۔ [illegible] کافی عرصے بعد اچھی لگی۔

عدنان انکل بھی ایک بہت ہی اچھا اور نیک کام سر انجام دے رہے ہیں لوگوں کی زندگیوں کو آسان بنانے کے حوالے سے بہت اچھے لگتے ہیں اور ایک بات اور کہنا چاہوں گی کہ مختلف سلسلوں میں صرف مخصوص نام ہی شامل ہوتے ہیں۔ پلیز دوسروں کو بھی جگہ دیا کریں۔

ج: پیاری صبا! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ سلسلوں میں اگر چند مخصوص نام نظر آتے ہیں تو اس کی صرف ایک وجہ ہے وہ یہ کہ وہ قارئین اچھا انتخاب بھجواتی ہیں۔ ہمارے پیشِ نظر صرف تحریروں کا معیار ہوتا ہے خواہ وہ کسی نے بھجوائی ہوں۔ آپ ہمیں اچھی تحریریں انتخاب کر کے بھجوائیں۔ ہم ضرور شامل کریں گے۔

آپ کی رائے مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

ناظمہ امین ۔۔۔۔ ای میل

نمرہ احمد کو میری طرف سے سات سلام کہ ان کی تحریر میرے لیے مشعلِ راہ ہے۔ "سفال گر" بہترین ناول ہے۔ میری فرینڈز کہتی ہیں کہ بہت مشکل ناول ہے لیکن مجھے بہت پسند ہے۔ نبیلہ عزیز کی "مائے نی میں کینوں آکھاں" اچھا ہے اور عنیزہ سید کو آرام سے پڑھوں گی۔ آپی! آپ یقین کریں میں کل سے بہت اداس تھی میرا دل چاہتا ہے کہ میں آپ سے بات کروں اور بہت زیادہ کروں لیکن کوئی فائدہ نہیں' آپ کون سا مجھے پڑھیں گی۔

ج ناظمہ! آپ کو سالگرہ مبارک ہو۔ آپ نے یہ کیسے گمان کر لیا کہ ہم آپ کی تحریر پڑھیں گے نہیں۔ یقین کیجیے ہم سارے خطوط پوری توجہ سے پڑھتے ہیں۔ آپ شوق سے جتنا چاہیں طویل لکھیں۔

مریم افتخار ۔۔۔۔ وزیر آباد

منیر نیازی مرحوم نے کہا تھا کہ 'ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں' مجھے لگتا ہے کہ میں بھی ہمیشہ دیر کر دیتی ہوں' چاہے وہ خط لکھنے میں ہو یا رسالہ خریدنے میں۔ اپریل میں بھی یہی صورت حال پیش آئی میرے ساتھ ہوا کچھ یوں کہ اپریل کا خواتین مجھ سے مس ہو گیا ہے۔ اب وہ آپ نے مجھے دینا ہے چاہے جہاں سے مرضی لے کر۔

ج : مریم اپنا ایڈریس بھجوا دیں' آپ کو اپریل کا شمارہ وی پی کر دیا جائے گا۔

پارس بلوچ ۔۔۔۔ ڈھرکی

سعدیہ عزیز آفریدی' سعدی حمید چودھری' فرحت اشتیاق' آمنہ ریاض' عمیرہ احمد' رخسانہ نگار عدنان' راحت جبیں' نبیلہ ابر' نبیلہ عزیز' درِ ثمن' نایاب جیلانی' مریم عزیز اور ساجدہ حبیب ۔۔۔ ہماری فیورٹ رائٹرز ہیں۔ ساجدہ حبیب کی تحریر "وردی' وعدہ اور وفائیں" یہ ایک اعلا پائے کی تحریر تھی' جسے میں کبھی نہیں بھلا سکتی۔ "وردی' وعدہ اور وفائیں" کے بعد میرا دوسرا فیورٹ ناول ہے "سفال گر"۔ ہمیں یقین ہے کہ بشریٰ سعید کا "سفال گر" بھی ایک یادگار اور کبھی نہ بھلائے جانے والی تحریر ثابت ہو گی۔

نبیلہ عزیز کا مکمل ناول "مائے نی میں کینوں آکھاں" ہمیں رلا گیا۔ ملکہ آفاق کا انتقام اور حسد اس کی اپنی بیٹی کو ہی نگل گیا۔ موموتو ہر معاملے معصوم اور بے قصور تھی پھر اسے کس چیز کی سزا ملی اور پھر معظم تو ساری باتیں سن چکا تھا۔ اس معاملے میں جتنا بے خبر معظم خود تھا' اتنی ہی بے

خبر مومو بھی تھی، پھر اس نے کس جرم کی پاداش میں اسے اتنی باتیں سنا ڈالیں۔

مریم ساجد کا ناول "نکھر گئے گلاب سارے" موضوع تو پرانا ہی تھا لیکن ان کا اسلوب بیان اور انداز تحریر کہانی کو خوب صورت بنا گیا۔ "مصحف" نمرہ احمد کی ایک منفرد تحریر ہے وہ بہت ہی اچھے انداز میں کہانی کو آگے بڑھا رہی ہیں۔

"معجزہ" عنیزہ سید نے بھی بہترین انداز میں لکھا۔

"چراغ آخر شب" ہمارا فیورٹ سلسلہ وار ناول ہے۔

محبت خواب سفر کی بہت کمی محسوس ہوئی۔ اپیا جی! رخسانہ نگار آپی سے کوئی اچھا سا مکمل ناول لکھوائیں نا۔

اب آتے ہیں افسانوں کی طرف! سب سے پہلے کنیز نبوی کو پڑھا۔ کیا صرف معافی مانگنے سے بے وفائی اور دھوکہ دہی کا زخم بھر سکتا ہے؟ "دل دروازہ کھولے" رُخ چودھری اور "درد آشنا" راشدہ رفعت نے بھی اچھا لکھا۔ مصباح گل نے بھی بہترین انداز میں لکھا۔ ان کا افسانہ اچھا لگا۔

اپیا جی! کبھی آئیں نا آپ ہمارے شہر ہمارا شہر بہت ہی خوب صورت ہے، یہاں کے لوگ بھی نہایت خوش اخلاق اور مہمان نواز ہیں اور ٹوھری کے رَس گلے اور بادام کا حلوہ بہت مشہور ہیں ہم آپ کو ڈھیر سارے رس گلے کھلائیں گے۔

پارس! آپ کا خط پڑھ کر ہمارے منہ میں پانی آگیا میٹھا ہو اور بہت سارا ہو، اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ میٹھے کے بغیر تو ہمیں زندگی پھیکی پھیکی لگنے لگتی ہے۔ اگر مصروفیات نے اجازت دی اور زندگی نے موقع دیا تو آپ کے شہر ضرور آئیں گے اور آپ کے رَس گلے اور بادام کا حلوہ جی بھر کے کھائیں گے۔

تفصیلی تبصرہ اچھا لگا۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

ماریہ خان..... ای میل کراچی

نبیلہ عزیز آپی سے کہیں کہ "مائے نی میں کینوں آکھاں" نے مجھے اذیت میں مبتلا کر دیا۔ کیا ضرورت تھی مومو کو مارنے کی؟ آپ مجھے ایک بات بتائیں نبیلہ آپی! کیا معظم موحّل آفاق سے محبت کرتا تھا یا صرف انسیت تھی اسے موحّل سے؟

مہر تو ہر جگہ بھی۔ سب سے اذیت ناک ہوتا ہے یہ کہ جسے آپ چاہیں، وہ کسی اور کو چاہے لیکن اس سے زیادہ اذیت کا سبب یہ بات ہوتی ہے، جسے آپ چاہیں، وہ آپ کو مل جائے لیکن ہمیشہ کسی اور کا رہے۔ وہ موحّل پر غصہ کیوں ہوا آخر میں؟ میں آپ سے التجا کرتی ہوں، اس کے آگے بھی کچھ لکھیں۔

ج: ماریہ جی! آپ کی جذبات نبیلہ عزیز تک پہنچا رہے ہیں لیکن یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں اس سے آگے کیا لکھا جائے۔ مومو تو مر چکی ہے۔ اب اسے زندہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ معظم کا موحّل پر غصہ وقتی جذباتی لمحہ تھا۔ وہ بعد میں اس پر پشیمان ہوا۔

نفل..... ٹنڈو محمد خان

پچھلے ماہ رخسانہ نگار عدنان کا ناول مکمل ہوا، دل نے عاجز کر دیا کہ خط لکھ کر اپنی تعریف رخسانہ نگار تک پہنچاؤ کہ زبردست تحریر تھی۔ رخسانہ نگار اب آپ [illegible] مکمل ناول کے ساتھ جلد آئیے۔ آپ کے ناول، ناولٹ افسانے مجھے آج بھی یاد ہیں۔ بے خبری میں میں پرانے ڈائجسٹ کھو چکی ہوں۔ کاش میں انہیں چھپا دیتی تو آج یہ سرمایہ میرے پاس ہوتا۔ رخسانہ کی تحریروں سے جدوجہد کرنا، حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا، رشتوں کو نبھانا، بہترین اخلاق، محبتوں میں مخلص ہونا سیکھا ہے۔ ان کے نام سے، تحریروں سے مجھے محبت ہے۔ ایک سچی خالص پاکیزہ محبت۔

نمرہ احمد سے کہنا چاہتی ہوں کہ آپ نے جتنے بھی ناولز لکھے ان میں "مصحف" میرے لیے نمبر ون پہ ہے۔ جب سے محمل کو اپنے سوالات کے جوابات ملنا شروع ہوئے ہیں، ناول زبردست موڑ لے رہا ہے۔

نبیلہ عزیز کے ناول کا ٹائٹل جو پنجابی زبان میں تھا۔ سمجھ سے اوپر تھا اس کا مطلب بتائیے گا ضرور، مریم ساجد نے تو امیدوں کے جگنو روشن کر دیے۔ میرے خیال میں لڑکیوں کو باہر والوں کے لیے اتنا ہی بہادر اور سخت ہونا چاہیے۔

بشریٰ سعید کا ناولٹ جب سے شروع ہوا ہے ہر بار پڑھنے پہ بہت سی تعریفیں منہ سے نکلتی ہیں۔ خوب صورت جملوں کا چناؤ، کرداروں کی پختگی، معاشرے کی حقیقتوں کی تلخی کا سامنا ان کے کردار اچھی طرح ادا کر رہے

ان کے افسانے سب ہی اچھے تھے۔

کنیز نبوی کا افسانہ پسند آیا۔ اس عورت نے اچھا کیا کہ اس مرد (سعد) کو ہرا جھنڈا دکھایا۔

راشدہ رفعت کی تحریر اچھی تھی۔ مصباح! شکر ہے آپ نے مرد سے یہ اقرار تو کروایا کہ اس کی کامیابی میں اس کی بیوی کا ہاتھ ہے۔

عنیزہ سید بہت اچھا لکھتی ہیں۔ اسماء قادری اور سدرہ سحر عمران، ثمینہ عظمت علی کہاں ہیں، جلدی اپنی تحریروں کے ساتھ آیے۔

پیاری نفل! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ تفصیلی تبصرہ اچھا لگا۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔ نبیلہ عزیز کے ناول کا عنوان تھا "مائے نی میں کنوں آکھاں" اس کا مطلب ہے "ماں میں کس سے کہوں؟"

مہ جبیں..... ای میل لاہور

سارے ہی رائٹرز بہت اچھا لکھتی ہیں۔ عنیزہ جی نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ پھر فرحت اشتیاق، پھر نبیلہ ابر راجا، مالا ملک، رخسانہ نگار اور سب کی فیورٹ فائزہ افتخار کمال کی ڈرامہ نگار ہیں۔ ویسے بھی سب بہت اعلا لیکن یہ نایاب جیلانی سمجھ میں نہیں آتیں۔

آپ سے کہنا تھا۔ یہ کہانی (چراغ آخر شب) اپنی سمجھ سے تو باہر ہے، پتا نہیں کیا کیا سین چلتے رہتے ہیں، سمجھ نہیں آتا کہ یہ کس کی فیلنگز بیان کی جارہی ہیں پلیز اس میں کچھ تو واضح کیا کریں۔ دل ہی نہیں کرتا پڑھنے کا..... بڑے آسان انداز میں لکھا کریں، پلیز پہلے سین بھی بھول جاتے ہیں۔ اتنا مشکل لکھنے کا فائدہ، جب پتا ہی نہ چلے کہ کس کی بات ہو رہی ہے۔

پیاری مہ جبیں! چراغ آخر شب ایک پورا دور ہے۔ جس میں مختلف ادوار کے منازل اور کردار آپ کے سامنے آتے ہیں۔ آپ اسے روایتی کہانی سمجھ کر نہ پڑھیں، بلکہ اسے پاکستان کی معاشرتی تاریخ سمجھ کر پڑھیں تو آپ کو یقیناً لطف آئے گا۔

مسز سلیم..... ضلع اٹک

کسی بھی نئے ملنے والے سے بات کرنے کے لیے کسی حوالے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میرا حوالہ یہ ہے کہ گزشتہ چوبیس، پچیس سال یا اس سے بھی زیادہ وقت گزرا ہے آپ سب کی ہمراہی میں۔ جب امی، بابو جی کی چھاؤں میں ہم سب بہنیں بابل کے آنگن میں "تو شریک سفر رہا" کی نایاب پر بحث کرتے "شہریاراں" "دل دریا تن صحرا" سے لے کر "محبت خواب سفر" تک آپ کے ہمراہ ہوں۔ جب خالدہ اسد، ہما کوکب بخاری، غزالہ نگار اور کرنیٔ، رفعت سراج، ثمرہ بخاری، نگہت عبداللہ، اقبال بانو، عنیزہ سید، فریدہ اشفاق، شازیہ چوہدری (مرحومہ) سب گھر کے افراد کی طرح تھے، ریاض صاحب کی فیملی اپنے خاندان کی کسی فیملی کی طرح تھی اور ہم ان کے ہر دکھ سکھ میں شریک تھے۔

وقت کروٹ لیتا گیا بابو جی جو چھ پوزیشن ہولڈر بیٹیوں کے باپ تھے، کبھی بیٹا نہ ہونے کا گلہ نہ کرتے اور اپنی بیٹیوں کی اچھی تربیت پہ نازاں تھے اخبار اور اچھے ادب کی طرف راغب کرتے، جانے کیسے رسالے ہمارے گھر کا ایک حصہ بن گئے۔ امی چڑتی تھیں کہ کل انہوں نے دوسرے گھر جانا ہے تو کون یہ ناز اٹھائے گا.....

ایک ایک کر کے سب چڑیاں عازم سفر ہوئیں۔ بابو جی، امی جی جلدی جلدی اپنے فرائض ادا کرتے ہمیں اکیلا کر گئے۔ بابل کا آنگن ماں باپ سے خالی ہوا مگر باجی فرح اپنے تینوں بچوں کے ساتھ (علیحدگی کے بعد) کہ بعض اوقات ذہانت اور خوب صورتی مرد کے لیے ناقابل برداشت ہو جایا کرتی ہے، اس آنگن کو آباد کر گئیں اور انٹر کے بعد میری شادی ہوئی، جب میں میڈم رفعت ناہید سجاد کی بہت اچھی اسٹوڈنٹ تھی، میرے پاس شان دار ریکارڈ تھا مگر سسرال میں سارا ادب دوسرے کا دھرا رہ گیا۔ تعلیم طعنہ بن گئی اور ذہانت کو چالاکی کا نام ملا۔ پے در پے، پانچ بچوں کی اماں بن کر بھی وقت آگے کے بجائے پیچھے لے جاتا جب میکے میں ملتیں تو کوئی نہ کوئی خبر ڈسکس ہوتی۔ بابر بھائی، خاور بھائی، شازیہ چوہدری، عدنان شاہد کو ہم اپنے گھر والوں کی طرح روئے ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ اب تئیس سال گزار کر بڑی بیٹی کی بی ایس سی کے بعد شادی کر کے الحمدللہ حج کی سعادت بھی حاصل کر لی۔ سسرال کے فرائض سے بھی حقیقتاً "فراغت پا کر جب سب ریاضتوں کا فیصلہ بھی ملنا

شروع ہو گیا ہے تو زندگی میں ملنے والی اس فراغت میں سب سے پہلا حق آپ سب کا ہے کہ جنہوں نے امتحان میں ہاتھ نہیں چھوڑا۔ تینوں رسالوں کا معیار بہترین جا رہا ہے۔ کسی سے کوئی گلہ نہیں، نئی لکھنے والی بہت اچھا اضافہ ہیں۔ خصوصاً" عمیرہ احمد اور نمرہ احمد، جبین سسٹرز، تنزیلہ ریاض "مصحف" کے بارے میں کیا لکھوں اب تو سب کچھ برت چکے ہیں، سب سچ ہے۔

پیاری نیر! آپ کا خط اس سچائی کا گواہ ہے کہ خواتین ڈائجسٹ کے قارئین اس سے سچی محبت رکھتے ہیں اور زندگی کے ہر دور میں خواتین ڈائجسٹ ان کی زندگی میں شامل رہا ہے۔ یہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کا ہم پر بہت بڑا کرم ہے۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آئندہ بھی تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔ ویسے نیر! ایک بات بتانا ضروری ہے، آپ کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے، کبھی افسانہ نگاری کی طرف توجہ نہیں دی؟

صوفیہ سرور...... ای میل لاہور

نمرہ احمد نے قرآن مجید کے فہم و ادراک کو ایک نئے انداز میں پیش کیا۔

رفعت ناہید سجاد کا انداز تحریر قابل تعریف ہے۔ وہ ماحول کو کچھ اس انداز سے بیان کرتی ہیں کہ آنکھوں کے آگے فلم سی چلنے لگتی ہے اور اپنے ناول کے لیے جس موضوع کو انہوں نے چنا ہے، وہ بہت نازک اور بے حد محنت کا متقاضی ہے۔ اس کے لیے میں انہیں خراج تحسین پیش کرتی ہوں "سفال گر" کی کہانی آگے بڑھ رہی ہے اور اس ماہ کی قسط پسند آئی۔ باقی افسانوں میں سے "دل دروازہ کھولے" پسند نہیں آیا۔ میرا خیال ہے اس موضوع پہ اس انداز میں کافی کچھ لکھا جا چکا ہے۔ باقی یہ کہ ہماری فیورٹ رائٹر نمرہ بخاری کی تحریر کا بے چینی سے انتظار ہے۔

ج صوفیہ یاد آوری کا شکریہ۔ نمرہ کی تحریروں کا تو ہم بھی بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔ دیگر مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

سحر فرحین...... کراچی

آپ کے تینوں پرچوں کی تقریباً" تیرہ سال سے ایک خاموش قاری ہوں۔ آپ کے رسالوں کی عاشق ہوں جی ہاں عاشق، عشق ہے مجھے ان سے، ان کے پہلے صفحے سے لے کر آخری صفحے تک۔ کئی دفعہ امی نے میرے پڑھے بغیر ہی رسالہ پھاڑ دیا لیکن پھر بھی میرا ان کا ساتھ کوئی نہ توڑ پایا، یہاں تک کہ شادی کے بعد بھی، جب مجھ پر ایک بڑی بہو اور ماں ہونے کی بھی ذمے داریاں پڑ چکی ہیں، میرا اور اس کا اٹوٹ بندھن ٹوٹ نہ پایا بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں اور مضبوطی آ چکی ہے۔ میں نے شادی کے بعد بہت مشکل وقت بھی گزارا ہے اور شادی سے پہلے بھی، لیکن ان عزیز دوستوں کی بدولت مجھے زندگی کی تکلیفیں اور پریشانیاں تھوڑی آسان لگتی تھیں اور میں ان میں کھو کر کچھ دیر کے لیے اپنا دکھ بھول جاتی ہوں۔

ج : سحر فرحین! آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ ہم خط بغیر پڑھے پھاڑ دیں گے۔ ہمیں اپنے قارئین بے حد عزیز ہیں اور ان کی رائے بھی ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ اگر ہم آپ کے دکھوں کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں اور [illegible] خوشیوں بھرے لمحات مہیا کرتے ہیں تو یہ ہمارے لیے بہت بڑی خوش نصیبی ہے۔

ام ابو ہریرہ...... کراچی

نمرہ احمد کی تحریر "مصحف" نے خط لکھنے پر مجبور کر دیا اور لکھے بغیر رہ نہ سکی۔ دوسری قسط میں محمل کو قرآن کی تعلیم حاصل کرتے ہوئے بتایا گیا۔ اب قرآن کی تعلیم جو تفسیر کے ذریعے دی جاتی ہے کسی عام اسکول یا کالج میں نہیں دی جاتی بلکہ قرآن کی تعلیم یا دین کا علم کسی "مدرسہ" میں دیا جاتا ہے نہ کہ مسجد میں۔ ہمارے کراچی ہی کو لیں، اتنے بڑے بڑے خواتین کے مدارس ہیں، وہاں کا ماحول بالکل بھی ایسا نہیں ہے جیسا کہ مصنفہ نے پیش کیا ہے مدارس میں "میڈم یا میم" نہیں ہوتیں بلکہ استانی صاحبہ یا باجی ہوتی ہیں۔ پردے کا خاص اہتمام ہوتا ہے۔

مصنفہ نے ناول کے صفحہ نمبر 247 پر لکھا ہے کہ "قرآن کسی اچھے غیر متعصب عالم سے زندگی میں ایک مرتبہ ضرور پڑھ لینا چاہیے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کسی کا دامن پکڑنا ضروری ہے نہیں بلکہ کسی غیر متعصب تفسیر کو پڑھ کر بھی کسی حد تک قرآن کی سمجھ بوجھ پیدا کی جا سکتی ہے۔"

عرض ہے کہ ایک عالم ہی قرآن کا صحیح مفہوم سمجھا سکتا ہے خود سے نہیں پڑھ سکتے بہت سی باتیں ایک عام آدمی کو صرف قرآن اور حدیث سے سمجھ میں نہیں آ سکتیں اجتہاد ضروری ہے۔ جو دلیل ایک عالم دے سکتا ہے وہ ایک عام آدمی نہیں دے سکتا۔ عالم کی سوچ ایک عام آدمی کی سوچ سے بہت مختلف ہوتی ہے۔

ام ابو ہریرہ! آپ نے ہماری تصحیح کی۔ بہت شکریہ۔ دراصل وہ مدرسہ ہی ہے جہاں محمل قرآن کی تعلیم حاصل کرنے جاتی ہے۔ ہم آئندہ اسے مدرسہ ہی لکھیں گے۔

ام ابو ہریرہ! بہت معذرت کے ساتھ ہمیں کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ نمرہ کے ناول کا پیغام واضح طور پر نہیں سمجھ سکیں۔ نمرہ کے اس ناول کا مقصد یہ ہے کہ خواتین قرآن پاک کو ترجمے اور تفسیر کے ساتھ پڑھیں تاکہ اس کا مفہوم سمجھ سکیں اور جان سکیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس عظیم کتاب میں مسلمانوں کو کیا ہدایت اور پیغام دیا ہے۔ آپ نے مصنفہ کی اس بات کا حوالہ بھی دیا ہے کہ کسی غیر متعصب تفسیر کو پڑھ کر بھی کسی حد تک قرآن کی سمجھ بوجھ پیدا کی جا سکتی ہے۔" اب آپ خود ہی سوچیں کہ اس بات سے یہ پہلو کہاں نمایاں ہوتا ہے کہ نمرہ نے عالم کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی ہے؟ قرآن کی تفسیر لکھنے والا کوئی شخص یقیناً "ایک مستند عالم کے درجے پر ہی فائز ہوتا ہے کہ یہ کام کسی عام آدمی کے بس کا ہے بھی نہیں۔

بہت سے چھوٹے شہروں اور دیہاتوں میں عالمہ یا عالم نہیں ہیں یا مدرسے نہیں ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ قرآن کو سمجھنے کی کوشش نہ کریں۔ عالم یا عالمہ نہیں ہے تو کسی اچھی تفسیر کو پڑھ کر اسے سمجھنے کی کوشش ضرور کی جائے۔ یہ سوچ کر نہیں چھوڑ دینا چاہیے کہ ہم عالم کے بغیر نہیں سمجھ سکتے۔ خطبہ حجتہ الوداع میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح طور پر فرمایا تھا کہ "میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، ایک قرآن، دوسری میری سنت...... تو اے لوگو! میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا اور ان دونوں کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہنا۔"

رسول پاک کے اس ارشاد مبارکہ سے قرآن کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ نمرہ نے بھی یہی پیغام دیا ہے۔ پیاری بہن! آپ کی معلومات کے لیے عرض کر دوں کہ کراچی ہی میں چند ایسی مساجد موجود ہیں جو

صرف خواتین کے لیے مختص ہیں اور وہاں قرآن کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔
جہاں تک قرآن یا حدیث کو دلیل کہا گیا ہے، اس کا مقصد قرآن اور حدیث کی برتری ثابت کرنا ہے کیونکہ قرآن و حدیث پر سارے علما اور امتِ مسلمہ کا اجماع ہے جبکہ کسی مسئلہ پر فقہی لحاظ سے علماء کی رائے مختلف ہو سکتی ہے۔

رقیہ ارشد۔۔۔۔۔وزیر آباد

سب سے نمایاں خوبی جو میں نے خواتین ڈائجسٹ اور شعاع میں پائی ہے وہ یہ ہے کہ یہ تمام بہنوں کو فحاشی سے پاک اور ان کے مزاج، رہن سہن اور عادات و اطوار کے مطابق مواد مہیا کرتا ہے۔
اس ماہ کا سرورق اچھا لگا۔ تمام افسانے اور ناول اچھے تھے نایاب جیلانی جب بھی لکھتی ہیں تو قارئین کے دل جیت لیتی ہیں۔ بشریٰ سعید ایک منجھی ہوئی رائٹر ہیں مگر ان کا ناول "سفال گر" وہ تاثر نہ چھوڑ سکا جو رقصِ جنوں نے ہمارے ذہنوں پر چھوڑا تھا۔ اس ناول میں سب سے بڑی پرابلم کرداروں کا گڈمڈ ہونا ہے دوسرا بہت سے انگلش کے الفاظ استعمال کرنا ہے۔ کیونکہ ہر قاری سنہ تو بہت ایجوکیٹڈ ہوتا ہے جو ان مشکل الفاظ کو سمجھ سکے۔ دوسرا وہ ناولز زیادہ زبردست ہوتے ہیں جو ہماری تہذیب و تمدن سے متعلق ہوں کیونکہ مغرب کی تہذیب، ان کی اخلاقیات اور رہن سہن کا معیار ہم سے کافی مختلف ہوتا ہے۔ ایک شخص کی ہالی وڈ اسٹار بننے کی لگن ہمیں متاثر نہیں کر سکتی۔ یقین مانیے جب میں ان گوروں کو اپنے بے گناہ مسلمانوں بھائیوں کا خون بہاتے ہوئے سنتی ہوں، مجھے ان سے نفرت سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ بہرحال بشریٰ سعید صاحبہ نے جو نتائج اس ناول میں پیش کی ہے وہ واقعی لاجواب اور قابلِ تعریف ہے۔
پلیز مجھے نمرہ احمد اور نایاب جیلانی کے متعلق کچھ بتائیں کہ وہ کہاں سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کا کیا پروفیشن ہے۔

ج : رقیہ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ نمرہ احمد اور نایاب جیلانی دونوں ہاؤس وائف ہیں۔ نمرہ کی شادی ابھی، تقریباً سال بھر پہلے ہوئی ہے۔

اس سے پہلے وہ پڑھ رہی تھیں۔
بشریٰ سعید کا ناول ہماری بہت سی قارئین پسند بھی کر رہی ہیں۔ کبھی کبھی عام تحریروں سے ہٹ کر کوئی تحریر پڑھنا اچھا لگتا ہے۔ آپ کے لیے خوش خبری یہ ہے کہ اس ناول کے اختتام پر (اس کی چند اقساط ہی رہ گئی ہیں) بشریٰ سعید نے ہماری معاشرت پر مکمل ناول لکھنے کا وعدہ کیا ہے۔ آپ دعا کریں کہ ان کے حالات سازگار رہیں اور وہ اس وعدہ کی تکمیل کر سکیں۔

ثوبیہ جبیں۔۔۔۔۔نامعلوم شہر

سیکنڈ ایئر کی طالبہ ہوں اور پڑھائی سے عشق ہے۔۔۔۔ میٹرک کے بعد آپ کا پرچا "خواتین ڈائجسٹ اور شعاع" میرے بیسٹ فرینڈ بن گئے اور اب تو گوڈی سہیلی بن گئی ہیں ہم۔۔۔۔ رسالے چھپ چھپ کر پڑھے۔ بہت مار بھی کھائی۔۔۔۔ لیکن ہڈیاں ڈھیٹ ہیں۔ راجپوت قوم ہے ہماری اور میواتی زبان ہے۔
راجپوت قوم ہمارے ابو بتاتے ہیں کہ۔۔۔۔ یہ ہندوؤں کی سب سے اونچی ذات تھی اور بہت مغرور اور سب سے ظالم قوم کہلاتی تھی۔ بس جہاں جہاں اسلام آباد۔۔۔۔ پھیلتا گیا جو راجپوت مسلمان ہو کر ہجرت کر آئے وہ میواتی ہو گئے اور جو ہندو ہی رہے انہیں میوتیوں کا نام دے دیا گیا۔ ہمارے راجپوت میں آج تک ہندوانہ رسوم و رواج رائج ہیں۔ وہ دلہنوں کے پاؤں میں مہندی کا تھال پڑواتے ہیں۔ ناف تک لمبا گھونگھٹ روایت ہے۔۔۔۔ ایک بات بہت غلط ہے ہماری قوم میں کہ وہ عورتوں کو بہت پنج سمجھتے ہیں، ان کی تعلیم کی مخالفت کرتے ہیں اور ان کا ایمان ہے کہ عورت صرف نسل کو بڑھانے اور گھر کی رکھوالی کے لیے اللہ نے پیدا کی ہے۔

ج : پیاری ثوبیہ! آپ کا افسانہ ان شاء اللہ جلد شامل ہو جائے گا۔ راجپوت آن پر مر مٹنے والی غیور قوم ہے لیکن عورت کو پنج سمجھنے والی بات غلط ہے۔ عورت کا تو ہمارے مذہب میں بہت بڑا درجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ماں کے قدموں تلے جنت رکھی ہے۔

عابدہ ناہید۔۔۔۔۔پاہڑیانوالی تحصیل پھالیہ

خواتین اور شعاع سے وابستگی نئی نہیں، بہت پرانی ہے۔ تقریباً دس سال پرانی اور دس سال زندگی کا ایک بڑا حصہ ہوتے ہیں۔ ان دس سالوں میں کئی موسم آئے، کئی گئے۔ زندگی گزارنے کا طریقہ سلیقہ ان ہی سے سیکھا اور سیکھتے رہیں گے۔
اس دفعہ مئی کا شمارہ آیا۔ پڑھا، بہت اچھا لگا۔ ہر کہانی، ہر سلسلہ بہت اچھا تھا۔ لیکن مجھے قلم اٹھانے پر مجبور کیا نمرہ احمد صاحبہ نے۔ "مصحف" دیکھنے میں ایک عام سی اسٹوری ہے۔ لیکن نمرہ احمد نے اس میں جو قرآن اور تفسیر کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے، یہ زبردست ہے۔ تیسری قسط میں جو بات ہوئی نماز کے بارے میں۔ میں تو پڑھ کر گنگ رہ گئی کہ واقعی اللہ کو ہماری عبادت کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کی تو اتنی مخلوقات ہیں جو دن رات اس کی عبادت میں مشغول رہتی ہیں۔ اگر ایک انسان اس کی عبادت نہیں کرے گا، اسے سجدہ نہیں کرے گا تو اسے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ فرق تو ہمیں پڑتا ہے۔ اللہ کو ہماری نہیں بلکہ ہمیں اللہ کی ضرورت ہے۔ شیطان نے ہمیں اپنے فتنے میں ایسا الجھا دیا ہے کہ ہم [illegible] ڈھونڈنے کے لیے ادھر ادھر [illegible] لیکن قرآن کی طرف دیکھنے کی بھی [illegible] نہیں۔ اگر ہم قرآن کو کھول کر دیکھ لیں، پڑھ لیں [illegible] مسائل کا حل ڈھونڈ سکتے ہیں۔
پلیز نمرہ سے کہیں کہ یہ کہانی کا اینڈ اچھا کیجیے گا اور محمل کے رشتے داروں کو سزا ضرور دلایئے گا۔ کیونکہ محمل تو جس راہ پر چل پڑی ہے اس کا تو مقصد ہی معاف کرنا ہے اور ہماری پسندیدہ رائٹر عمیرہ احمد صاحبہ! جناب آپ کدھر چلی گئی ہیں بھئی۔ آپ ٹی وی اور اپنی زندگی میں اتنی مصروف ہو گئی ہیں کہ ہمیں بالکل ہی بھلا بیٹھیں۔ آپ سے ایک سوال پوچھنا ہے کہ نمرہ احمد اور عمیرہ احمد کی آپس میں کیا رشتہ داری ہے پلیز بتایئے گا ضرور۔

ج : پیاری عابدہ! دس سالہ رفاقت میں ایک بھی خط نہیں۔ اپنی رائے کا کوئی اظہار نہیں؟ یہ تو ہم جانتے ہیں کہ اگر خواتین ڈائجسٹ سے آپ کی وابستگی برقرار ہے تو یقیناً آپ اس سے مطمئن ہیں لیکن آپ کے خطوط ہمیں جو خوشی دیتے ہیں، اس کا آپ اندازہ بھی نہیں کر سکتیں۔ نمرہ احمد اور عمیرہ احمد تک آپ کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔ عمیرہ کی کمی آپ کو ہی نہیں ہمیں بھی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔

نمرہ احمد اور عمیرہ احمد کی آپس میں کوئی رشتہ داری نہیں ہے۔

ماہ وش جنید...... کراچی

سب سے پہلے "مصحف" پڑھا۔ واقعی نمرہ احمد آپ نے بڑی ذمہ داری اٹھائی ہے۔ افسانے بہت اچھے تھے لیکن کنیز نبوی آپ کا اینڈ پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ "بھروسہ" بھی بہترین تحریر تھی۔ نبیلہ عزیز آپ سے تو میں یہ ہی کہوں گی "تسی چھا گئے ہو ٹھا کر کے"۔ آپ کی تحریر کردار مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ "مائے نی میں کینوں آکھاں" بھی اچھی تھی۔ ملکہ بیگم نے جو کیا وہ ان کی بیٹی نے بھگتا اپنی جان دے کر اور ملکہ کو شاید سبق مل گیا لیکن معظم کا اینڈ واضح نہیں کیا۔ معظم اور مہر ایک ہو جائیں گے واضح کرنا چاہیے تھا اور پھر کیا حنان درانی مہر کو دوبارہ کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ نایاب جیلانی اس بار آپ کی کمی محسوس ہوئی۔ فرحت اشتیاق، ثروت نذیر، نبیلہ ابر راجہ، میمونہ خورشید، رفعت سراج، تنزیلہ ریاض، راحت جبیں، ماما ملک آپ سب کہاں ہیں؟ پلیز جلدی سے اچھی اچھی تحریریں لکھیں۔ مئی کے مہینے میں شازیہ چودھری کا کوئی چھوٹا سا افسانہ شائع ہو جاتا تو بہت اچھا لگتا۔

ماہ وش! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کا شکریہ۔ مہر کی شادی معظم سے ہو گئی۔ یہ بات آخری سطروں میں واضح ہے۔ حنان درانی اب اسے تنگ نہیں کر سکتا کیونکہ وہ معظم کی بیوی بن چکی ہے اور مہر کو اس نے اغوا کیا اس کے کئی ثبوت موجود ہیں۔ سب سے بڑا ثبوت مہر کی شکل میں موجود ہے۔ اب کسی اقدام کی صورت میں اس کے لیے بہت سے مسائل کھڑے ہو سکتے ہیں۔ اس لیے وہ کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کرے گا۔

آپ کی اور آپ کی بہن کی تحریریں ابھی پڑھی نہیں ہیں۔

زینب مختیار...... ملتان

ناول کچھ خاص نہیں تھا۔ سلسلے وار ناولوں میں "مصحف" اول نمبر پر ہے۔ نمرہ احمد نے کمال کر دیا۔ انہوں نے دین اور دنیا کو کیسے یکجا کیا۔ اس سے ہمارا ایمان اور بھی قوی ہو گیا۔ بے شک قرآن پاک میں ہر بات کا حل موجود ہے۔ لیکن اس کے لیے عقل اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔ نبیلہ عزیز کی تحریر نے آنکھوں کو نم کر دیا۔ ملکہ آفاق کے کیے کی سزا مومو کو موت کی صورت میں بھگتنی پڑی۔ افسانوں میں راشدہ رفعت نے ماں کے احساس کو اچھی انداز میں پیش کیا ہے۔ عنیزہ سید نے اپنی ماں کے بارے میں بہت اچھا لکھا۔

زینب! صبا قمر کے انٹرویو کی فرمائش نوٹ کر لی ہے' جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف پہنچائی جا رہی ہے۔

☼



رفعت ناہید سجاد

چراغِ آخرِ شب

پروفیسر عباس رشید کا گھرانہ علمی و تہذیبی اعتبار سے مڈل کلاس روایات کا امین ہے۔ پروفیسر صاحب کی قابلیت اور نیک نامی مثالی ہے۔ وہ تاریخ کے مضمون کے استاد رہ چکے ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں' ان کا دروازہ ہر طالب علم اور خاص و عام کے لیے کھلا رہتا ہے۔ شاگرد' ان کے علمی خزینے سے فیض حاصل کرنے آتے رہتے ہیں۔ گھر کا تمام نظم و نسق پرانی گھریلو ملازمہ کریم بی کے ذمہ ہے، جو بڑی جانفشانی سے سنبھالے ہوئے ہیں۔ ان کی بیگم کے ساتھ اولادوں کو بھی آزادیٔ اظہار کی مکمل اجازت ہے۔ ان کی تین اولادیں ہیں۔ تنویر' عثمان اور عبیر۔

بڑی بیٹی تنویر ماں کی لاڈلی ہے۔ دورانِ تعلیم غیر نصابی سرگرمیوں میں خاصی سرگرم رہی۔ وہ مقامی کالج میں پڑھاتی ہے۔ شادی کے بعد اس کی صلاحیتیں جیسے گہنا گئی ہیں۔ سسرال میں علم اور تہذیب دونوں کی کمی ہے۔ ساس گھر پر حاوی ہیں' اپنے آگے وہ شوہر سمیت کسی کی چلنے نہیں دیتیں۔ تنویر کا شوہر نعیم برا مرد ہے۔ وہ ایک مقامی روزنامے میں صحافی ہے لیکن ایک پڑھی لکھی بیوی کے ساتھ اس کا رویہ انتہائی بے حسی لیے ہوئے ہے۔ ایک بچی گڑیا ہے جس کی نگرانی کریم بی کے سپرد ہے۔ پسند کی شادی اور نوکری کرنے کے باوجود سسرال میں اس پر زبان بندی کا اصول سختی سے لاگو ہے۔

عثمان عباس کا شمار ان نوجوانوں میں ہوتا ہے جو قابلیت اور ڈگری کے باوجود معقول نوکری حاصل نہیں کر پاتے۔ تاہم گھر کے ماحول اور پر اعتماد فضا نے اسے مکمل مایوس نہیں کیا ہے۔ وہ مختلف آئی ٹی یونیورسٹیز کے لیے پروگرامنگ کر کے اتنا کما لیتا ہے کہ گزر اوقات اچھی ہو جائے۔

عبیر آج کے دور کی لڑکی ہے جو اپنے ذہن سے فیصلہ کرنا جانتی ہے۔ گھر میں باپ سے قریب ہونے کے باعث ان کی علمی تجربے سے فیض اٹھانے کا موقع اسے زیادہ ملا ہے۔ وہ ماسٹرز کی طالبہ ہے' وہ حالات کو حساس انداز میں لیتی ہے۔



عبیرہ اپنی بڑی بہن سے زیادہ بچپن کی سہیلی حمیرا سے قریب ہے۔ اونچے طبقے کی پروردہ ثریا بھی عبیر کی دوست ہے لیکن وہ صرف عثمان کی وجہ سے اس گھر میں آتی جاتی ہے۔ عبیر اسے خاص وجہ سے عزیز رکھتی ہے۔

گھر میں چچا عبدالعزیز اور ماموں کریم بخش اپنے اسرار کے ساتھ بہ وجوہ رہائش پذیر ہیں۔ بڑی تائی بے اولاد ہیں اور بیوگی کے بعد سے کچھ دن قیام کے لیے پروفیسر صاحب کے یہاں آتی ہیں۔ جہاں ان کی ساس بھی رہتی ہیں۔

عبیر کا گروپ یوم پاکستان کے حوالے سے اسٹیج شو کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ وہ لوگ وطن سے محبت قوم کے دل میں اجاگر کرنے کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں ناکامیوں سے عبیر دل برداشتہ ہوتی ہے تو وہ کچھ دیر کے لیے حمیرا اور رضا کے یہاں چلی آتی ہے' جہاں ان دونوں کی والدہ آپائی اپنے خلوص اور ڈھیر ساری محبت سے ان کا سواگت کرتی ہیں۔ یہ محبتیں اسے روح تک سرشار کردیتی ہیں۔

ان کے گروپ میں ان کی کوششیں رنگ لاتی ہیں اور شو کرنا صرف اسپانسر مل جاتا ہے بلکہ ڈراما آڈینس میں بے حد پسند کیا جاتا ہے۔ عبیر کو سب سے زیادہ شو میں کزن شہریار کی موجودگی مسرور کرتی ہے' جو محض عبیر کی خاطر طویل سفر طے کر کے شو دیکھنے آتا ہے۔ دونوں میں لفظوں سے زیادہ دل کا رشتہ ہے' اس لیے ایک دوسرے کی بات فوری سمجھ لیتے ہیں۔ عثمان' شہریار کے لیے عبیر کے جذبات سے آگاہ ہے۔

ان ہی دنوں بابا جان کی عدم موجودگی میں ایک واقف کار سے عبیر کی ملاقات ہوتی ہے' جن کی مختلف سی شخصیت اسے کچھ الجھادیتی ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

۲۱

اکیسویں قسط

من کہ مسمی نعیم ملک ولد ارشاد ملک' درج ہے کہ میں مذکورہ بالا پتے پر رہائش پذیر ہوں اور بقائمی ہوش و حواس اپنا یہ بیان افسر تحریر کنندہ کے سامنے قلم بند کرواتا ہوں۔

میری بیوی کا چال چلن درست نہیں۔ میں نے بہت مرتبہ اس کو محبت پیار سے راہ راست پر لانے کی کوشش کی لیکن اس نے میری ایک نہ سنی۔ وقوعہ کے روز جو کہ درج بالا کالم میں تحریر ہے' وہ اپنے ایک آشنا کے ساتھ میرے گھر سے فرار ہوگئی اور جاتے ہوئے گھر کے سارے زیورات جن کی کل مالیت بارہ لاکھ سے زائد تھی' جو میری ماں نے اپنی بیٹیوں کو جہیز میں دینے کے لیے اس کے پاس بطور امانت رکھوائے تھے' ہمراہ لے گئی اس جرم میں اس کا باپ برابر کا شریک ہے۔ میں مجرم کے طور پر عباس کا نام نامزد کرتا ہوں۔ جناب والا! وہ ایک عادی مجرم ہے۔ سابقہ حکومتوں کے زمانے میں بھی وہ بدنام زمانہ سی آئی اے کا ایجنٹ رہا ہے۔ اس پر مقدمہ بنا' اس کو ملازمت سے برطرف کیا گیا۔ جس کا ثبوت arex1 میں پیش کیا گیا ہے متعلقہ حکام میرے الزام کی شہادت جیل کے ریکارڈ سے چیک کرسکتے ہیں۔ واضح رہے' وہ غداری کے سلسلے میں حکمرانوں کو مطلوب تھا لیکن اپنے ذاتی اثر و رسوخ کی بنا پر جو کہ اس کا غیر ملکی بدنام زمانہ نیوز ایجنسیوں سے وابستگی کے سبب تھا' اس کو رہا کروالیا گیا نا صرف رہا ہو کر آگیا بلکہ اس کو اس کی سابقہ ملازمت پر بحال کردیا گیا۔

مزید عرض ہے کہ اس کے آشنا جمال نامی فرد نے جو کہ ایک معزز عہدے پر فائز ہے' اپنے عہدے کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے اپنا جرم چھپانے کی خاطر مجھے ایک جھوٹے مقدمے میں ملوث کردیا۔ الحمدُ للہ کہ رب العزت نے میری بے گناہی ثابت کردی۔"

رضا نے سیڑھیوں پر بیٹھے بیٹھے ہی پلٹ کر دیکھا۔ وہ جا چکی تھیں۔ وہ جانتا تھا۔ اٹھتے اٹھتے ان کے قدم اکھڑ اکھڑ جاتے ہوں گے۔ آنکھیں بھی نم ہوئی ہوں گی۔ لیکن انہیں بہادری کا میڈل لٹکانے کا بے حد شوق ہے۔ اس لیے وہ ان کے سامنے یہ دو قطرے بھی نہیں ٹپکائیں گی جن کو عمر بھر کہتی آئی تھیں۔ "بڑے ہو جاؤ رضا! مرد بنو عثمان!"

مگر عجب بدقسمتی تھی۔ اس نے گڑبڑا کر سوچا۔ آخر ہر ایسے اہم موقع پر وہ ہی کیوں موجود ہوتا ہے۔ ایسے تمام امور جن کو سر عباس تک پہنچانے کی اس کی کوئی خواہش نہیں ہوتی۔ اسی پر کیوں آپڑتے ہیں۔ چچی نائلہ یہ لفافہ اس کی طرف اچھال کر اسی لیے جاچکی ہیں کہ یہ مٹی مٹی سی سیاہی میں فوٹو اسٹیٹ کی ہوئی دستاویز ان تک پہنچانے کی ذمہ داری اس کی ہے' ممکن ہے یہ لفافہ آج انہیں موصول بھی نہ ہوا ہو اور ہوسکتا ہے عثمان' عبیر سے اس کا تذکرہ تک نہ کیا ہو۔ وہ اسی انتظار میں ہوں کہ میں کب آتا ہوں تاکہ عبیر عثمان کو معاملے کی سنگینی سے آگاہ کر سکوں۔ یہ بھی ممکن ہے وہ محض اس کو اطلاع ہی دے رہی ہوں۔

بہرکیف۔ اس نے از خود اس ذمے داری کو اٹھاتے ہوئے سوچا۔ وہ یہ کاغذ لے کر سر کے پاس ضرور جائے گا۔ چچی نائلہ نے ان کی پیشانی پر بڑا بڑا ٹیگ لگا رکھا ہے۔

Fragile Handle with care (نازک۔ احتیاط کے ساتھ برتیے) کرسٹل کی طرح قیمتی۔ لیکن کانچ کی طرح نازک سر عباس کو وہ خود بھی کسی کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔

دروازہ پرانے اسپرنگ کے چرچرانے کی وجہ سے ایک چوں سے کھلا۔ چچی نائلہ گیلری میں بھی نہیں تھیں۔ جانے کہاں چھپی وہ کیا کررہی ہوں گی۔ وہ کوئی سی کیفیت میں کھڑا رہ گیا۔ پہلے کس کے پاس جائے وہ جب بھی ان پر بوجھ لاد دیتیں' اس کا سامنا کرنے سے بچتا پھرتی تھیں۔

وہ کسی کے بھی پاس جانے سے پہلے بلاوجہ ان تصویروں کے آگے رکا حالانکہ اب تک وہ تصویریں ان سب کو ازبر ہو چکی تھیں۔ جون آف آرک ہیں۔ کوئی صاحب ہیں جو آسمان پر کبوتر یا چڑیاں دیکھتے ہیں (ابھی طے نہیں ہوا کیا دیکھتے ہیں) ایک ہیروئے صاحب ہیں۔ انہوں نے ان کو نام گھر کے بڑوں سے چھپ کر دیے تھے۔ ان کے نزدیک یہ جیتے جاگتے انسان نہیں محض کردار تھے۔

پتا نہیں کون لوگ تھے' کہاں رہتے تھے۔ ان سب کی قبریں کہاں ہوں گی۔ اپنے دائمی مکانوں میں جانے سے قبل اور اس فریم کی کھڑکی میں قید ہونے سے پہلے وہ کیا کیا سوچتے تھے۔ انہوں نے کون کون سے دکھ جھیلے ہوں گے۔ کتنی خوشیاں منائی ہوں گی۔ وہ جب فوت ہوئے تو کوئی ان پر رویا ہوگا۔ پھر رونے والوں پر بھی اب تو کوئی رو بیٹھا ہوگا۔ سو کسی بھی دکھ' پریشانی کی بس اتنی ہی عمر ہوتی ہے۔ وہ یونہی کھانے والے کمرے کی طرف نکل گیا۔ فریج سے پانی کی بوتل اور ریک سے گلاس اٹھا کر چپ چاپ کرسی پر آبیٹھا۔ گھر میں گونجتے سناٹوں میں کال بیل کی کرخت آواز نے اسے لمحہ بھر کو چونکایا۔ اس کا دروازہ کھولنے کا کوئی موڈ نہیں تھا۔

"اب کون آگیا؟" اس نے جھنجلاہٹ سے سوچا۔

"چچا عبدالعزیز۔ ذرا دروازہ دیکھ لیجیے۔" انہوں نے کوئی جواب تو نہیں دیا۔ لیکن ان کی کنگھار بھری کھانسی اندر تک گیٹ کی طرف جاتی سنائی ضرور دی۔

دو گلاس غٹاغٹ چڑھا جانے کے بعد اس نے تیسرا گلاس بھرا۔ وہ گھبرایا ہوا نہیں تھا۔ لیکن انصاف سے توقع جاتی رہی تھی۔ جس سسٹم میں ہم رہتے ہیں وہاں ظالم' مظلوم سب آپس میں گڈمڈ ہوجاتے ہیں۔ وہ رسان سے بیٹھ کر زندگی کو قابو میں رکھنے کے گر سوچنے لگا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اسے تحریر بھی زہر لگی۔ غلط فیصلے صرف فیصلہ کرنے والوں کو نقصان نہیں پہنچاتے۔ اس کی لپیٹ میں آس پاس کے بہت سے لوگ نہ چاہتے بھی آجاتے ہیں



لیکن فیصلوں کے نتائج تو فیصلہ کیے جانے کے بعد ہی بھگتے جاتے ہیں۔

پھر جیسے کسی حتمی نتیجہ تک پہنچ ہی گیا تھا۔ اس نے استقامت سے کندھے سیدھے کیے ٹھوڑی بلند کی۔ مٹھی میں بھیگ کر پسیجی ہوئی ایف آئی آر کی شکنیں درست کیں جو اماں کے ہیجان کا پتا دیتی تھیں مضبوط قدموں سے چلتا وہ ان کے کمرے پر آکر ٹھٹک گیا۔

دروازہ نیم وا تھا "آدھا کھلا" آدھا بند۔ وہ ایک خاص طرز زندگی کے عادی تھے۔ دروازہ مکمل بند ہو یا پورا کھلا۔ کوئی ادھورا کام انہیں اچھا بھی نہیں لگتا تھا۔ نیم وا دروازوں سے انہیں وحشت ہوتی تھی۔ اپنے سے رخصت ہو کے جانے والے کو وہ پیچھے سے ضرور آواز دیتے تھے۔

"بیٹا دروازہ ٹھیک سے بند کرنا۔"

ثریا کہا کرتی تھی۔ ہم سب نے سر عباس کو لاڈلے بگڑے بچے کی طرح پال رکھا ہے۔ وہ بھی اپنے لاڈ اٹھوانے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ثریا بھی ابھی پتا نہیں کہاں ہو گی۔ لڑکیاں بتا رہی تھیں کہ اس کی شادی کا کارڈ آیا تھا۔ چونکہ مبالغہ آرائی ان پر ختم ہے۔ لہٰذا ان کا یہ بیان بھی سننے میں آیا تھا جس رقم میں عموماً شادیاں ہو جاتی ہیں اس کے صرف انہوں نے کارڈز چھپوائے تھے۔ عجیب ہیں لڑکیاں۔ بے مقصد ٹراتی رہتی ہیں۔ دیکھا جائے تو یہ بھی لاڈلیاں ہیں۔ ان کو بھی بگاڑ رکھا ہے۔ بگاڑا تو ہم نے جی بھر کر تنویر کو بھی تھا۔ وہ جس موضوع سے بچنے کو بھاگتا پھر رہا تھا۔ وہ گھوم پھر کر پھر اس کے سامنے آکھڑا ہوتا۔

"کیا ضمانت قبل از گرفتاری کروانی چاہیے۔ مقدمے میں پیل کرنا اہم ہو سکتا تھا۔ جوابی مقدمہ دائر کرنا اہم ہو گا بھی یا نہیں۔"

عثمان سے گفتگو کے بعد ہی وہ کسی نتیجے تک پہنچ سکے گا۔

"تم کو عباس میاں اندر بلوا رہے ہیں بیٹا!"

کریم بی ناخ تاخ کرتی نزدیک سے گزری تھیں۔

"کریم بی!" رضا نے اپنی پیشانی سے تفکر مٹاتے بڑی بشاشت سے کہا۔

"ذرا اندر چائے بھجوا دیں گی۔"

"چائے تو کب کی بھجوا دی بیٹا! عباس میاں کے پاس ان کے کوئی ملاقاتی آئے بیٹھے ہیں۔"

اس نے نیم کشادہ دروازہ پورا کھولا۔ بات تو اب مہمان کے جانے کے بعد ہی ہو گی۔ اس نے ایک قدم اندر رکھا ہی تھا۔ لمحہ بھر کو اس کو اپنے اعصاب میں پھر سے تناؤ محسوس ہوا۔ یونی فارم میں ملبوس سر کے برابر والی کرسی پر موجود شخص غیر متوقع تو نہیں تھا۔ اس کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ خواہ یہ غصہ لاحاصل نتیجہ ہی ہو۔

"آؤ بیٹا! بیٹھو۔" انہوں نے رسان سے کہا۔ "میں نے عثمان کو بھی بلوایا ہے۔ پہنچتا ہی ہو گا۔ ایس ایس پی عارف میرے طالب علم رہے ہیں..... بہت بھلا بچہ ہے۔ طالب علمی کے سوا بھی کچھ چیزیں ماضی میں ان سے منسلک رہی ہیں اور یہ میرے بے حد عزیز دوست کا بیٹا ہے رضا۔"

یونی فارم میں ملبوس شخص کی خوش دلی اس کو زیادہ بھائی نہیں۔ نہ ہی گرم جوشی سے اٹھے اس کے ہاتھوں کی طرف وہ خوش اخلاقی سے لپکا۔

"کیسے آنا ہوا؟"

"یونہی سر کو سلام کرنے چلا آیا تھا۔"

"شاید یونہی تو آپ نہیں آئے۔" اس نے اپنے لہجے کی تلخی ذرا بھی ماند پڑنے نہیں دی تھی۔

"پتا نہیں ہم اس وردی میں اپنے گھر میں دیکھ کر لوگ ہمیں رد کیوں کر دیتے ہیں۔"

"اگر لوگ ایسا کرتے ہیں تو ضرور اس کی کوئی وجہ ہی ہو گی۔ تجربات سے گزر کر ہی انسان کوئی رائے بناتا ہے۔ ہمارے ملک میں بار بار انقلاب آئے ہیں۔ کتنی ہی دفعہ عوام نے تنگ آ کر حکومتوں کو پٹخ دیا۔ پھر ہم نئے زمانے کی آس میں جینے لگتے ہیں۔ ہم بہت خوش فہم لوگ ہیں ایس ایس پی صاحب! ہر دفعہ ایک نئی آس لگا لیتے ہیں لیکن اس تبدیلی سے آج تک بدلا کچھ نہیں۔ میں اور آپ بھی نہیں۔ وہی چور اچکے دندناتے پھر رہے ہیں۔ ایک چور جاتا ہے تو دوسرا چور آجاتا ہے۔ قاتلوں کو آپ پناہ دیتے ہیں۔ شریف آدمیوں کے وارنٹ جیب میں لیے پھرتے ہیں جن کی حفاظت آپ کی ذمے داری ہے۔ ان سے خوف زدہ آپ بنکرز میں چھپے بیٹھے ہیں۔ پھر پوچھتے ہیں۔ لوگ وردی میں دیکھ کر آپ کو رد کیوں کر دیتے ہیں۔

اس سب سے میں نے کیا سیکھا؟ کم از کم میں نے ذاتی طور پر اگر آج آپ عدل قانون کی لاٹھی پکڑ کر انہیں لے گئے تو یقین کر لیجیے۔ آپ کی چوکی پر جو اگلا دھماکہ ہو گا اس کی ذمے داری میں ابھی سے قبول کرتا ہوں۔"

"رضا، رضا۔" سر نے اس کی بلند ہوتی آواز کو وقفوں وقفوں سے ٹوکا تھا۔ مگر وہ سر کی طرف بھی متوجہ نہیں تھا۔ وہ چپ ہوا تو کتنی دیر کے لیے سناٹا چھا گیا۔

"آپ کی عمر کا تقاضا ہے رضا میاں! یہ شعلہ بیانی آپ پر جچتی ہے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"میں جانتا ہوں۔ آپ ایسا کچھ نہیں کریں گے۔ لیکن ہر وردی والا چور ہو ضروری نہیں اور ہر وردی والے کی جیب میں وارنٹ ہوں' یہ بھی ضروری نہیں۔ ضروری یہ بھی نہیں کہ ہر انقلاب ضائع ہو جائے۔ ہم قوم یہود تو نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں دھتکاری ہوئی قوم قرار دیا ہو۔ وہ ہماری طرف متوجہ ہو گا۔ تبدیلی بھی آئے گی اور بار سر رضا! میں آپ کو بتا دوں' اب اگر سر عباس کے ساتھ ظلم ہوا تو آپ کو حملہ آور بننے کی ضرورت نہیں پڑے گی یہ کام میں خود کروں گا۔ اجازت ہے سر۔ چائے کا شکریہ۔"

وہ جھٹکے سے اٹھا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

اس نے اس کے باہر جاتے وجود کی طرف دیکھا۔ دروازے کا پٹ نیم وا تھا اور وہ باہر جا چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

عباس رشید کلاس لے کر باہر نکلے۔

وہ طالب علموں کے ہجوم کے ساتھ ساتھ چلا کرتے تھے۔ جو ان کے ساتھ ہی کلاس سے ریلے کی طرح نکلا تھا۔

ایک دھیمی میٹھی مسکراہٹ۔ شفاف پیشانی پر تفکر سے سوچتے بل۔ دائیں بائیں چلنے والوں کے سوالوں کا جواب دیتے۔ وہ عام استادوں کے مقابلے میں بے پناہ مقبول تھے۔ یونیورسٹی تک پہنچتے ویسے بھی شاگرد استاد اتنے فاصلوں میں نہیں رہتے تھے اور انہوں نے تو فاصلوں کا وہ تکلف بھی ختم کر ڈالا تھا۔ ان کا مطالعہ اس قدر وسیع تھا کہ خشک اوق بین الاقوامی گتھیوں سے لے کر ناصر کاظمی تک انہیں سب ازبر تھا۔ وہ بڑی باقاعدگی سے فیکلٹی کی میٹنگ میں شرکت کرتے۔ ٹریڈ یونین ازم ان کی رگ رگ میں بسا تھا۔ سیاست یونی ورسٹی کا اوڑھنا بچھونا رہی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے یونین بین ہوئی۔ یونین کے الیکشن تقریباً "ایک صدی تک مسلسل ہوتے رہنے کے بعد سمیٹ دیے گئے۔

یونی ورسٹی سیاسی تربیت گاہ بھی تھی۔ اپنے وقت کے طالب علم لیڈر بعد ازاں مشہور قومی سیاسی لیڈر بھی بنے۔ لیکن اب برا وقت آن لگا تھا۔ مارشل لا کا سخت زمانہ۔ ہر قسم کی سیاسی سرگرمیاں بین تھیں۔ سیاسی نعرہ بازی گناہ تھی۔ ہر چیز اکھاڑ پچھاڑ کا شکار تھی۔ ڈنڈوں مکوں سے سیاست گولیوں تک آ پہنچی تھی۔ شاید ہی کوئی سال ہوتا جب طالب علم آپس کی فائرنگ سے ہلاک نہ ہوتے۔ اظہار کے سیدھے راستے بند ہو جائیں تو لوگ چور دروازے استعمال کرتے ہیں۔

یونی ورسٹی میں استادوں کی دھڑا دھڑ بھرتی ہو رہی تھی۔ پوچھنے والا کوئی نہیں تھا۔ مخصوص حلیوں کے لوگ کہاں سے آتے تھے اور پتہ نہیں کیونکر استاد بن گئے تھے۔ لیکن یونیورسٹی میں آئے دن ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ بغیر کسی مقابلے کے راتوں رات بھرتیوں کا رواج عام ہو چلا تھا۔ انتخاب کرنے والے ہر فن مولا تھے۔ واپڈا سے لے کر تعلیمی اداروں تک وزیر مشیر سے لے کر سفارت تک ہر اعلا عہدہ ان کے قبضہ قدرت میں تھا۔ یہ چھوٹے موٹے کلرک سیکشن آفیسر' استاد ڈاکٹر ان پیشوں سے انہیں کوئی خاص رغبت نہیں تھی۔

فیکلٹی کے کمروں میں سر عباس کا پہلا کمرہ تھا۔ انہوں نے دور سے دیکھا۔ وہ نصف کھلا ہوا تھا وہ لیکچر دینے جاتے تو اپنا دروازہ چوپٹ کھول جاتے تھے۔ ان کی غیر موجودگی میں ان کے طالب علموں کو چھوٹی چھوٹی بہت سی چیزوں کے استعمال کی آزادانہ اجازت تھی۔ اگر کوئی ان کے خرچے پر چائے پینا چاہے یا ان کی اسٹیشنری سے کسی کو کچھ درکار ہو۔ کوئی پین' بال پین کاغذ اور کچھ نہیں تو کوئی یونہی دم لینے کو رکے۔ راہ چلتے کچھ دیر ٹھہرے۔ ان کے کمرے میں کونے میں بچھے صوفے پر سگریٹ کے کش لگائے اور کمرہ دھواں دھواں چھوڑ کر باہر نکل جائے۔ ان کی ٹیبل ڈائری پر اوٹ پٹانگ کے نوٹ لکھے ورنہ ایزی چیئر پر پاؤں پھیلا کر ان کی واپسی کا انتظار کرے۔

اندر سے اٹھنے والے کسی خوف اور اندیشے نے سر اٹھایا۔ وہ خبردار کرتا ایک گھڑیال عین اسی وقت اندر ٹن ٹن شروع کر دیتا ہے۔ حالانکہ کچھ دیر کے لیے ان کے بے جا اندیشوں کو ایک خیال نے دبایا۔ سلطان نے اپنی مخصوص حفاظت والی ڈیوٹی کے پیش نظر دروازہ بند کر ڈالا ہو گا۔ طالب علموں کی طرح وہ بھی ان کا خاصا منہ چڑھا تھا۔ عموماً "سبز دبیز پردوں کے پیچھے سے اس کا سر اندر آتا۔ باقی کا وجود پردوں کے پیچھے برآمدوں کی طرف ہی ٹھہرا رہتا۔

"صاحب بہادر! ایک سو روپیہ دیں۔"

صاحب بہادر بغیر کسی سوال جواب کے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک نوٹ نکالتے ہیں۔ کبھی کبھی سلطان مانگنے کے لیے گنتی کا استعمال بھی نہیں کرتا۔

"صاحب بہادر! ذرا ایک سبز نوٹ پکڑائیں۔"

ان کے بدترین اندیشے بے جا نہیں تھے۔ انہوں نے دروازہ کھولا تو میز کے دوسری طرف دو افراد جیسے ان کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ لمحہ بھر کو سر عباس کو اپنے دل میں کچھ اتھل پتھل ہوتا محسوس ہوا حالانکہ ملاقاتی کوئی انہونی بات نہیں تھی۔

وہ سادہ شلوار قمیص میں ملبوس تھے۔ پشاوری چپلوں کے فیتوں میں جکڑے پاؤں۔ دونوں بظاہر ایک جیسے ہی لگتے تھے۔ ان کے چہروں پر پھیلی پتھروں کی سی سنگینی بھی یکساں تھی۔ سر عباس کو اندر داخل ہوتا دیکھ کر دونوں احتراماً "کھڑے ہو گئے۔ گرم جوشی سے ان کے بڑھے ہاتھوں میں بھی سرد مہری تھی۔ ان کی ہتھیلیوں کی ٹھنڈک کوئی پیغام دے رہی تھی۔ انہوں نے اپنا اور اپنے محکمے کا تعارف کرایا۔

"سو وہ آ گئے۔" انہوں نے سوچا۔ "کب سے انتظار کی اس کیفیت میں وہ لٹک رہے تھے کہ کب آتے ہیں۔"

"آپ کو تکلیف دی۔" وہ قطعی غیر معذرت خواہانہ انداز میں رواں تھے "اگر آپ کے پاس وقت ہو تو کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔ دراصل۔"



عباس نے اپنی نشست سنبھالنے سے قبل ایک۔ چھچھلتی سی نظر ان پر ڈالی۔ بظاہر سکون سے بیٹھے دونوں افراد کہیں سے بھی پرسکون نہیں لگ رہے تھے۔

"اگر وقت ہو؟" انہوں نے سوچا۔ "مگر نہ ہو تو کیا واپس چلے جائیں گے۔"

لیکن یہ کسی قیمت پر واپس نہیں جائیں گے۔ ان کے ارادے ان کی پیشانیوں پر لکھے تھے۔ وہ بڑی ڈھٹائی سے کرسی پر ڈٹے ہوئے تھے۔

"میری اگلی کلاس بارہ چالیس پر ہے۔ اس وقت تک کے لیے میرے پاس بالکل فرصت ہے آپ فرمایئے۔" انہوں نے اپنے مخصوص ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ حالانکہ خود ان کو اپنی آواز میں ارتعاش کی ہلکی سی جھلک سنائی دی تھی۔

"یہاں۔" ان میں سے وہ جس کی مونچھیں تھیں اس نے حیرت سے اس مختصر سے آفس کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔

"کیوں نہ ہم تھوڑی دیر کے لیے باہر چلیں۔ کہیں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔ میرے خیال میں دفتر کا یہ ماحول بات چیت کے لیے قطعی سازگار نہیں۔"

انہوں نے ایک نظر دونوں کی طرف دیکھا۔ بڑی مشق سے بولے گئے جملے۔ بڑی مہارت سے چنے الفاظ جیسے وہ عمر بھر ان جملوں کی ریہرسل کرتے آئے ہوں۔ کہیں کوئی جھول نہیں تھا' جیسے یہ جملے بار بار بولے گئے ہوں۔ غلطی کی گنجائش ہی نہیں تھی۔

"یہ میرا آفس ہے۔ میں منع کردوں گا تو کوئی اندر نہیں آئے گا۔"

"صاحب بہادر!" عین اسی وقت سلطان کا سر اندر آیا۔

"چائے؟"

"نہیں سلطان! تم جاؤ۔ اور جب تک میں نہ کہوں کوئی اندر نہ آئے۔"

"جو حکم" سلطان کا سر اسی لمحے پردے سے غائب ہوگیا۔

"جی فرمایئے اب۔" وہ پھر مشکوک افراد کی طرف متوجہ ہوئے۔

"یہ مداخلت تو وقفوں وقفوں سے جاری رہے گی۔ کتنی مرتبہ آپ کا حکم مانا جائے گا۔ ہم یہاں بات نہیں کر سکتے ہمارے ساتھ بہرحال آپ کو جانا ہوگا۔ آپ چاہیں یا نہ چاہیں۔"

اس کی آواز گرم جوشی سے سرد مہری کی طرف اور وہیں سے تحکم کی طرف موڑ کاٹ چکی تھی۔

"آپ تو ایسے بات کررہے ہیں جیسے میں گرفتار کیا جاچکا ہوں۔" سر عباس نے بے زاری سے کہا۔ حالانکہ وہ جانتے تھے' یہ ناممکنات میں سے نہیں۔

"ایسا نہیں ہے۔" دوسرے والے نے بڑی چابک دستی سے لہجے کو پُرسکون کیا۔ اس کے انداز کا یہ ریورس گیئر ان کی قطعی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

"ہمیں کچھ چیزوں کے بارے میں آپ سے معلومات لینا ہیں اور یہ آپ کا قومی فریضہ ہے۔ بطور استاد... بطور ایک ذمے دار شہری کے جو کچھ آپ کے علم میں ہو۔ ہمیں سچ سچ بتا دیجیے۔"

"گویا اب تک میں جھوٹ بولتا آرہا ہوں؟ معاف کیجیے۔ میں جھوٹ تفریحاً بھی نہیں بولتا۔"

سر عباس کو خیال آیا۔ وہ یونہی تکرار کیے جارہے ہیں۔ اس سے ہونی کو ٹال تو نہیں سکتے۔ صرف سامنا کرنے سے کترانے سے کوئی سرا ہاتھ بھی نہیں لگے گا۔ انہیں لے جانا ہے اور لے جائیں گے۔ انہیں جس جس کو لے

جانا تھا۔ اسے لے جاچکے ہیں۔ مزید جوان کی لسٹ میں ہے۔ اس کو بھی جانا ہوگا۔

وہ بہ رضا و رغبت اپنی سیٹ سے کھڑے ہوگئے۔

وہ وارنٹ مانگتے یا یونیورسٹی میں داخل ہونے کا اجازت نامہ طلب کرتے۔ لیکن ان کا دعوا تھا وہ گرفتاری کے لیے نہیں آئے اور یونیورسٹی شارع عام نہ ہونے کے باوجود سب کے لیے کھلی تھی۔ جہاں نہ دروازے تھے نہ چہار دیواری۔ یہ درسگاہ ہے۔ جہاں آمدورفت پر کوئی روک ٹوک نہیں۔ ابھی جامعہ پر وہ وقت نہیں آیا تھا کہ دیواروں میں چُن دی جاتی۔

وہ کوئی مظلوم لڑکی بھی نہیں تھے کہ ان کو اغوا کرلیا جاتا۔ مارشل لا اور ایمرجنسی کے باوجود وہ ایک ذمے دار شہری ہیں۔ کچھ نہ کچھ حقوق تو اس بندوق تلے بھی رکھتے ہی ہوں گے۔

انہوں نے ایک نظر دروازے کے پار دیکھا۔ ڈیپارٹمنٹ روزمرہ کی سرگرمیوں میں مگن تھا۔ خوش گپیاں کرتے، اپنی ذات میں گم بے فکرے نوجوان یا کتابوں میں محو امتحان کی فکروں میں سرگرداں۔ کوئی ان کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔

"سلطان کو بتا جائیں۔" انہوں نے چند ثانیے کے لیے ٹھٹک کر سوچا۔ گو اس کی سمجھ داری مشکوک تھی۔

"ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ کو؟ شاید یہ سب سے بے کار ذریعہ تھا۔ یقیناً" اس کے علم میں یہ بات پہلے سے موجود ہوگی۔ وہ خود بھی اس کھیل کا کہیں نہ کہیں کوئی کردار ہوگا۔

"سلمان کو فون کریں یا گھر اطلاع بھجوائیں۔" پر انہیں بے سبب کی یہ بڑھک اچھی نہیں لگی۔ سکون سے انہوں نے اپنا بریف کیس اٹھایا۔

"سبز شیشوں والا رے بین Rayben شیفر کا قلم۔ ایرن مور کا تقریباً" خالی تمباکو ڈن ہل کا پائپ چند سادہ کاغذ کچھ ذاتی تصویریں نیوز ویک کا تازہ شمارہ۔"

بریف کیس میں چیزیں جماتے۔ جیسے انہوں نے اپنی چیزوں کی لسٹ پر کاؤنٹر سائن (Counter Sign) کروائے تھے۔

وہ ان کے بریف کیس اور اس کی لسٹ سے قطعی بے پروا تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ اب روانہ ہوا جائے۔ وہ باہر نکلے تو انہیں لگا۔ وہ خود بخود ان کے دائیں بائیں سے ان کو حصار میں لیے تھے اور ایک انچ یا ایک لمحہ کو ان کو اپنی رینج سے باہر نہیں ہونے دے رہے تھے۔ گاڑی تک پہنچتے انہوں نے اسی اطمینان سے کہا۔

"سر! اصل میں آپ ہماری حفاظت میں ہیں۔" لفظوں کے منافقانہ مفہوم بھی حال ہی میں رائج ہوئے تھے۔ مدت گزری، ملک حفاظت میں لے لیا گیا تھا۔ لیڈرز بھی اور آج وہ خود کسی کی پناہ میں تھے۔ ان کا قصور کیا تھا۔ وضاحتیں دینے، قائل کرنے کی ان کی عادت نہیں تھی۔

گاڑی میں چونکہ غیر معمولی خاموشی تھی۔ ان کے دائیں بائیں بیٹھے دونوں زیادہ گفتگو کے عادی بھی نہیں لگتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے فرصت میں سابقہ چند دنوں پر غوروخوض شروع کردیا۔ پچھلے کئی سال سے وہ بین الاقوامی تعلقات کے پیپر پڑھا رہے تھے۔ جن اخباروں میں وہ لکھا کرتے تھے، وہ بند کردیے گئے تھے۔ جو اخبار جاری تھے، وہ ان کو چھاپتے نہیں تھے۔ چوری انہوں نے نہیں کی۔ بنک ڈکیتی کی کسی واردات میں وہ شریک نہیں تھے۔ قتل ان سے سرزد نہیں ہوا۔ کسی اخلاقی یا سیاسی جرم میں دھر لیے جانے کے لیے انہیں تو کہیں کوئی گنجائش نظر نہیں آرہی تھی۔ انہیں اپنا بظاہر کوئی جرم نظر نہیں آتا تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ تھے اور بولتے تھے۔ موجود تھے اور سوچتے تھے۔ کڑھتے تھے۔

"کبھی کبھی ہم اس قدر تنگ نظر ہوجاتے ہیں کہ ہم سے مختلف کسی سوچ کا وجود بھی ہم سے برداشت نہیں ہوتا۔"

"کیا میں گرفتار کیا جاچکا ہوں؟"

ان کو لگا سوال تو بچکانہ ہے مگر پوچھ لینے میں حرج بھی کیا ہے۔ لیکن ان کی آواز کی غیر معمولی استقامت اور قطعی بے فکرے انداز میں پوچھے گئے سوال پر جیسے کار میں موجود باقی لوگوں پر اضطراب کی سی ایک کیفیت گزری تھی۔

"I am afraid yes ۔"

"اور میں نے کیا جرم کیا ہے؟ اس کی کوئی تفصیل آپ کے پاس ہے؟"

"نہیں۔"

"میرے وارنٹ؟" اچانک ان کے بائیں پہلو پر بیٹھا شخص تلملا اٹھا تھا۔

"بہت زیادہ قابلیت مت بگھاریے پروفیسر صاحب! ہم آپ کے طالب علم نہیں۔ ملک میں ایمرجنسی لگی ہے۔ آپ کو کہیں سے بھی اٹھایا جاسکتا ہے۔ گلی سے، سڑک سے، گھر سے۔ یہ قانون آپ نے نہیں پڑھا ہے؟"

"یقیناً" آپ میرے طالب علم نہیں۔" انہوں نے اسی سکون سے کہا۔ "اور شکر ہے کہ نہیں ہیں۔"

"ش ش۔" ایک نے دوسرے کو مزید بحث میں الجھنے سے روک دیا تھا۔

راستہ نامانوس نہیں تھا جہاں سے گاڑی بھاگتی جارہی تھی۔ لاہور کا وہ کون سا گلی کوچہ تھا جہاں کی خاک انہوں نے نہیں چھانی تھی لیکن سفر جاری تھا۔ کیمپس گزرا۔ نہر گزری، فیروز پور روڈ پوری گزر گئی۔ پتہ نہیں اس کا خاتمہ کہاں ہے اور کون جانے جو وہ ان لوگوں اور راستوں کو آخری بار دیکھ رہے ہوں۔ سست روی سے سائیکلوں پر اونگھتا مزدور طبقہ۔ فلموں کے اشتہار پڑھتے بے مصرف نوجوان۔ اچھرہ میں خریداری کرنے والی چیل جھپٹتی کفایت شعار خواتین کا ریلا۔ سواری کا انتظار کرتے رکشا۔

یہ سب بھی اچھا بھلا دلچسپ ہوتا ہے اگر آپ کو اپنے اندر سے باہر نکلنے کا موقع ملے۔ ان کے سامنے سے منظر متحرک فلم کی طرح تیزی سے گزر رہے تھے جب ان کی گاڑی مزنگ چونگی پر صنم سینما کے سامنے تکے کبابوں پر ٹلہ بولتے نوجوانوں کے سامنے سے گزری اور ان کی توقع کے مطابق جیل روڈ کی طرف نہیں مڑی تو ان کو تشویش لاحق ہوگئی۔ گاڑی نے لٹن روڈ کا راستہ پکڑ لیا تھا۔ آخر انہیں کہاں لے جایا جارہا ہے۔ معلوم نہیں ان لوگوں کا تعلق محکمہ پولیس سے تھا بھی یا یونہی وہ جذبہ گرفتاری میں اغوا ہو رہے ہیں۔ اس ایک شش شست کے بعد گاڑی میں مکمل سناٹا تھا۔ ڈرائیور نے تو اس سارے سفر کے دوران گردن اس قدر سیدھی رکھی کہ شیشے میں سے بھی ان کو نہیں جھانکا تھا۔

گاڑی رواں تھی، کچہری بھاٹی، داتا صاحب بلند عمارتوں کے پیچھے سے جھانکتے شاہی مسجد کے مینار۔ چھپا دیے تھے گھروں نے خدا کے گھر کیسے۔

مینار پاکستان کے لق دق گراؤنڈ میں کرکٹ کھیلتے لڑکوں سے گاڑی نے اب چونا منڈی کی طرف رخ کیا تھا۔ مختصر سا گھوم کر وہ اب ایک عظیم الشان دروازے کے سامنے ٹھہر گئی تھی۔

سامنے شاہجہاں کا قلعہ تھا۔ لاہور فورٹ۔

ایسے ہی ایک اور محل میں اس کے باپ شہنشاہ نے انصاف کے لیے ایک زنجیر لٹکائی تھی۔ حضور والا فریادی بازیابی کا منتظر ہے۔ مگر کہاں ہے انصاف؟

لاہور قلعے کے اندر گیروے رنگ کا سنہری عکس والا گوردوارہ بھی نظر آرہا تھا۔ جو سکھوں کے عہد حکومت میں قلعے کے درمیان کہیں کھڑا کرلیا گیا۔ وہ اس طرح تعمیر کیا تھا کہ قلعے کا سارا حسن اس کے پس منظر میں چلا گیا تھا۔

سڑک کے پار شاہی مسجد تھی جس میں خطیب قرآنی آیات پڑھا کرتے تھے۔

"فرعون زمین پر بڑا بن بیٹھا۔ اور اس نے انسان کو طبقات میں تقسیم کردیا۔"

یہی مسجد سکھوں کے عہد میں شاہی اصطبل قرار پائی جس کے سبزہ زاروں پر رنجیت سنگھ کے گھوڑے گھاس چرتے پھرتے تھے۔ وہی سکھ جنہوں نے ہجرت کے موقع پر وطن کی طرف سفر کرنے والوں کا قتل عام کیا۔

مسجد کے ساتھ مینار پاکستان تھا۔ جہاں لوگوں کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر میں قائداعظم نے اُس زبان میں کچھ کہا جو وہاں موجود اکادکا لوگ ہی سمجھتے تھے۔ لیکن اعتماد کا یہ عالم تھا کہ یہ شخص جو کچھ کہہ رہا ہے' وہ غلط ہو ہی نہیں سکتا۔

وہ تاریخ کے قدموں میں کھڑے تھے۔ چہار طرف سے عہد حکومت ان کو گھیرے میں لیتے تھے۔ مغل سکھ انگریز' ہندو سب نام ور بے نام ہو جاتے ہیں۔ لیکن تاریخ سے عبرت لی گئی نہ درس۔

چھوٹی باریک اینٹوں سے کھڑی کی گئی جاہ و جلال سے سربلند عمارت کے صدر دروازے پہ کھڑے انہوں نے سوچا۔ مغل بادشاہ ہاتھیوں کے ہودے پر سوار۔ زرق برق فراک پہنے۔ زیورات سے لدے پھندے ہاتھ میں گلاب کی ادھ کھلی کلی پکڑے داخل ہوا کرتے تھے۔ مدت سے یہاں ٹورسٹ کا داخلہ منع تھا' کیونکہ ان کے بقول قلعے کی مرمت ہو رہی تھی۔ اور کون جانے قلعے میں کس کس کی مرمت ہو رہی تھی۔

وہ اپنے لڑکپن میں یہاں لاتعداد مرتبہ آئے تھے۔ یہ تجربہ کرنے وہ مغل شہزادہ ہوتے تو کیا محسوس کرتے۔ وہ بہت سوچتے تھے بغیر کواڑوں کے اس گھر میں لوگ سوتے کہاں تھے۔ کپڑے کیسے بدلتے تھے۔ نہاتے دھوتے کہاں تھے۔ یہ تنگ تنگ اندھیری کوٹھریاں ان تنگ چرخوں کی خواب گاہیں نہیں ہوسکتیں۔ کھلے صحن میں فواروں کے آس پاس جس مچھر نے سکندر اعظم کی جان لے لی ان کو تنگ نہیں کرتا تھا؟

قلعے کے بارے میں ان کی تاریخ کمزور تھی نہ جغرافیہ۔ یہیں کہیں پولیس نے حسن ناصر کی جان لی تھی۔ جہاں حسن ناصر نے جان دی ہوگی وہاں مستقل پہرہ تھا۔ کوئی پاس بھی نہیں پھٹک سکتا تھا۔

ایک مرتبہ دور کہیں کسی کوٹھری کے روشن دان میں لحہ بھر کو بجلی چمکی اور بند ہوگئی۔ پتہ نہیں اس وقت کون بدقسمت وہاں کس مرحلے سے گزر رہا تھا۔ وہ ان بھول بھلیوں میں بھی اترے جن کے بارے میں ہدایت تھی یہ اندر ہی اندر کہیں دہلی کے لال قلعے میں نکل جاتی ہیں۔ وہ اندر گئے کچھ دور چلے بھی لیکن دہلی تک بہرکیف نہیں پہنچے۔ ہنوز دلی دور است۔ اندر اتنی سیلن اور گھپ اندھیرا تھا۔ وہ تاریک سرنگیں کئی شاخوں میں تبدیل ہو جاتی تھیں۔ ایک جلتی ماچس کی تیلی میں شاید سفر ممکن نہیں تھا۔ وہ باہر نکل آئے۔

انہوں نے ان کے ہاتھ سے بریف کیس لے لیا۔ آس پاس کھڑے کچھ اور لوگ ان کو اُترتا دیکھ کر نزدیک آگئے تھے۔ اپنے استقبال میں آنے والوں کو انہوں نے جھروکے سے درشن دیا۔ پھر انہوں نے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔

چوبدار نے نقارے پہ ضرب لگائی۔

"باادب' باملاحظہ ہوشیار۔ نگاہ روبرو ظل سبحانی' فخر شاہان ہند' تاجدار تخت دہلی' شان فرماں روایان مغلیہ تشریف لاتے ہیں۔"

ان کے ہاتھ ایک کپڑے کی دھجی سے آگے کی طرف بندھے تھے۔ دوسری دھجی' ان کی بصارت پر تاریکی کا پردہ

ڈالے تھی۔ جب باہر سے روشنی بند ہو جائے تو اندر کی آنکھ اپنی خواہش سے منظر دکھانے لگتی ہے۔

دیوہیکل بھاری دروازہ کو آہستہ آہستہ کھلتے انہوں نے محسوس کیا' وہ ہاتھی پر سوار' فیل کی چال سے لہراتے بڑی شان سے تلواروں کی چھاؤں میں داخل ہوئے اور سیڑھیوں کے اس راستے سے اوپر اٹھ گئے جو ہاتھیوں کو طے کرنی تھیں۔

کبھی وہ آئے تھے۔ گھوڑے دوڑاتے' قلعوں کی فصیلوں پر بغل میں آدمی دبا کر دوڑتے۔ نکالے گئے تو آخری زمانہ تھا۔ ریشم واطلس میں ملبوس گردن تو لکھے کے بوجھ سے جھکی۔ کمہاروں کے ڈنڈوں پر سوار پالکیوں میں ناز سے لہراتے میدان جنگ کی طرف روانہ ہوتے تھے۔

وہ شاہ وقت اقلیم کو سہارا دیے چلے۔ وہ سبزہ زاروں کے پاس سے گزرے۔ اوپر چڑھتے۔ نیچے اترتے ایک خاموش سناٹے کو توڑتے قلعہ میں قید ہوا ان کے چہرے کو چھو کر گزرتی۔

وہ اس ہوا سے بھی نامانوس نہیں تھے۔ جب سارا لاہور حبس اور گھٹن کا شکار ہوتا۔ ان جالی دار جھروکوں سے بھر بھر ہوا گزرتی تھی۔ اب وہ ان کو لیے نیچے کہیں سیڑھیاں اتر رہے تھے۔ سیڑھیوں سے اترنے کا یہ سفر بہت طویل ہو گیا تھا۔ پھر شاید وہ صحیح مقام پر پہنچ گئے تھے کیونکہ اب چلنے کا عمل بند ہو گیا تھا۔ پھر ان کے ہاتھ آزاد ہوئے اور آنکھوں سے پٹی اتار لی گئی۔ وہ کسی ایسی جگہ کھڑے تھے۔ جہاں دن کی روشنی میں بھی چھت سے ایک تار کے ذریعے پیلا سا بلب روشن تھا۔ پٹی کھل جانے کے بعد انہیں کتنی دیر تک کچھ نظر نہیں آیا۔ اتنی دیر تاریکی میں رہنے کے بعد آنکھیں روشنی اور اندھیرے میں فرق کرنے سے قاصر تھیں۔ آنکھوں کے سامنے ناچتے رنگ برنگے ترمرے۔ اندھی سی مایوس روشنی میں ڈیسک کے پیچھے دراز قد لیکن جھکی ہوئی توند والے آدمی نے ایک اچٹتی نظر ان پر ڈالی۔ یہاں تک لانے والے پلٹ گئے۔ اب وہ نئے لوگوں کے ہاتھوں میں تھے۔ دوست تو وہ بھی نہیں تھے لیکن اتنی دیر کے ساتھ میں وہ ان سے مانوس ہو گئے تھے۔

"مجھے اس طرح یہاں بلا لانے کی وجہ۔۔۔؟" اس سناٹے کو توڑنے کی پہل بھی ان ہی طرف سے ہوئی۔

"راستے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی پروفیسر! چائے پیو گے؟"

"مجھے یقین ہے میں یہاں کسی ٹی پارٹی پر انوائٹ نہیں کیا گیا۔"

رسان سے بولے گئے ان کے فقرے نے توندل میں بارود بھر دیا۔

"وجہ تو تمہیں خود بھی پتہ ہے ماسٹر!" اس نے حقارت سے چلا کر کہا۔ "کیا سمجھتے ہو تم خود کو۔ چھ سو روپیہ ماہوار کمانے والے کیڑے مکوڑے۔"

"بڑی عجیب سوچ ہے چھ سو روپیہ کمانے والے اور ماسٹر دونوں آپ کے نزدیک کیڑے مکوڑے ہیں۔"

"یہ ماسٹر بہت بک بک کر رہا ہے۔" ڈھلکی توند نے برابر بیٹھے آدمی سے کہا "ذرا اس سے پوچھو' روسیوں سے اس کا کیا تعلق ہے؟ کلمہ سنائے سالا کمیونسٹ۔ مارشل لا کو کیا تکلیف دیتا ہے او ئے تجھے؟" وہ خاموش رہے۔

"اس سے پوچھو افغان جہاد میں روسیوں کی مدد کیوں کرتا ہے؟" وہ ان سے مخاطب نہیں تھا۔ پیغام رسانی کے لیے اس نے اپنے ساتھی کو چنا تھا۔ اور ساتھی نے چونکہ اس کا سوال دہرایا نہیں تھا۔ اس لیے جواب بھی موصول نہیں ہوا۔ دوسرا کتنی دیر چپ رہا۔ پھر وہ بولا تو اس کی آواز میں گو نرمی نہیں تھی لیکن کوئی اشتعال بھی نہیں تھا۔

"بات یہ ہے مسٹر! حکومت سے تنخواہ لیتے ہو اور اسی کے خلاف بولتے ہو۔ لوگوں کو بھڑکاتے ہو۔"

"آج ادھر آئے ہو نا۔" پہلے نے دوسرے کا جملہ پکڑا۔ "اپنی ماں سے بول آنا تھا۔ تمہارے بین ڈال لے۔ یاد رکھنا۔ گھر والے تمہاری لاش کو ترسیں گے۔ اندر ڈالو اس کو۔ ابھی مجھے اس سے کوئی بات نہیں کرنی۔ تین دن

بعد اس کو لے کر آنا جب اس کی پروفیسری نکل گئی ہو گی۔"

اس نے گھومنے والی کرسی کا رخ پھیر لیا۔ بات ختم ہو چکی تھی۔

وہ رضا کارانہ طور پر راستے کی رہبری کرنے والے کے پیچھے چل پڑے۔ وہ بزدل نہیں تھے۔ لیکن یہاں بہادری کسی کام نہ آتی۔

ع جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے

گنجے کے پلّے ان کا مصرعہ تو نہیں پڑا۔ لیکن اس کی توقع کے برعکس رونے گڑگڑانے کے بجائے وہ جس استقامت سے سر اٹھا کر پلٹے' اس سے برداشت نہیں ہو سکا۔ کسی وجہ کے بغیر اس نے ہوا میں لات گھمائی' یہ دیکھے بغیر کہ ان کے کہاں لگی ہو گی۔

"او ئے۔ تمیز کرا او ئے" دوسرے نے سر اٹھا کر محض تنبیہہ کی تھی۔

پتہ نہیں عباس کا جی چاہا کہ وہ اسے اٹھا کر پٹخ دیں یا ان کی خواہشیں دم توڑ چکی تھیں' وہ اپنے سے آگے چلنے والے کے پیچھے بغیر لڑکھڑاتے چلتے گئے۔ ایک کوٹھری میں سے گزر کر دوسری کوٹھری۔ اس کو پار کر کے تیسری کوٹھری۔ جن کے بجلی کے بٹن کمروں سے باہر تھے۔ ایک کلک سے کال کوٹھری روشن ہوئی' ان کو اپنے حلق میں نمک کا ذائقہ محسوس ہوا۔ وہ خون پونچھ کر ان کو ظلم کے بعد کی لذت سے دوچار نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ لمحہ بھر کو بجلی جلی یا شاید دانستہ جلائی گئی۔ ایک جھلک میں انہوں نے دیکھا۔ چھت سے دو رسّے لٹک رہے تھے۔ شاید ان میں قیدی کو الٹا لٹکا کر مارا جاتا ہو۔ (اتنا سیدھا یہ ابھی انہیں دیکھنا باقی تھا۔)

کوٹھری میں نہ کھڑکی تھی نہ روشن دان۔ دروازہ مقفل ہوا۔ ٹک کی آواز سے روشن کمرہ ایک دم اندھیرے میں ڈوب گیا۔ وہ جا چکے تھے اور لوہے کے قفل بتاتے تھے' وہ ایک کے بعد ایک کوٹھریوں کو تالے لگاتے باہر نکل چکے تھے۔ کچھ دیر وہ چپ چاپ کھڑے رہے۔ شاید آنکھیں اس اندھیرے کی عادی ہوں تو ان کو کچھ دکھائی دینے لگے۔ تھوڑی دیر میں انہیں کوٹھری کی جھلک دکھائی دی۔ اس میں لٹکتے رسّوں کے سوا کچھ نہیں تھا نہ چارپائی' نہ اسٹول نہ فرش کی غلاظت ڈھانپنے کو کوئی کپڑا' بس ایک گھپ اندھیرا اور آنکھوں کے سامنے ناچتے پیلے پیلے دھبے۔ انہوں نے آنے والے وقت کا سوچنا شروع کر دیا۔ انہوں نے ان کی گھڑی اتروالی تھی اور بریف کیس پچھلی الماری میں رکھ دیا تھا۔

ان قلعوں میں رہنے والے اور اس کی تعمیر کرنے والے سے زیادہ بدقسمت تو وہ خود تھے' شاہجہان کو ایک روزن تو نصیب ہوا تھا۔ انہوں نے یہ کال کوٹھریاں بھول بھلیاں کیوں بنوائی تھیں۔ اس لیے کہ عباس جیسا غیر اہم شخص ان دیواروں میں قید کر دیا جائے۔ وقت کو جانچنے کا ان کے پاس کوئی پیمانہ نہیں تھا لیکن اب ان کی اگلی کلاس کا وقت بھی ختم ہو چکا ہو گا اور یہ زندگی میں پہلی کلاس ہو گی جو انہوں نے نہیں لی۔ ان کے طالب علم کسی تشویش میں مبتلا ہوئے ہوں گے۔ کسی نے ان کو اجنبی لوگوں کے ساتھ جاتے دیکھ کر اچنبھے کا اظہار کیا ہو گا یا شاید ان کی گمشدگی کی خبر اس وقت تک عام نہ ہو' جب شام گئے وہ گھر واپس نہ پہنچیں۔

بہت دنوں سے ان کو ایسی تنہائی کی سخت ضرورت تھی' جس میں ان کی اپنے آپ سے ملاقات ہو سکے۔ جس میں بیٹھ کر وہ اپنی کوتاہیوں' ناکامیوں اور کمزوریوں کو ایک نظر پرکھ سکیں۔ وطن کے حالات پر کڑھ سکیں اور تنہائی میں جی بھر کر رولیں۔

لیکن اس سے پہلے انہیں اس محل سے مانوس ہونا تھا جہاں بن بادشاہت رہائش ان کا مقدر ہوئی تھی۔

وہ جب ان کو یہاں بند کر کے گئے اور اپنے پیچھے ایک کے بعد ایک کمروں کی کنڈیاں لگنے کی آوازیں اور زنجیروں کی کھڑکھڑاہٹ کا شور ان کے کانوں سے ٹکرایا تو وہ کمرے کے وسط میں کھڑے تھے۔ دیوار کتنے قدم دور تھی

اندازوں کا آسرا گھٹا ٹوپ اندھیرے میں معدوم ہو گیا۔ ہاتھ پھیلا کر وہ دو قدم دور چلے ہی تھے کہ ان کی ہتھیلی دیوار کی سخت سطح سے ٹکرائی۔ رخ بدل کر انہوں نے دیوار سے ٹیک لگالی۔ اسی اندازے سے انہوں نے خود کو دیوار کی کھردری سطح کے سہارے رگڑتے خود کو فرش تک گھسیٹ لیا۔ کتنی دیر وہ اسی طرح اکڑوں بیٹھے رہے ان کا خیال تھا وہ واپس آئیں گے وہ ان کے منتظر رہے جن کے انتظار کا انہوں نے کبھی سوچا نہیں تھا۔ وقت گزر رہا تھا کہ ٹھہرا ہوا تھا۔ وقت سے بے نیاز۔ زمانے سے بے خبر۔

کتنی مرتبہ انہوں نے خود سے پوچھا۔ آخر انہیں یہاں کیوں لایا گیا ہے ان پر الزام عائد کیوں نہیں کیے گئے۔ مقدمہ کیوں نہیں بنا کورٹ کچہریوں سے دور کھڑا کھڑاتی عدل جہانگیر ان کا مقدر کیوں ہوئی۔ ان کو سزا کیوں نہیں سنائی گئی۔ کیا ان کا وجود آزاد فضا میں اس قدر خطرناک تھا کہ ان کو معصوم خلقت سے دور کر دیا جائے؟

یقیناً" یہ قلعہ میں ایک اکیلا کمرہ نہیں ہوگا۔ گمشدہ لوگوں میں بھی وہ اکیلے گم نہیں ہوئے ہوں گے۔ ان کے اردگرد ان جیسے لوگوں کی ایک بستی آباد ہوگی۔ وہ چور ڈاکو قاتل نہیں ہیں لیکن مجرم ہیں۔ جرم نامعلوم وہ ایک دوسرے کی شکلوں سے آگاہ نہیں' نہ ایک دوسرے کو سن سکتے ہیں لیکن سب جانتے ہیں کہ اس قید تنہائی میں ہم تنہا نہیں۔

پتہ نہیں وہ کتنی دیر اسی طرح بیٹھے رہے۔ شام ہو گئی ہوگی یا رات آگئی ہوگی۔ معلوم نہیں یہ ایک دن تھا یا زمانے تھے۔ آپ زبان و مکان سے ماورا ہوں تو وقت بھی ٹھہر جاتا ہے۔ پہر بدلتے۔ گھڑی کی سوئیاں سرکتے دن کی سفیدی سے رات کی سیاہی میں تبدیل ہونے اور درمیان میں مختصر سے وقفے کے لیے نارنجی پڑتے آسمان وہ ہر چیز سے لاعلم تھے۔

پہلے انہوں نے اپنی سابقہ پوزیشن بدلی۔ اکڑوں سے پھسکڑا مارا پھر انہوں نے پاؤں پھیلائے ذرا سا وقفہ دے کر انہوں نے خود کو فرش پر کھسکایا اب وہ فرش پر چت لیٹے تھے۔ وہ کس قسم کی غلاظت تھی جو ان کے وجود سے مس ہوتی تھی۔ وہ اس سے بھی لاعلم تھے۔ اتنی دیر کے بعد بھی آنکھیں اس تاریکی کی عادی نہیں ہو رہی تھیں۔ لاعلمی بھی کیا نعمت ہے۔ شاید ایسی ہولناک تاریکی ان کی زندگی میں کبھی نہیں آئی تھی۔ جنگ کے زمانے میں بلیک آؤٹ کی راتوں میں بھی چاند کی ہلکی سی جھلک۔ ستاروں کی مدھم روشنی اجالے سے محروم نہیں ہونے دیتی تھی۔

درمیان میں انہیں نیند کے جھونکے بھی آئے لیکن مکمل نیند کی حالت میں وہ ایک لمحے کو بھی نہیں جا سکے۔

انہیں پتہ بھی نہیں چلا ایک دن گزر چکا ہوگا۔ یا نصف پہر۔ باہر رات ہوگی کہ صبح کی روشنی نمودار ہو رہی ہوگی۔

انہوں نے پتھر کے سخت فرش پر لیٹے لیٹے سوچا۔ چلو فرض کر لیتے ہیں۔

سورج ڈوب رہا ہوگا۔ بڑا سا نارنجی گولا جھاڑ جیسے درختوں کے پیچھے اپنی بے رنگ روشنی بکھیرتا آہستہ آہستہ افق کے کونے میں آدھا چوتھائی ہوتا زمین میں تحلیل ہو رہا ہوگا۔ بلند بالا عمارتوں کے پیچھے سے ایک جھلک دکھاتا۔ آسمان میں بکھرے مچھلی کے خشک پنجر جیسے روئی کی طرح اڑتے بادلوں کو نارنجی رنگ میں ڈبوتا۔ یہ منظر کچھ دیر کے لیے آسمان پر ٹھہرا رہتا ہے۔ سورج غائب ہو جاتا ہے لیکن اس کے بعد بھی کچھ دیر دنیا روشن رہتی ہے۔

کیا دنیا میں روشنی نام کی کوئی چیز بھی ہے۔؟

روشنی سے اندھیرے کا سفر آسمانوں پر ایک دم ہو جاتا ہے۔ وہ آخری مٹی مٹی سورج کی شعاعوں کے غائب ہوتے ہی اندھیرا ایک دم اتر آتا ہے۔ چیزوں کو تاریکی میں چھوڑ کر۔ لوگ باگ تیز تیز سائیکل چلاتے گھروں کی طرف دوڑتے ہیں۔ اچانک سڑکوں پر رش بڑھ جاتا ہے۔ تانگے رکشا سب سواریوں کو سمیٹے ان کو اپنی اپنی منزل تک پہنچانے کے لیے کوشاں' ہیڈ لائٹس کی چمک' کھمبوں پر چمکتے بلب ٹریفک سگنل۔ ہر طرف مصنوعی روشنی کا راج ہوگا۔



پھر اچانک گھنے پتوں کے پیچھے سے ایک مرا مرا چاند نکلا ہوگا۔ جس کی روشنی آہستہ آہستہ تیز ہو رہی ہوگی جیسے ان کا ریڈیو، جوں جوں اس کا والیوم گرم ہوتا اس کی آواز بلند ہوتی جاتی تھی۔ چاند بھی اب خوب چمکا ہوگا۔ پتہ نہیں چاند کی کیا تاریخیں ہوں گی۔ یہ تو انہوں نے غور ہی نہیں کیا تھا۔ ابتدائی آخری یا مکمل جگمگاتا چاند۔ ٹریفک کا اژدھام اب سست پڑ گیا ہوگا۔ تفریح کے لیے آئے لوگ بھی اب گھروں کو واپس جا رہے ہوں گے۔ وہ تمام لوگ جن کے ٹھکانے تھے جنہیں رات گھروں میں آتی تھی۔ پرندے کب کے اپنے آشیانوں میں جا پہنچے ہوں گے لوگوں کے گھروں سے دال کو بگھار لگانے کی مہک اٹھی ہوگی۔ شاید انہوں نے ساتھ چاول ابال رکھے ہوں۔ سرکے میں کتری ہوئی پیاز کے ٹکڑوں اور لیموں کے قتلوں کے اچار کے ساتھ۔

لوگ باگ اب کھانا کھا چکے ہوں گے۔ گھروں میں عشاء کی نماز کی تیاری جاری ہوگی۔ بہت سے لوگ دن بھر کا آخری کام یہ فرض ادا کر کے کرتے ہیں۔ اس کے بعد ایک ترتیب سے صحن میں بچھی چارپائیوں میں سے اپنی چارپائی پر ایک دن کے خاتمے اور نئے دن کے آغاز کے انتظار میں ایک طویل رات سو کر کاٹتے ہیں۔ اب چاند پورے آسمان کی سیر کرتا ایک سرے سے نکل کر دوسرے سرے میں ڈوبنے جا رہا ہوگا۔

درختوں کے پیچھے سے پھر نارنجی روشنی ہوئی ہوگی۔ طلوع و غروب۔

نہیں۔ انہوں نے کروٹ بدلی۔ انہوں نے منظر بہت تیزی میں گزار دیے ہیں۔ چلو پھر سے شروع کرتے ہیں۔ اب کہاں سے شروع کریں۔ سورج کے ڈوبنے سے یا دال کو بگھار سے......!

اس منظر کاری ٹھیک شروع نہیں ہوا تھا کہ انہیں کوٹھری میں نامانوس سا شور سنائی دیا۔ کھٹ کھٹ کھڑاک شاید وہ پھر آ رہے تھے۔ کنڈی تالے کھولے جا رہے تھے۔ اب ان کی کوٹھری کا قفل کھلا، دروازہ سرکا۔ روشنی کہیں بہت دور تھی۔ لیکن ایک کرن تھی گو وہ اتنی ناکافی تھی کہ کھلے دروازے کے آگے کھڑے شخص کے ارادوں کا کوئی پتہ نہیں دیتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کچھ تھا۔ شاید تشدد کا وقت شروع ہوا چاہتا ہے یہ وقت نہ سورج ڈوبنے کا تھا نہ چاند نکلنے کا۔

آنے والا اسی طرح ساکت کھڑا تھا۔ کوئی تھا اور کھڑا تھا۔ اپنے سفید کپڑوں اور دور سے آتی پھیکی روشنی کی ایک رنج سے بس وہ اتنا ہی دیکھ پائے۔

”سر! ایک ہلکی سرگوشی۔ نامانوس لہجہ۔

”سر عباس! میں آپ کا اسٹوڈنٹ ہوں۔“ ان کا جواب نہ آنے پر اس نے دوبارہ پکارا تھا۔ ”سر پلیز۔“

”ہاں بولو۔“ ان کا استادانہ وقار کہیں سے ابھر کر جاگا۔ اسی شاہانہ انداز میں وہیں لیٹے انہوں نے سکون سے پوچھا۔

”کون ہو تم۔ میرے کون سے اسٹوڈنٹ ہو۔“

”سر پلیز۔ میں اپنا نام نہیں بتاؤں گا۔ اس کا فائدہ بھی کیا ہوگا۔“

”فائدہ تو یہ بتانے سے بھی نہیں ہوگا کہ تم میرے اسٹوڈنٹ ہو۔ ہو یا تھے؟“

”تھا۔“

”میں تمہیں پہچانتا ہوں؟“

”ہاں۔ اگر میں روشنی میں ہوں تو۔ سر! آپ کے لیے کھانا ہے۔ میں شاید آپ کو یہاں سے نکال تو نہیں سکتا۔ یہاں کوئی آرام بھی نہیں پہنچا سکتا۔ میں بہت جونیئر ہوں سر۔ لیکن آپ کے ساتھ تشدد نہیں ہونے دوں گا۔ یہاں خوراک میں صرف دال ہی دی جاتی ہے سر! لیکن میں نے اس میں اسپیشل بگھار لگایا ہے۔ آپ اس کو

کھالیں گے۔“ وہ چند قدم آگے آیا۔ ٹرے ان کی طرف بڑھا کر رک گیا۔

”کل سے میں آپ کے لیے گھر سے کچھ لیتا آؤں گا۔ آپ کسی سے بھی اس بات کا ذکر مت کیجیے گا۔“

ٹرے ان کے ہاتھ میں تھی اور وہ الٹے قدموں پلٹ رہا تھا۔ دروازے تک جا کر وہ رکا۔ اس نے پیٹھ ان کی طرف موڑی اور پہلے سے بھی دھیمی سرگوشی میں بڑبڑایا۔

”آئی ایم سوری سر۔“

پھر وہی قفل بند ہونے۔ لوہے کے دروازے کی کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ قدموں کی چاپ دور ہو گئی۔ روشنی کی وہ لکیر ساتھ ہی معدوم ہو گئی۔

وہ کھانے کے معاملے میں کبھی بھی نخریلے نہیں رہے تھے۔ یہاں ان کو کسی اچھی یا ناپسندیدہ۔ کسی خوراک کی سرے سے توقع ہی نہیں تھی۔ لیکن یہ تو اچھا بھلا خوش ذائقہ کھانا تھا۔ کیا اندھیرے اور تنہائی میں حسیات اس قدر تیز ہو جاتی ہیں۔ انہوں نے پہلا نوالہ منہ میں رکھتے حیرت سے سوچا۔

ان کا طالب علم کیا کہہ گیا تھا۔ وہ مکمل طور پر سمجھ چکے تھے۔ انہیں یہاں ایک عمر گزارنی ہوگی۔ جب تک ان کا دماغ ٹھکانے نہیں آتا اور مزاج درست نہیں ہو جاتا۔ تنہائی اور تاریکی کے یہ طویل دورانیے مزاج کی درستی میں معاون ثابت ہوں گے۔ دن گزارنے کے تصوراتی شغل میں ان کی مشق ایک دو دن میں اس قدر پختہ ہو چکی تھی کہ جب وہ فرض کرتے اب صبح ہو چکی ہوگی تو ان کا ناشتہ آ جاتا۔ ناشتے سے دوپہر تک وہ اپنی اس کتاب کے باب تشکیل دیتے جو انہیں [illegible] میسر ہونے کے بعد لکھنی تھی۔ اگر آزادی میسر ہوئی۔ اگر...... درمیان میں ایک بہت بڑا اگر ہے۔

ان کا طالب علم روز نہیں آتا تھا۔ لیکن جب آتا انہیں یہ ضرور بتا جاتا اس وقت کیا بجا ہے کون سی تاریخ چل رہی ہے۔ مہینہ تو ابھی وہی چل رہا تھا۔ اس کے پاس پیک میں باقاعدہ کھانا تو کبھی نہیں ہو سکا لیکن محروم رہ جانے والی چھوٹی چھوٹی بے ضرر نعمتیں ضرور ہوتیں۔ گلاب جامن سینڈوچ سموسہ۔ ایک دفعہ وہ کاغذ کے گلاس میں ان کے لیے کافی بھی لایا جیسے پیتے پیتے اندر آ گیا تھا۔

”کیا وہ مجھے یہاں سے کبھی نہیں نکلنے دیں گے؟“

”جب تک آپ کے اعصاب مکمل طور پر ٹوٹ پھوٹ نہیں جاتے تب تک تو نہیں سر۔ جتنی جلدی آپ خود کو تھکا لیں۔ ہار مان لیں۔ اتنا ہی آپ کے لیے اچھا ہے۔“

”لیکن میں کسی ایجنسی کا ایجنٹ نہیں۔ مجھے یاد نہیں۔ میں نے کبھی کسی روسی کو قریب سے دیکھا بھی ہو۔“

”یہ ان کو بھی معلوم ہے سر! لیکن آپ اپنے طالب علموں کو انقلابی بنا رہے ہیں۔ اس نظام کے خلاف اٹھنے کے لیے آمادہ کر رہے ہیں۔ اور مجھ سے زیادہ کون جانتا ہے۔ آپ کی بات میں کس قدر تاثیر ہے لیکن کسی کو اندر بند کرنے کے لیے کوئی الزام تو لگانا پڑتا ہے نا۔“

ایک دن وہ آیا تو دروازے سے ایک قدم اندر نہیں آیا۔ اور اس قدر محتاط تھا کہ جملہ مکمل ہونے سے قبل ایک مرتبہ باہر ضرور جھانکتا تھا۔

”سر! آپ بالکل تھک نہیں رہے ہیں۔ وہ جب آپ سے باتیں کر کے جاتے ہیں تو باہر نکل کر یہی کہتے ہیں کہ آپ کی جملہ بازی ماند نہیں پڑی۔ اس کا مطلب اس کال کوٹھری نے آپ کا کچھ نہیں بگاڑا۔ وہ اب کسی انتہائی اقدام سے گریز نہیں کریں گے۔ اور میں کچھ بھی نہیں کر سکوں گا۔ آپ مان لیجیے۔ اور اس پر عمل بھی کر کے دیکھیے کہ آپ طالب علموں میں جسے آپ ذہنی شعور کہتے ہیں بیدار کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ شاید وہ آپ کو چھوڑ دیں...... لیکن اگر آپ اسی طرح حق بات کہنے پر جمے رہے



تو پھر انتہائی اقدام۔۔۔ آپ جانتے ہیں ناں۔ اس مارشل لاء کا انتہائی اقدام کیا ہے۔"

"آئی ایم سوری سر۔" کسی دن وہ روہانسی آواز میں کہتا۔ "اگر انہیں آپ میں تبدیلی نظر نہ آئی تو شاید آپ ساری عمر یہیں کاٹ دیں گے۔ انہیں کوئی جلدی نہیں۔ اور یہاں cells کی کمی نہیں کہ انہیں آپ سے کمرہ خالی کروانا پڑے۔"

"ساری عمر۔؟ کس کی عمر؟ ظلم کی رات طویل ضرور ہوتی ہے مگر اتنی طویل نہیں کہ اس کی صبح نہ ہو۔ کسی کو عمر کی ضمانت دینے سے پہلے ان سے پوچھو۔ ان کے پاس اپنی عمر کی بھی کوئی ضمانت ہے۔ اور کیا نام ہے تمہارا۔ ان کا خاتمہ ضرور ہوگا اور جب تک ان کا خاتمہ نہ ہو جائے میں اپنے بچوں کو یہ سبق پڑھاتا رہوں گا کہ ظلم کے خلاف اٹھ جاؤ۔ ظالم کا خاتمہ کردو اور کچھ نہیں کر سکتے تو ظالم سے نفرت ضرور کرو۔"

"میرا نام عارف ہے۔"

وہ چپ ہو گئے۔ پہلے دن انہوں نے طے کیا تھا اس کا نام پوچھ کر وہ اس کے لیے مسائل کھڑے نہیں کریں گے۔

اس وقت جب ان کا نام پوچھنے کا کوئی ارادہ بھی نہیں تھا۔

"عارف وقار؟" انہوں نے اپنی آواز مزید دھیمی کرلی۔ "ہاں تم میرے اچھے طالب علموں میں سے تھے۔ مجھے تمہیں آواز سے پہچان لینا چاہیے تھا۔ جاؤ بچے! اپنے مستقبل، اپنی ترقیوں کو میرے پیچھے داؤ پر نہ لگاؤ۔"

یہ تو انہیں باہر آکر پتا چلا کہ جونیئر آفیسر عارف نے ان سے جھوٹ بولا تھا۔ ان کا وہاں قیام ایک ماہ یا دن نہیں تین ماہ سولہ دن رہا۔ اس دوران وہ صرف ایک مرتبہ باہر آئے تھے، جب ان کے جرم کی سزا ان کی پیشی نے وصول کی، صرف ایک نظر انہوں نے ہجوم میں شامل مانوس لوگوں کو دیکھا، کچھ کہا اور prison van (قیدیوں کی گاڑی) ان کو واپس لے گئی۔

سزا پر عمل درآمد کے باوجود ان کی مدت سزا ختم کیوں نہیں ہوئی۔ یہ وہ نہیں جانتے تھے۔ اور ان کو بتانے کے لیے عارف وہاں موجود نہیں رہا۔ وہ نہیں معلوم کسی شکایت کا شکار ہوا یا روٹین کے ٹرانسفر میں کہیں جاتا رہا۔ یا انتہائی اقدام جس کی پیش گوئی پر وہ خوف زدہ ہوتا تھا ان سے چھپ رہا۔ اس نے ایک وعدہ کیا تھا۔ جس کی ایفائی اس کے اختیار سے باہر ہو گئی تھی۔

وہ باہر آئے تو ان کی رنگت سیاہ تھی۔ بھری جوانی میں سر کے بال سفید ہو گئے اور وہ سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکے تھے۔

"ظلم کی انتہا ہے۔" ان کے ایک طالب علم نے بڑی رقّت سے کہا۔

"آپ پاکستان چھوڑ دیجیے۔"

"لیکن کیوں؟" پروفیسر عباس نے حیرت سے پوچھا۔ "اس میں پاکستان کا کیا قصور ہے؟"

"سر! آپ حکمرانی کو پاکستان سے الگ تو نہیں کر سکتے۔"

"تو اس کا علاج یہ ہے کہ پاکستانیوں کو پاکستان سے الگ کر دیا جائے۔ ان کو الگ کرو جن کا الگ ہونا ضروری ہے۔"

"سر بہت لوگ exile (جلاوطنی) پہ زندگی گزار رہے ہیں۔ ہمیں پہلے ہی خوف تھا، آپ سے کہا بھی تھا۔"

"ملک میں آپ کون سی عزّت کی زندگی گزار رہے ہیں۔" بھڑکے ہوئے طالب علموں کی طرف انہوں نے ایک نظر دیکھا۔

"افسوس ہم نے اپنے اور پرایوں کی بھی پہچان کھو دی۔ میں تو اتنا جانتا ہوں۔ ماں سے تھپّڑ کھا کر بھی بچہ ماں کی

طرف ہمکتا ہے۔ بڑوسن کی طرف جائے گا تو شاید آج وہ رکھ لے لیکن کل آپ کا استحصال ضرور کرے گی۔

آپ کو اپنا آج محفوظ بنانا ہے یا کل؟

یہ قانون قدرت ہے۔ آنے والے وقتوں میں شاید یہ ناانصافی نہیں ہو گی۔ ہم گزرے وقت سے یہی تو سیکھتے ہیں۔"

☼ ☼ ☼

کیسی وحشت ناک رات تھی۔

ساتھ والے بستر پر حمیرا بے خبر سو رہی تھی۔ وہ نیند کی ماتی ہے کڑے سے کڑے وقت میں جب سرہانے ڈھول پیٹا جا رہا ہو' وہ سو سکتی تھی۔ کیونکہ وہ صرف نیند کے سامنے بے بس ہوتی ہے ہر ایک کے سامنے ڈٹ کر کھڑی ہو جانے والی۔ مسئلوں کو چٹکیوں میں حل کرنے والی۔ اگر اس کو کوئی پسپا کر سکتا تھا تو صرف نیند۔ گو وہ ہر پانچ منٹ بعد کروٹ بدلتی جو اس بات کا ثبوت دیتی تھی کہ بے فکری کی نیند آج اس کو بھی نہیں آتی تھی۔

لیکن بہرکیف عبیر والا حال اس کا نہیں تھا۔

کھڑکی کے شیشوں سے ہرے شہتوت کی شاخوں میں الجھا چاند بھی اسے تنگ کر رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر میں اس کا سفر مکمل ہو گا' اپنی روشنی بکھیرنے وہ زمین کے کسی اور حصے پہ چمکے گا۔ روشنی جو ایک امید کی علامت ہے لیکن اس کی اپنی امید کہاں جا چھپی تھی۔ تنویر کے کمرے میں ہر رات کی طرح جلنے والا بلب اس کو آگ برساتے دے رہا تھا۔ ابھی وہ اس بلب کی چھن چھن کر آتی روشنی کی عادی ہونے لگتی کہ ایک دم سے روشنی بجھ جاتی ذرا سی دیر میں اس کا دروازہ کھلتا بند ہوتا۔ پھر روشنی کے جل بجھ کا کھیل شروع ہو جاتا۔

کتنی شدت سے اس کا جی چاہ رہا تھا وہ سو جائے۔ نیند سے بے حال ہونے کے باوجود اس کی آنکھیں بند نہیں ہو پا رہی تھیں۔ اس نے کھڑکی کے پردے برابر کیے دروازہ بند کیا۔ پھر اپنے بستر پر بیٹھ کر وہ نیند کی منتظر رہی۔ یونہی وہ اٹھ کر باورچی خانے کی طرف نکل گئی۔ باورچی خانے سے ملحقہ کمرے میں کریم بی پلنگ سے پاؤں لٹکائے تسبیح کے دانے گرا رہی تھیں۔ آج کی رات شاید کسی کو نیند نہیں آئے گی۔

"خیر تو ہے بیٹا!" انہوں نے ذرا سی بلند آواز میں پکارا تھا۔

"کچھ نہیں کریم بی' چائے بنانے آئی ہوں۔"

"میں بنا دوں؟" انہوں نے اپنے کھڑاؤں میں پاؤں پھنساتے ذرا سی جلد بازی کا مظاہرہ کیا۔

"نہیں کریم بی! آپ دعا جاری رکھیے۔ یہ زیادہ ضروری ہے۔"

بڑے اہتمام سے بنائی گئی چائے کا پہلا گھونٹ بھی اس کے حلق سے نہیں اترا۔ "کتنی بد مزہ چائے بناتی ہوں میں۔" اس نے بڑبڑا کر سوچا۔ "چینی' پتی' دودھ کسی چیز کا ریشو بھی ٹھیک نہیں۔ سب گڑبڑ۔ چائے نہ ہوئی آج کی رات ہو گئی۔

وہ پھر نیند سے لڑنے بستر پر آلیٹی تھی کتاب پڑھی جائے' میل کی جائے یا اپنے موبائل سے گانے سنے جائیں اور حمیرا کے بقول سکہ اچھالا جائے پتہ نہیں وہ کسی فیصلے پر کیوں نہیں پہنچ سکتی۔

رات کے تین بجنے میں دس منٹ تھے۔ جب اس کے سیل پر قطعی غیر متوقع طور پر رنگ ٹون بجی۔ اسکرین پر ایک نمبر روشن تھا۔ کوئی اجنبی کال وصول کرنے کا یہ ہرگز بھی موقع نہیں تھا۔ لیکن کسی بھی وجہ کے بغیر اس نے فون کان سے لگا لیا۔

"یہ میرا طوطا کیا کہہ رہا ہے۔"

"اس پہر میں کہیں دور سے آتی مدھم سی آواز۔ اسے لگا رگوں میں دوڑتے دوڑتے اس کا خون اس کے اندر ٹھہر گیا ہے۔

"لو۔ پھر کون سی ہو گئی۔ وہ آج تک جتنی مرتبہ بھی اس شخص سے ملی اسے انگلیوں پر گن سکتی تھی۔ جن میں ایک ملاقات بھی ارادتا" نہیں تھی۔ وہ کبھی بطور خاص اس سے ملنے بھی نہیں آیا تھا۔ بھیس بدل کر گھر میں گھسنے سے لے کر ایم ڈی کے آفس تک ہر دفعہ کا سامنا محض ایک اتفاق تھا۔ رات کی اس گزرتی گھڑی میں اس کا سوال بھی کچھ بے سروپا تھا۔

"مٹھو' میاں مٹھو ہی کہتا ہے۔" اپنی آواز کی اتھل پتھل پر قابو پانے میں اسے بہت وقت نہیں لگا تھا۔

"سو طوطا بھی پال رکھا ہے۔"

"ہاں بہت کام آتا ہے۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آتا ہو تو فال نکال دیتا ہے۔"

"کیا کہتا ہے فال والے لفافے میں کیا لکھا ہوا ہے۔"

"لکھا ہے' آپ کچھ پریشان ہیں۔"

وہ کتنی دیر کے لیے چپ رہ گئی۔ ایسا بھی کبھی ہوتا ہے بھلا۔

"اور پریشانی کی وجہ کیا بتاتا ہے؟"

"میرا طوطا اتنا ایم اے' پی ایچ ڈی نہیں ہے کہ وجہ بھی بتا دے۔ بس کہتا ہے آپ بے وجہ پریشان سی ہیں مادام۔"

"طوطا کہتا ہے تو پھر سچ ہی کہتا ہو گا۔ ویسے تو میں پریشان نہیں ہوں۔"

"چلیے پھر آپ ایک کپ چائے پی لیجیے ...ورنہ پھر آپ بقول آپ کے یہ رات بولیں گی کاٹے گا۔ میں سونا چاہتا ہوں' مجھے نیند نہیں آ رہی۔

"چائے پینی چاہی تو مجھے لگا میں نے اس میں بے شمار چینی ڈال لی ہے۔ حلق سے نہیں اتر رہی۔"

کتنی دیر دونوں طرف خاموشی رہی پھر دوسری طرف سے ایک ٹھہری ہوئی پرسکون سچ بھری آواز ابھری۔

"کیا ہوا۔"

"کچھ نہیں۔"

"اگر کچھ نہیں ہوا تو میں سو کیوں نہیں سکا۔"

وہ اپنے اسی لاپروا انداز میں بول رہا تھا۔ اسے اپنی بہادری پر کبھی خوش گمانی نہیں رہی تھی لیکن اس نے خود کو اتنا کمزور بھی کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ اسے لگا اس کا دل اپنی جگہ چھوڑ کر حلق میں دھڑکنے لگا۔

"میرے بہنوئی نے ابا کو ایک لیگل نوٹس بھیجا ہے۔" کسی وجہ کے بغیر اس کے ہاتھ سے اپنے اختیار جیسے ختم ہو گئے تھے۔ "مجھے قانون کا نہیں پتہ۔ لیکن مجھے لگتا ہے ابا کو ایک دن پولیس لے جائے گی۔ کریم بی نے بتایا ایک پولیس والا آیا بھی تھا۔"

"کریم بی سے پوچھ لینا تھا۔ اصلی تھا یا بہروپ بدل کر آیا تھا۔ سنو عبیر۔" اس نے رسان سے کہا۔

"اب سر عباس کو کوئی کہیں نہیں لے جا سکتا۔ اس کے لیے مجھے اپنے عہدے کا جائز یا ناجائز.... جو بھی استعمال کرنا پڑا' وہ میں کر گزروں گا.... کیونکہ تم نہیں جانتیں لیکن میں آج اس سیٹ پر پہنچا ہی اس لیے ہوں کہ اب ان پر کوئی آنچ نہ آنے دوں۔ نہیں اعتبار؟ نہ سہی! پر اب سو جاؤ تاکہ میں بھی سو سکوں۔" فون منقطع ہو گیا۔

"کس کا فون تھا؟" نیند میں دھت حمیرا نے سر اٹھا کر بند آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ جواب کی منتظر بھی نہیں تھی کہ پھر بے خبر ہو چکی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



سلوی علی بٹ

پروڈکٹ گرل

سردیوں کا مختصر دن گھرے سرمئی بادلوں، گیلی فضا اور ٹھنڈی ہوا نے ہر ذی روح کو سکڑا دیا تھا۔ خرید فروخت اور خورونوش کی دکانوں پہ رش نہ ہونے کے برابر تھا۔ سامنے ہوٹل پہ مزدور پیشہ لوگ بہت سست روی سے روٹی کھا رہے تھے۔ ہوٹل میں جلتے ہوئے تندور کی وجہ سے کافی گرمائش تھی۔ اس لیے اکثر لوگ — کھانے سے فارغ ہونے کے بعد بھی وہاں جمع ہوتے تھے۔

اسی ہوٹل کے سامنے والے سیلون میں، میں کرسی پہ ٹھٹھری ہوئی بیٹھی سات فٹ اونچے رکھے ٹی وی کو دیکھ کم اور گھور زیادہ رہی تھی۔ آپی (سیلون کی مالکہ) مجھے اس برف خانے میں اکیلا چھوڑ کر خود اپنے چوبارے میں ہیٹر لگائے یقیناً "موبائل فون" پہ باتیں مٹھار رہی ہوں گی۔

دوسری اسٹوڈنٹس سیمی اور نازیہ — نے شوقیہ چھٹی مار لی تھی۔ سو میں ہی رہ گئی تھی ٹھنڈ سے لطف اندوز ہونے کے لیے۔

ٹی وی پہ سارے ہی چینل بڑے ماٹھے آ رہے تھے۔ ان پہ لعنت بھیج کہ میں نے دل لگی کے لیے میگزین کے مطالعہ کے لیے دراز کھنگالی۔ کاغذوں کی نچلی تہہ میں سے lolah کا پمفلٹ میرے ہاتھ لگ گیا۔ اس کے ٹائٹل پہ کھڑی ڈائی براؤن پرم بالوں، ادھ کھلے ہونٹ اور سرخی مائل آنکھیں والی ماڈل گرل میں مقابل کو جکڑ لینے والی جاذبیت تھی۔

تب ہی — وہ کاہی گاؤن میں ملبوس بھاری شیشے کے دروازے کو دھکیل کے اندر داخل ہوئی۔ میں نے اکتاہٹ سے اس آنے والے مجسمے کو دیکھا۔ جس نے مجھے سلام کر کے بڑی بے تکلفی سے میرے بائیں ہاتھ کی کرسی سنبھال لی تھی۔ وہ اپنا شاپنگ بیگ کرسٹل ٹاپ پر رکھ کے ہینڈ بیگ میں سے کچھ کھنگالنے لگی۔

"آپی نہیں آئیں؟" اس نے سیل فون نکالتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں! وہ گھر گئی ہیں اور میں نیو اسٹوڈنٹ ہوں۔" میں نے اگلا جملہ حفظ ماتقدم کے طور پہ کہا تھا اور باریک بینی سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔

بھنویں ترشی ہوئی، اسکن کچھ ڈل دکھ رہی تھی۔ شاید وہ اسکن مساج یا فیشل وغیرہ کروانے آئی ہو۔ میرا پانی میں ہاتھ ڈبونے کا قطعی ارادہ نہیں تھا۔ حالانکہ مساج میں میں نے تگڑی ٹریننگ لی ہوئی تھی۔ روزانہ ایک دو فیشل میرا معمول تھے۔

وہ دھیمی سی مسکراہٹ سے موبائل پہ نمبر ڈائل کرنے لگی۔ آپی کو کال کر کے اپنے آنے کی اطلاع دی۔ یہ جان کر کہ وہ آپی کی جان پہچان والی ہے۔ میرے اندر خطرے کی گھنٹی بجی۔

"کیا نام ہے آپ کا؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"سلوی۔" نام بتا کر میں نے پوری گردن پمفلٹ پہ گرا دی۔ میرا دماغ بہت تیزی سے چل رہا تھا۔ اصول کے مطابق اس سے پوچھنا چاہیے تھا کہ "وہ کیا ٹریٹمنٹ لینے آئی ہے؟"

"میرا نام شمائلہ ہے۔" اس نے بتایا۔

"اسکن ٹریٹمنٹ لیں گی؟" آخر میں نے پوچھ ہی لیا۔

"نہیں میں تو پروڈکٹ گرل ہوں۔" جتاتے ہوئے اس نے ریموٹ اٹھا لیا۔

پروڈکٹ گرل یعنی چلتا پھرتا اشتہار۔ گنجے سر پہ [illegible] جھاڑیوں سے بھی گھنے بال، بوٹے قد کا اضافہ، موٹاپا [illegible] پن میں ٹرانسفر بھی۔ تین چار چیزوں کے حوالے سے میری اس پیشے کے حوالے سے معلومات تھیں۔

پھر اس نے بتایا کہ وہ اسکن وائٹنر سوپ اور ہیئر [illegible] کی مختلف اقسام کی کریمیں، لوشنز حتی کہ "ایلیسریز" تک کا بڑھیا مال سیل کرتی تھی۔ مجھے [illegible] ہو چکی تو میں نے دوبارہ اسے منہ لگانا مناسب نہ سمجھا۔ مجھ پہ حد سے زیادہ بے زاری سوار تھی۔

آپی سیلون سے آگئی تھیں۔

وہ ان کو بھی لائی گئی — پروڈکٹ کو بڑے ماہرانہ انداز میں متعارف کروا رہی تھی۔ میرا اس کی خود اعتمادی اور چرب زبانی سے استفادہ — کرنے کا قطعی موڈ نہیں تھا۔ وال کلاک نے چار کا گھنٹہ بجایا اور میں اپنی کتابیں اور ہینڈ بیگ سمیٹنے لگی۔ شکر کا سانس خارج کیا۔ میرے جانے کا وقت تھا۔

اس لڑکی سے بحث کرتی آپی کو اپنے جانے کا سندیسہ دیا اور جواب سنے بغیر ہی باہر دوڑی۔

☼ ☼ ☼

"دس اور بارہ ہزار ہم نے ان فرشوں کا پوچھا کرنے کے دیے ہیں، یہ منہ پہ چونا مل کر ہم پہ رعب بٹھانے کو رہ گئی ہیں۔ اور سلوی! تم اپنی ٹیڑھ سیدھی کر لو۔"

یہ سیمی تھی، جس کی توپوں کا رخ یکدم آپی سے "میری" طرف مڑ گیا تھا۔

کیونکہ وہ ہمیں تھوڑی دیر قبل بتا کر گئی تھیں کہ پرمننٹ ہیئر ری بونڈنگ کی ورکشاپ ہے، تین تین سو روپے جمع کروا دیں۔ سیمی کو تب سے تپ چڑھا ہوا تھا۔

اس کا موقف بھی درست تھا۔ جب ایگریمنٹ سائن ہوا تھا اس میں تحریری نوٹس مکمل کورس کا تھا۔ ایکسٹرا ورک شاپس کا بالکل ذکر نہیں تھا۔ اب یہ نیا خرچا ہمیں کھولا رہا تھا۔

"یہ سب تمہاری وجہ سے ہو رہا ہے سلوی!" آجاتی

ہو اپنے تھوبڑے پہ یتیمی کا لیبل لگائے جیسے......"
"یتیمی نہیں معصومیت۔" میں موقع کی نزاکت بھانپتے ہوئے بھی اسے کاٹنے سے باز نہیں آئی تھی۔
"اپنی اس چالو زبان کا تھوڑا سا استعمال آپی کے سامنے بھی کرلینا' میری تو قسمت خراب ہے جو یہاں پھنس بیٹھی۔ یونو میں نے اپنے کزن سے پیسے ادھار لیے ہیں۔ گھر والوں سے ضد کی ہاتھ میں کوئی ہنر ہونا چاہیے۔ آخر لڑکی ذات ہوں۔ امی نے مشورہ دیا کپڑے سلائی کرنا سیکھو مگر مجھے تو بجنے سنورنے کا شوق تھا' سو خوار ہو رہی ہوں اس شوق کے پیچھے جیسے......"
"شوق کے نہیں' دس ہزار کے پیچھے۔" میں نے پھر سے تصحیح کرنا ضروری جانا۔
اس نے گھور کے مجھے دیکھا اور پھر سے بڑبڑانے لگی۔ اس کے کزن سے ادھار پیسے لے کر ٹریننگ لینے کا رونا میں پہلے دن سے سنتی آرہی تھی۔
آپی کے پاس ہم تین اسٹوڈنٹس تھیں۔ نازیہ یونیورسٹی میں آنرز کی اسٹوڈنٹ' سیمی بی کام کرکے فارغ اور میں ابھی زیر تعلیم تھی۔ آپی نے ہم تینوں سے بیوٹیشن کے کورس کی فیس بٹوری تھی۔ کام کے نام پہ وہ ہمیں ایک ٹپ دینے کی روادار نہیں تھیں۔
نازیہ ــــ کم گو' سنجیدہ اور کسی حد تک آپی کے فیور میں تھی' اس میں صبر کا مادہ حلق تک بھرا ہوا تھا۔ میں بھی تھوڑی مشکل سے برداشت کے گھونٹ نیچے اتار لیتی تھی مگر سیمی وہ تو برے کا قبر تک پیچھا کرنے والی تھی۔ اسے زیادہ بولنا' طویل بحث اور اپنی منوالینے کا بڑا چسکہ تھا' اپنے آگے وہ آپی کو بھی خاطر میں نہ لاتی تھی۔ اکثر ان کے معرکے وقوع پذیر ہوتے رہتے تھے۔

"میں نے آپ ہی لوگوں کا فائدہ سوچا ہے' اس علاقے میں کون آئے گا دس ہزار کی ہیئر ٹریٹمنٹ کروانے' بہتر ہے ورکشاپ لے لی جائے اگر نہیں لیتی تو تمہاری مرضی۔"

سیمی کے گرم دماغ کو آپی نے کافی رسانیت سے ٹھنڈا کیا۔ ہمیں مجبوراً" گردن جھکانا پڑی۔ ورکشاپ کے روز ہم تینوں بہت پابندی سے آئی تھیں۔ سیمی کے ہتھے نازیہ چڑھ گئی۔ وہ اس کا سر کھانے لگی۔

شمائلہ کے آنے سے ساری باتیں سمٹ گئیں۔
"آپی نہیں آئیں ابھی تک۔" اس نے انہیں نہ پاکر استفسار کیا۔
"تیار ہو رہی ہوں گی۔" سیمی کا جواب فٹافٹ حاضر تھا۔
"آپی کی لیپا پوتی کی ٹائمنگ بڑھتی جارہی ہے۔" وہ میرے کان میں گھسی۔
"دبیں بنا کے اسے دو گھنٹے جذب کرتی ہیں پھر بلش آن کی باری آتی ہے۔" میں نے لمبی ٹائمنگ کی وجہ بتائی۔
شمائلہ شاپنگ بیگ میں سے سارا سامان کریمیں اور شیشیاں وغیرہ نکال کے ریک پہ دھرنے لگی۔
سیمی شمائلہ کے ساتھ جت گئی اور میں غیر محسوس انداز میں کرسی پہ بیٹھی نازیہ کی طرف کھسک آئی تاکہ اس کے موڈ کا صحیح اندازہ لگا سکوں۔ میں حقیقتاً" اس کی شخصیت سے متاثر تھی اور کچھ میری حساس طبیعت کا بھی اثر تھا۔

دس منٹ بعد جب میں نے دوبارہ ان کے پاس راؤنڈ لگایا تو سیمی بڑی دلچسپی اور دلجمعی سے شمائلہ سے اس کے افیئر کی تفصیل سن رہی تھی۔
"یہ لڑکی بھی نا۔" میں اس کے اتنی تیزی سے حد پھلانگنے سے حیرت زدہ تھی۔
خود وہ اپنے منگیتر کم اور بوائے فرینڈ کا ذکر بڑے ذوق شوق سے سنایا کرتی۔
"ارے سلوی! اس کا بوائے فرینڈ باہر کھڑا ہے' اسی کے ساتھ آئی ہے۔" اس کا اشتیاق قابل دید تھا جوش میں اتنا اونچا بولی کہ نازیہ نے چونک کر مڑ کے دیکھا۔

"بوائے فرینڈ نہ کہو بہت odd (معیوب) سا لگتا ہے' لور (Lover) ٹھیک رہے گا۔"
شمائلہ خفیف سا مسکرائی۔
"اچھا۔" میں نے زبردستی اس بریکنگ نیوز پہ باچھیں چیریں۔
"او دیکھیں۔ کیسا ہے ان کا کپل' خوب صورت بھی ہے کہ......"
سیمی' آپی کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کے اپنے منگیتر کو باہر بلا کے گلاس ڈور کھسکا کے دیکھا کرتی تھی اور مجھے بھی متعدد بار دعوت نظارہ دے چکی تھی مگر میں بھی اپنے نام کی ایک ڈھیٹ اور بے زار طبیعت تھی' مجال ہے جو کبھی اس قسم کی انٹرٹینمنٹ میں حصہ لیا ہو۔ اس وقت بھی اس کی آواز پہ کان بند کرکے میں اپنی جگہ سے نہ ہلی۔
"آپ "ان" کے ساتھ آئی ہیں۔" میں نے جان بوجھ کے [illegible] آپی [illegible]
"وہ میرے ساتھ ہی کمپنی میں کام کرتے ہیں' ان کی ڈیوٹی لڑکیوں کو بائیک پہ پارلر' پارلرز کے لیے گھومنا ہی ہوتا ہے۔ ہم دونوں کافی عرصے سے اکٹھے......"
"ہائے کچی پیار ہے' مائنڈ مت کرنا شمائلہ تم سے تو پیار ہی ہے۔" سیمی نے درمیان سے اس کا جملہ کاٹ دیا۔

اتنے میں آپی کی تشریف آوری بھی ہوگئی' ساتھ میں ان کی کزن تھی جو ہمارے آج کے تجربے کی ماڈل گرل بنی تھی۔ اس کے خودرو جھاڑیوں جیسے گھنے خشک' روکھے پھیکے اور خشکی سے بھرے بالوں کو ملائم اور سلکی بنانا تھا۔ اس کے جھاڑ جھنکار جیسے بال دیکھ کر مجھے یہ تجربہ کم' عنقریب نمودار ہونے والا معجزہ زیادہ لگ رہا تھا۔ پہلے بالوں کو اچھی طرح ہربل شیمپو سے دھو کر خشک کیا گیا' اس کے بعد اسٹریٹنرز کی باری آئی۔ شمائلہ بہت نرمی اور روانی سے طریقہ سمجھا رہی تھی۔ پھر اس نے اسٹریٹنرز نازیہ کے طرف بڑھا دیا۔
"اب آپ چلائیں اسے۔" اس نے جھجکتے ہوئے پکڑا۔

"اوں ہوں' کنگھا بائیں ہاتھ میں۔" اس نے غلط پکڑنے پہ ٹوکا تھا۔
پھر میری اور سیمی کی باری' اسٹریٹنرز اور کنگھا تینوں کے ہاتھوں میں گھومتے رہے۔ ہم پہلی دفعہ یہ سب استعمال کر رہی تھیں' اس لیے کافی دشوار تھا' دائیں ہاتھ کی کلائی اور انگلیوں میں دکھن ہونے لگی' ناخن سرخ ہوگئے' ایسے میں ہم نے مدد طلب نگاہوں سے شمائلہ کو دیکھا اور اس نے جھٹ ہم سے اسٹریٹنرز پکڑ لیا' لیکوڈ کریم سے ایک ایک بال پہ مساج کرکے دو گھنٹے چھوڑ دیا' پھر اسے دھو کر ڈرائی کرکے اسٹریٹ کیا۔ شمائلہ کے ہاتھوں کی تیزی اس کی مہارت کی گواہ تھی۔
"جی چاہ رہا ہے 240 پہ ہیٹ دے کر سارے بال جلا دوں۔" سیمی نے غصے سے میرے کان میں سرگوشی کی۔
"حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔" میں نے مرجھائی ہوئی کیفیت میں باآواز بلند شعر پڑھا۔
چار گھنٹے کھڑے رہ کے جب ہمارا جوڑ جوڑ دہائیاں دینے لگا تب اس کے بال نرم و ملائم اور سلکی ہوئے۔ ہم سب اس قدر تھک چکی تھیں کہ نہ حیران ہوئیں' نہ تبصرے کیے اور نہ ہی شمائلہ کو داد دی۔
"باقی کا ٹریٹمنٹ تین روز بعد ہوگا اور اس دوران آپ نے بالوں کو قطعاً" نہیں باندھنا" کھلے رکھنا ہے۔" شمائلہ نے اس لڑکی کو ہدایت کی۔
ہم سب تھک ہار کے بیٹھ گئیں۔ آپی نے شمائلہ کے لیے کھانا منگوایا' کھانا کھا کے بھی وہ کافی دیر تک بیٹھی رہی۔ سیمی نے اس سے خوب دوستی گانٹھ لی تھی۔
پھر مختصر سے عرصے میں سیلون میں چند تبدیلیاں آئیں۔ سیمی نے اپنے منگیتر کے کہنے پر کمپیوٹر کالج جوائن کرلیا۔ نازیہ انٹرن شپ کی تیاری میں لگ گئی' تین نئی اسٹوڈنٹس یکے بعد دیگرے آگئیں۔
آپی کے نزدیک میں تین میں نہ تیرہ میں' انہوں نے

مجھے خوب زیرِ نشانہ رکھا۔ اسی دوران شمائلہ کا دوسرا چکر بھی لگا۔ آپی اس دن بھی معمول کی طرح غائب تھیں۔ وہ اپنے نزدیکی چوبارے کا خاطر خواہ ناجائز فائدہ اٹھاتی رہتی تھیں۔

میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ کوئی پروڈکٹ نہیں بلکہ "لیڈیز اسیسریز" لائی ہے۔ وہ آپی کو اپنی آمد کا اطلاعی میسج کر کے میرے ساتھ بات چیت کرنے لگی۔ مجھے اس کی گفتگو آج قابلِ قبول لگ رہی تھی یا شاید میں تنہائی سے اکتائی ہوئی تھی۔ مگر کیا؟ کھینچ تان کے مرغ کی ایک ٹانگ، اس کے ہر قصے کا اختتام گھوم پھر کے باہر بائیک پہ منتظر اپنے محبوب پر ہوتا۔

اس کی کل رام کہانی یہ تھی کہ وہ اپنے گھر کی واحد کفیل تھی۔ والدہ حیات نہیں تھیں، ایک بھائی کم تنخواہ پر کام سیکھ رہا تھا اور بہن تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ تبھی نہیں محبوب صاحب جن کا نام عارف تھا۔ ان کی دو بن بیاہی بہنیں اور ماں تھیں۔ ایک بہن کی شادی ہو چکی تھی۔ والد صاحب داغِ مفارقت دے چکے تھے۔ میرے اور اس کے تعلقات میں کسی حد تک بہتری آ ہی گئی۔ وہ جب بھی آتی ہم کافی دیر گپیں ہانکتے۔ تب ایک روز اس نے بہت شرمیلی اور البیلی سی مسکان ہونٹوں پر سجائے بتایا۔

"عارف اپنی ماں کو میرے رشتے کے لیے بھیجنے والا ہے۔"

اس کی آنکھیں تیل سے لبالب بھرے دیے کی طرح روشن ہو گئیں۔

پھر میری کچھ گھریلو مجبوریاں اور تعلیم کا حرج بھی، مجھے مجبوراً "سیلون کو چھوڑنا پڑا۔ زندگی نے بہت سے گورکھ دھندوں میں الجھا دیا۔ میں ہر مشغلہ ترک کر کے پڑھائی میں جت گئی۔ اگزام کی تیاری مکمل کی اور پھر امتحانات دیے۔

✡ ✡ ✡

میں چھٹیوں میں نانی اماں کے گھر آئی، وہیں سے آنٹی کے ہمراہ قریبی سیلون جانے کا اتفاق ہوا۔

"السلام علیکم رضیہ، کیسی ہو؟ لافٹی کی زبردست پروڈکٹ آئی ہے۔ ایک منٹ نکالتی ہوں۔"

رضیہ میری بائیں آئی برو چیک کر رہی تھی۔ آنے والی کی آواز پر اپنا کام ادھورا چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اس کی آواز میرے ذہن میں کھٹکنے لگی۔ میں نے آنکھیں کھول کے شیشے میں دیکھا۔ وہ واقعی شمائلہ تھی۔ اپنے ہاتھ میں پکڑی بوتل کے فوائد گنوائی۔

"شمائلہ آپ۔" میں کرسی کی پشت چھوڑ کے آگے کو اٹھ گئی۔

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ "وہ سلوی! تم، یار یہ تم ہی ہو۔" اس کی بھی حیرت اور خوشی دیدنی تھی۔

میں فارغ ہو کے اس کے ساتھ بینچ پہ بیٹھ گئی جبکہ میری سیٹ آنٹی نے سنبھال لی تھی۔

"تم اچانک کہاں چلی گئی تھیں؟" اس نے پوچھا۔

"بس میں اسٹڈیز میں بزی ہو گئی تھی۔ اگزام اس ایریا میں میرا ننھیال ہے وہیں آئی ہوں اور آپ سے ملاقات ہو گئی۔ آپ تو لگتا ہے سارا شہر گھومتی ہیں۔" میں نان اسٹاپ تھی۔

"ہاں کچھ ایسا ہی ہے۔"

تب میں نے نوٹ کیا کہ اس کے ہونٹوں پہ مدھم سی بھی ہنسی نہیں اور نہ ہی آنکھوں میں روشنی۔ جیسے کوئی مجبور اور کمزور زبردستی خود کو ڈھیٹ بنا کے بہادر ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"اور کچھ۔" وہ اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں بتا رہی تھی۔

"اور کچھ آپ بتاؤ، شادی ہو گئی، کیسے ہیں آپ کے محبوب شوہر۔" اس کا چہرہ یک دم ماند پڑ گیا۔ اس نے بے اختیار ہی سیٹنگ چیئر کے بائیں طرف سے نیچے لٹکتے آنٹی کے رنگین پلو کو تھام لیا۔

"پھر۔" میری آواز ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہونے والی انہونی کا اندازہ ہو چکا تھا۔

"پھر کیا؟ شادی نہیں ہو سکی۔"

اس کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ مجھے جھک کر کان لگانا

"پر کیوں، وہ تو اپنی ماں کو بھیجنے والا تھا۔" میں حیرت زدہ رہ گئی۔

"ہوں۔" اس نے نفی میں سر جھٹک کے دوپٹے کا پلو چھوڑ دیا۔

"اس کی ماں نے ایک پروڈکٹ گرل کو خاندان کی بہو بنانے سے انکار کر دیا، یہ ہی طریقہ تھا۔ اپنے نام نہاد خاندان کی عزت و ناموس کو بچانے کا۔" اس کے لہجے میں دکھ تھا یا نفرت۔

"اس نے آپ کو محبت کے جھانسے میں رکھا اور ماں کو منا نہیں سکا۔" میں شدید دکھ میں تھی۔

"اس کی ماں کے دلائل، محبت کے الفاظ سے کہیں زیادہ مضبوط اور کھرے تھے اور وہ بے چارہ مرد، جس پہ دو بن بیاہی اور ایک بیاہی بہن کا بوجھ تھا، اپنی مردانہ غیرت کی آخری رمق، محبت کی جوت خود ہی پھونک مار کے بجھا دی۔" وہ غیر مرئی نقطے پہ نگاہیں ٹکائے کتنی خالی خالی لگ رہی تھی۔

"اس نے اچھا نہیں کیا آپ کے ساتھ۔" میں تاسف سے بولی۔

"نہیں، اس کی ماں بھی سچی تھی۔ وہ کیسے ایک پروڈکٹ گرل کو بہو بنا لیتی جو اس کے بیٹے کی موٹر سائیکل پر پیچھے بیٹھی اس کے کندھے پہ ہاتھ دھرے سارا شہر گھومتی تھی۔ پروڈکٹ گرل کو کبھی بھی مجبور نہیں بے حیا سمجھا جاتا ہے، ایسی بے باک گفتگو کرنے والی لڑکی کسی بھی شریف خاندان کا حصہ بننے کے لائق نہیں ہوتی، میری مجبوریوں کا سودا میرا تھا۔ وہ کیوں اپنے اکلوتے بیٹے کے معاملے میں گھاٹے کا سودا کرتی، یہاں ہر کسی کو اپنی مجبوری کی گٹھڑی کا بوجھ خود ہی ڈھونا ہوتی ہے۔"

دوسرے ہمیں برا کہیں اور ہم ان کی تردید یا تصحیح حتیٰ کہ اپنی ذات کا محاسبہ کیے بغیر ہی خود کو اسی زاویۂ نگاہ سے تولنے لگیں، یہ سارا عمل خود اذیتی کی آخری حد ہوتا ہے۔ وہ بھی ایسا ہی کر رہی تھی۔

"تم نہیں سمجھو گی سلوی، اپنی محبت سے دستبرداری کے بعد کا سارا سفر کس قدر اذیت ناک اور لاحاصل لگتا ہے۔" اس کے لہجے میں برسوں کی تھکن غالب آ چکی تھی۔

"تم بھی نہیں سمجھو گی، یہاں چپکے سے ہی سب کچھ چھن جاتا ہے اور ہم بے خبری میں لٹ جاتے ہیں۔" میں نے دل میں کہا تھا۔ میری آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ اس کے دکھ پر یا...

"اب؟" کافی توقف کے بعد میں نے پوچھا۔

ہمارے مابین بے معنی سی خاموشی در آئی تھی۔

"اب کیا جب تک پروڈکٹ گرل کا ٹیگ مجھ سے نہیں ہٹے گا، اچھا رشتہ نہیں آئے گا۔ ویسے ایک دودھ، دہی کی دکان والے کا رشتہ ہے، شاید بے چارے ان پڑھ کو پروڈکٹ گرل کے کام کی نوعیت سے آگاہی نہیں ہے، ورنہ یہ ان پڑھ، پڑھے لکھوں سے زیادہ غیرت مند ہوتے ہیں۔" وہ یوں کھوکھلی سی ہنسی جیسے کوئی لطیفہ ہو۔

"چلو اٹھو سلوی۔" آنٹی پیسے پکڑا کر میری طرف مڑیں۔

میں نے اٹھنے سے پہلے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ دھرا۔

"میں دعا کروں گی، آپ کے نصیب میں مزید دکھ نہ ہوں۔"

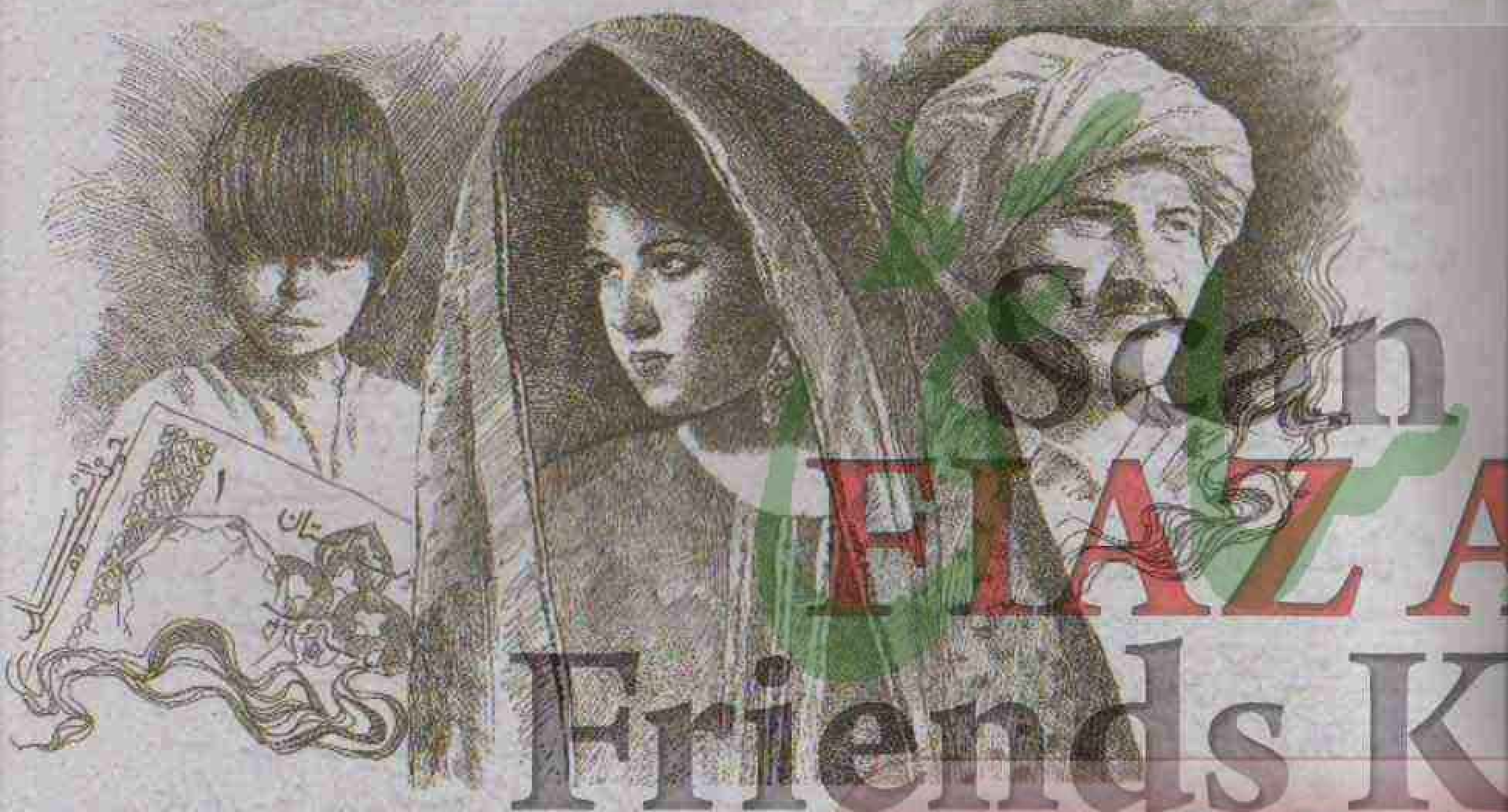
اسے تسلی دیتے میرا دل اندر سے رو رہا تھا۔ اس نے سر اٹھا کے میری طرف نہیں دیکھا، صرف سر ہلانے پہ اکتفا کیا۔

"میں جا رہی ہوں، زندگی رہی تو پھر کبھی یوں ہی سرِ راہ مل جائیں گے۔"

اس نے پھر سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کی گردن سینے تک جھکی ہوئی تھی۔ شاید وہ گالوں پہ لڑھکنے والے بے اختیار آنسوؤں کو چھپانا چاہ رہی تھی۔ میں اس کے تر چہرے کا بھرم رکھنے کے لیے خدا حافظ کہے بغیر باہر نکل آئی۔

راحت جبیں

تم سے مل کے





مکمل ناول

لڈی ہے جمالو پا ولڈی ہے جمالو

وہ کب سے واش بیسن پر لگے آئینے کے سامنے کھڑی اپنے کمر تک آتے بالوں میں برش چلاتی گنگنائے جا رہی تھی۔ گنگنانا کیا بس ایک ہی جملے کی تکرار' کبھی سارے بال ایک طرف سمیٹتی' کبھی دوسری طرف' اپنا جائزہ لیتی دوبارہ برش چلانے لگتی' پھر برش رکھ کے اس نے کاجل اٹھایا اور دونوں آنکھوں میں ایک ایک سلائی پھیری' آنکھوں کو پھیلا پھیلا کر جائزہ لیا۔

وہ بہت خوب صورت نہ تھی' ہاں بن ٹھن کر خوب صورت لگتی' سوائے ہر وقت بننے سنورنے کا خبط تھا۔ کھلی سی چھت' جس کے ایک کونے میں پانی کی ٹنکی تھی' تو دوسرے میں ٹوٹی کرسیوں اور چارپائیوں کا ڈھیر' گھی کے خالی ڈبے' ٹوٹے جوتے' چھجے چھپے' جس میں کسی زمانے میں قلعی گھولی گئی ہو گی۔ سامنے کے رخ پر ایک کمرہ اور باتھ اور باتھ کے ذرا اس طرف واش بیسن' جس کے سامنے کھڑی ملیحہ عرف ملی فرام چیچہ وطنی چک 44 کے بال بن کے ہی نہ دے رہے تھے اور لڈی ہے جمالو کی تان ٹوٹنے نہ پا رہی تھی۔

ایک بار جو تان لمبی ہوئی' تو پاس ہی چارپائی پر مسالا میگزین سے منہ ڈھانپے اونگھتی نگین ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ وہ صاف رنگت' بڑی آنکھوں اور بیٹھی ہوئی ناک والی لڑکی بس ٹھیک ٹھاک تھی۔ خوب صورت لگ سکتی تھی' مگر کیا ہے کہ اسے ایسا کوئی خبط نہ تھا۔ سو جیسی بھی تھی ویسی ہی لگتی' اس وقت تیل کی مالش کروائے' کس کے چوٹی باندھے' کچھ زیادہ ہی ہونق اور بے رونق لگ رہی تھی۔

"گیسوئے آبدار کو اور بھی تابدار کر' غالباً" اقبال تمہارے لیے ہی فرما گئے تھے۔" اس نے چڑ کر بالوں سے لاڈ کرتی ملیحہ سے کہا۔

"شاید۔" اس نے لاپروائی سے کندھے اچکا دیے۔ پھر دوپٹہ ٹھیک کرتی اس کی طرف پلٹی' تب ہی ڈھلتی شام کے پس منظر میں بائیں دیوار کے عقب سے ان ہی جیسی مہاندرے کی لڑکی نے جھانکا۔

"ارے ملی! یہ تو پکڑ۔" اس نے ڈونگا دیوار پر رکھا، جسے ملی نے جھپٹ کر اٹھایا۔

"آہا... ٹرائفل۔"

"ملی! صرف تمہارے لیے نہیں ہے۔" اسے "فوراً" شروع ہوتے دیکھ کر نگی نے دہائی دی، جبکہ تابندہ عرف تابی دیوار پھلانگ کر اس طرف آگئی۔

وہ دبلے پتلے چھریرے بدن کی مالک خوب صورت سی لڑکی تھی اور اس کی ساری خوب صورتی اس کی ستواں ناک میں تھی، ورنہ آنکھیں، رنگت، بال سب نگین جیسے تھے۔

"سارا ڈونگا اٹھا لے آئی، شام کو چچی نے تجھے اسی ڈونگے میں گھسا دینا ہے۔"

"ممانی کے دوستوں کے لیے بنائی تھی، دوست آئے نہیں، میں یہاں لے آئی۔" اس نے اپنا کارنامہ بتایا، اور یہ پہلی بار نہ تھا۔ وہ اکثر ایک دوسرے کے لیے یوں ہی اشیاء پار کرلاتی تھیں۔ پہلے دو تھیں اور جب گرمیوں میں ملیحہ آجاتی تو تینوں مل کر خوب ہنگامہ کرتیں۔

ملیحہ، نگین کی خالہ زاد تھی۔ اور تابندہ چچازاد۔ یہ دونوں ملی ہوئی چھتیں پہلے ایک ہی تھیں۔ پھر بچے جوان ہوئے تو ان کے ساتھ ساتھ دیورانی جیٹھانی یعنی ان ماؤں کے اختلافات بھی۔ جو اتنے بڑھے کہ ایک گھر دو میں تقسیم ہوگئے۔

بات چیت برائے نام تھی۔ مگر ان کا ایک دوسرے کے بغیر کھانا بھی ہضم نہ ہوتا۔ مبین بھی ساتھ مل جاتا، مائیں جانتی تھیں، مگر چشم پوشی کرجاتیں کہ بہنوں کی شادیوں کے بعد تابندہ گھر میں اکیلی تھی اور نگین تو تھی ہی اکلوتی، نہ بھائی، نہ بہن۔

کمرے سے پلیٹیں اور چمچے برآمد کیے، جو اسی مقصد کے لیے یہاں رکھے گئے تھے۔ ٹھنڈی ٹھار ٹرائفل، اور سنہری شام، جو آسمان کے کناروں سے پھسلتی گھروں کی منڈیروں اور چھتوں پر پھیل رہی تھی۔ ملیحہ نے چھت پر ٹہلنا شروع کردیا۔ پھر دونوں ہاتھ داہنی دیوار پر ٹکا کر جھکی ۔ پُرجوش آواز میں بولی۔

"مبارک ہو، ساتھ والوں کا سامان جارہا ہے۔"

"نہیں بچی۔" تابی بھی اس دیوار کی سمت لپکی اور للچائی نظروں سے شہتوت اور بیری کے درختوں کو دیکھنے لگی جو پھلوں سے لدے ہوئے تھے۔

"ہائے کیسے اچھے وقت جارہے ہیں، دعا کرو بہت دنوں تک نئے کرائے دار نہ آئیں۔" بھلا یہ چھوٹی سی دیوار پار کرکے ساتھ والوں کی چھت پر اترنا اور درختوں سے شہتوت اور بیر کھانا کون سا مشکل کام تھا۔ بشرطیکہ گھر خالی ہو، اور یہ مشغلہ تو محلے کے سارے بچوں کا تھا۔

"اف شہتوت اور بیر دیکھ کر رال ٹپکانے والی ننھی بچی۔"

"ملی! ابھی یہ کام تم بھی کررہی تھیں۔"

"میں تو یہ سوچ رہی تھی کہ کاش کوئی کنوارہ خوب صورت نوجوان یہ گھر کرائے پر لے لے۔"

"تو اس سے کیا ہوگا؟" تابی نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"شاید ہم میں سے کسی کے ہاتھ پیلے ہوجائیں۔" ملی نے حسرت سے دیوار پر کہنی ٹکائی۔

"ہاتھ پیلے کرنے کا یہ آئیڈیا انتہائی گھٹیا ہے۔" چہل قدمی کرتی نگی نے اطمینان سے اطلاع دی۔

"تم کچھ بھی کہو، میں اپنے خیال سے دستبردار نہیں ہوں گی۔"

"تم چک 44 سے یہاں کوئی لو اسٹوری لکھنے آئی ہو۔"

"حرج ہی کیا ہے۔" وہ ڈھٹائی سے گویا ہوئی۔ "میں تو سنجیدگی سے سوچ رہی ہوں اب ہم تینوں کی شادیاں ہوجانی چاہئیں۔"

"اور جنہیں یہ سوچنا چاہیے وہ آرام سے خواب خرگوش کے مزے لے رہی ہیں، وہ بھی اے۔ سی چلا کے۔"

"کون؟"

"تمہاری مائیں..."

"اسی لیے تو کہہ رہی ہوں، کچھ ہاتھ پاؤں مارو۔"

"یہاں سے... یہ سمندر نہیں تالاب ہے، ہاتھ پیر مارنے سے صرف مینڈک ہی ہاتھ آئیں گے۔" نگی نے خبردار کیا۔

"یار! میں گھر میں سب سے چھوٹی ہوں، سو کسی کو لگتا ہی نہیں کہ بڑی ہوچکی ہوں۔" تابی نے رونا رویا۔

"سکھیو! میں تو ویسے ہی اکلوتی ہوں، اماں کا جی ہی نہیں چاہتا خود سے جدا کرنے کو۔" نگی نے آہ بھری۔

"میری اماں کا بس چلے تو آج ہی گھر سے رخصت کردیں، مگر کس کے ساتھ؟ کوئی ملتا ہی نہیں۔" ملی ہنسی۔

"تمہارا کہنے کا مطلب ہے کہ ہم جلدی سے تین عدد بر پکڑیں اور رخصتی کی تیاری کریں؟"

"آف کورس۔"

"تین..." نگی ان کے مخالف سمت تھی۔ ایک دم اٹک سی گئی۔ ہاتھوں کا چھجا سا بنا کر تابندہ کی چھت سے آگے دیکھا۔

"ہاں تین ہی ہیں، مگر کون سا پکڑوں، پہلا، دوسرا یا تیسرا، میرے خیال میں دوسرا زیادہ خوب صورت ہے۔"

تابی اور ملی نے ایک دوسرے کو دیکھا، پھر تیزی سے نگی کی طرف بھاگیں، ہاتھوں کا چھجا بنا کر دیکھا۔ (نگی کی تقلید میں) پھر جھنجلا کر تابندہ بولی۔

"دوسری مرغی ہے۔"

"ہم مرغوں کی نہیں دولہوں کی بات کررہے ہیں۔"

"ایک ہی بات ہے۔" اس نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔

☼ ☼ ☼

صبح ملیحہ کی آنکھ خاصی دیر سے کھلی (حسب معمول) نگین کچن سمیٹ کر پھوپھو کی طرف جاچکی تھی کہ آج کل ان کی ماسی چھٹی پر تھی۔ اور پھوپھو کے گھٹنوں میں درد رہتا تھا۔ سو نگین نے عارضی طور پر ان کی ماسی کی سیٹ سنبھال رکھی تھی۔

خالو آفس جاچکے تھے اور خالہ ریموٹ ہاتھ میں لیے ہر چینل کے مارننگ شو میں جھانکیاں مار رہی تھیں۔ ملیحہ نے اپنے لیے بڑا سا چکن پراٹھا اور پیالہ بھر دودھ پتی بنایا اور ٹرے میں سجا خالہ کے برابر آبیٹھی۔

"خالہ! شائستہ کا سوٹ تو دیکھ لینے دیں۔"

چینل بدلتی خالہ نے ریموٹ رکھ کر ناشتے کا جائزہ لیا۔

"حق ہا... ایک کپ میرے لیے بھی بنا لیتیں، ناشتے کے بعد سستی سی ہوجاتی ہے۔"

"اور جو چائے ناشتے میں پیتی ہیں؟"

"وہ تو ناشتے کے ساتھ ہضم ہوگئی؟"

"جو بیڈ ٹی خالو کے ساتھ لیتی ہیں۔"

"وہ تو ان کے ساتھ مغز ماری میں ہضم ہوجاتی ہے۔" انہوں نے معصومیت سے کہا۔

"آپ اسی میں سے آدھا لے لیں، آپ سے میرا پیالہ کہاں برداشت ہوگا۔" آخری جملہ پراٹھے کے لقمے کے ساتھ اندر کیا۔ خالہ نے جھپٹ کر پیالہ قبضے میں کیا اور ہر گھونٹ کے ساتھ ملیحہ یاد کراتی رہی۔

"خالہ! آدھا۔"

ڈٹ کر ناشتے کے بعد وہ نگین کے پیچھے چلی آئی۔ چھوٹی سی سڑک عبور کرکے عین سامنے والا گھر ان کا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اک زوردار چنگھاڑ سنائی دی۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ آج شیر اپنی کچھار میں ہے۔

وہ لپک کر پھوپھو کے کمرے میں گھس گئی۔ مگر وہ وہاں نہ تھا۔ کچن سے کھٹ پٹ کی آوازیں آرہی تھیں۔ ملیحہ نے گردن باہر نکالی، اک اور چنگھاڑ کے ساتھ نگین بغل میں جھاڑو ہاتھ میں جھاڑن لیے افتاں و خیزاں برآمد ہوئی۔ دونوں آگے پیچھے کچن میں آگئیں، نگین کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"آپ کہہ رہی تھیں عذیر نہانے گیا ہے؟"

"ہاں گھنٹہ تو لگاتا ہی ہے، آج نہ جانے کیسے نکل آیا۔" وہ ناشتے میں الجھی تھیں، جو تعداد و مقدار میں

بتاتا تھا عذیر کے لیے ہے۔

"جب تمہیں پتا تھا آج شیر کچھار میں ہے تو کیوں گئی تھیں؟" ملیحہ نے ناشتے کے لوازمات کو للچائی نظروں سے دیکھا۔

"پھوپھو نے کہا تھا۔ ابھی تک دھاڑ رہے ہیں' یہ کیوں چھیڑا' یہ کیوں اٹھایا۔" اس نے روہانسی ہو کر بتایا۔

"ایک تو میں اس لڑکے کی عادت سے تنگ ہوں' ناشتے میں ہی اتنے نخرے ہیں' پتا نہیں کس پر گیا ہے۔"

دونوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ دنیا جانتی تھی عذیر ماں' باپ کا مزاج لے کر پیدا ہوا ہے' دونوں میں ساری زندگی اینٹ کتے کا بیر رہا۔ وہ تو پھوپھا نے ذرا جلدی میدان چھوڑ دیا اور اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ورنہ ان کے گھر میں ہر وقت دنگل ہوا کرتے تھے۔ تب ہی شیر یعنی عذیر چنگھاڑتا ہوا آگیا۔

"ایک ویک اینڈ پر آنا ہوتا ہے' اس دن بھی ناشتا وقت پر نہیں ملتا۔"

"چار ہاتھ نہیں ہیں' بنا رہی ہوں۔"

"تو یہ دو بانس تنبو تاننے کے لیے کھڑے کیے ہیں۔"

ملی نے ادھر ادھر بانس تلاشے' پھر پتا چلا یہ خطاب ان کے لیے ہے۔

"ہاں ہم تو نوکر لگے ہیں۔" وہ زیر لب بڑبڑائی۔

عذیر جتنی تیوریاں چڑھا سکتا تھا چڑھا کر اسے گھورا۔ مگر وہ نگی نہیں تھی جو فریج کھولے خوامخواہ اس میں سمانے کی کوشش کر رہی تھی۔ بس ہاتھ لٹکائے ادھر ادھر دیکھتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ گھور گھار کر چلا گیا۔

"اب فریج سے نکل آو' فریز ہو جاؤ گی۔"

"شکر ہے چلے گئے۔"

"ہاں تھوڑی دیر کھڑے رہتے تو تم نے تو سبزی والے خانے میں گھس جانا تھا۔ پھوپھو! کوئی لڑکی دیکھ کر شادی کر دیں۔"

پھوپھو نے اسے دیکھا تو گڑبڑا کر بولی۔

"میں اب چلتی ہوں۔"

"چائے ستو پیتی جاؤ۔" پھوپھو نے یقیناً "رسماً" کہا تھا۔ مگر وہ آرام سے اسٹول کھینچ کر بیٹھ گئی' نگی نے اشاروں میں سرزنش کی' پھر ڈھٹائی دیکھ کر کہنا پڑا۔

"ابھی گھر سے دودھ پتی کا پیالہ پی کر آئی ہو گی۔"

"وہ تو خالہ نے پی لیا' پھوپھو ساتھ کیک پیس بھی۔" وہ ڈھیٹ ابن ڈھیٹ تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ تینوں اپنے گوشہ عافیت میں سر جوڑے گنڈیریاں چوس رہی تھیں۔

"اک بات تو بتا ملی' یہ تو ہر گرمیوں میں یہاں کیوں بھاگ آتی ہے؟" نگی اتنی معصوم تھی نہیں جتنا بن کر سوال کر رہی تھی۔

"تمہیں تکلیف ہے؟ میری خالہ کا گھر ہے۔"

"نہیں پھر بھی؟"

"ہمارے گاؤں میں بجلی نہیں آتی۔" بہت سوچ کر جواز تراشا گیا۔

"وہ تو یہاں بھی نہیں آتی۔"

"یہاں جنریٹر تو چلتا ہے۔" وہ چمک کر بولی۔ تب ہی دیوار کی دوسری طرف اک خوشنما بالوں اور زبردست ہیر کٹ والا سر ابھرا۔

"ہائے گرلز۔"

"تم کہاں غائب ہوتے ہو۔" ملی نے شکوہ کیا تو وہ دیوار پھلانگ کر ان کی طرف آگیا۔ اس کی ناک ہو بہو تابندہ جیسی تھی' جس سے معلوم ہوتا تھا وہ تابندہ کا بھائی مبین ہے۔

"آئس کریم کھاؤ گی؟" اس نے گنڈیریاں اٹھاتے ہوئے آفر کی' تینوں تیار ہو گئیں تو اطمینان سے بولا۔

"پیسے نکالو۔"

"تم ہمیشہ کنگلے رہنا۔" نگی نے منہ بنایا۔

"بے روزگار کنگلا ہی ہوتا ہے۔"

"امی اٹھیں تو نہیں؟" تابی نے فکرمندی سے کہا۔

"کب سے بیٹھی ان دونوں کو باتیں سنا رہی ہیں۔"

"ہیں! ہمیں کیوں؟" دونوں تڑپ کر سیدھی ہوئیں۔

"ان کی صوم و صلوۃ کی پابند' حد درجہ معصوم بچی کو ورغلا کر بگاڑ دیا' اب یہ کسی کام کی نہیں رہی۔"

"ہا۔۔۔ ہا۔۔۔ یہ ہی خیالات میری والدہ محترمہ کے تابی کے بارے میں ہیں۔" نگی کھلکھلائی۔

"ہماری ماؤں کے خیالات کتنے ملتے جلتے ہیں۔"

"پھر بھی ان کی آپس میں کبھی نہیں بنی۔" ملی نے کہا۔

"کیونکہ خیالات ہی نہیں عادتیں بھی ملتی ہیں' یہ کان خالی ہو گیا؟"

"کب کا؟"

"تب میں ابھی آتا ہوں۔" وہ مڑ کے دیوار پھلانگ گیا۔

"ہمارے لیے بھی بیر اور شہتوت لانا۔" تینوں چلائیں۔

"سوری۔۔۔"

"تمہیں کیا لگتا ہے ہم خود نہیں کھا سکتے۔"

"وہاں شہد کی مکھیوں کا چھتہ ہے۔" وہ وہاں سے صحن میں اتر چکا تھا۔

"ہونہہ' مکھیوں سے ڈرنے والے اے آسمان نہیں ہم۔"

"میں نے کہا' اگر بیٹھک ختم ہو گئی ہے تو نیچے آکر آٹا گوندھ لو۔" سخت طنز میں گندھی آواز یقیناً "نگی کی اماں جان کی تھی' وہ ہڑبڑا کر چارپائی سے اٹھی۔

"اچھا سکھی! وقت رخصت آگیا' اب کل ملاقات ہو گی۔" تابی نے اک طویل سانس بھری۔ "ان گنڈیریوں کا شکریہ' جو ہم سے زیادہ ملی کے پیٹ میں گئی ہیں۔"

"تم میرے کھائے پے ذرا کم ہی نظر رکھا کرو۔" ملی نے باقی بچی بھی اپنے قبضے میں کیں۔

"اوکے۔۔۔ کل امرود' بیر اور شہتوتوں کی دعوت

میری طرف سے۔" تابی نے دیوار پھلانگتے پھلانگتے ہانک لگائی۔

"ہاں بھئی' ورنہ یہ محلے کے بچے ہمارے لیے کچھ نہیں چھوڑیں گے۔"

☼ ☼ ☼

"یہ تابی کدھر رہ گئی۔" ملی نے بے تابی سے اس کی چھت پر جھانکا۔ پھر دیوار سے صحن میں۔

"نگی کا بھی کچھ پتا نہیں' یقیناً" خالہ نے کسی کام سے روک لیا ہوگا۔"

وہ تھک کر چارپائی پر بیٹھی' اس کی دانست میں آج کی شام بے کار گئی تھی۔

"لیکن بے کار کیوں' یہ کام میں اکیلے بھی کر سکتی ہوں' بچپن سے یہ ہی کچھ تو کرتی آئی ہوں۔" اس نے ٹوکری اٹھائی اور چھوٹی سی دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف کود گئی۔

اتنے آرام سے کسی اور کے گھر کودنے کی وجہ یہ تھی کہ ایک تو وہ گھر خالی تھا۔ دوسرے نگی کے تایا کا تھا۔ جو اپنے کاروبار کے سلسلے میں فیصل آباد میں رہتے تھے اور اس گھر کو کرائے پر چڑھا دیتے تھے۔ ان ہی نے اپنے شوق سے اس گھر کے صحن میں یہ پھل دار درخت اگائے تھے۔ کرائے داروں کی بھی موج ہو جاتی' جو بھی یہاں سے جاتا' اداس ہو کر جاتا تھا۔ چھوٹا سا گول برآمدہ خشک پتوں اور دھول سے اٹا تھا۔ درختوں کے نیچے بیروں اور شہتوت کا فرش بچھا تھا۔

"اف کمروں کا بھی حشر ہو گیا ہوگا۔" اس نے برآمدے میں کھلتے جالی کے دروازوں کو دیکھا۔ پھر نگاہ برآمدے کی دھول پر نقش پیروں کے نشان پر پڑی۔

"اللہ... یہاں کیا بھوت رقص کرتے رہے ہیں۔" باآواز بلند خیال آرائی کی۔ پھر بیر اور شہتوت چننے لگی' اٹھتی' بیٹھتی' لاپروائی سے دوپٹہ گلے میں ڈالے' کیچو میں جکڑے بال پشت پر بکھرتے' سمٹتے' اچانک کسی عجیب سے احساس سے چونک کر وہ ٹھٹکی اور سیدھی ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ سنا تھا خالی گھروں میں بھوت پریت بسیرا کر لیتے ہیں۔ پر گھر کو خالی ہوئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔

"لگتا ہے وہ بھوت بھی بے گھر تھا۔" وہ ہنسی۔ "خالی گھر کی تلاش میں پھر رہا ہوگا۔ پھر یہیں پڑاؤ ڈال دیا تو بہ یہ خالی گھر بھی اب ڈرانے لگا ہے۔"

اپنے بے نام خوف کو زائل کرنے کے لیے اس نے تان اڑائی۔

پک گئے بیریاں وے بیر بجناں۔

اب پتا نہیں اس کی تان زیادہ سنگین تھی' یا باہر سے پھینکا گیا پتھر' اسے تو صرف اک سیاہ چادر دکھائی دی' جو بھنبھناتی ہوئی اس پر جھپٹی۔ بس ایک پل ہی حیرت و تا نجھی کا تھا۔ دوسرے لمحے اس کی چیخوں سے کمرے میں محو خواب بھوت بھی ہڑبڑا کر جاگے۔

تب ہی اک بھوت سیاہ چادر میں لپٹا اندرونی کمرے سے جھپٹ کر نکلا اور اسے کھینچتا ہوا اندر لے گیا۔ تیزی سے دروازے' کھڑکیاں بند کیے۔ چند ایک مکھیاں جو اس کے ساتھ آگئی تھیں ان کا قلع قمع کیا۔

"آپ ٹھیک تو ہیں۔"

وہ تھوڑا بہت حواسوں میں ہوتی تو ضرور سوچتی بھوتوں کی آواز اتنی پرکشش اور خوب صورت ہوتی ہے۔ اسے تو صرف اپنے چہرے' بازوؤں اور گردن پر تیز سوئیوں کے چبھنے اور جلن کا احساس تھا۔ اور چیخیں جو بلا ارادہ نکلی آرہی تھیں۔ بھوت نے تیزی سے پلٹ کر موبائل اٹھایا اور نمبر ملانے لگا۔ دو منٹ میں مبین اور عذیر وہاں تھے۔

"نہیں فوراً" اسپتال لے چلو' میری گاڑی باہر ہی کھڑی ہے۔"

اس کے بعد جو کچھ ہوا' اس کا اندازہ صرف ملی کو تھا' دو دن بخار میں جلتی رہی۔

خالہ اور عذیر بھائی سے جو ڈانٹ پڑی وہ الگ' شکر ہے خالہ نے اس کے گھر فون نہیں کیا تھا۔ ورنہ اماں' ابا کی باتیں الگ سننا پڑتیں۔ سکھیوں نے ہنسی الگ اڑائی۔ اور چہرے کی جو حالت ہوئی وہ بیان سے باہر تھی۔ ناک' گال' آنکھیں سب برابر ہو گئے۔

"ا۔۔۔ا۔۔۔ آپی تو الیین لگ رہی ہیں۔" پھوپھو کی ہونی کے خوامخواہ دانت نکلتے رہے۔ ملی کا دل چاہا اس کے دانت توڑ دے' آنکھیں کھلی ہوتیں تو یقیناً" عمل بھی کر دیتی۔

"اس کی آنکھیں کہاں ہیں؟" بہت دنوں بعد وہ لوگ چھت پر اکٹھی ہوئیں۔ اب وہ تھوڑی آنکھیں کھول لیتی تھی۔

"وہیں جہاں پہلے تھیں۔" نگی نے تابی کو جواب دیا جو ابھی تک ملی کو گھور رہی تھی۔

"تمہیں کہا کس نے تھا کہ ہمارے بغیر وہاں جاؤ؟"

"تم ساتھ ہوتیں تو آج دونوں میری طرح سوجی ہوئی بلیاں بن کے بیٹھی ہوتیں۔"

"لو ملی! میں نے تمہارا بدلہ لے لیا۔" پرجوش انداز میں مبین کی انٹری ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں شہد کی بھری ہوئی بوتل تھی۔

"پوری ٹیم کو مطلب ہے نکلیں اور مکھیاں بھی کوچ کر گئیں' اب جی بھر کے شہتوت کھانا۔"

"نام مت لو' ان شہتوتوں کا اور دور کرو اسے' مجھے نہیں چاہیے۔" اس نے اس کا بوتل والا ہاتھ پیچھے کیا تو نگی نے فوراً" جھپٹ لیا۔

"پتا بھی ہے شہد کتنا مہنگا ہے۔"

"ہاں ملی! یہ تمہارا حصہ ہے' آخر اس میں تمہارا خون جگر شامل ہے۔" مبین نے ہمدردی سے کہا۔

"اوہ' تب یہ شہد تھوڑی رہا ہوگا۔" تابی نے مایوسی سے سر ہلایا۔

"نگی! تیرے پاس دو سو روپے ہوں گے۔" کان کھجاتے ہوئے مبین نے کہا تو تابی نے فوراً" لتاڑا۔

"بھائی! شرم کرو' نگی سے پیسے مانگتے ہو۔"

"تو کیا کروں' تم بہن ہو کر ساتھ نہیں دیتی ہو' اوپر سے ابو نے جیب خرچ بند کر دیا ہے۔ انہیں لگتا ہے میں جان بوجھ کر نوکری نہیں کرتا۔" مبین کے چہرے کے تاثرات اور نگی کا ہمدرد دل' فوراً" دو سو روپے لا کر اسے تھما دیے۔

"جیتی رہو! اللہ تمہیں چاند سا دولہا عطا فرمائے۔"

"چاند سی دلہن ہوتی ہے۔"

"اچھا تو دولہا؟"

"بہت محبت کرنے والا۔" تابی نے پیار سے بھائی کو دیکھا۔

"ہاں' یہ ٹھیک ہے' کیوں نگی؟" مبین نے ذرا جھک کر اسے دیکھا تو نگین منہ پھیر کر مسکرا دی۔

"شرم کرو' بہنوں کے ساتھ ایسے مذاق نہیں کرتے۔" ملی نے لتاڑا۔

"میں نے بہن کے ساتھ تو نہیں کیا۔" وہ ڈھٹائی سے کہتا غائب ہو گیا۔

"اچھا یہ تو بتا ملی! تجھے بچانے والا کیسا تھا؟" تابی نے اشتیاق سے پوچھا۔

"ہائے پتا نہیں کون فرشتہ تھا۔ میں تو اسے دیکھ بھی نہ سکی' کیسی خوب صورت سچویشن تھی۔" ملی نے جھوم کر کہا۔

"خوب صورت..." دونوں کو اس کی دماغی حالت پر شبہ ہوا۔

"میرا مطلب ہے..."

"تم نے یہ نہیں سوچا' وہ وہاں کیا کر رہا تھا؟" نگی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"ہاں یار... وہ اس گھر میں کیا کر رہا تھا' کہیں بھوت تو نہیں تھا۔" تابی اچھلی۔

"نہیں یار' بھوت اتنے ہمدرد نہیں ہوتے۔" ملی نے فوراً" جھٹلایا۔

"تو پھر وہ تھا کون؟"

"ریان مصطفیٰ! تایا غلام مصطفیٰ کا بیٹا' اور وہ اپنے گھر کا جائزہ لینے آیا تھا۔" نگی نے انکشاف کیا۔

☼ ☼ ☼

دو دن کے بعد پھوپھو نے انہیں گھر کی چابی دی کہ ملازمہ کو ساتھ لے کر اچھی طرح صفائی کروا دیں' کیونکہ بڑے بھائی صاحب کا فیصل آباد میں کاروبار لوڈشیڈنگ' گیس کی بندش اور مزدوروں کی ہڑتال کی وجہ سے بالکل ٹھپ ہو گیا۔ سو وہاں کرائے کے گھر

میں رہنے کے بجائے انہوں نے اپنے گھر اور اپنے شہر کو لوٹنا زیادہ مناسب خیال کیا۔ چھت پر سے ہوتی تائی بھی آگئی۔ سو تینوں نے ملازمہ کے ساتھ مل کر رگڑ رگڑ کر گھر چمکایا۔ اور جب کام کر کر کے تھک گئیں تو مبین سب کے لیے چرغہ اور نان لے آیا۔ پتا چلا یہ مہربانی پھوپھو نے کی ہے۔

پھوپھو کے تعلقات دونوں گھروں کے ساتھ ٹھیک تھے کہ پھوپھا کی وفات کے بعد ایک تو پھوپھو کا طنطنہ کم ہو گیا تھا۔ (ورنہ ساری زندگی بھابھیوں کو گھاس نہ ڈالی) دوسرا دونوں بھابھیوں کو ایک دوسرے کی بدخوئی کرنے اور ادھر کی بات ادھر پہنچانے کے لیے پھوپھو کی ضرورت رہتی تھی۔

چاروں نے دھلے دھلائے ٹھنڈے ٹھار فرش پر بیٹھ کر کھانا کھایا کہ گھر میں فرنیچر نام کی کوئی چیز نہ تھی۔

ایک ہفتے کے بعد نگی کے تایا یہاں شفٹ ہو گئے۔ تایا جن کے غصے اور رعب سے ان کے بھائی بھی کانپتے تھے۔ تائی جو اتنی گم صم تھیں کہ گھنٹوں خاموش بیٹھی رہتیں اور جب بات کرتیں تب بھی انسان کو لگتا اس کا واہمہ ہے۔

ریان مصطفیٰ تو بد قسمتی سے تینوں کی ملاقات اس سے نہ ہو سکی اور اسی بات نے تینوں کے دیدار شوق کو اور ہوا دے دی۔ خود نگی نے بھی اسے عرصہ پہلے ہی دیکھا تھا۔ جبکہ ملی نے دو دن قبل اسے صحن میں واش بیسن کے سامنے شیو کرتے دیکھا تھا۔ ملی کی طرف اس کی پشت تھی۔ اور آئینے کا رخ ایسا تھا کہ وہ فرنٹ سے بھی نہ دیکھ سکی۔

تب ہی تو آج تینوں بھری دوپہر میں بڑا قفل لیے تایا کے دروازے کے سامنے کھڑی تھیں۔ تائی کو بھی فون کر کے بلا لیا گیا۔ وہ پھوپھو کے گھر کا بہانا کر کے نکل آئی۔ ملی نے بے بی پنک اور سفید رنگ کا سوٹ زیب تن کیا تھا۔ سنا تھا کہ وہ اس میں بڑی خوب صورت لگتی تھی۔ آج تو تابندہ نے بھی تھوڑی بہت لیپا پوتی کر لی' جبکہ نگین نے منہ دھو کر صرف فیئر اینڈ لولی لگائی تھی' وہ ہی معمول کا حلیہ۔

غالب گمان تھا کہ ریان آج گھر میں موجود تھا۔ ایک تو اتوار اور دوسرا دوپہر' بیل کے بعد تینوں سانس روکے بند دروازے پر آنکھیں لگائے کھڑی تھیں' اب اس دوپہر میں تائی تو دروازہ کھولنے آنے سے رہیں۔

"ایک بات تو بتاؤ' ہم یہاں کرنے کیا آئے ہیں۔" تابی کو غلط وقت پر غلط سوال سوجھا تھا۔

"میں تو اپنے محسن کا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں۔" ملی نے بال جھٹکے۔ "اور تم؟"

"اور میں تائی سے ملنے۔"

"میں تم دونوں کا ساتھ دینے۔" نگین نے بے چارگی سے کندھے جھٹکے۔ تب ہی دروازہ کھلا اور کھلتا چلا گیا۔

"جی ہم۔" کالی پینٹ اور سرخ شرٹ سے ہوتی نگاہیں چہرے تک گئیں تو دروازے کی طرح منہ بھی کھلتا چلا گیا۔ وہ ہی لمبا قد' چوڑے شانے' پر چہرے کی رنگت بینگن سے مشابہ' سامنے کے دو دانت گلہری کی طرح چک مارنے کو تیار۔

"جی تساں کینوں ملنا اے۔"

جہاں نگی اس کی صورت دیکھ کر غائب ہوئی' وہاں جملہ و آواز سن کر تابی اڑنچھو' جبکہ ملی ابھی تک تحیر میں غوطے کھا رہی تھی۔

"ہاں جی۔"

"یہ برتن خالی کر کے بھجوا دینا۔" وہ اسے ہکا بکا چھوڑ کر آ گئی۔ اندر وہ دونوں ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہی تھیں۔

"ہو... ہو... کزن کی انٹری' یہ تو اسے دیکھنے کے شوق میں مری جا رہی تھی۔"

"صرف میں ہی نہیں۔" وہ دھپ سے ان کے قریب بیٹھی۔

"پتا نہیں بچپن میں تو ریان بھائی ٹھیک ٹھاک تھے' لگتا ہے فیصل آباد کا پانی انہیں راس نہیں آیا' بے چارے کیا سے کیا ہو گئے۔"

"بے چاری ملی' اس کے ارمانوں پر تو اوس ہی گر گئی۔"

"اوں.... نہیں بم۔"

"تم دونوں اپنی بکواس بند کرو۔" ملی نے ہنسی دباتے ہوئے دونوں کو گھورا' جانتی تھی اب اگلے کئی دن وہ اس کا مذاق اڑاتی رہیں گی۔

☼ ☼ ☼

لائیاں لائیاں میں تیرے نال ڈھولنا
اک دل سی ریا میرے کول نا' میں تاں لٹی گئی آں

اس کی آواز خوب صورت تھی۔ جب بھی گاتی باآواز بلند گاتی اور آج تو گھر میں خالہ بھی نہ تھیں۔ وہ پھوپھو کے ساتھ بازار گئی تھیں۔ انہوں نے تابی کو بھی بلالیا۔ اب دونوں مل کر کیک تیار کررہی تھیں' جبکہ تابندہ باہرواش بیسن پر ہاتھ منہ دھورہی تھی۔

"سنو ریان بھائی کے لیے بھی رکھ لینا۔" ملی نے گانا روک کر چھیڑا۔

"اچھا.... کسی کا مذاق نہیں اڑاتے۔"

"اے ملی' ذرا موٹر کا بٹن تو دبانا' پانی ختم ہوگیا ہے۔" تابی نے پکارا۔

"محترمہ کے ہاتھ ٹوٹ گئے ہیں۔"

"میرے منہ پر صابن لگا ہے۔"

"اچھا...." ملی نے باہر آکر بٹن دبایا تو موٹر ذرا دیر کو کھکھیا کر جو چپ ہوئی تو پھر ٹس سے مس نہ ہوئی۔

"میری آنکھوں میں صابن جارہا ہے۔" تابی دہائی دینے لگی۔

"اچھا کچھ کرتی ہوں۔" وہ فریج سے پانی کی بوتل نکال لائی اور اس کا منہ دھلایا۔

"تم پانی بھی نہیں بھر سکتیں۔"

"ذہن سے نکل گیا' حالانکہ امی نے کہا بھی تھا۔"

"اب کیا ہوگا' یہ تو مسئلہ ہوگیا۔"

"ہونا کیا ہے' فوراً" مولی کو فون کرو' کسی پلمبر کو بھیجے۔" نگی کے مشورے پر تابی نے مبین کو فون کیا۔ اس نے تسلی دی کہ ابھی کسی پلمبر کو بھجواتا ہے' آدھے گھنٹے کے بعد دروازے پر بیل ہوئی۔ ملی نے دروازہ کھولا اور ہکابکا رہ گئی۔

"آپ...."

"ہاں جی۔" اس نے دانت نکالے۔

"آپ یہ کام بھی کرلیتے ہیں۔"

"ہاں جی تے ہور کیتا کی اے۔"

"آیئے۔" وہ منہ بناتی اسے موٹر تک لے گئی۔ وہ جھٹ پٹ کام میں مصروف ہوگیا۔

"ریان بھائی خود موٹر ٹھیک کرنے آئے ہیں۔" اندر چل کے اطلاع دی۔

"ہیں.... مبین نے ان سے کہہ دیا۔" تابی نے حیران ہوکر جھانکا۔

"پر ریان بھائی ایسا کام کیوں کریں گے' ان کی تو اچھی خاصی جاب ہے۔" نگی عالم حیرت میں تھی۔

"یہ ہی جاب تھی' لوگ کیا کیا چھپاتے ہیں۔"

"پر.... یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"

"ہونے کو سب کچھ ہوسکتا ہے' پڑھائی میں نکمے ہوں گے' تایا نے پکڑ کر کام سے لگادیا۔" ملی نے کہا۔

"پر یار' ہماری تو پشتوں میں کسی نے ایسا کام نہیں کیا۔"

"کیا ہے یا نہیں' البتہ وہ کررہے ہیں' اب چائے بنادو۔ جاکے تائی سے شکایت کردیں گے کہ چائے پانی کا بھی نہیں پوچھا۔"

جب تک چائے بنی' موٹر چلنے کی آواز آنے لگی۔

"تم ہی لے جاؤ' میں نہیں جارہی۔" ملی نے صاف انکار کیا' نگی مصروف تھی' سو تابی ٹرے لے گئی' جس میں چائے کے ساتھ بسکٹ اور سموسے موجود تھے۔

"کچھ ہونق سے نہیں ہیں' ٹرے دیکھ کر دانت ہی نکالے جارہے ہیں۔" اس نے واپس آکر بتایا۔

"بس چھوڑو' مذاق نہیں اڑاتے۔"

تھوڑی دیر کے بعد بیل دوبارہ ہونے لگی۔

"میں چائے دینے گئی تھی' تم دروازہ کھولوگی۔" تابی نے پہلے ہی انگلی اٹھاکر کہہ دیا۔ وہ اسے گھورتے ہوئے چلی گئی' اور جب دروازہ کھولا تو....

اونچا لمبا قد' جاذب نظر نقوش' خوب صورت ہیر کٹ' بلیک پینٹ' لائٹ کلر کی شرٹ۔

"السلام علیکم۔" شائستہ لب و لہجہ' ملی ہوش میں ہوتی تو جواب دیتی۔

"کام ہوگیا؟"

"کون سا کام؟"

"مبین نے فون کیا تھا کہ موٹر خراب ہے۔ اس دن جو پلمبر ہمارے گھر کام کررہا تھا اسے بلادیں۔" اس نے الجھ کر سامنے کھڑی لڑکی کو دیکھا۔ جو حواسوں میں نہیں لگ رہی تھی۔

"پلمبر!" سارے ہوش و حواس ایک جھٹکے سے واپس آگئے۔ "آ.... آپ کون ہیں؟"

"ریان مصطفیٰ!"

"جی.... ب.... ب...."

"ریان۔ اتنا مشکل نام تو نہیں ہے۔"

ملی نے پلٹ کر دیکھا' جہاں ڈرائنگ روم میں پلمبر صاحب چائے کے ساتھ سموسے اڑارہے تھے۔

"سب ٹھیک تو ہے؟" ریان نے الجھ کر پوچھا۔

"جی.... ابھی تو سب ٹھیک ہوا ہے۔"

"مطلب...."

"کچھ نہیں' آپ اندر آئیں۔" وہ سنبھلی۔

"نہیں' میں چلتا ہوں' غالباً" خالہ بھی گھر پر نہیں ہیں' اسے پے منٹ مت کیجیے گا' میں کردوں گا' اللہ حافظ۔"

وہ اک ٹرانس میں چلتی اندر آئی' پھر ڈرائنگ روم میں نظر گئی' پہلے تو پلمبر کو چلتا کیا' پھر کچن میں آئی۔

"تم کہاں رہ گئی تھیں؟"

"ریان کے پاس۔" وہ کھوئے کھوئے انداز میں کرسی پر بیٹھی۔

"چلو...."

"یا.... اس کی آواز...."

"ہیں...." نگی نے تابی کو دیکھا۔

"اس کا بات کرنے کا اسٹائل۔"

"اس کی آنکھیں۔"

"جی.... اس کی رنگت' اس کے دانت۔" تابی چڑ کر بولی۔

"ہائے تو نے دیکھا ہی نہیں ظالم۔"

"اس نے آج کچھ نرالا دیکھ لیا ہے۔"

"یار! وہ تو کسی بھی لڑکی کا آئیڈیل ہوسکتے ہیں۔"

"ایسا آئیڈیل.... اوہ مس ہوش میں تو ہو۔" نگی نے اس کا کندھا ہلایا۔

"ابھی تو ہوش میں آئی ہوں۔"

"اسے کہتے ہیں بن پیے بہکنا' محترمہ دروازے پر کون تھا؟"

"میرے خوابوں کا شہزادہ۔"

"مجھے نہیں پتا تھا' تم اتنے بھیانک خواب دیکھتی ہو۔" تابی نے جھرجھری لی۔

تم سے مل کے ایسا لگا تم سے مل کے
اراماں ہوئے پورے دل کے

"یہ پاگل ہوگئی ہے۔"

☼ ☼ ☼

اگلے کئی دن ملی کی حالت نازک رہی اور وہ تشویش کا شکار ہوتی رہیں۔ تین دن بعد وہ جو ملی پر افسوس کررہی تھیں' چوتھے دن خود پر کرنے بیٹھ گئیں۔ جب ریان مصطفیٰ کو بنفس نفیس دیکھا۔

"تو وہ کون تھا؟"

"پلمبر...." ملی نے دانت نکالے۔

☼ ☼ ☼

"ایک بات تو بتا ملی؟" تیسرے گھر کی دیوار پر وہ تین مرغے (جن میں سے ایک مرغی تھی۔) آج بھی موجود تھے' ان ہی کو تاکتے ہوئے تابی نے کہا۔ ملی جو شہتوتوں والے گھر کی دیوار پر کہنی ٹکائے آسمان پر پھیلتی سنہری شام کو دیکھتی گاہے بگاہے نگاہ صحن میں بھی ڈالتی (مگر مقصود نظر اب تک نظر نہ آیا تھا۔) اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر بولی۔

"پوچھو...."

"تم سچ مچ ریان میں انٹرسٹڈ ہو؟"

ملی نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر نگی کو' جو چارپائی پر بیٹھی اپنی قمیص کی ترپائی کررہی تھی' لیکن اب سوئی

روکے اس کے جواب کی منتظر تھی، پھر صاف مکر گئی۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"تو پھر بھاگ بھاگ کر بڑی تائی کے پاس کیوں جاتی ہو؟" نگی معنی خیز انداز میں ہنسی۔

"وہ گھر میں اکیلی ہوتی ہیں، کمپنی دینے کے خیال سے چلی جاتی ہوں، اور تم بھی تو بھاگ بھاگ کے پھوپھو کے کام کرتی ہو، کیا عذیر کے لیے ہیں؟"

"لاحول ولا، کس کا نام لے دیا، اس چنگیز خان کو پسند کرنے کے لیے لوہے کے دل گردے چاہئیں۔" نگی نے قمیص لپیٹ کر ایک طرف رکھی۔

"اچھا... پھر مجھے یوں ہی لگا ہو گا۔" تابی ہاتھ جھاڑتی ان کے قریب آ گئی۔ "ویسے یہ پھوپھو عذیر بھائی کی شادی کیوں نہیں کرتیں؟"

"جب عذیر بھائی کی پنڈی میں پوسٹنگ ہوئی تو انہیں وہاں اک لڑکی پسند آ گئی تھی، مگر پھوپھو نے صاف انکار کر دیا، ضد میں عذیر بھائی نے شادی نہ کرنے کا اعلان کر دیا، یہ نادیہ باجی آج کل اسی مہم پر آئی ہیں۔" نگی نے بتایا، نادیہ عذیر کی بہن تھیں اور سکھر میں بیاہی تھیں۔

"تب ہی تمہارا کل کا سارا دن پھوپھو کے کچن میں گزرا، ملی کا تائی کے ہاں اور میں اکیلی یہاں بور ہوتی رہی۔"

"اب کیا کرتی، پھوپھو کو انکار میری امی نہیں کر سکتیں، میں کیسے کروں، تم تو صاف بچ جاتی ہو کہ مجھے تو کچھ پکانا ہی نہیں آتا۔" نگی نے تابی کو گھورا تو وہ ہنس دی۔

"ہاں تو دو، دو بھابھیوں کی موجودگی میں مجھے پکانے کی ضرورت کیا ہے؟"

"سسرال بھی بھابھیاں ساتھ لے کر جاؤ گی۔" نگی نے لتاڑا۔

"وہاں نندیں جو ہوں گی۔"

"اگر تمہارے جیسی ہوئیں؟"

"تب سیکھ لوں گی۔"

"اچھا... وہ جو ایک رشتہ تمہارے لیے آیا تھا اس کا کیا بنا؟" نگی نے پوچھا۔

"ابھی تو کچھ نہیں، ابو معلومات کروا رہے ہیں، نگی! آج کچھ کھانے کو نہیں ہے، یار گلگلے ہی تل لاؤ۔" وہ اس کے قریب بیٹھ گئی اور قمیص کھول کر دیکھنے لگی، جس پر نگی نے خود کڑھائی کی تھی۔

"سوری... امی شام کو کچن میں تالا ڈال دیتی ہیں، اچھا... وہ امی کہہ رہی تھیں، تابی سے سن گن تو لینا۔ نادیہ باجی واپس جائیں گی تو چچی انہیں کتنے کا سوٹ دے رہی ہیں۔"

ان میں یہ ہی تو ایکا تھا کہ وہ کبھی ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں چھپاتی تھیں۔ خواہ ماؤں میں کتنی ہی ٹھنی ہو۔

"ہا... ہا... اماں نے بھی یہ ہی کہہ کر بھیجا ہے۔" دونوں ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسنے لگیں۔

"ہماری ماؤں کے خیالات کتنے ملتے ہیں۔"

"اور عادتیں بھی۔"

"مجھے لگتا ہے وہ ہمیں ملنے ہی اس لیے دیتی ہیں کہ ایک دوسرے کی خبریں پہنچتی رہیں۔" تابی۔

مگر ملی کی توجہ ان کی طرف کہاں تھی، وہاں واش بیسن کے آس پاس تھی، جہاں آفس سے آنے کے بعد ریان ہاتھ منہ دھو رہا تھا۔

✵ ✵ ✵

شام کی چائے کے ساتھ ملی نے ڈھیر سارے چپس بنا لیے، ابھی دودھ پتی کا مگ بنا ہی رہی تھی کہ گاؤں سے ابا کا فون آ گیا۔ وہ اسے لینے آ رہے تھے۔ چھوٹے بھائی کے ہاں تین بیٹیوں کے بعد بیٹا ہوا تھا۔

ایسے موقع پر جب پوری برادری جمع ہو رہی تھی، ملیحہ کی وہاں موجودگی بہت ضروری تھی، خوش تو ملیحہ بھی بہت تھی، سو "فوراً" جانے کو تیار ہو گئی۔ خوش خبری سن کر خالہ بھی پیچھے نہ رہیں، اسی وقت بازار سے جا کر شاپنگ کی، ملیحہ کے ابا کو منع کر دیا کہ وہ خود ملیحہ کو لے کر آ رہی ہیں۔

شام کو وہ لوگ گاؤں کے لیے روانہ ہوئے، رات وہاں رکیں، نگی بھی ساتھ تھی۔ ملیحہ نے بہت روکا کہ وہ بھی کچھ دن اس کے ساتھ رہیں، مگر ماں کی تنہائی کے خیال سے اس نے انکار کر دیا، اگلے دن وہ لوگ ملیحہ کو چھوڑ کر واپس آ گئیں۔

ملیحہ کا ارادہ "فوراً" واپسی کا تھا، مگر پہلے بھابھی کا چلّہ اس کے بعد کٹائی کا موسم، ماں نے خوب لتاڑا۔

"لوگ پہلے ہی باتیں کرتے ہیں کہ لڑکی کو شہر بھیج بھیج کر خراب کر دیا ہے، اب یہاں میں کیا کیا کروں، تیرے درجن بھر بہن، بھائیوں کو سنبھالوں یا آنے والی فصل کو۔"

سوائے رکنا پڑا، لیکن دن تھے کہ گزرنے میں ہی نہ آتے، چاندنی راتیں خوامخواہ بے چین کیے رکھتیں، اور وہ بے وقوفوں کی طرح اس بے چینی کا سبب ہی ڈھونڈتی رہ جاتی۔ حالانکہ سب تو سامنے تھا۔

وہ چھ فٹ کا بندہ، دل، ذہن، سوچیں، جذبے، کچھ بھی تو اپنا نہ رہا، وہاں تو صرف شک تھا، یہاں آ کر یقین میں بدل گیا، ایسی شدید واپسی کی خواہش، حسب معمول نکمین کی وجہ سے نہیں تھی۔

ساڈا کلیاں نئیں لگدا دل ماہی رے
راتاں آ گئیاں چاننیاں

وہ چاندنی راتوں میں خوامخواہ گنگنانے لگتی اور جس دن سال بھر کی گندم گھر آئی اور ابا نے چارپائی پر بیٹھ کر سب کو گرمیوں کے کپڑے بنوانے کے لیے پیسے بانٹنے شروع کیے تو اس نے چپکے سے تابی کی منگنی کا بہانہ کر کے تھوڑے پیسے اور اینٹھ لیے، یوں وہ ٹھیک دو ماہ کے بعد دوبارہ خالہ کے گھر موجود تھی۔

✵ ✵ ✵

"کتنے دن لگا کے آئی ہو، میں کتنا بور ہو رہی تھی۔"

گرمی اپنے عروج پر تھی، شام بھی خوش گوار نہ تھی، ہوا نہ جانے کس کونے کھدروں میں منہ چھپائے اونگھ رہی تھی، پھر بھی وہ دونوں چھت پر موجود تھیں۔

"اوپر سے تابی نے منگنی کے بعد سے شکل دکھانا بند کر دی ہے، لگتا ہے اس پر چچی کی باتوں کا اثر ہونے لگا ہے۔"

"کر لو میری برائیاں۔" وہ دیوار پھلانگ کر چلی آئی۔ "بد قسمتی سے شوق ہی شوق میں سلائی سیکھ لی تھی، گرمیوں کے سارے کپڑے خود سینے پڑ گئے، اپنے بھی اور بھابھیوں کے بھی۔"

"تم نے چھپ چھپا کر منگنی کروا لی۔" ملی نے کمر پر ہاتھ رکھ کر گھورا۔

"ہاں... امی نے کہا دھوم دھام سے کی تو تمہاری تائی کو بلانا پڑے گا۔" تابی، نگی کی طرف دیکھ کر ہنسی۔ "مٹھائی سب کے ہاں بھجوا دی تھی، نگی کے ہاں سے واپس آ گئی۔"

"ہاں... تم لوگوں نے ہوا نہیں لگنے دی۔ تو ہم تمہاری مٹھائی کیوں کھاتے۔" نگی نے چمک کر کہا۔

"بکواس بند کرو، اسی چھت پر بیٹھ کر گلاب جامن اور قلاقند کھائی تھی۔"

"وہ تو میری سہیلی لائی تھی۔" نگی نے آرام سے کہا۔

"اور پتا ہے ملی، ان کی واپس کی پلیٹ بھین گھر نہیں لے کر آیا۔"

"اچھا... تو۔"

"گلی میں کھڑے ہو کر ساری کھا گیا، گھر جا کر کہہ دیا تائی نے رکھ لی ہے، اور اس کے بعد ساری رات ٹوائلٹ کے چکر لگاتا رہا۔" دونوں ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنس دیں، پھر نگی نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

"دیکھنا جب میری منگنی ہو گی تو ہم بھی لفٹ نہیں کروائیں گے۔"

"یہ ممکن ہے؟" تابی نے اک دھموکا جڑا۔ "محترمہ! ہمارے بغیر تمہاری منگنی ہو ہی نہیں سکتی۔"

"نگی! تمہاری بھی منگنی ہو رہی ہے۔" دیوار کے اس پار جھانکتی ملی ان کی طرف متوجہ ہوئی۔

"ہو بھی سکتی ہے، بس تم دعا کرو۔" تابی نے نگی کو ٹہوکا دیا تو وہ منہ پھیر کر مسکرانے لگی۔

ملی کو لگا کوئی بات ہے جو اسے نہیں معلوم، اس سے قبل کہ وہ کوئی تفصیل پوچھتی، دوسری چھت پر کھڑے

ریان مصطفیٰ کو دیکھ کر گنگ سی رہ گئی۔

"میں جانتا تھا تم لوگ یہیں ملو گی' کیسی ہو ملیحہ؟"

"ٹھیک ہوں۔" وہ اس کی طرف متوجہ تھا' ملی بمشکل بول سکی۔

"نگی! فارغ ہو تو میری شرٹ کا بٹن ہی لگا دو۔" اس نے کریم کلر کی شرٹ اور سوئی دھاگے والا ڈبہ نگی کو تھمایا۔ نگی فوراً" ہی بٹن ٹانکنے بیٹھ گئی۔

تائی کو بھابھی کی قیمص پوری کرنا تھی' سو وہ جلد ہی چلی گئی' ریان واپس نہیں گیا تھا' وہ اپنی چھت پر موجود کاٹھ کباڑ کا جائزہ لے رہا تھا اور ملی اس کا سفید کاٹن کے شلوار قمیص میں وہ کتنا اپنا سا لگ رہا تھا' حبس زدہ شام ایک دم خوب صورت ہو گئی۔

تب ہی ریان پلٹا اور اس کی نگاہ ملی پر پڑی' اسے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر ہلکے سے مسکرایا۔

ہائے کیا جان لیوا مسکراہٹ تھی' ملی کا دل پھڑک کر ریان کے قدموں میں لوٹنے لگا۔

(ملی تو پاگل ہو رہی ہے۔) وہ سٹپٹا کر نگین کو ڈانٹنے لگی۔

"اتنی دیر لگتی ہے بٹن لگانے میں۔"

"بس لگ گیا۔" نگی نے جلدی جلدی آخری ٹانکا لگایا۔

"بھئی نگین کو کچھ مت کہو' یہ تو بہت کام کی لڑکی ہے۔" ریان نے ہاتھ بڑھا کر شرٹ لے لی اور چلا گیا۔

(کاش! میں تیری شرٹ کا بٹن ہوتی۔)

ملی کو لگا وہ بھی اس کے ساتھ ہی چلی گئی ہے' نگین نہ جانے کون کون سے افسانے سنا رہی تھی' وہ غائب دماغی سے ہوں ہاں کرتی رہی' ملیحہ کو شدت سے احساس ہوا' وہ اس بار صرف نگین کے لیے یہاں نہیں آئی۔

اس رات اس کے خوابوں میں صرف ایک ہی جملے کی بازگشت ہوتی رہی۔

"کیسی ہو ملیحہ؟" اپنا نام اس سے قبل اسے اتنا خوب صورت نہ لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ملی! میرا گلا کاٹ دو۔" ریموٹ ہاتھ میں لیے وہ نہ جانے کن سوچوں میں تھی کہ بری طرح چونکی۔

"ہائے نہیں' کیا خالہ سے لڑائی ہو گئی' یا زندگی سے بے زاری' اور مجھے کیا پڑی ہے تمہارا گلا کاٹ کر جیل جاؤں۔"

"میرا نہیں قمیص کا۔" نگی نے قینچی اور کپڑا اس کے قریب رکھا۔ "میں جام شیریں بنا کر لاتی ہوں۔"

"اچھا۔" وہ قینچی اٹھا کر ٹی۔وی کی طرف متوجہ ہوئی' جہاں ہیرو' ہیروئن ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ اور آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے تھے۔

دریچے سے جھانکتی بارش' ہوا سے اڑتے بال اور بیک گراؤنڈ میوزک۔

چاہتوں کا مزا فاصلوں میں نہیں
آ چھپا لوں تجھے۔

اللہ جانے ان ایسے موقعوں پر بائی گھر والے کہاں اور کیوں غائب ہو جاتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہیرو ہیروئن کی شکلیں بدل گئیں۔ اب وہ خود بارش کی کن من میں بھیگ رہی تھی۔

ریان نے دھیرے سے اس کے بال سنوارے' مگر ٹی وی ڈرامہ تو نہ تھا کہ اگلے بیس منٹ تک خواب کا تسلسل ہی نہ ٹوٹتا' تب ہی نگین کی ہولناک چیخ نے ڈرامے سے نکال کر صوفے پر پٹخا' اس نے پہلے ٹی وی' پھر ہاتھ میں پکڑی قینچی اور کپڑے کو دیکھا' وہاں ایک نہیں کئی گلے کٹ چکے تھے اور نگین اپنے پسندیدہ سوٹ کا یہ حشر دیکھ کر بھاں بھاں رو رہی تھی۔

"آئی ایم سوری نگی! وہ میں پتا نہیں۔"

"دفع ہو جاؤ' آں۔۔۔ ہاں۔۔۔ میرا پندرہ سو کا سوٹ۔"

"نگی۔۔۔ دیکھ میں ہاتھ جوڑ رہی ہوں' خالہ کو نہ بتانا' میں تمہیں ایسا نیا سوٹ لے دوں گی' میرے پاس پیسے ہیں' ہم کل ہی بازار۔۔۔"

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" ریان نے بے حد حیرت سے یہ منظر دیکھا۔

نگی صوفے پر بھاں بھاں کر رہی تھی' ملیحہ قالین پر

بیٹھی منت سماجت کر رہی تھی' دونوں کے درمیان خوب صورت پرنٹ کا ایسا کپڑا پھیلا تھا' جس میں کئی سوراخ تھے۔ ملیحہ نے تیزی سے کپڑا سمیٹنا چاہا' مگر اس سے قبل ہی نگی نے کپڑا اٹھا کر مزید پھیلایا۔

"اس نے میرے سوٹ کا کیا حشر کیا ہے۔"

ملیحہ کا دل چاہا کھینچ کر ایک جھانپڑ نگین کے رسید کرے' دانت پیس کر بولی۔

"میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا نگی؟"

"بس اتنی سی بات پر اتنا رونا دھونا' نگی۔" ریان پاس آیا۔

سائیڈ ٹیبل پر پڑے ڈبے سے ایک ٹشو کھینچ کر اس کی سمت بڑھایا' پھر دھونس بھری نرمی سے بولا۔

"خبردار۔۔۔ اب ایک آنسو نہیں' اس جیسے ایک نہیں دو' سوٹ لے دوں گا' اب اٹھو' مجھے کھانا نکال دو۔"

دونوں اٹھ کر کچن میں آ چکے تھے۔ قالین پر بیٹھی ملی دم بخود تھی' جب وہ یہاں سے گئی تھی تو ریان بس ایک آدھ بار وہ بھی ذرا سے وقت کے لیے گھر آیا تھا اور دو ماہ کے بعد یوں محسوس ہوتا تھا گویا وہ اس گھر کا فرد ہو اور نگین کے ساتھ اس کا رویہ کس قدر اپنائیت بھرا تھا۔

ملیحہ سے رہا نہ گیا تو لاؤنج سے باہر آ گئی' سامنے کچن کا منظر واضح تھا' نگی روٹیاں بنا رہی تھی' ریان ڈائننگ ٹیبل کے پاس پانی کا گلاس ہاتھ میں لیے کچھ کہہ رہا تھا اور نگی۔۔۔ نگی ہنس رہی تھی۔

شام کو ملی نے بے حد سرسری انداز میں پوچھا۔

"ریان! روز کھانا یہیں کھاتا ہے؟"

"ہوں۔ تائی جو علیان بھائی کے پاس گئی ہیں' ایک ہفتہ رہیں گے۔" نگی نے لاپروائی سے بتایا۔ "اچھا۔۔۔ میں نے تائی کو دکھایا تھا' وہ کہہ رہی تھی' شلوار دوپٹہ یہ ہی رہنے دو' سادہ قمیص کا کپڑا لے آنا' میں اسی سے خوب صورت سا ڈیزائن بنا دوں گی۔"

"میں نے کہا تو تھا تمہیں نیا سوٹ لے دوں گی۔"

"پاگل! اب میں تم سے سوٹ لوں گی' غلطی تو کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔۔۔ ویسے تمہارا دھیان کہاں تھا۔" وہ پہلے محبت' پھر شرارت سے بولی۔

"کہیں نہیں۔" ملی وہاں سے اٹھ گئی۔

☼ ☼ ☼

"ہائے۔۔۔ اوئی۔۔۔ سی۔۔۔ مر گئی۔" پارلر میں جہاں دوسروں کے لبوں پر مسکراہٹ تھی وہیں ملیحہ کا خجالت سے برا حال۔

"تمہیں بلیچنگ کا مشورہ کس نے دیا تھا۔" نگین نے بدقت آنسوؤں بھری ایک آنکھ کھولی۔

"تائی نے۔۔۔ کہنے لگی' اپنا خیال رکھا کرو' یہ ملی کون سا خوب صورت ہے' بس مانجھ مانجھ کر چہرہ لشکار رکھا ہے۔"

"اس نے ایسا کہا؟"

"نہیں۔۔۔ آ۔۔۔ آہستہ کرو۔۔۔ تم کیا بکرا ذبح کر رہی ہو۔"

"باجی! میرا ہاتھ تو بہت نرم ہے۔" لڑکی نے ہنستے ہوئے بتایا۔

"ہاتھ ہو گا نرم' دھاگہ نہیں ہے' اس سے تو با آسانی گلا کٹ سکتا ہے۔"

"آپ نے بھی تو اتنا جنگل اگا رکھا ہے۔" وہ چمک کر بولی تو نگی منہ بنا کر بیٹھ گئی۔ بمشکل یہ مرحلہ تمام ہوا۔

"مونچھیں بھی بنوا۔۔۔ م۔۔۔ میرا مطلب ہے اپر لپس۔"

"بس۔۔۔ اتنا ہی کافی ہے' مجھے کون سا ماڈلنگ کرنا ہے' میری توبہ' یہ خوب صورت لگنا اتنا مشکل ہے۔" اس نے اٹھتے ہوئے ٹشو پیپر سے آنکھیں صاف کیں' پھر پرس سے فیشل اور بلیچنگ کے پیسے نکال کر دینے لگی۔

"ویسے تم کس کو خوب صورت لگنا چاہتی ہو؟" ملی نے بغور اس کا جائزہ لیا' نگی کے لبوں پر ایک پل کے لیے مسکراہٹ چمکی' دوسرے پل انجان بنتے ہوئے بولی۔

"خود کو۔" تب ہی گھر سے کال آنے لگی' خالہ



اتنی دیر ہو جانے پر پریشان ہو رہی تھیں، پھر انہوں نے کہا، وہ ریان کو بھیج رہی ہیں۔

"ریان کو بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔" نگی نے پلٹ کر اپنا جائزہ لیا، بھنوؤں کے اردگرد سرخ سوجی ہوئی جگہ، مساج کی بدولت دوران خون تیز ہونے سے چہرے کا رنگ سانولا... وہ تو لڑکی پر چڑھ دوڑی۔

"فیشل کا رزلٹ بارہ گھنٹے کے بعد سامنے آتا ہے۔" وہ چڑ گئی، پھر بڑبڑاتے ہوئے دوسرے کسٹمر کی طرف متوجہ ہوئی۔ "نہ جانے کہاں سے پینڈو اٹھ کے آجاتے ہیں۔"

"اب اس طرح ریان بھائی کے سامنے جاؤں گی۔" اس نے دوپٹہ آنکھوں تک کھینچا۔

اس کی جھنجلاہٹ کو ملیحہ کا ذہن کچھ اور معنی پہنا رہا تھا۔ اول جلول حلیے میں گھومنے والی نگین کو ایک دم اپنا خیال رکھنے کا شوق ہو رہا تھا... کبھی بیسن لگتا، تو کبھی دہی اور اب بیٹھے بیٹھے فیشل کا شوق، پانچ منٹ کے بعد ہی ریان آگیا۔

"جلدی چلو، مجھے دیر ہو رہی ہے۔" مخصوص مردوں والی عجلت، لیکن اس عجلت کے باوجود وہ انہیں کپڑوں کی دکان پر لے آیا۔ نگی منع ہی کرتی رہی۔ مگر وہ اطمینان سے بولا۔

"اس دن تم سے وعدہ کیا تھا، اب سوٹ پسند کرو۔"

اب نگی دکان پر کیا بحث کرتی، فوراً" پسند کر لیا، تب ہی ریان، نگی کے کان کے قریب جھکا۔

"ہاں... ہاں... کوئی بات نہیں۔" پھر ملیحہ کی طرف مڑی۔ "ملی! تم بھی پسند کر لو، ریان بھائی کہہ رہے ہیں۔"

"مجھے نہیں لینا۔" وہ جو بے زاری سے ساری کارروائی دیکھ رہی تھی، کھڑی ہو گئی۔ "جلدی چلو، خالہ انتظار کر رہی ہوں گی۔"

راستے میں نگی نے آئس کریم کی فرمائش کر دی، ملی کو اس بات کی حیرت تھی کہ ہمیشہ لیے دیے رہنے والی نگی، ریان سے کب اور کیسے اتنی بے تکلف ہو گئی۔

"کیا بات ہے ملیحہ! تم بہت چپ چپ ہو۔" ریان نے اپنائیت سے پوچھا۔ وہ کب سے اس کی بے زاری نوٹ کر رہا تھا۔

"کچھ نہیں، سر میں درد ہے۔" اس نے آہستگی سے ٹالا، اس رات وہ سو بھی جلدی گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

مبین کو جاب ملی تھی، اس خوشی میں اس نے ایک ٹانگ پر بھنگڑا ڈالا تھا۔ ماں سے کہنے لگا "اب اپنے شوہر کو سمجھا دیجیے گا، اب مجھے ان کے بیس پچاس کی ضرورت نہیں رہی۔ جواباً" ماں سے جوتی کھا کے چھوٹی تائی یعنی نگین کے گھر آیا، زبردستی گلے لگ کر خوب مبارک باد دی۔ مجبوراً" انہیں بھی دینا پڑی، شام کو مٹھائی چھت پر لے آیا۔

"باقی گھروں میں دے آیا ہوں، اور تم لوگوں کا حصہ یہاں لے آیا ہوں۔" وہ نگین سے مخاطب تھا۔

"دوبارہ نگی مما بیٹھ کر پوری پلیٹ کھانے کی ہمت نہ تھی۔"

"ہمیں صرف مٹھائی نہیں پوری ٹریٹ چاہیے۔" ملی پھیلی۔

"دن، اپنی پہلی پے پر، اور نگی کے لیے اک زبردست سا گفٹ۔"

"صرف نگی کے لیے کیوں؟" دونوں چلائیں۔

"ہر برے وقت میں اس نے ساتھ نبھایا ہے۔ اپنا جیب خرچ مجھ پر قربان کیا، اب صلہ دینے کا وقت آگیا ہے۔" وہ سینہ ٹھونک کر بولا۔

"تمہاری جاب کی سب سے زیادہ خوشی بھی اسی کو ہے۔ اب ادھار تو نہ مانگو گے۔" تائی نے منہ بنایا۔

"جانے دو تائی! سو دو سو روپے سے کیا ہوتا ہے وہ تو..." نگی نے کہنا چاہا، تائی نے بات قطع کر دی۔

"بس اسی طرح میرے بھائی کو قابو میں کیا ہے۔"

"فضول مت بولو۔" مبین نے جھڑکا۔ "اور چل کے میرے کپڑے استری کرو۔"

"صبح آفس جانا ہے۔"

"جو کہا ہے وہ کرو۔" مبین نے بھائیوں والا رعب

دکھایا۔ ان کے جانے کے بعد نگی نے مڑ کر دیکھا۔ نہ جانے کب وہ اس دیوار کے پاس جا کر کھڑی ہوئی تھی۔

"تمہارا سورج ادھر سے طلوع ہوتا ہے۔" نگی کا لہجہ معنی خیز تھا۔

"درخت کتنے مرجھائے مرجھائے سے لگ رہے کیاریاں بھی اجڑ گئیں۔"

"ریان سارا دن آفس میں اور تائی کا تمہیں پتا ہی ہے۔"

"یہ گھر سب گھروں سے زیادہ خوب صورت اور بڑا ہے، بہت خوش نصیب ہوگی جو اس گھر کو سنبھالے گی۔" بظاہر ملی کا لہجہ سرسری تھا، مگر نگی نے چونک کر اسے دیکھا، پھر مسکرائی۔

"وہ تم بھی ہو سکتی ہو۔" ملی لگا وہ اسے کریدنا چاہتی ہے، تب ہی دونوں ہاتھ جھاڑ کر بولی۔

"مجھے ایسی کوئی حسرت نہیں۔"

"کیوں، تمہیں ریان اچھا نہیں لگتا؟"

"تمہیں لگتا ہے؟" ملی الٹا اسی سے پوچھنے لگی۔

"وہ کسی بھی لڑکی کا آئیڈیل ہو سکتا ہے اور مجھے تو۔۔۔" عین وقت پر خالہ نے آوازیں دینا شروع کر دیں، نگی کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر صحن میں جھانکا۔

"نیچے آجاؤ، پھوپھو آئی ہیں۔" وہ خود بھی تیزی سے سیڑھیاں اتر گئی۔ جبکہ ملی کا ذہن اٹک سا گیا۔ وہ وہیں بیٹھی کچھ سوچتی رہی۔

"نہیں نگی، ریان سے دستبرداری آسان نہیں اور میں جانتی ہوں مجھے کیا کرنا ہے۔" اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ اتوار کا دن تھا۔ نگی کو حسب معمول پھوپھو نے بلوا رکھا تھا۔ خالہ بڑی دیر تک بڑبڑاتی رہیں۔

"میری بیٹی کو نوکر سمجھا ہے، بیٹا گھر آتا ہے یا وزیراعظم۔"

ملی نے جی بھر کے تربوز کھائے، خالہ کی تقریر سنی، پھر ریان کے گھر آگئی، تائی سر پر پٹی باندھے لیٹی تھیں، ریان ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ گھریلو لباس میں صوفے پر نیم دراز، سر کے نیچے کشن رکھے، اسے دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔

"آج تو بڑے بڑے لوگ آئے ہیں۔"

ابھی وہ پوری طرح مسکرائی بھی نہ تھی کہ نگی کا پوچھ لیا۔ جسے سنی ان سنی کرتی وہ تائی کے پاس آگئی، وہ سر کے درد سے بے حال تھیں۔ ملی کی دلی مراد بر آئی تھی گویا گھر سے ان کی بیماری کی دعائیں کرتی آرہی تھی۔ (ملی کر کس لے۔)

"ملیحہ! چائے لیں گی یا کولڈ ڈرنک۔" ریان کو مہمان نوازی یاد آئی۔

"میں تائی کے لیے دلیہ بنانے جا رہی ہوں، ہاں اگر آپ نے چائے پینا ہو تو۔" وہ دلکش انداز میں مسکرائی، سکھیاں کہتی تھیں اس کی مسکراہٹ خوب صورت ہے۔

"نہیں، میں اس وقت چائے نہیں پیتا۔"

"تو پھر کس وقت پیتے ہیں۔" ملی نے بے ساختہ پوچھا تو وہ برجستہ بولا۔

"جب کوئی ساتھ دینے والا ہو۔" اس نے بغور سامنے کھڑی لڑکی کو دیکھا۔ جو پنک لان کے لباس میں بڑی نکھری نکھری سی لگ رہی تھی۔

"اچھا ابھی! میں ذرا نہالوں۔" وہ کہہ کر پلٹ گیا۔ پھر تائی کے لاکھ کہنے کے باوجود کہ وہ اتنی بیمار نہیں ہیں کہ دلیہ کھائیں، اس نے دلیہ بنایا بھی اور کھلایا بھی۔

"آنٹی۔ گھر کتنا گندہ ہو رہا ہے، اور یہ پودے۔۔۔ انہیں کبھی پانی نہیں دیا۔"

تائی بے چاری دلیہ ہضم کرنے کی کوشش میں مصروف تھیں۔ کچھ نہ کہہ سکیں اور وہ جھاڑو اٹھا صحن میں۔۔۔ پھرتی سے جھاڑو لگا کر پتے اکٹھے کیے، کیاریوں سے موٹا موٹا کوڑا اٹھایا۔ اس کے بعد پائپ لگا کر صحن دھویا، کیاریوں کو لبالب بھرا، درختوں کے پتوں پر چھڑکاؤ کیا۔ اب پتا نہیں ریان مصطفیٰ نے نہانے میں گھنٹہ لگایا، یا ملی میں کوئی سگھڑ جن گھس گیا تھا۔ بہر حال جب وہ کیمل کلر کے کاٹن کے شلوار قمیص میں گیلے بالوں کو رگڑتا باہر آیا تو منظر بدل چکا تھا۔

صحن دھلا دھلایا، کیاریوں سے پھوٹتی مٹی کی خوشبو، نکھرے تازگی لیے سبز پتے، جن سے قطرہ قطرہ ٹپکتا پانی وہ اپنی ہتھیلی میں سمیٹ رہی تھی۔ انجان، بے خبر (حالانکہ ساری حسیات وہیں متوجہ تھیں، جہاں برآمدے کی آخری سیڑھی پر ریان ہاتھ تولیے پر رکھے متحیر سا کھڑا تھا۔)

"یہ سب آپ نے کیا ہے؟"

وہ آہستگی سے پلٹی، مسکرائی اور معصومیت سے پوچھنے لگی۔

"آپ کو اچھا نہیں لگا۔"

"اچھا۔ میں تو عالم حیرت میں ہوں، آپ کے پاس کیا جادو کی چھڑی ہے؟"

"جناب! میں خود جادو کی چھڑی ہوں۔" وہ کمر سے اڑسی قمیص کو دامن کو چھوڑتے ہوئے ہنسی اور اس کے ہاتھ سے تولیہ لے کر تار پر پھیلا دیا۔

"پھر بھی مجھے اچھا نہیں لگ رہا، نگی کو ساتھ۔۔۔"

"ریان بھائی! آج کے دن نگی نہیں ملے گی۔"

"کیوں؟" وہ ماتھے پر بکھرے بال دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے سنوار رہا تھا۔

"آج سنڈے ہے، عذیر بھائی آئے ہیں اور انہیں صرف نگی کے ہاتھ کا کھانا پسند آتا ہے۔"

"واقعی۔۔۔"

"کپڑے تک اسی سے پریس کرواتے ہیں، خود نگی بھی، اچھا چھوڑیں میں اب چلتی ہوں۔"

"ملیحہ۔۔۔" وہ ریان کے پکارنے پر رکی اور پلٹی۔

"تھینکس۔۔۔" تر و تازہ فریش چہرہ، بکھرے گیلے بال، دلکش آنکھیں، اس پر مخاطب کرنے کا خوب صورت و قاتل انداز، ملی کا دل پسلیاں توڑ کر باہر آنے لگا۔ تو وہ ذرا سا سر ہلا کر تیزی سے پلٹ آئی۔

پھر یہ پہلی بار نہ تھا، وہ اکثر ریان کے سامنے پھوپھو کی نگی کے لیے محبت اور عذیر کا ذکر بظاہر سرسری مگر معنی خیز انداز میں کر جاتی۔ مگر لگتا تھا ریان ڈیشنگ ہونے کے ساتھ ساتھ کوڑھ مغز بھی تھا۔ مجال ہے جو دونوں کی (نگی اور ریان) انڈر اسٹینڈنگ میں کچھ فرق آیا ہو، وہی انداز و اطوار، وہی ایک دوسرے سے تعاون۔۔۔ اور وہی نان اسٹاپ باتیں۔

اوپر سے نگی کو نہ جانے کیا ہوا تھا کہ دن بہ دن نکھرتی جا رہی تھی، ملی کو لگتا تائی کو بھی پتا ہے، بس اسی سے کچھ چھپایا جا رہا تھا اور جو چھپایا جا رہا تھا وہ اس کے سامنے بالکل عیاں تھا۔

اس دن بھی ملی نے نگی اور ریان کو ایک ساتھ دیکھا۔ وہ دونوں پاس پاس کھڑے نہ جانے کس بات پر بحث کر رہے تھے۔ ریان کے ہاتھ میں موبائل اور گاڑی کی چابی تھی۔ سیاہ جینز پر سفید ٹی شرٹ پہنے وہ کہیں جانے کو تیار تھا۔ کچھ کہہ کر وہ جانے لگا تو نگی نے اسے بازو سے پکڑ کر روکا، اور نہ جانے کیا کہا، جواب میں ریان نے ہنستے ہوئے اس کے سر پر چپت لگائی اور چلا گیا۔

نہ جانے کیوں ملی کی آنکھوں میں پانی سا بھر آیا، جسے دیوار سے ہٹتے ہوئے بے دردی سے صاف کیا، اور سوچا۔

"کچھ اور کرنا پڑے گا، لیکن کیا؟"

☼ ☼ ☼

"پھوپھو!" تھیں تو وہ نگی کی پھوپھو، لیکن ملیحہ بھی ہمیشہ انہیں پھوپھو ہی کہتی تھی۔ آج تو پھوپھو پر جی جان سے پیار آرہا تھا۔ تب ہی تو تیل کی مالش ہو رہی تھی۔ نیند کے جھونکوں سے ادھر ادھر ڈولتی پھوپھو چونکیں۔

"آپ سارا دن اکیلے بور نہیں ہوتیں۔"

"لو۔۔۔ یہ شیطان کا ڈبا بور ہونے دیتا ہے۔" انہوں نے ٹی وی کی طرف اشارہ کیا۔ "دوپہر کو لمبی تان کر سو جاتی ہوں، شام کو کسی نہ کسی کے گھر چلی گئی۔"

انہوں نے بڑے آرام سے ملیحہ کا یہ وار ضائع کیا تو اس نے دوسری چال چلی۔

"پھر بھی۔۔۔ صبوحی تو چھوٹی ہے اور اسکول چلی جاتی ہے، اس عمر میں سارے گھر کا کام اکیلے کرنا پڑتا ہے۔"

"اس عمر میں کیا مطلب۔" انہوں نے جھٹکے سے اپنا سر چھڑایا۔ "چھوٹی عمر میں شادی کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں بوڑھی ہو گئی ہوں' عمر میں تینوں بھابھیوں سے چھوٹی ہوں۔"

"اور کام؟" عقب میں بیٹھی ملی نے دانت پیسے۔

"نوکرانی صفائی کرکے کپڑے دھو جاتی ہے۔ تھوڑے پیسے زیادہ دے کر استری بھی کروالیتی ہوں۔ نگی آئے تو تین' چار سالن بنوا کر فریز کروالیتی ہوں' آس پڑوس سے بھی کچھ نہ کچھ آتا رہتا ہے۔"

آس پڑوس سے مراد بھائیوں کے گھر تھے کہ بھابھیوں کی اتنی مجال کہاں کہ کچھ اچھا بنائیں اور ان کو چکھائے بنا خود کھالیں۔

"چلو۔ چھٹی ہوئی' یہاں تو راوی چین ہی چین لکھ رہا ہے۔" ملیحہ سر پر ہاتھ مار کر رہ گئی۔

"اچھا بس کرو مجھے بڑی سخت نیند آرہی ہے' بال سمیٹ کر چوٹی بنادو۔" ملیحہ بدمزاسی ہو کر چوٹی بنانے لگی' گھر میں چھایا سناٹا ہر آواز پر حاوی ہو تا گیا تو وہ اکتا کر بولی۔

"آپ کے گھر میں کتنا سناٹا ہے۔" پھوپھو نے ذرا رک کر اس خاموشی کو محسوس کیا' پھر آہ بھر کے بولیں۔

"ہاں۔۔۔ سناٹا تو ہے۔"

(شکر' کہیں تو اونٹ پہاڑ تلے آیا۔)

"تو توڑ دیں یہ سناٹا' عذیر بھائی کی شادی کردیں۔"

"میں تو کب کی کردیتی' پر اس پر تو۔۔۔" وہ کہتے کہتے بات بدل گئیں۔

"آپ ماں ہیں' جذباتی طور پر بلیک میل کریں اور شادی کردیں۔" ملیحہ نے مفت مشورہ دیا۔ وہ نہ جانے کس سوچ میں ڈوب گئیں۔

"نگی بھی بہت فکر کرتی ہے' کہنے لگی میرے جانے کے بعد پھوپھو کا کیا ہو گا۔"

"وہ کہیں جارہی ہے؟" انہوں نے چونک کر پوچھا۔

"کبھی نہ کبھی تو اس کی شادی ہونا ہی ہے' پھر کون آپ کو کھانے بنا کر فریز کروائے گا۔ پھر تھوڑا وہ آپ کی ایک آواز پر بھاگی بھاگی آئے گی' اسی لیے کہہ رہی ہوں بہو گھر لے آئیں' جو تازہ تازہ کھانے پکائے' کپڑے استری کرے' اور آپ کی خدمت کرے' بالکل نگی کی طرح۔" آخری جملہ بے حد آہستگی سے اور سنبھل کر کہا گیا۔

"نگی کی طرح۔" وہ زیر لب بڑبڑائیں۔ (لگتا ہے تیر نشانے پر لگا ہے۔)

اس نے تیل کی بوتل بند کی اور چپکے سے ہاتھ دھونے اٹھ گئی۔ اگلے ایک دو دن میں اس نے تھوڑی برین واشنگ اور کردی۔ جس میں نگین کے سگھڑاپے کے ساتھ یہ بھی تھا کہ وہ خالو کی اکلوتی اولاد ہے۔ خالو کے پاس جو کچھ ہے' نگین ہی کا ہے۔

پھوپھو کا رسپانس دیکھ کر ملیحہ کو لگتا تھا کہ کامیابی زیادہ دور نہیں۔

☼ ☼ ☼

تابی پہلے سے چھت پر ٹہل رہی تھی' ملی کو خالی ہاتھ آتے دیکھ کر بولی۔

"ایں۔۔۔ تمہارے گھر سے تو بریانی کی خوشبو آرہی تھی۔"

"بریانی کو خالہ کی ڈانٹ کا تڑکا لگ گیا۔" ملی ہنسی۔ "نگی اسی تاک میں رکی ہے کہ کسی طرح بریانی کی ایک پلیٹ تمہارے لیے اڑا سکے۔"

"ارے جانے دو' آج میری طرف سے پزا اور کولڈ ڈرنک اڑاؤ۔" مبین نے فل سائز پزا کے ساتھ انٹری دی۔

"واؤ۔۔۔" ملی نے ڈبا کھولنا چاہا تو مبین نے اوپر اپنا ہاتھ رکھ لیا۔

"پہلے نگین کو بلاؤ۔"

"توبہ ہے۔" ملی نے گھورا' پھر اوپر سے نگی کو آوازیں دینے لگی۔ اشارے سے یہ بھی بتادیا کہ بریانی کی ضرورت نہیں' وہ فوراً ہی اوپر آگئی۔

"تمہیں کیا ایڈوانس پے ملی ہے۔" لوازمات دیکھ کر نگی نے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ میری تنخواہ کے لالچ میں ابا نے جیب خرچ دینا شروع کردیا ہے۔" وہ ہنسا۔

"شرم کرو۔۔۔ کوئی والدین کو بھی لالچی کہتا ہے۔" نگی نے ڈانٹا۔ "اور میر اگفٹ۔"

"وہ خالص اپنی تنخواہ میں سے۔"

چاروں نے خوب ہلا گلا کرتے ہوئے پزا اڑایا۔

"ویسے آج بہت عجیب دن ہے۔" تابی نے کولڈ ڈرنک سے دوسرا گلاس بھرا تو باقی کی ملی نے اپنے قبضے میں کرلی۔

"اس گرمی اور حبس زدہ دن میں تمہیں نئی بات کیا نظر آئی۔"

"آج سنڈے ہے۔ اس کے باوجود پھوپھو کی طرف نگین کا بلاوا نہیں آیا۔"

"میں خود حیران ہوں' حالانکہ آج نادیہ باجی بھی آئی ہیں' اور عذیر بھائی بھی۔ کچھ پر اسرار سرگرمیاں چل رہی ہیں۔"

"یا۔۔۔ ہو گا وہی عذیر بھائی کی شادی کا معاملہ۔" ملی نے سرسری انداز میں کہا۔

"اچھا بچو! تم لوگ کرو اپنی قیاس آرائیاں' ہم چلتے ہیں۔"

"ویسے عذیر بھائی اتنے برے بھی نہیں۔ بس غصے کے تھوڑا تیز ہیں۔ پرسنالٹی اور جاب تو بہت اچھی ہے۔" مبین کے جانے کے بعد ملی نے یوں ہی برسبیل تذکرہ تبصرہ کیا۔ تو دونوں کے منہ سے ایک ساتھ اوہ نکلا۔

"خیر ہے آج کل پھوپھو کی طرف چکر بھی بہت لگ رہے ہیں؟" تابی نے شرارت سے پوچھا۔

"یوں ہی ایک بات کر رہی ہوں۔" وہ اٹھ کر مخصوص دیوار کی طرف چل دی۔

نگین اور تابندہ نے مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کو کہنیاں ماریں' جبکہ ملی سوچ رہی تھی' کیا ہی اچھا ہو اگر پھوپھو آج عذیر بھائی کو گھیر ہی لیں۔

رات کو کھانے کے بعد پھوپھو نے بھائی کو اپنے گھر بلا لیا' دونوں بہن' بھائی گیارہ بجے تک کیا بات چیت ہوئی' اس کی خبر خالہ کو بھی نہ تھی۔ لیکن کھدبد انہیں بھی لگی تھی کہ' آخر یہ کھچڑی پک کیا رہی ہے' کیونکہ سنا تھا اس میٹنگ میں بڑے ابا بھی شریک تھے۔

☼ ☼ ☼

پھر وہ دھماکہ ہو گیا' جس کے بعد ملی کا دل چاہا وہ لڈیاں ڈالے۔ مگر سب کا ردعمل دیکھ کر چپ ہونا پڑا۔ پھوپھو نے باقاعدہ نگی کے لیے عذیر کا رشتہ ڈالا تھا۔ دونوں بہن' بھائی میں بات بالواسطہ طے ہو چکی تھی۔ یہ کارروائی غالباً" خالہ کے لیے تھی' جو ششدر سی سب کا منہ دیکھ رہی تھیں۔

پھوپھو نے چالاکی یہ کی کہ بڑے اور چھوٹے بھائی کو بھی ساتھ لے آئیں۔ تاکہ اگر بھابھی کو اعتراض ہو تو بھی ان کی موجودگی میں کچھ بول نہ سکیں۔ اور وہی ہوا' نگی کے ابا نے جھٹ پٹ ہاں کی اور پھوپھو نے آگے بڑھ کر بھابھی کے کھلے منہ میں رس گلا ٹھونس کر گلے لگالیا اور اصل دھماکہ (ملی کے لیے بھی) اس وقت ہوا جب پھوپھو نے کہا کہ انہیں منگنی وگنی نہیں کرنا۔ بس اگلے مہینے شادی کی کوئی بھی تاریخ دے دیں۔

اب پھوپھو کو عذیر کی طرف سے خدشہ تھا تو خالو کو خالہ کی طرف سے' تب ہی جھٹ سے اگلے مہینے کی پندرہ تاریخ دے دی۔

"نگی کو بلاؤ' میں اپنی بیٹی کو پیار تو کرلوں۔"

پھوپھو کے کہنے پر ملیحہ نے پردہ چھوڑ کر نگی کو دیکھا۔ اس کا چہرہ دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سپید تھا اور جسم ہولے ہولے کانپتا ہوا۔ ایک لمحے کو ملیحہ کا اپنا دل بھی ڈوب سا گیا۔

"نگی!" ملیحہ نے اس کا ہاتھ تھامنا چاہا تو وہ جہاں کھڑی تھی وہیں بیٹھ گئی۔

اس کے لرزتے ہونٹ کچھ کہنے کی کوشش میں چپ سادھ گئے۔ لشتم پشتم پھوپھو اندر آئیں' چٹ چٹ نگی کی بلائیں لیں۔ پانچ ہزار کا کڑکڑاتا نوٹ اس کے ہاتھ میں تھمایا۔۔۔ اور چلی گئیں۔۔۔ نوٹ کچھ لمحے

ہولے ہولے اس کی انگلیوں میں کانپتا رہا، پھر نیچے گر گیا۔

"نگی! امانا... یہ سب کچھ بہت اچانک ہے۔ مگر..."

"ملی! مجھے اکیلا چھوڑ دو۔"

ملیحہ کچھ لمحے ہونٹ کاٹتے ہوئے اسے دیکھتی رہی، پھر تیزی سے باہر نکل گئی۔ جہاں مہمانوں کے جانے کے بعد خالہ، خالو سے الجھ رہی تھیں۔

"میری بیٹی ہے، اور مجھ سے پوچھنا بھی گوارہ نہیں کیا؟"

"پوچھا تو تھا۔" وہ آرام سے بیٹھے مٹھائی کھا رہے تھے۔

"ایسے پوچھتے ہیں۔"

"تو کیا اسٹامپ پیپر پر لکھواتا... احمق عورت! اس سے اچھا رشتہ بھلا کہاں سے ملے گا۔ ایسی کوئی حور پری نہیں ہے ہماری بیٹی۔ ایک تو اپنا، پھر اتنی اچھی نوکری، ساری جائیداد کا اکلوتا وارث۔" وہ بگڑ کر بولے۔

"ہاں... اور غصہ ہر وقت ناک پر دھرا رہتا ہے۔"

"غصہ مرد کی شان ہے۔" وہ مونچھوں کو تاؤ دے کر بولے۔

"ہاں ساری عمر آپ کی یہ ہی شان کم نہ ہوئی۔" خالہ جل کر بولیں۔

"تو... تم نے بھی تو گزارا کیا ہے۔"

"چلیں... اسی بہانے یہ تو مانا کہ گزارا میں نے کیا ہے۔"

"پاگل عورت! بیٹی نظروں کے سامنے رہے گی اور کیا چاہیے... غیروں میں رشتہ کرنے سے سو طرح کے خدشے ہوتے ہیں۔ نہ جانے کون لوگ ہوں، کیسے نکلیں یہاں تو سب کچھ دیکھا بھالا ہے، باقی مرد کا کیا ہے، بیوی سمجھ دار ہو تو قابو کر ہی لیتی ہے، تمہاری طرح... یہ تم کھڑی منہ کیا دیکھ رہی ہو، دو کپ چائے ہی بنا لو۔" بات کرتے کرتے ملیحہ کو لتاڑا تو وہ کچن کی طرف مڑ گئی۔

ساس پین چولہے پر رکھتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے، جو کچھ اس نے چاہا اور سوچا تھا یہ اس سے کہیں زیادہ تھا۔

مگر نہیں؟" ہلکی سی شرمندگی، جو اندر ہی اندر کانٹے کی طرح چبھ رہی تھی۔

"شرمندگی کس بات کی، محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔" اس نے خود کو تسلی دی۔

"یہ محبت ہے یا جنگ..." یہ کون تھا جو اندر بیٹھا سوال جواب کیے جا رہا تھا۔

"میرے پاس فضول سوالوں کا کوئی جواب نہیں۔" اس نے جھنجلا کر تی چینی کے ڈبے نکالے۔

"اور فضول حرکتوں کا جواز ہے۔"

"شٹ اپ۔" وہ چلائی۔

"تمہیں کیا ہوا، کس سے لڑ رہی ہو؟" خالہ کا چہرہ کچن کے دروازے پر نمودار ہوا۔

وہ شرمندہ سی ہو گئی، جبکہ خالہ سوچ رہی تھیں۔ جب جوان لڑکیاں ہوں اسے بھی لڑنے لگیں تو ان کی شادی کر دینی چاہیے۔

☆ ☆ ☆

وہ نگی کو ڈھونڈتی اوپر چلی آئی۔ حالانکہ ابھی دوپہر شام کے آخری کنارے پر کھڑی تھی... مگر وہاں اوپر والے کمرے میں تینوں موجود تھے۔ نگین، تابندہ اور مبین۔

"لو میں نیچے ڈھونڈ رہی تھی۔ نگین یہ کیٹلاگ لو... خالو نے کہا ہے، نگین سے فرنیچر پسند کروالو۔" ملیحہ نے کیٹلاگ آگے بڑھایا۔

نگین یوں ہی بیٹھی اپنے ہاتھوں کو گھورتی رہی۔ تابندہ نے کیٹلاگ پکڑا اور بنا کھولے ایک طرف ڈال دیا، مبین اٹھا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

ملیحہ نے باری باری سب کا چہرہ دیکھا، پھر جھنجلا گئی۔

"مسئلہ کیا ہے تمہارے ساتھ... تابندہ کی منگنی ہوئی تو یہاں وہاں پھدکتی پھر رہی تھی اور تم ہو کہ یہ سوگوار صورت بنائے بیٹھی ہو، یا عذیر بھائی میں کمی کیا ہے؟"

"بچپن سے نگی کے ساتھ ہو، ابھی تک اس کے دل کا حال نہیں جانتیں۔" تابی نے تیز لہجے میں کہا، ملی

سٹپٹا گئی، پھر ٹھٹکے انداز میں بولی۔

"ہاں... تو مجھے بتایا کیا ہے؟ ہر چیز کا تو پردہ رکھا ہے۔"

"جو دل سے قریب ہوتے ہیں، انہیں بتایا نہیں جاتا۔"

"ہاں... ٹھیک ہے تو اب کیا ہو سکتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے، اگر نگی ہمت کرے۔" تابی نے نگین کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تو ملی سٹپٹا گئی۔

"لیکن، شادی کی تاریخ طے ہو گئی ہے۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"تم دونوں اگر خاموش نہیں ہو سکتیں تو خدا کے لیے یہاں سے چلی جاؤ۔" نگین پھٹ پڑی۔ "اور تابی... تم بھی بس کرو، جو کچھ ہو رہا ہے اسے میں اپنی قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کر چکی ہوں، جنہوں نے مجھ سے رائے لینا بھی گوارا نہیں کیا، وہ میرے فیصلے کو کیسے قبول کریں گے۔"

تابندہ تاسف سے اسے دیکھتی رہی، پھر خاموشی سے چلی گئی۔ ملی نے کن انکھیوں سے نگی کو دیکھا۔ وہ مضطرب سی کیٹلاگ کے کناروں پر انگلی پھیر رہی تھی۔

"اچھا چھوڑو، آؤ فرنیچر پسند کریں۔"

"امی سے کہو، جو اچھا لگتا ہے بنوالیں، اور پلیز مجھے کچھ دیر اکیلا چھوڑ دو۔" اس کے لہجے میں بے زاری ہی بے زاری تھی۔

"بھاڑ میں جاؤ۔" ملی کیٹلاگ اٹھا کر نیچے چلی آئی۔ پھر خالہ کے ساتھ مل کر ڈیزائن پسند کر لیا۔ اس کی بڑی خواہش تھی کہ وہ اس خبر کا ریسپانس ریان مصطفیٰ کے چہرے پر دیکھے، مگر سنا تھا کہ اس کے آفس میں کام بڑھ گیا ہے، اس لیے دیر سے گھر آتا ہے۔

"بے چارہ... خیر میں سب بھلا دوں گی، ذرا نگی کی شادی ہو جائے۔" وہ اس وقت بہت خود غرض ہو رہی تھی۔ اسے نگی کے احساسات سے زیادہ اپنے دل کی پروا تھی۔

محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔ مگر یہ محبت تھی یا جنگ؟

☆ ☆ ☆

شادی کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں، نگین نے والدین کی خاطر ہی سہی، لیکن خود کو سنبھال لیا تھا۔ اوپری دل سے مگر اب وہ شادی کی تیاریوں میں حصہ لینے لگی تھی۔ ملیحہ بھی مطمئن ہونے لگی۔ بس ریان مصطفیٰ کی مصروفیات میں دن بدن ہوتا اضافہ ملی کو جھنجلا دیتا۔

"کیا وہ ابھی تک اس فیصلے کو تسلیم نہیں کر سکا۔" حالانکہ ایک دوبارہ جو ملاقات ہوئی۔ اس میں وہ نارمل ہی نظر آ رہا تھا۔ اور دوسری بات دو ویک اینڈ گزر گئے، عذیر گھر نہیں آیا تھا، مگر پھوپھو مطمئن تھیں۔

"شادی پر چھٹیاں لی ہیں۔ اس لیے کام سمیٹنے میں جتا ہے۔" انہوں نے ملیحہ کو بتایا تھا۔

اس دن بہت دنوں کے بعد وہ زبردستی نگین کو چھت پر لے آئی۔ ورنہ اب اس نے چھت پر آنا بند کر دیا تھا۔ لیکن آج شام خوشگوار تھی۔ نیلے امبر پر سفید بادلوں کی کشتیاں تیر رہی تھیں۔ دونوں یوں ہی ٹہلنے لگیں۔

خالہ اور خالو، تابندہ کے گھر گئے تھے۔ انہیں شادی کا بلاوا دینے اور صلح کرنے کہ، ریان کے ابو نے بہت سختی سے کہا تھا، اگر اس شادی پر وہ لوگ ایک نہ ہوئے تو وہ بھی شادی میں شریک نہ ہوں۔ پھر کون سا جائیدادوں کے جھگڑے تھے۔ وہ ہی معمول کی گھریلو چھوٹی چھوٹی باتیں، جو بڑھتے بڑھتے دونوں گھروں کے درمیان دیوار کھڑی کر گئیں۔

"تایا، تائی ہمارے گھر آئے ہیں، امی، ابو کو منانے۔" دیوار کی دوسری طرف تابی کا مکھڑا طلوع ہوا۔

"تو تم یہاں کیا کر رہی ہو، ان کی کوئی خدمت خاطر کرو۔" ملی نے جھڑکا۔

"مبین گیا ہے بیکری تک... نگی تم نے پارلر سے

ٹائم لے لیا یا میں لوں؟"

"ابھی تک تو نہیں لیا۔" نگین آسمان پر تیرتے بادل دیکھ رہی تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا ان بادلوں پر بیٹھ کر بہت دور نکل جائے۔

"اچھا... میں لے لوں گی۔"

"ادھر آجاؤ۔"

"نہیں... جا کر چائے بناتی ہوں، مبین آنے والا ہوگا۔" وہ نیچے چلی گئی۔

ملیحہ ہلکی پھلکی باتوں کے ساتھ نگین کا دھیان بٹاتی رہی، مگر وہ مضطرب سی تھی۔ پھر ایک دم ملیحہ کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگی۔

"ملی! میرا دل گھبرا رہا ہے۔"

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" ملیحہ نے گھبرا کر اس کا چہرہ دیکھا۔

"پتا نہیں کیوں، ایسا لگتا ہے، جیسے کچھ ہونے والا ہے۔" اس نے پیشانی مسلی۔

"تمہارا وہم ہے نگی۔" ملیحہ تھوڑا پریشان ہوئی۔

"ہاں... شاید... آؤ نیچے چلتے ہیں۔"

مگر وہ نگین کا وہم نہ تھا۔ مبین بیکری تک گیا، جب راستے میں کسی گاڑی نے ٹکر ماری، جان تو بچ گئی، ہاں ٹانگ زبردست طریقے سے فریکچر ہوگئی، سب کے سب اسپتال بھاگے۔

✡ ✡ ✡

تابی، مبین کے لیے سوپ لے کر آئی تو نگین اس کے سرہانے بیٹھی زارو زار رو رہی تھی۔

"توبہ۔" وہ ماتھے پر ہاتھ مار کر رہ گئی۔ "شکر ادا کرو کہ اس کی جان بچ گئی اور تم ہو کہ..."

"یہ پتا ہے کیوں رو رہی ہے۔ اب اس کی شادی میں بھنگڑا کون ڈالے گا۔" ملی نے مذاق کرنے کی کوشش کی، مگر اپنے مذاق پر خود ہی ہنسنا پڑا۔ وہ سب چپ سے ہوگئے تھے۔

وہ اندر ہی اندر جھنجلانے لگی۔ مبین پورے دس دن کے بعد اسپتال سے واپس آیا تھا۔ ان دس دنوں میں شادی کے سارے کام ٹھپ ہوگئے تھے۔ نگین کے ابو نے چاہا کہ شادی کی تاریخ آگے کر دی جائے۔ مگر پھوپھو نے عذیر کی چھٹی کا عذر پیش کر دیا جو پہلے ہی بڑی مشکلوں سے منظور ہوئی تھی۔ پھر مبین کے ابو نے بھی منع کر دیا۔

اس ایک حادثے کے بعد سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا، جب اچانک ایک دن وہ چلی آئی۔

✡ ✡ ✡

بری کی ساری تیاری ملیحہ نے پھوپھو کے ساتھ مل کر کی تھی کہ نگین نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔ خود اپنے کپڑے بھی بی جان سے تیار کروائے تھے۔ (آخر ریان کو امپریس بھی تو کرنا تھا) شادی میں دو دن باقی تھے۔ جب اس نے سارے کپڑے عذیر کے بیڈ روم کی دیوار گیر الماری میں ہینگ کر دیے۔ نگین کے جہیز کا سامان کمرے میں سج چکا تھا۔ عذیر بھی آچکا تھا۔ اب اس کا چہرہ ہی ایسا تھا کہ نہ خوشی کا اندازہ ہوتا نہ غم کا۔

آج نادیہ باجی نے بمعہ اہل و عیال آنا تھا۔ اس لیے پھوپھو کا خیال تھا ان کے آنے سے قبل سارا سامان ٹھکانے لگ جائے۔

"پھوپھو! آج تو تھک گئی ہوں، کھانا بازار سے منگوا لیں۔" وہ کمر پکڑ کر سیدھی ہوئی۔

"امی! پزا آرڈر کروں۔" صبوحی اچھل کر کھڑی ہوئی۔ پھوپھو نے گھورنا چاہا۔ پھر ملیحہ کا خیال کر کے رک گئیں۔

"اچھا... میں نہا لوں... ملیحہ! یہ ڈبے وغیرہ بھی ٹھکانے لگا دو۔"

"موٹی بھینس! تم بھی کوئی کام کر لیا کرو۔" ملی نے چڑ کر صبوحی سے کہا۔

"میں تو پڑھنے جا رہی ہوں۔" وہ بہانہ بنا کر کھسک گئی۔

"سچ مچ بھینس ہے، بس بیٹھ کر جگالی کرنا آتی ہے۔" وہ چڑ کر ڈبے اٹھانے لگی، تب ہی کال بیل ہونے لگی۔

...نے صبوحی کو کئی آوازیں دیں۔ مگر وہ ٹس سے مس ...ہوئی۔ وہ جھنجلاتی ہوئی بیرونی دروازے تک آئی۔

"کون؟"

"ریان..."

"ہائے اللہ!" اس نے تیزی سے اپنے بکھرے بال ...سمیٹے۔ "کاش منہ بھی دھو لیا ہوتا۔"

"آپ...؟"

"عذیر ہے۔" وہ اسے دیکھ کر چونکا، پھر نارمل سے انداز میں پوچھنے لگا۔

"وہ تو کسی کام سے گئے ہیں۔" صاف لگتا تھا... وہ آفس سے سیدھا یہیں آرہا تھا۔

"آپ اندر آئیے نا۔" وہ شاید پھوپھو سے ملنے کے خیال سے اندر آگیا۔

"نگین کی منگنی کے بعد سے آپ غائب ہی ہوگئے ریان بھائی۔" وہ سرسری لہجے میں کچھ جتانا چاہتی تھی۔

"بس مصروفیت اچانک ہی بڑھ گئی۔ آج کچھ فراغت تھی، تو سوچا۔ السلام علیکم پھوپھو!" وہ صوفے پر بیٹھتے بیٹھتے پھر سے کھڑا ہوگیا۔

"لوگ بھی بس پانی کو ہاتھ لگا کر آجاتے ہیں۔" ملی نے بے حد کوفت سے سوچا، جبکہ پھوپھو بھی وہی گلہ کر رہی تھیں اور وہ وہی عذر تراش رہا تھا۔

دھیما پر اثر لہجہ... جو پورے ماحول پر حاوی ہو رہا تھا۔ وہ کھڑے کھڑے مدہوش ہونے لگی، ہوش تب آیا ...جب وہ جانے کی اجازت مانگنے لگا۔

"بیٹھو نا۔" پھوپھو کا لہجہ حسب معمول سرسری ہی تھا، ملی کو غصہ آنے لگا۔

"ابھی آفس سے آرہا ہوں، گھر جا کر فریش ہوں گا۔" وہ ان کے سامنے جھکا، انہوں نے سر پر ہاتھ پھیرا، پھر ملی کو دیکھ کر پوچھنے لگا۔

"وہ تم لوگوں کی شام کی محفلیں تو غالباً ناپید ہوگئی ہیں۔" ملی چونکی، پھر ہنس دی۔

اسے سب خبر تھی، وہ چلا گیا، مگر اپنی خوشبو اور ...اپنے ہونے کا احساس چھوڑ گیا تھا۔

"کوئی آئے تو شربت، پانی بنا لیتے ہیں۔"

"آپ بٹھاتیں تو ہی بناتی۔" (کر لو گل... الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے، لیکن یہاں چور کون ہے اور کوتوال کون؟)

سوال کے جواب سے قبل ہی بیل دوبارہ ہونے لگی۔

"پزا آیا ہوگا، پتا نہیں آج کل کی لڑکیوں کو اس خمیری روٹی میں کیا ملتا ہے۔"

"ہیں... پزا لڑکیوں نے ڈلیور کرنا شروع کر دیا۔" دروازہ کھولتے ہی اک خوب صورت سی لڑکی نظر آئی، کٹے ہوئے بال، اسٹائلش سا لباس، مگر کچھ پریشان اور مضطرب۔

"یہ عذیر کا گھر ہے؟"

"جی..." ملیحہ نے چونک کر از سر تو اس کا جائزہ لیا۔

"آپ اس کی بہن ہیں۔" اس کے چہرے پر اطمینان سا پھیل گیا۔

"یہ ہی سمجھ لیں۔"

"میں اندر آجاؤں۔"

"آئیے..." ملی نے دروازہ چھوڑا۔ اسے ڈرائنگ روم میں لے گئی، پھر پھوپھو کو آواز دے کر بلا لیا۔

"عذیر بھائی سے ملنے آئی ہیں۔" ملی کے بتانے پر انہوں نے حیران ہو کر لڑکی کو دیکھا۔ پھر تیوری چڑھالی، چہرے کے تاثرات جتنے خوف ناک بنا سکتی تھیں، بنا لیے۔

"کیا بات ہے؟"

"آپ عذیر کی مدر ہیں؟" لڑکی نے سنجیدگی سے ان کے تاثرات کا جائزہ لیا۔

"ہاں... پر تم کون ہو؟" خطرے کی گھنٹی زور سے بجی۔

"میں عذیر کی بیوی ہوں۔" جہاں پھوپھو بھونچکی رہ گئیں۔ وہیں ملیحہ کے قدموں سے زمین نکل گئی۔

"کیا بکواس کر رہی ہو لڑکی؟" انہوں نے سنبھل کر غصے سے کہا۔

"بکواس نہیں کر رہی، سچ کہہ رہی ہوں، ہم دونوں

ایک ہی آفس میں کام کرتے ہیں' سال بھر پہلے اس نے مجھ سے نکاح کیا تھا۔ اب اس نے مجھ سے کہا کہ اس کی امی بیمار ہیں' اس لیے چھٹی لے رہا ہوں' مگر مجھے لگتا تھا بات کچھ اور ہے' وہ الجھا ہوا ضرور تھا' مگر پریشان نہیں' مجھے کسی نے بتایا وہ دوسری شادی کر رہا ہے۔"

"تمہیں شرم نہیں آتی میرے بیٹے پر الزام لگاتے ہوئے۔" پھوپھو پھٹ پڑیں۔

"نہ میں جھوٹ بول رہی ہوں' نہ بکواس کر رہی ہوں' میرے پاس ثبوت موجود ہے' یہ نکاح نامہ۔"

اس نے پرس کھول کر نکاح نامہ ان کی طرف بڑھایا۔

اب اور کیا رہ گیا تھا' پھوپھو گم صم سی ہو گئیں۔

"اس نے مجھ سے نکاح کیا' ایک سال میرے ساتھ میرے فلیٹ پر رہا' مجھے برتا' روپیہ پیسہ' ہر چیز شیئر کی اور اب وہ دوسری شادی کر رہا ہے' میں کہاں جاؤں گی' میرا تو اس دنیا میں عذیر کے سوا کوئی نہیں۔" وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر سسکنے لگی۔

ملی کے اعصاب پر برف سی گر گئی۔ وہ کچھ بھی سوچنے سے قاصر تھی۔ پھوپھو بھی چپ تھیں۔ پھر بہت دیر کے بعد انہوں نے ہلکے سے کھنکار کر گلا صاف کیا۔

"سنو لڑکی! عذیر کوئی شادی نہیں کر رہا ہے اور اس وقت تم یہاں سے چلی جاؤ' میں اس سے بات کروں گی۔"

"میں عذیر سے ملے بغیر نہیں جاؤں گی۔"

"احمق لڑکی... تمہیں یوں اچانک یہاں دیکھ کر وہ بھڑک بھی سکتا ہے۔ عذیر کے باپ کو پتا چلا تو..."

"مگر ان کی تو ڈیتھ ہو چکی ہے؟"

"پر اس کے ماموں تو زندہ ہیں' ہنگامہ کر دیں گے' مجھے کچھ راہ تو ہموار کرنے دو۔" وہ تڑخ کر بولیں۔

لڑکی کے چہرے پر تھوڑا اطمینان پھیل گیا' پھر ڈرتے ڈرتے پوچھنے لگی۔

"مگر عذیر نے چھٹی..."

"ارے مجھے ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔" وہ ماتھے پر ہاتھ مار کر رہ گئیں۔ لڑکی کا منہ کھل گیا' ہارٹ اٹیک کا مریض دو دن میں اتنا ہٹا کٹا ہو سکتا تھا؟

"نہیں ہوا تو اب ہو جائے گا۔ خدا کے لیے بی بی! ابھی تو یہاں سے نکلو۔" انہوں نے دونوں ہاتھ جوڑے' لڑکی نے آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ تھامے' چٹ چٹ گالوں پر بوسے دیے۔

"اب میں مطمئن ہوں۔ وہ عذیر تو یوں ہی ڈرا رہا تھا کہ میری ماں بہت غصے والی ہیں۔" (بے شرم... یہ ہی کچھ کر کے عذیر کو قابو کیا ہو گا۔) انہوں نے دونوں گال رگڑے۔

"یہ میرا فون نمبر ہے۔" اس نے پرس سے اک چٹ نکال کر نمبر لکھا اور ملیحہ کو تھما دیا۔ اس کے جانے کے بعد پھوپھو کو احساس ہوا کہ یہ سب کچھ ملیحہ کے سامنے ہوا ہے۔

"اب کیا ہو گا' یہ کلموہی کہاں سے ٹپک پڑی۔ ہائے میں تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی بھائیوں نے تو ویسے ہی مجھ سے قطع تعلق کر لینا ہے۔" ملی ششدر سی صوفے پر بیٹھ گئی۔

"ملی میری بچی! دیکھ تو تو سیانی بیٹی ہے' اس وقت یہ بات ہنگامہ کھڑا کر دے گی اور نگین کا کیا ہو گا' تو کسی سے ذکر نہ کرنا' میں نے اسے ٹال دیا ہے' دو دن کی ہی تو بات ہے' شادی ہو جائے تو میں سب سنبھال لوں گی' عذیر نے وعدہ کیا ہے وہ اسے طلاق دے دے گا۔"

ملیحہ نے چونک کر ان کا چہرہ دیکھا۔ تو انہیں پہلے ہی سے اس بات کی خبر تھی' لگتا تھا ماں' بیٹے میں تفصیل سے بات ہوئی تھی' پھوپھو نے نہ جانے کس کس طرح عذیر کو بلیک میل کیا کہ وہ اس شادی پر رضامند ہو گیا۔

"نہیں بتائے گی نا' بس دو دن کی بات ہے۔" ان کے ملتجی سے لہجے پر ملیحہ نے بدقت نفی میں گردن ہلائی۔

"ہاں تو بہت اچھی بیٹی ہے۔"

"میں چلتی ہوں۔" وہ بڑبڑائی اور اک ٹرانس میں چلتی گھر آ گئی۔

فون نمبر والی پرچی ابھی تک اس کے ہاتھ میں دبی

تھی۔ اس نے پھوپھو سے وعدہ تو کر لیا تھا' مگر ساری رات کروٹیں بدلتے گزری۔

"یہ تو نے نگین کے ساتھ کیا کیا ملی! کیا وہ یہ سب ڈیزرو کرتی تھی' اک شادی شدہ مرد..."

"پر میں نے کیا کیا ہے' پھوپھو نے رشتہ مانگا۔ اس کے گھر والوں نے قبول کیا' سارے قصے میں میں کہاں ہوں؟"

"ہاں تو تم بہت معصوم اور نیک پاک ہو۔"

"ہاں تو میرا قصور کیا ہے؟"

"ٹھیک ہے فرض کرو تم نے پہلے کچھ نہیں کیا' پر اب... اب یہ سب چھپا کر نگین کے ساتھ کون سا بھلا کر رہی ہو؟"

"میں خالہ کو سب کچھ بتا دوں گی۔" وہ ایک دم اٹھ بیٹھی۔

"پاگل ہو گئی ہو' محض دو دن کی بات ہے' پھوپھو نے کہا ہے وہ سب ٹھیک کر لیں گی۔"

"ہا... ہا... تم واقعی بہت نیک اور بے قصور ہو؟"

"شٹ اپ۔" وہ چیخ اٹھی۔

"کیا ہوا ملی؟" ساتھ والے بیڈ سے نگین ہڑبڑا کر جاگی۔

"کچھ نہیں' ڈراؤنا خواب دیکھ لیا تھا۔"

"آیتہ الکرسی پڑھ لو' میرے ساتھ آ جاؤ۔"

"نہیں' میں ٹھیک ہوں۔" اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

☆ ☆ ☆

صبح بہت زیادہ خوشگوار نہ تھی' گھر میں مہمانوں کی آمد تھی' ملیحہ کے امی' ابو بھی آ گئے۔ ماں نے آتے ہی پہلا سوال یہ ہی کیا۔

"کپڑے تو ڈھنگ کے بنوائے ہیں' وہ آج کل کی لڑکیوں کی طرح چوغے تو نہیں سلوا لیے اور وہ کھلا پائجامہ' جس میں بلی بھی گھس جائے تو پتا نہ چلے۔"

ملیحہ سٹپٹا گئی۔

اب کیا بتاتی... کہ اس نے بڑے اہتمام سے بارات کے لیے سلور کلر کی فراک اور وہ ہی بلی والا پائجامہ سلوایا ہے' تایا نے مہندی کے فنکشن کے لیے منع کر دیا تھا' پھوپھو صبح صبح ایک چکر لگا گئی تھیں' پھر سب ٹھیک دیکھ کر مطمئن سی چلی گئیں۔

لڑکیوں نے عذیر کے گھر ہنگامہ مچا رکھا تھا تو لڑکیوں نے ادھر مل جل کر مہندی کی رسم ادا کر لی۔ سب ہنگامہ وہ ہی تھا جو روایتی شادی میں ہوتا ہے۔

شور' ہنگامہ' گانے' ڈانس' پھر بھی ملیحہ کو لگ رہا تھا... کچھ کمی ہے۔

نگین مایوں کے جوڑے میں سرسوں کا پھول لگ رہی تھی' اداس اور مضمحل سب کام تایا اور ملی نے سنبھال لیا تھا بقول خالہ۔

"دونوں نے مجھے بیٹیوں سے بڑھ کر دکھایا' نگی کو بہن کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔"

وہ کچن کا کام سمیٹ کر آئی تو نگی کمرے میں نہ تھی۔ جبکہ ایک گھنٹہ قبل "وہ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" کہہ کر کمرے میں ہی آئی تھی۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے اور سارا ہنگامہ سرد پڑ گیا تھا۔ اس نے سارے کمروں میں جھانکا۔

"ہائے اللہ! کہاں چلی گئی۔" کچھ سوچ کر وہ سیڑھیاں چڑھتی چھت پر آ گئی۔ اور نگی کو وہاں دیکھ کر سکون کا سانس لیا۔

وہ چارپائی پر گھٹنوں میں چہرہ چھپائے بیٹھی تھی اور ادھورا چاند اداسی سے اسے تک رہا تھا۔

"توبہ ہے نگی! کل تمہارا نکاح ہے اور تم یوں بال کھولے چھت پر بیٹھی پوری کی پوری چڑیل لگ رہی ہو۔ اگر کوئی جن ون عاشق ہو گیا تو۔" وہ دانستہ اونچی آواز میں بولتی اس کے قریب آئی۔

"عذیر کی موجودگی میں کسی جن کی ضرورت رہ جاتی ہے۔" بھیگی بھیگی آنسوؤں سے لبریز آواز... نہ جانے کیوں ملی کو لگا وہ تھک گئی ہے۔

"شاید سارا دن کام کیا ہے اس لیے۔" خود کو تسلی دیتی نگی کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

دونوں کے درمیان خاموشی سی حائل ہو گئی۔ ایسی

خاموشی‘ جس سے ملی کو وحشت ہونے لگی۔

”نگی! تو خوش نہیں ہے؟“ وہ اس طرف آنا نہیں چاہتی تھی کہ سوال نگی کی نہیں اس کی خوشی کا تھا۔ جس کے لیے اس نے یہ سارے پاپڑ بیلے‘ مگر سوال کر بیٹھی‘ جو گولی کی طرح نگی کو لگا۔

تب ہی وہ ایک دم آگے ہوئی اور اس کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔۔۔ اندھیرے میں اس کے رونے کی آواز ملی کو وحشت زدہ کرنے لگی‘ وہ اسے دھکیلنا چاہتی تھی‘ مگر بے بس سی بیٹھی رہی‘ پھر بدقت بولی۔

”بس کرو نگی۔“

”ملی! یہ تو ساری زندگی کا رونا ہے۔ ایک بات تو بتا‘ محبت کے نصیب میں ملنا نہیں ہوتا تو یہ ہمارے دل پر قابض کیوں ہوتی ہے‘ محبت اتنی خود غرض کیوں ہوتی ہے۔“

ملی کے پاس اس کے سوال کا جواب نہ تھا۔ اور نگی جواب کا انتظار کیے بنا ہی نیچے بھاگ گئی۔ ملی نے سر اٹھا کر خود پر جھکے آسمان کو دیکھا۔ جس پر جگمگاتے تارے بے حد تاسف سے اسے دیکھ رہے تھے۔

ملی کی نگاہوں میں وہ سارے لمحے ایک ایک کرکے گزرے جو اس گھر میں اور نگین کی سنگت میں گزرے تھے۔ وہ مضطرب سی ساری چھت پر چکرانے لگی۔

اندر سوالوں کا جنگل تھا اور جواب ایسا کہ ہر بار منہ پر طمانچہ سا پڑتا‘ وہ اپنے آٹھ بہن‘ بھائیوں میں سب سے زیادہ جذباتی اور غصے والی تھی۔ اماں اس کے ہاتھوں تنگ آئی رہتیں۔ تب چھٹیوں میں خالہ اسے اپنے پاس لے آتیں۔ وہاں گھر میں سکون ہوتا تو یہاں نگین جیسی صلح جو کزن کے ساتھ ملیحہ کا ہر دن عید کی طرح گزرتا۔

پھر یوں ہونے لگا کہ چھٹیاں ہوتے ہی نگین کے پیغام پر پیغام آتے اور وہ خود بھی جانے کو بے تاب ہوتی۔ میٹرک کے بعد وہ مستقل خالہ کے پاس آگئی۔ دونوں نے اکٹھے کالج میں داخلہ لیا‘ اور بی اے کے بعد بھی اس کا یہ حال تھا کہ سال کے آٹھ مہینے خالہ کے پاس گزارتی تھی۔

”اور زندگی میں وہ کون سا موقع ہے‘ جب خالہ نے مجھ میں اور نگین میں فرق کیا ہو؟“ اس نے دونوں ہاتھ دیوار پر لگائے اور اس پر بیٹھ گئی‘ ریان مصطفیٰ کے گھر اندھیرا تھا۔

”یہ اندھیرا گھر میں نہیں‘ نگی کی زندگی میں چھا رہا ہے‘ اور اس کا سبب تم ہو۔“ بہت دنوں سے خود کو بہلائے ہوئے تھی کہ محبت میں سب کچھ جائز ہے۔

”کیا کسی کی زندگی تباہ کرنا بھی اور کسی کون؟ وہ بہنوں جیسی کزن‘ جس نے اپنی پلیٹ میں سالن نکالنے سے پہلے تیری پلیٹ میں ڈالا۔ جو سوٹ پسند آیا اسے بنا تیرے کہے تیری الماری میں رکھ دیا‘ تیرے ساتھ ہنسی‘ روئی‘ اور تو نے اس کے ساتھ کیا کیا۔“

وہ بہت دنوں سے خود کو دھوکہ دے رہی تھی کہ اسے نگی کے آنسوؤں کی نہیں اپنے دل کی پروا ہے‘ لیکن آج احساس ہوا نگی کے آنکھ سے نکلتا ہر آنسو اس کے دل پر گرا تھا۔

”کیا پاگل پن ہے ملی! اب صرف ایک رات ہے‘ نگی تمہارے اور ریان کے درمیان سے ہمیشہ کے لیے نکل جائے گی۔“ اس کی خود غرضی نے پھر سے بہکانا چاہا۔

”پر نگی ہمارے درمیان کہاں آئی تھی ہمیں آئی تھی ان دونوں کے درمیان۔۔۔ کیا مجھے کچھ نظر نہیں آیا تھا‘ وہ ریان کا ہر بات کے لیے نگین کو پکارنا۔۔۔ ان کی بے تکلفی ہنسی‘ نگین کی آنکھوں کے جگنو‘ میں تو کبھی بھی کہیں نہیں تھی‘ کیا ریان نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے‘ تو پھر یہ سب جتن کس لیے۔“ اس نے کھینچ کر دو تھپڑ اپنے گالوں پر مارے۔

”تو کمینی ہے ملی! بالکل کمینی۔۔۔ اگر نگی تیری نظروں کے سامنے ناخوش رہے گی تو کیا ملی چین پاسکے گی۔“

”تم نگی کے لیے پریشان ہو۔“ اپنے قریب تابی کی آواز سن کر ملیحہ ڈر سی گئی۔

”نہیں بھی۔۔۔ ملی! وہ عذیر کے ساتھ کبھی خوش نہیں رہے گی۔“

”ہوں۔۔۔“ ملی نے چہرہ پھیر لیا۔

وہ نہیں چاہتی کہ اس نیم اندھیرے میں وہ اس کے تاثرات پا جائے۔ وہ ہی تو تھی جو عذیر کی اصل حقیقت سے واقف تھی۔

”اپنی پہلی محبت بھلا دینا اتنا آسان کام تو نہیں۔“ (تو کیا تابی جانتی ہے کہ نگی اور ریان۔)

”ہم اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتے‘ سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ۔۔۔“

”کچھ۔۔۔“ اچانک ملی کے ذہن میں اک جھماکا ہوا۔

”ہم کچھ نہ کچھ کر سکتے ہیں۔“

”کیا۔۔۔“ بس ایک ہی لمحے میں فیصلہ ہو گیا تھا۔

”تابی! میرے ساتھ آؤ۔۔۔ فون نمبر۔۔۔ ہمیں فون نمبر ڈھونڈنا ہے۔“ وہ تابی کا بازو گھسیٹتی سیڑھیاں اترتی چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

تابی‘ نگین کو لے کر پارلر چلی گئی۔۔۔ گھر میں مہمان کم تھے۔ پھر بھی شور ہنگامہ تھا اور ملی جلے پیر کی بلی کی طرح اوپر نیچے چکرا رہی تھی۔ مبین اپنی زخمی ٹانگ کے ساتھ ایک کونے میں خاموش بیٹھا تھا‘ اسے ریان کہیں نظر نہ آیا۔

”ملیحہ! کیا باؤلوں کی طرح ادھر ادھر ٹکریں مارتی پھر رہی ہے۔ تجھے کوئی کام نہیں۔“ ماں نے بری طرح لتاڑا۔

”ملی! ذرا فون کرکے پوچھو اور کتنی دیر ہے‘ بارات تو آنے والی ہے۔“ خالہ نے پکارا۔

”بارات کو بہت جلدی ہے‘ یہ دروازے سے تو آنا ہے۔“ وہ چڑ گئی۔

”بکواس نہ کر‘ کام کر۔“ اماں پاس ہی تھیں۔

”پوچھ نگین کب تک آئے گی۔“

”نگین بھی آجائے گی‘ وہ تو آجائے۔“

”وہ کون؟“

”وہ۔۔۔ وہ۔“ بوکھلاتی ہوئی ملی آرائشی لڑیوں میں الجھی‘ تو عقب سے ریان نے سنبھال لیا‘ ملی کو نہیں‘ اس فینسی لائٹ کو‘ جو ان ہی آرائشی لڑیوں میں بجھی تھی۔

”ابھی تمہارے سر پر لگتی اور دماغ روشن ہو جاتا۔“ ملی نے نظریں اپنے قدموں پر فکس کیں اور دل کو زور سے جھاڑا۔

”خبردار! اب اسے دیکھنا بھی نہیں۔“ جبکہ وہ اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کے بازو میں الجھی لڑی نکالتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”یہ جھاڑ جھنکاڑ سنوارنے کا ارادہ نہیں ہے۔“ اس نے اس کے کھلے الجھے بالوں پر تنقید کی۔ تو یاد آیا سر پر دوپٹہ نہیں ہے‘ تیزی سے سر پر دوپٹہ ڈالا تو نگاہ اماں پر پڑی۔ جو اسے نظروں ہی نظروں میں کھا جانے کی تیاری کر رہی تھیں۔

وہ تیزی سے پلٹ کر اندر آگئی۔ فون کرتے ہوئے اس نے دل ہی دل میں دعا کی‘ اللہ کرے نگین پارلر ہی سے بھاگ جائے۔ مگر پتا چلا وہ دونوں واپسی کے لیے روانہ ہو گئی ہیں۔

”ہائے اللہ! نگین آرہی ہے۔“

”تو کیا نہ آتی۔“ صبوحی نے حیرت سے پوچھا۔

”میرا مطلب ہے مولوی صاحب تو آجاتے۔“

”وہ تو کب کے آگئے۔ اب تو بارات آرہی ہے۔“ باہر پٹاخے چل رہے تھے۔

”یا اللہ! مولوی بھی آگیا‘ بارات بھی آگئی‘ اور۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ ابھی تک نہیں آئی۔“ تب ہی اماں نے اسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹا اور کمرے میں لے آئیں۔

”کیسی باندریوں جیسی شکل لیے گھوم رہی ہے۔۔۔ نا۔۔۔ تیار کیوں نہیں ہوتی۔“

اسے کپڑے بھی بدلنے پڑے‘ بال بھی سنوار لیے‘ تب ہی نگین بھی آگئی‘ ملیحہ کو ذرا اچھی نہ لگی‘ ایک تو آنکھوں کا میک اپ اچھا نہ تھا‘ دوسرا رو‘ رو کر ناک پکوڑے جیسی ہو رہی تھی۔

تابی نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا‘

اس نے بے چارگی سے کندھے اچکا دیے۔

"میں نے تو اپنی سی کوشش کرلی' اب نگی تیرا نصیب۔" وہ مایوسی سے دونوں ہاتھ گود میں رکھ کر بیٹھ گئی۔ باہر عذیر کے دوستوں نے خوب رونق لگا رکھی تھی۔

"دولہا تو یوں منہ پھلائے بیٹھا ہے گویا گن پوائنٹ پر نکاح ہو رہا ہے۔" کسی نے اعتراض کیا۔

"عذیر کا مزاج ہی ایسا ہے۔" دوسرے نے تسلی دی۔

"مجھے تو دلہن کا حال بھی مندا لگ رہا ہے۔" ایک سرگوشی۔

"کہا نا۔۔۔ دونوں کی شکلیں ہی ایسی ہیں۔"

"مولوی صاحب نکاح کے لیے آرہے ہیں۔"

"ہائے۔۔۔" نگین غش کھانے کو تیار ہوئی۔ ملی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے' تب ہی باہر ایک دم غیر معمولی سناٹا چھا گیا۔ پھر ایک دم بہت سے لوگوں کے بولنے کی آوازیں' جن میں نمایاں تایا اور خالو کی تھی' ملی سرپٹ باہر کی طرف لپکی۔

سب کچھ حسب خواہش تھا۔ سب کے درمیان گھری اس کو دیکھ کر وہ دوبارہ اندر بھاگی۔

"مبارک ہو' دولہا شادی شدہ ہے۔" اندر بیٹھی خواتین حق دق رہ گئیں تو وہ سنبھلی پھر منہ بنا کر بتایا۔

"عذیر بھائی پہلے سے شادی شدہ تھے۔ ان کی بیوی باہر کھڑی ہیں۔ بمعہ نکاح نامہ کے۔" پھر نگی کے ساتھ لپٹ گئی۔

"ہائے نگی! تیری بارات یونہی واپس ہو جائے گی۔" پھر اس کے کان میں بولی۔ (رونا بند کر اور شکرانے کے نفل پڑھ)

سب کی سب عورتیں باہر چلی گئی تھیں۔ وہ بھی ان کے پیچھے آگئی تاکہ عذیر کی درگت بنتی دیکھ سکے۔ اور ریان کے چہرے کے تاثرات بھی۔

وہاں منظر نامہ تھوڑا بدلا تھا۔ عذیر اور صدف ایک ساتھ بیٹھے تھے۔ پھپھو غش کھا کر گری تھیں اور خالہ غش کھانے کو تیار تھیں۔ مرد سر سے سر جوڑے بیٹھے تھے۔

"ہائے' میری معصوم بچی کو داغ لگ گیا۔ اب اس کا کیا بنے گا۔" خالہ دہائی دے رہی تھیں۔

"لوگ سو سو باتیں کریں گے۔ میری نگی کو اب کون بیاہنے آئے گا۔"

"خالہ۔۔۔" ملی ان سے لپٹ گئی۔ "آپ کیوں فکر کرتی ہیں۔ عذیر بھائی اس قابل ہی نہ تھے کہ نگی کے ساتھ ان کی شادی ہوتی۔ شکر کریں نکاح سے پہلے بھانڈا پھوٹ گیا۔ بعد میں پتا چلتا تو ہم کیا کر لیتے۔۔۔ اور ہماری نگی کو تو شہزادہ بیاہنے آئے گا۔" (ہائے میرے دل کا شہزادہ) اس نے زرافے کی طرح گردن گھما کر ادھر ادھر دیکھا۔ ریان' مبین اور چچی ایک طرف کھڑے کھسر پھسر کر رہے تھے۔ پھر اشارے سے چچا کو بلایا گیا۔

"تائی کو بھی وہاں موجود ہونا چاہیے۔" مگر تائی ایک طرف چپ چاپ سب کی شکلیں دیکھ رہی تھیں۔

"اگر ریان نگین سے محبت کرتے ہیں تو اب تک انٹری دے دینی چاہیے۔ یہی مناسب وقت ہے۔"

اور انٹری تو دی مگر ریان نے نہیں مبین نے۔۔۔ ملی ہکا بکا چچی اور خالہ کو گلے ملتے دیکھنے لگی۔

"ارے جلدی جاؤ۔۔۔ دولہا کے لیے ریڈی میڈ سوٹ لاؤ۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ یہ شادی نہیں ہو سکتی۔" ملیحہ کی بڑبڑاہٹ حلق میں رہ گئی کیونکہ دولہا کے لیے سوٹ لینے ریان جا رہا تھا۔

بے چارہ ریان مصطفیٰ۔

☼ ☼ ☼

باہر پھر سے ڈھول شادیانے بجنے لگے۔ پھپھو' عذیر اور اپنی اچانک وارد ہونے والی بہو کو لے کر اپنے پورشن میں جا چکی تھیں۔ او وہاں کیا ہونا تھا۔ اس سے ان میں سے کسی کو سروکار نہ تھا۔ اور ملی خونخوار شیرنی کی طرح مبین کو چیرنے پھاڑنے کو تیار تھی۔

سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا۔ باہر نکاح کی تیاری ہو رہی تھی اور اندر دولہا کی۔۔۔ ملی کی ساری قربانی گئی کھوہ کھاتے میں۔۔۔ نگین کے آنسو اور آنکھوں کی اداسی وہیں کی وہیں رہ گئی۔ جس کی وجہ سے وہ اپنا دل ٹوٹے ٹوٹے کرنے کو تیار ہوئی تھی۔ اور بے چاری نگین ابھی تک سڑک سڑک گھونگھٹ میں روئے جا رہی تھی اور مبین تھا کہ ایک ٹانگ پر ناچے چلے جا رہا تھا اور ملی کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ ایک ٹانگ بھی توڑ کر اس کے ہاتھ میں تھما دے۔

"تمہیں ضرورت کیا تھی۔ ایسے حالات میں خود کو پیش کرنے کی۔" وہ اتنے زور سے دھاڑی کہ تابندہ کو دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر رکھنے پڑے۔

"ایسے حالات میں گھر کا لڑکا ہی قربانی کا بکرا بنتا ہے۔ اور میں تو تم لوگوں کی چوتھی سہیلی ہوں۔"

"بکواس بند کرو۔ ہمیں نہیں چاہیے ایسا بے ٹانگ کا بکرا۔" وہ دونوں مٹھیاں بھینچ کر چلائی۔

"بے ٹانگ۔ کا کیوں۔ میرے بھائی کی پوری کی پوری ٹانگ سلامت ہے۔" تابی نے تڑپ کر اور جوش جذبات میں اس کی زخمی ٹانگ پر ہاتھ دے مارا۔ وہ چیخ اٹھا تو اطمینان سے بولی۔

"دیکھا۔ ٹانگ ہے تب ہی تو چیخا۔"

"تابی کی بچی۔" وہ غصے سے تابی کی طرف بڑھا۔ مگر ملی نے درمیان سے ہی دھکا دے دیا۔ وہ ایک ٹانگ پر لڑھکتا پیچھے کرسی پر جا گرا۔

"تم یہاں سے دفع ہو جاؤ اور نگی! آئی ایم ساری۔۔۔" اس نے نگین کے حنائی ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبوچ۔

"میں یہ سب نہیں کرنا چاہتی تھی۔۔۔ میں نے تو سوچا تھا۔ یقین جانو میں نے پوری نیک نیتی سے اپنی غلطی کی اصلاح کرنے کی کوشش کی۔ کن جتنوں سے صدف کو ڈھونڈ کر عین وقت پر یہاں بلایا۔ ورنہ وہ تو مایوس ہو کر اپنی پھپھو کے پاس لالہ موسیٰ جا رہی تھی۔ لیکن سب بے کار گیا۔ یہ گھامڑ اپنی ایک ٹانگ کے ساتھ میدان میں کود پڑا۔"

"ایک نہیں۔۔۔ دو۔۔۔" تابی کا ہاتھ ٹانگ پر اور مبین کی دلدوز چیخ۔

"دیکھا خالی پلاسٹر کے اندر ٹانگ بھی ہے۔" تابی نے خوش ہو کر بتایا۔

"تابی کی بچی! اب تیرا ہاتھ میری ٹانگ کی طرف آیا تو یہی پلاسٹر تیری گردن کو چڑھا دوں گا۔" وہ تکلیف سے دہرا ہوتا چلایا۔

"ان کو دفع کرو۔ نگی! تم ہمت کر کے انکار کر دو کہ تم اس ایک ٹانگ کے مرغے کے ساتھ شادی ہرگز نہیں کرو گی۔ نگی! میں سب ٹھیک کر دوں گی۔"

"ایک نہیں۔۔۔" تابی کا ہاتھ بلند ہوا مگر مبین بروقت وہاں سے بھڑک گیا تھا۔ ہاتھ کرسی کی ہتھی پر پڑا اور وہ اپنا ہاتھ پکڑ کر رونے بیٹھ گئی۔

"تم نے سب ٹھیک کر دیا ہے ڈیر! مجھے تو سمجھ نہیں آتا۔ تمہارا کس منہ سے شکریہ ادا کروں۔"

"ٹھیک' کیونکہ اس منہ کے ساتھ تو شکریہ بھی اچھا نہیں لگے گا۔" ملی تڑخ کر بولی۔

"آج کچھ بھی کہہ لو۔ آج تمہاری صورت دنیا کی حسین ترین صورت لگ رہی ہے ملی! تم نے وہ کیا ہے کہ ساری زندگی تمہارے پاؤں دھو دھو کر پیوں تو بھی کم ہے۔"

"آخ۔۔۔" تابی کو ابکائی آگئی۔ "اس نے تو ساری زندگی اپنے پاؤں خود نہیں دھوئے۔"

"مجھے سمجھ نہیں آتا کیسے اپنی شکر گزاری کا اظہار کروں۔ تم کتنی جینئس ہو۔ تم نے پل بھر میں سب کچھ بدل دیا۔ ایک لمحہ قبل مجھے زندگی بے کار اور فضول لگ رہی تھی اور اب۔۔۔ آئی لو یو سسٹر! تم نے ہمارے رستے کے سارے کانٹے اپنی پلکوں سے چن لیے۔" وہ دونوں بازو پھیلائے ایک ٹانگ پر پھدکتا جذباتی انداز میں اس کی طرف بڑھا۔

"خبردار۔۔۔ دور رہو مجھ سے۔" وہ بھاگ کے نگین کے پیچھے جا چھپی۔ "خدا کے لیے مبین ہوش کی دوا لو۔ ایسے نازک وقت میں ولن بننے کی کوشش مت کرو۔" اب وہ منتوں پر اتر آئی تھی۔

"ہیرو وہ جو ہیروئن کو لے جائے اور دل والے دلہنیا لے جائیں گے۔"

اب پتا نہیں اس کی دماغی حالت ایسی تھی یا اس کا دل ٹانگ میں دھڑک رہا تھا کہ اپنا ہی ہاتھ سینے پر مارنے کے بجائے بائیں ران پر دے مارا اور لگا چیخنے۔

”تم جیسے پاگل سے شادی کرنے سے بہتر ہے نگی خود کشی کرلے۔ ایک میں ہوں، جس نے اپنے دل پر پتھر رکھا ہوا ہے۔“ وہ آخری جملہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔

”خود کشی۔ ہاں خود کشی ہی تو کرنے گیا تھا۔ مگر وہ گاڑی والا ایسا گھامڑ نکلا کہ صرف ٹانگ کو چھو کر نکل گیا۔ تم کیا جانو ملی! یہ نگی کی شادی نہیں میری بربادی تھی۔ آج سے نہیں بچپن سے شاید ہوش سنبھالنے سے بھی پہلے میں نے نگی سے محبت کی ہے۔ میری روح صدیوں سے اسی کے عشق میں مبتلا تھی۔ اور میں صحرا صحرا یہی پکارتا تھا۔

میڈھا عشق وی تو میڈھا یار وی تو۔

”بند کرو یہ ٹرٹرانا۔ تم نگی سے محبت کرتے ہوگے مگر نگی تم سے محبت نہیں کرتی۔ وہ ریان مصطفیٰ سے محبت کرتی ہے۔“ ملی نے انکشاف کا ہتھوڑا اس کے سر پر دے مارا۔

”کیا...؟“ ایک چیخ بلند ہوئی کہیں اور سے نہیں گھونگھٹ سے اور ساتھ ہی گھونگھٹ الٹ دیا گیا اور ایک بھیانک صورت برآمد ہوئی۔

”کمینی نے مسکارا اور آئی لائنر واٹر پروف استعمال نہیں کیا۔“ تائی سر پر ہاتھ مار کر بڑبڑائی۔

”کیا بکواس ہے یہ۔“ وہ بھڑک کر بیڈ سے نیچے اتری۔

”آئی ایم ساری نگی! لیکن مجھے اپنی غلطی کا احساس بہت بعد میں ہوا۔ میں تھوڑی خود غرض ہو گئی تھی۔ لیکن ابھی بھی دیر نہیں ہوئی۔ اگر تم دونوں ہمت کرو تو اب بھی سب ٹھیک ہو سکتا ہے۔ بازار سے دولہا کا سوٹ آنے تک دولہا بدلا جا سکتا ہے۔“ وہ جوش سے بیڈ سے اتری اور نگین کا ہاتھ پکڑنا چاہا۔

”اب اگر دولہا بدلا تو میں خود کشی کرلوں گی۔“ نگی اپنا لہنگا گھسیٹتی کئی قدم پیچھے ہٹ کر چلائی۔

”اس کے دماغ پر اثر ہو گیا ہے۔“ مارے صدمے کے ملی کی آواز گھٹ گئی۔

”دماغ میرا نہیں تمہارا الٹا ہے۔ میں ریان مصطفیٰ سے نہیں مبین احمد سے محبت کرتی ہوں۔“

ملی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس نے تحیر سے کمرے میں موجود تینوں نفوس کو دیکھا جو اسے کڑے تیوروں سے گھور رہے تھے۔

”ریان مصطفیٰ نہیں...؟“ ملی نے ہکلاتے ہوئے تصدیق چاہی۔

”نہیں... مبین احمد...“ نگی قطعی لہجے میں گویا ہوئی۔

”وہ آہیں۔ آنسو... وہ راتوں کو جاگنا... وہ سب ریان کے لیے نہیں۔ مبین کے لیے...“ وہ اب بھی بے یقین تھی۔

”ہاں...“ کمرے میں تین ہاں ایک ساتھ گونجے۔

”تو وہ بھاگ بھاگ کر ریان کے پاس... وہ کوکنگ...“ ملی اب بھی بے یقین تھی۔

”تمہارے لیے...“

”میرے لیے...؟“

”ہاں ریان تم سے محبت کرتے ہیں۔ اور تم سے شادی کرنا چاہتے تھے انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہارے دل کو ٹٹولوں... مگر تم تھیں کہ کسی صورت پکڑائی ہی نہ دی۔ الٹا وہ عذیر بھائی کو میرے پیچھے لگا دیا۔“

”ریان... مجھ سے... محبت...“ ملی نے دھپ سے بیڈ پر بیٹھنا چاہا مگر بیڈ دور تھا وہ دھڑام سے نیچے گری اور ساکت ہو گئی۔

”اسے کیا ہوا...“ مبین نے تشویش سے پوچھا۔

”مجھے لگتا ہے صدمہ برداشت نہیں کر سکی۔“ تائی اسے اٹھانے کو بڑھی مگر وہ یا ہو کا نعرہ لگاتی کھڑی ہو گئی۔

ہے جمالو۔ پاؤ لڈی ہے جمالو

لڈی ہے جمالو...

تینوں ہکا بکا اسے لڈی ڈالتے دیکھ رہے تھے۔ پھر تینوں اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔

✡

اُم طیفور

عکسِ حسن



”خالہ کوثر لنگڑی دلہن بیاہ کر لے آئیں۔“ خبر تھی کہ آگ جو سارے میں پھیلی تھی۔ ہر بچہ، بڑا بوڑھا سُن گُن لینے کی کوششوں میں تھا۔ جس نے بھی سنا منہ میں انگلیاں دابے خالہ کوثر کے گھر کی طرف چل پڑا تھا۔ عورتوں کا ایک جم غفیر تھا جو خالہ کوثر کے گھر میں دھرنا مارے بیٹھا تھا مگر وہ بھی ایک کائیاں تھیں۔ کسی کو بھی دلہن کا منہ دیکھنے نہیں دیا اور محلے کی ”وہلی“ عورتیں تھیں کہ اٹھنے کا نام نہ لے رہی تھیں۔ لگے ہاتھوں محلے کی ایک نائن نے خالہ کوثر کو ایسا طعنہ مارا کہ ماؤ دکھتی رگ چھیڑ دی۔ بس پھر ٹھیک ڈیڑھ گھنٹے بعد خالہ کوثر کا صبر جواب دے ہی گیا اور انہیں دلہن کے بجائے اپنی دو دھاری زبان کی ”رونمائی“ کرانی پڑ گئی اور پھر جو مغلظات کا ”سونامی“ ان کے منہ سے نکلا، اس نے ساری عورتوں کو بچوں سمیت گھر سے اٹھا کر گلی میں دے مارا۔

خالہ کوثر نے سکون سے دروازہ بند کیا اور مڑ کر ان تین، چار عورتوں کے پاس آ بیٹھیں، جنہوں نے ہمیشہ خالہ کوثر کے معاملات میں ٹانگ اڑانے سے احتراز برتا تھا۔ باہر گلی میں ان کی اس حرکت کی وجہ سے کیا ہنگامہ تھا انہیں چنداں پریشانی نہیں تھی۔

✡ ✡ ✡

خالہ کوثر محلہ باغبان پورہ کے مکان نمبر 111 کی ایک دلچسپ مکین تھیں۔ وہ سارے محلے کی خالہ تھیں، چاہے چھوٹا یا بڑا، چوہڑا ہو یا چمار، دودھ والا ہو یا کوئی دکان دار انہیں خود کو خالہ کہلوانا ہی پسند تھا۔

چار بچوں کا بچپنا ابھی گیا بھی نہ تھا کہ خالہ کوثر پہ بہت بڑی افتاد آن پڑی۔ شوہر ٹریفک کے حادثے میں

دونوں ٹانگیں تڑوا بیٹھے جن کو علاج کی غرض سے کاٹنا پڑا۔ تب سے شوہر بے کار تھے اور خالہ گھربار سنبھالے بیٹھی تھیں۔

اچھے علاقے میں چند دکانیں تھیں، جن کا کرایہ آتا تھا اور خرچ چلتا تھا۔ بس تب سے کوثر بی، خالہ کوثر بن گئیں، کہہ کہہ کر سب کے منہ سے زبردستی خالہ کہلوایا اور جوانی کو نبھایا۔ اچھوں کے ساتھ اچھی تھیں اور بروں کے ساتھ رج کے بری۔ خاص طور پر خالہ کوثر کی زبان کے جوہر اس وقت کھل کر سامنے آتے جب کوئی محلے دار ان کے گھر کی سن گن لینے کی کوشش کرتا۔ تب خالہ کی زبان دودھاری تلوار ہوتی جس سے اگلے کا تیاپانچا ہوجاتا۔

اولاد میں چار بیٹے ہی تھے، اس لیے ٹھسے سے رہتی تھیں۔ دل کی بری نہیں تھیں مگر زمانے کے سرد وگرم نے خود غرضی کو طبیعت کا حصہ بنا ڈالا تھا۔ اپنا کام کسی نہ کسی بہانے نکلوانے میں ماہر ہوچکی تھیں۔ محلے دار شریف لوگ تھے، عزت کرتے تھے سو جس سے جس قدر بن پڑتا، خالہ کا ساتھ دیتا تھا۔ یوں جیسے تیسے بچوں کا بچپنا، خالہ کی جوانی اور ان کے شوہر کی معذوری ایک ساتھ بیت گئی۔

خاوند کی موت کے بعد کم از کم انہیں یہ فکر نہیں تھی کہ بچے کیسے پلیں گے کیونکہ چاروں بیٹے ہنرمند تھے اور کماتے تھے۔ کچھ تھوڑا بہت پڑھ لکھ بھی گئے، سو اب راوی خالہ کے لیے چین ہی چین لکھتا تھا۔ اب فکر تھی تو بس بہوئیں لانے کی۔ بیٹے شکل و صورت کے اچھے تھے۔ سو رشتہ ملنے کی فکر نہ تھی۔ اصل فکر تو یہ تھی خالہ کوثر نے کسی سے بھی رشتے کی بابت کچھ نہ کہا تھا۔

محلے کی کئی عورتیں جو اس طرح کے کاموں میں اچھل اچھل پڑتی تھیں، بے چین و بے قرار خالہ کے گھر کے چکر کاٹتی تھیں کہ کب کس سے وہ رشتے کے بارے میں پوچھیں مگر خالہ نے "بھوڈھونڈھمھم" کسی کو نہ سونپی پھر یہ بھی ہوا کہ دنیا نے چاند چڑھتا دیکھ ہی لیا۔ خالہ کوثر نے چپ چپاتے بڑے بیٹے ذوالفقار کا رشتہ محلے ہی کی ایک شریف النفس اور پڑھی لکھی لڑکی سے طے کیا اور دو دن کے وقفے سے نکاح پڑھوا دیا۔ رخصتی آٹھ ماہ کے وقفے سے مانگی، محلے کی نام نہاد "وچولنیں" دیدے پھاڑے، پاؤں پسارے اپنے گھروں میں بیٹھی رہ گئیں۔ لڑکی کا نام ہما تھا، والدین بھی سیدھے سادے اور اچھے لوگ تھے۔

جس دن خالہ کوثر نے بیٹے کا نکاح کیا۔ سارا محلہ میٹھے چاولوں کی دیگوں پہ آبیٹھا تھا۔ خالہ نے بھی خوب محلے والوں کے دل ٹھنڈے کیے۔ رج رج کے دیگیں لٹائیں۔

ابھی ہفتہ گزرا تھا کہ سننے میں آیا کہ ہما یعنی خالہ کوثر کی بہو بیمار ہے۔ دائیں ٹانگ میں ران کے نیچے چھوٹا سا پھوڑا نکلا تھا۔ جس کی تکلیف نے اٹھنا بیٹھنا دوبھر کررکھا تھا۔ اب تو بخار بھی چڑھا رہتا۔

خالہ کوثر خود اپنی بہو کو ساتھ لیے ڈاکٹروں کے پاس ماری ماری پھریں مگر آرام آکر نہ دیا۔ پھوڑے نے ناسور کی شکل اختیار کرلی تھی۔ ہر دوسرے دن کا کھیل بن گیا تھا ڈاکٹر سے چیرا لگوانا۔ دو دن ذرا افاقہ ہوتا پھر وہی تکلیف۔ اب تو محلے کی عورتوں میں بھی کھلبلی مچ گئی، تالی پہ تالی مارتیں اور کمر مٹکا کر کہتیں "یہ رشتہ ٹوٹے ہی ٹوٹے" لڑکی والوں کی نیندیں حرام اور سکون غارت کیے دے رہی تھی یہ بیماری۔

خالہ کوثر سرد وسپاٹ چہرہ لیے ہواؤں کے رخ کو سمجھ رہی تھیں مگر منہ سے کچھ نہ پھوٹیں۔ ذوالفقار بھی روز شام کو ماں کے گھٹنے سے گھنٹہ جوڑے بیٹھتا، اس آس میں کہ ماں اب اس رشتے کے حوالے سے کیا کہتی ہے؟ اسے ہما سے انسیت سی ہوگئی تھی اور ماں سے محبت تھی۔ جیسا ماں کہتی وہ یقیناً ویسا ہی کرتا مگر وہ یہ پھانس نکالتیں بھی تو۔۔۔! کل شام ہی خالہ کوثر ہما کی طرف سے ہو کر آئی تھیں اور بہت فکرمند تھیں۔

ہما کی ٹانگ کا زخم خشک تو ہوگیا تھا مگر اس کی ٹانگ کا گوشت زخم کے آس پاس سے سکڑ کے اکٹھا ہوگیا تھا۔ جس سے چال میں واضح لنگڑاہٹ آگئی تھی۔

یہاں تک تو تھا سو تھا مگر اصل مسئلہ یہ تھا کہ وہ چارپائی کی ہو کر رہ گئی تھی۔ دو قدم بھی چلتی تو خشک زخم رسنے لگتا۔ ڈاکٹروں کے بقول زیادہ سے زیادہ بیڈ ریسٹ ہی تھا جو شاید اس کے ناسور کو مستقل ٹھیک کردیتا اور اسے صحیح ہونے میں کتنا وقت لگنا تھا، یہ تو رب ہی جانتا تھا مگر خالہ کوثر کے بیٹے ذوالفقار کا گھوڑی چڑھنے کا پروگرام کھٹائی میں پڑ گیا تھا۔ لوگوں کی زبانیں ان کے دہانوں سے باہر لٹک رہی تھیں اور خالہ کوثر کا چہرہ کسی پتھر کی طرح ساکت تھا۔ ان کے دل ودماغ میں کیا اکھاڑ پچھاڑ چل رہی تھی اس سے تو ان کی پرچھائیں بھی واقف نہ تھی، گھر میں کسی کو کیا خبر ہوتی۔ محلے والوں نے کریدنا چھوڑ دیا کہ وہ جانتے تھے خالہ کوثر جیسی اتھری گھوڑی بیماری کی پوٹ کو خود پہ لاد کے کبھی گھر نہیں لائے گی۔ سب عورتیں گھروں میں بیٹھی طعنوں کے نشتر پلوؤں میں باندھے تیار تھیں۔ جیسے ہی یہ رشتہ ٹوٹتا ہے سارا محلہ لڑکی والوں کا [illegible] بن کر خالہ کوثر کا دیوانہ پیٹتا نظر آتا۔ بس بلی تھیلے سے باہر آنے کی دیر تھی۔

اور پھر ایک دن بلی چھوڑ تھیلے میں سے کتا (بچھڑا) برآمد ہوا۔ صبح سارا محلہ خالہ کوثر کے گھر کو منہ اٹھائے حیرت سے تک رہا تھا۔ یہ بھی عجب معمہ تھا۔ پورا گھر شادیوں میں کی جانے والی لائٹنگ سے سجا تھا۔ حیرت سی حیرت تھی کہ راتوں رات کس جن نے یہ کام کیا تھا۔ نہ کوئی کھٹکا نہ رولا۔ کچھ عورتوں نے فٹافٹ اپنے بچے بغل میں دبائے اور پہنچ گئیں لڑکی والوں کی طرف، آخر ایک ہی تو محلہ تھا۔ پر وہاں تو آثار ہی کچھ نہ تھے۔ ہما کے والدین پریشان صحن میں بیٹھے تھے کہ محلے کی کوئی تیز گام ان تک پہنچ چکی تھی۔ تکلیف اور دکھ سے سارے گھر والوں کے چہرے کھنچے ہوئے تھے۔

ہما اندر کمرے میں چارپائی پہ لیٹی خون کے آنسو رو رہی تھی۔ خالہ کوثر کچھ تو کہتیں۔ یوں اچانک دھچکا تو نہ لگتا۔ آخر وہ ابھی بھی ذلفی کی منکوحہ تھی (اف! کس چاہت سے ذوالفقار کو ذلفی کہنا شروع کیا تھا) پر سب غارت ہوگیا۔

تھوڑی دیر گزری تو خالہ کوثر تمام گھروں میں ولیمہ کا نیوتا دے گئیں۔ بارات کا یہ کہہ کر ٹال دیا کہ لڑکی والوں کو زیادہ مہمان داری وارا نہیں۔ پھر ادھر دوپہر ڈھلی، خالہ نے برقع سر پر رکھا، اپنے خاص الخاص جوڑے پہ نظر ڈالی اور نک سک سے تیار ذوالفقار کی بانہہ پکڑی، باقی تینوں بیٹوں کو آنکھ کا اشارہ بہت تھا، تینوں نے کندھے سے کندھا جوڑ چوکھٹ پار کی اور یوں یہ پانچ نفوس پہ مشتمل بارات خاموشی سے روانہ ہوئی۔ راستے میں جس جس نے دیکھا، گھر اطلاع دینے بھاگا۔ تھوڑی دیر میں گھروں کے دروازے بجنا شروع ہوگئے تھے مگر خالہ کوثر سب سے بے نیاز اپنے چار "کاکے" تھامے خراماں خراماں چلتی ہوئی ایک گھر کے تھڑے پہ آکر کھڑی ہوچکی تھیں۔ پیچھے آنے والے ٹولے کو دیکھ کر خالہ نے شان سے ابرو اچکائے اور دھاڑ سے لکڑی کا خستہ حال دروازہ بجایا اور جھٹ دہلیز پھلانگ اپنے ٹبر سمیت اندر چلی گئیں۔

چھوٹے سے صحن میں ہما کا بھائی اور باپ سرنیہوڑائے بیٹھے تھے، ہما کی ماں اور چھوٹی بہن اس کی منجی کمرے سے نکال کر برآمدے میں گھسیٹ رہی تھیں۔ جس پہ ہما بدستور لیٹی دکھائی دی۔ بے چاری کو ہوا لگوانے ماں باہر نکال دیتی تھی۔ اب جو سامنے تن کر کھڑی خالہ کوثر اور اس کے چار عدد مشٹنڈوں پہ نظر پڑی تو جھٹ پائنتی پہ پڑے گولا بنے کھیس کو ہما کے منہ پہ دے مارا، جس کے نیچے مضحکہ خیز انداز میں کھلا ہما کا منہ چھپ گیا تھا، جو نجانے حیرت سے کھلا تھا یا خوشی سے۔ اس کا باپ اور بھائی بھی اپنی جگہ چھوڑ بت بنے کھڑے تھے۔

پریشانی میں ابھی تک کسی نے بیٹھنے کو بھی نہ کہا تھا۔ تب ہی اچانک ہما کی ماں کو خیال آیا اور لپک کر خالہ کی طرف بڑھی مگر خالہ کوثر نے بیٹھنے کے بجائے اپنے چھوٹے بیٹے کے ہاتھ سے ایک سفید لفافہ پکڑا، اسے کھول کر اندر سے زرتار لال دوپٹہ نکالا اور ہما کی چارپائی کا رخ کیا، جہاں ہما بے چاری نے مارے شرم کے ابھی تک منہ سے لپٹے کھیس کو پرے نہ کیا تھا۔

خالہ نے آگے بڑھ کر چہرے سے کھیس ہٹایا' سہارے سے بٹھایا اور جھٹ وہ لال دوپٹہ ہما کے سر پہ دے دیا۔ وفور جذبات سے دوچار کس کس کے جھپھیاں ڈالیں اور منہ ماتھا چوم کر برے ہو گئیں۔

اتنے میں خالہ کوثر کا چھوٹا لڑکا ابوبکر ساتھ لائی مٹھائی کی بڑی سی ٹوکری کھول کر سب گھر والوں کا منہ میٹھا کرانا شروع ہو گیا۔ ہما کے ماں باپ تشکر کے مارے آنکھیں میچے رو رہے تھے۔ سب سمجھ میں آگیا تھا' اب کوئی غلط فہمی نہ تھی۔ اتنے دنوں سے چھائے بدگمانی کے بادل چھٹے تو خوشیوں کی جھلملاتی کرنوں نے سب کے چہروں کو آفتاب کر دیا۔ پر اگلا منظر اس سے بھی زیادہ عجیب تھا' جب خالہ کوثر کی تیز اور اونچی آواز کی گونج سنائی دی۔

"چلو وے منڈو! چل ابوبکر' آجا پتر' عثمان' عبداللہ تم دونوں بھی اس پاسے سے پکڑ لو۔ چکو منجی اور لے چلو پرجائی نوں گھر' چلو شاباش! مغرب سے پہلے پہلے دیگیں بھی پکوانی ہیں۔"

ذوالفقار کو چھوڑ' باقی تینوں جھٹ آگے بڑھے اور چارپائی یوں ہوا میں اونچی کی جیسے اوپر کوئی بھی بیٹھا نہ ہو اور پھر بیماری نے ہما بےچاری کا وزن چھوڑا بھی کتنا تھا۔

"مگر خالہ کوثر! ایسے کیسے بچی رخصت کر دیں؟ نہ جوڑا نہ لتا' نہ لیا نہ دیا' لوگ کیا کہیں گے۔"

ہما کی ماں پریشان اور عاجز ہو کر گھگھیائی کہ آخر کو بیٹی کا نکاح تو ہو چکا تھا حق تھا۔ ان لوگوں کا۔

"فٹے حال! ابھی بھی تجھے انتظار کرنا ہے؟ پاغلے پورا محلہ خالہ کوثر کے دوالے ہوا پھر رہا ہے کہ یہ نہ بیاہے گی اب ہما کو۔ بےچاری کے ساتھ عیب جو لگ گیا ہے اور تو ابھی جوڑے ٹانکنے کی فکر میں ہے مگر خالہ کوثر کو ابھی تو جانتی نہیں۔"

سینے پہ ہاتھ مارتے ہوئے خالہ کوثر نے کرسی سنبھالی۔ یعنی ابھی انہیں لمبی بات کرنا تھی۔

"میں مر سکتی ہوں پر زبان سے نہیں پھر سکتی۔ کیا ہے جو اللہ نے مجھے بیٹی نہ دی پر میں خود تو کبھی کسی کی بیٹی تھی نا' کیا میں نہ سمجھوں گی تیرا دکھ؟ اور بیماری تو بادشاہوں کو بھی گھیر لیتی ہے' ہم تم تو پھر فقیر ہیں۔ اب اگر میری بیٹی کی قسمت میں صحت ہے تو وہ اسے میرے ہی گھر میں ملے گی اور اگر اس بیماری کے ہاتھوں خواری لکھی ہے خدانخواستہ تو وہ بھی ذوالفقار اور یہ دونوں اکٹھے جھیلیں گے۔ ہم خود علاج کرائیں گے اس کا' باقی جو میرے اللہ کو منظور۔"

خالہ نے اپنی بات ختم کرتے ہی کرسی چھوڑی اور سر پہ ٹکے برقعے کو سیٹ کیا' پھر اجازت طلب نظروں سے ہما کے ماں باپ کو دیکھا جو مسلسل شکرانے کے آنسو بہا رہے تھے۔ ادھر چارپائی پہ ٹنگی ہما کی سسکیوں کا الاپ بھی جاری تھا۔ دونوں نے آگے بڑھ کر ہما کو الوداعی پیار دیا' جس کی چارپائی کو اس کے دیوروں نے ان کی مشکل آسان کرنے کے لیے نیچے رکھ دیا تھا' تاکہ وہ آرام سے اپنی بیٹی کا سر اپنی چھاتی سے بھینچ سکیں۔

خالہ کوثر نے آگے بڑھ کر ہما کو اسی کھیس سے اچھی طرح لپیٹا جو اس کی چارپائی پہ اول وقت سے دھرا تھا' یوں کہ اس کا بال بال اس کھیس میں چھپ گیا اور پھر ماں کے اشاروں پہ گھوٹے' جھوٹتے بچے جمورا یعنی ذوالفقار کو ٹھوکا دیا کہ اٹھ کے اس ننگی جنگی جنج (چھوٹی سی بارات) کے آگے لگے۔ وہ تابعدار اور فرمانبردار ایک نظر اپنی "چارپائی والی دلہن" پہ ڈال کر دروازے کے پاس آلگا۔

باقی سب گلے ملنے ملانے میں مصروف ہوئے تو ذوالفقار نے باہر جھانک کر حالات کا اندازہ لگانے کی کوشش کی مگر اگلے ہی پل ہراساں ہو کر سر واپس اندر گھسیٹ لیا۔ مڑ کر "ننگی جنگی جنج" (چھوٹی سی بارات) کے پاس آکر کھڑا ہوا اور چارپائی کا اگلا پایا پکڑے ابوبکر اور باقی دونوں بھائیوں کے قریب سرگوشی میں کہا۔

"جانثاروں! فار مولا نمبر تین پنج دوڑ (بھاگو' دوڑو)"

تینوں نے اثبات میں سر ہلایا اور چارپائی کو سر پہ اٹھایا۔ خالہ کوثر کو آگے لگایا۔ ذوالفقار نے بیوی کا مکھڑا چھپایا۔ پھر جیسے ہی خالہ کوثر نے سر باہر نکالا' پورا محلہ ماجرا معلوم کرنے کو امڈ آیا مگر خالہ کوثر کے شیروں نے زوردار نعرہ لگایا اور جتے ہوئے کھوتے' گھوڑوں کی سی تیزی سے چارپائی کو وہ بھگایا' وہ بھگایا کہ اگر ذوالفقار آگے بھاگا نہ آرہا ہوتا تو وہ تینوں یقیناً "اندھوں کی طرح محلہ پار کر گئے تھے۔ ابھی بھی دو گھر آگے تو نکل ہی گئے تھے۔ بےچاری ہما پہلے ہی جھٹکے پہ جو چت لیٹی تو ابھی تک اسی پوزیشن میں تھی۔

نا معلوم کھیس کے اندر مسکین کا کیا حشر تھا۔

ذوالفقار نے فٹافٹ دروازہ کھولا اور بھائیوں عرف جانثاروں کو جلدی سے اندر کر کے کمرے میں چارپائی لے جانے کو کہا اور خود یہ سوچ کر کہ اماں تو ابھی محلے والوں کے نرغے میں پھنسی سوال جواب کر رہی ہوگی' مڑ کر دروازہ بند کرنے ہی والا تھا کہ خالہ کوثر کا چہرہ نمودار ہوا اور پیچھے پیچھے باقی سارا محلہ بھی باراتی بن کر ان کے وسیع و عریض صحن میں آن گھسا تھا۔ بس پھر کیا تھا' کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ابھی مزید عورتیں آرہی تھیں' جنہیں خبر دیر سے ہوئی تھی۔ اب وہ کونے کھدروں میں کھڑی "دلہن والوں" کو کینہ توز نظروں سے گھور رہی تھیں۔

اس وقت خالہ کوثر کا صبر و برداشت دیکھنے والا تھا۔ وہ بڑے تحمل سے سب کے سوال نمٹا رہی تھیں اور عورتوں کا سیاپا یہ تھا کہ انہیں کچھ بھی مرچ مسالے دار خبر نہیں مل پا رہی تھی' اس لیے مختلف زاویوں سے خالہ کی اس قربانی کا پوسٹ مارٹم جاری تھا۔ اخیر ایک نائن بولی اور ستھرا بولی کہ "خالہ کوثر نے لگتا ہے کوئی جائیداد نام کرائی ہے یا ہما کے باپ بھائی کی چلتی دکان۔"

بس اتنا سننا خالہ کوثر جیسی عورت کے لیے قیامت تھا۔ آستینیں اونچی کیں اور وہ روح تک جھنجھوڑ دینے والی گالیاں نکالیں کہ پل کے پل میں تمام عورتیں چوکھٹ سے باہر تھیں۔ سوائے چند کے جنہیں محلے کی سیاست میں کوئی دلچسپی نہیں تھی کیونکہ ان کی عمر بھی اب قبرستان سے دلچسپی رکھنے والی تھی۔ انہی میں سے ایک نے اٹھ کر خالہ کوثر کو پانی پلایا اور ٹھنڈا کیا۔ مگر خالہ کوثر نے دو گھونٹ پی کر گلاس پرے کیا اور پھر جو روئیں تو چاروں بیٹے بھی پریشان سے باہر بھاگے آئے۔ جھٹ ماں کو گھیرے میں لیا اور لگے ہاتھ پیر دابنے۔

ذرا دیر کو چپ ہوئیں تو پاس بیٹھی اماں رشیدہ کو دیکھا' جو عمر رسیدہ اور تجربہ کار عورت تھی۔ اسی کے پیٹے میں تھی پر حواس سلامت تھے۔ خالہ کوثر کے میکے اور سسرال کے تمام افراد کو ذاتی طور پر جانتی تھی۔

"کیوں اماں رشیدہ! تم تو میرے پچھلوں سے بھی واقف ہو نا۔" خالہ رشیدہ نے ٹھنڈا ہوکا بھر کر اثبات میں سر ہلایا' جان گئی تھی اب خالہ کوثر کس کا حوالہ دینے والی تھی۔

"اماں! طاہرہ یاد ہے تجھے؟ میری بڑی بہن۔ کیسی الہڑ اور سوہنی تھی۔ چٹی دودھ تھی۔ یہ پاء' پاء کے تو ڈیلے تھے۔"

خالہ نے دونوں ہاتھ اٹھا کر جیسے آنکھوں کا وزن کیا تھا۔

"گیارہ سال کی نکاحی گئی تھی میرے خالہ زاد سے۔ ادھر پندرھواں سن چڑھا اور موئی چیچک نے آلیا۔ مرتے مرتے بچی تھی پر کاش مر جاتی اس وقت چہرہ ٹوئیوں ٹبوں سے بھر گیا بےچاری کا' مگر اک چہرہ ہی تو خراب ہوا تھا' وہی مقدر بھی ڈبو گیا۔ بڑا علاج کرایا۔ جہاں تک بوڑھے ماں پیو کر سکے۔ انہوں نے کیا۔ دو ہی تو ہم بہنیں تھیں نہ کوئی بھائی تھا جو بازو بنتا۔ تین سال تک نہ دن دیکھا نہ رات' بس بھاگ دوڑ میں ہی نکل گیا مگر سوئے مقدر نہ جاگے۔"

خالہ کوثر دیوار کو تکتی ارد گرد سے بالکل بیگانہ اپنی ماں جائی کا دکھ بتا رہی تھیں' باقی سب دم سادھے سن رہے تھے کہ اماں رشیدہ کے علاوہ باقی سب کے لیے یہ کہانی نئی تھی۔

"پھر ہمارے محلے میں بھی ایسا ہی اک دن چڑھا' صبح سویرے ہمارے محلے کا اللہ دتہ' حلوائی بھاگا آیا تھا میرے ابے کے پاس کہ تمہارے ہونے والے جوائی کے گھر سے اسے بڑا لمبا چوڑا مٹھائی کا آرڈر ملا ہے جو اسے عصر تک تیار کر کے دینا ہے اور خوشی کی بات کہ وہ مٹھائی ادھر کو ہی آنی ہے' کیونکہ لڑکے کا نکا بھرا کہہ کے

گیا ہے کہ چاچا مٹھائی دکان پہ ہی رکھ لینا، ہمیں بارات لے کر خالہ جمیلہ (کوثر کی ماں) کے محلے میں ہی لانا ہے۔ یعنی بھلیا لو کا وہ لوگ تیری دھی بیاہنے آ رہے ہیں تجھے اطلاع دیے بغیر، تاکہ اتنے سالوں کی کدورت جھٹکے سے مک جائے۔ آخر دھڑکا بھی تو بڑا تھا نا طاہرہ کی بیماری کے بعد سے۔ بس تو بھی تیاری پکڑ۔ اپنی طرف سے ماڑی موٹی رخصتی کر کے بوجھ اتار جس طرح وہ تجھے حیران کریں، ویسے ہی تو انہیں چونکا دینا اللہ اللہ خیر صلا۔" اللہ دتہ حلوائی صافہ جھاڑ کر اٹھتے ہوئے بولا۔

بس پھر کیا تھا، مچ گئی سارے میں ہڑبونگ، وہ تھرتھلی مچی کہ اس بھاگ دوڑ میں اماں ابا آپس میں ہی ٹکراتے پھرتے تھے۔ فٹافٹ پیٹیاں، بکسے کھولے اور بند کیے گئے۔ ضرورت کا سامان چیک کر کے تسلی کی گئی۔ سردست اماں کا شادی کا لال زرتار دوپٹہ پڑا تھا جسے آپا طاہرہ نے اپنے نئے نکور جوڑے کے اوپر ہی اوڑھ لیا تھا۔ اس کا چیچک زدہ چہرہ جیسے دہکتا انار بن گیا، تھوڑی ہی دیر میں وہ کیا سے کیا لگنے لگی تھی۔

میں بھی کپڑے بدلے کچن میں گھسی مٹنجن بنانے کی تیاری کرنے لگی کہ اس وقت جلدی میں یہی بن سکتا تھا، ہلکا پھلکا سب ہی کچھ تیار تھا۔ اماں ابا خوشی کے مارے ایک دوسرے کو دیکھ کر بلاوجہ ہنس دیتے۔ اماں بار بار اپنی چھوٹی بہن کو تصور میں "شریر نہ ہو تو" کہہ کر کھلکھلا دیتی کہ اسی بہن کے بیٹے سے ہی تو طاہرہ نکاحی گئی تھی۔ اماں کے دو اوپر تلے کے بچے پیدا ہو، ہو کر مرتے گئے اور بچ گئیں ہم دو بہنیں۔ اسی لیے طاہرہ کا جوڑ بن گیا خالہ کے بیٹے سے، کیونکہ عمر میں وہ طاہرہ سے تین سال بڑا تھا۔

صبح سے دوپہر ہوئی اور پھر مغرب، جس وقت گلی کے نکڑ پر پٹاخے پھوٹنے کی آواز سنائی دی ہم چاروں جی، جواب انتظار کر کر کے اوبنے لگے تھے، جیسے پھر سے جی اٹھے۔ آپا جھٹ لپک کر اندر کمرے کی طرف بھاگی اور اماں سرسوں کے تیل کی شیشی لینے چلی گئی اور رہ گئے میں اور ابا تو ہم دونوں بے چین و بے قرار دروازے کے پاس چکرانے لگے۔ باہر پٹاخے پھوٹتے رہے، لوگوں کی بھگدڑ مچی رہی، قہقہوں اور ہنسی کی آوازوں میں اپنوں کی آوازوں نے یقین دلایا کہ بس خوشی اب چند ساعت کی دوری پہ ہے۔ کسی کسی وقت چھوٹی خالہ کی چہکتی آواز کان میں پڑتی تو ہمارے چہرے خوشی سے چمکنے لگتے۔ ابا بس ہلکے سے کھٹکے کا ہی منتظر تھا۔ وہ پہلی دستک جو دروازے پہ پڑتی اور بس ابا لمحے کے ہزارویں حصے میں دروازہ کھول دیتا اور اس کی روگی بیٹی کی خوشیاں سیلابی ریلے کی صورت ان کے چھوٹے سے صحن میں بہتی نظر آتیں مگر کھڑے کھڑے پاؤں شل ہو گئے، گھر سے باہر صرف بچوں کا شور سنائی دینے لگا تھا۔ حیرت تھی کہ ابھی تک باراتیوں نے ان کا دروازہ نہیں بجایا تھا۔ اماں تو کب سے کہہ رہی تھی۔ دروازہ کھول، پر ابا دستک کے انتظار میں ٹالتا رہا۔

مجھ سے آپا کا کمرے کی تاریکی سے جھانکتا بجھا ہوا چہرہ دیکھا نہ گیا اور میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ پر کاش میں ایسا نہ کرتی۔ اماں کھڑے قدموں سے صحن میں گری تھی، ابا نے بھی دروازے کا ختہ پٹ تھام لیا تھا اور آپا! میں نے مڑ کر دیکھا تو مجھے کمرے میں صرف اندھیرا دکھائی دیا۔ اس کے نصیبوں کا اندھیرا!

بارات آئی تھی، بڑی شان سے آئی تھی، آپا کے شوہر کی ہی آئی تھی، پر آپا کے لیے نہیں بلکہ سامنے، بالکل سامنے والے گھر کی ذکیہ کے لیے۔ اف! کیسا اوچھا وار کیا تھا خالہ نے۔ نہ طلاق دی اور نہ بیاہی، پتا نہیں کس چیز کا بدلہ خالہ نے لیا آپا سے؟ بس "مرے کو مارے شاہ مدار" والا حساب تھا۔ نہ ذکیہ کے گھر والوں کو شرم آئی لڑکی دیتے اور نہ خالہ کو غیرت۔ عجیب پتھر دل تھے۔ کہیں دور سے لے لیتے رشتہ! کمی تو نہ تھی۔ سامنے کھڑے ہو کر منہ پر تھوک دیا تھا۔

میں نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا کہ میرے کانوں میں ذکیہ کی رخصتی کی آواز پڑی تھی اور میں نہیں چاہتی تھی کہ ہم لوگوں میں سے کسی پہ بھی ان کی نظر پڑے۔ بند دروازے کے پیچھے تو ہمیں اب رونا ہی تھا، پر سامنے کرتا اٹھا کر پیٹ کیوں ننگا کرتے۔ میں جلدی سے پلٹ کر اماں ابا کو نظر انداز کرتی آپا کے کمرے کی طرف گئی۔ اندر گھپ اندھیرا تھا، اسی اندھیرے میں آپا کی آواز سنائی دی۔

"کوثر! مجھے مت بلانا، میں سو رہی ہوں، اماں ابا سے کہہ۔ حوصلہ کریں، دکھ بہت بڑا ہے، ابھی سے ہمت نہ ہاریں۔"

اور میں چپ چاپ پلٹ گئی۔ کاش میں آپا کے پاس جاتی، اس کی دلجوئی کرتی، پر میں اماں کے رونے کی آواز سن کر صحن میں آ گئی، پھر میں تھی، ابا اور اماں تھے اور ہمارے بے حساب آنسو جو ہمیں اگلے کتنے دن تک بہانے پڑے۔

صبح فجر وقت طاہرہ آپا مر گئی۔

اماں نے دیکھا تھا اسے آخری ہچکی لیتے، جوان بیٹی کی حالت دیکھی، ایسی پتھر ہوئی کہ دہلیز پہ ہی ڈھے گئی، آگے بڑھ کر اس کا سر اپنی گود میں نہ لے سکی۔ چلو! اس کی تکلیف تو کم نہ ہوئی پر۔۔۔

گھپ سناٹے میں خالہ کوثر کی سسکیوں کی آواز کانوں میں پڑ رہی تھی۔ ہما نہ جانے کس طرح گھسٹتی خالہ کے پاس آ بیٹھی تھی اور اب گوڈے پہ سر رکھے زار زار رو رہی تھی۔ چاروں لڑکے یوں دکھی تھے جیسے انہوں نے ہی خالہ طاہرہ کو قبر میں اتارا تھا۔ اماں رشیدہ جو اسی اللہ دتا حلوائی کی بہن تھی، ہر اس دکھ سے واقف تھی جو خالہ کوثر کے بچھلوں نے اٹھائے تھے اور جو ایک آدھ دوسری عورتیں بیٹھی تھیں، ان پہ آج خالہ کوثر کی شخصیت کے بھید کھلے تھے۔

"بڑا ٹائم لگا ہمیں اس غم سے نکلنے میں۔" ایک بار پھر خالہ کوثر کی ہی آواز نے سب کو متوجہ کیا۔

"بڑی باتیں بنائیں ظالموں نے کہ طاہرہ نے خود کشی کر لی، کانچ کھا لیا۔"

"ارے نہیں، نہیں سنکھیا تو خود محلے کے جمعدار سے منگواتے دیکھا تھا۔" "بس کیا بتاؤں، جتنے منہ اتنی بکواس پر ہم جانتے تھے اسے دل کا دورہ پڑا تھا، سہہ نہیں سکی تھی وہ یہ ذلالت۔"

بات کرتے کرتے خالہ کوثر نے یکدم ہما کو دیکھا تو فوراً آنسو پونچھ کر اسے سہارے سے اپنے ساتھ کرسی پہ بٹھایا اور بولیں۔

"اب یہ نمانی دیکھو! اللہ اس کو حیاتی دے اور خوشیاں دکھائے۔" خالہ کوثر نے محبت سے ہما کے ہاتھ تھامے۔

"سب مجھ سے یہ ہی آس لگائے بیٹھے تھے کہ میں اس بختوں والی کو طلاق دلوا دوں گی۔ ذوالفقار کے لیے کوئی دوسری کروں گی۔ اب تم ہی بتاؤ اماں رشیدہ! جس نے اپنی بہن ایسے ہی روگ کے ہاتھوں قبر میں اترتی دیکھی ہو، ماں پیو کو راتوں کو اٹھ اٹھ کر روتے دیکھا ہو اور ساری رات دعائیں مانگتے سنا ہو کہ "یا اللہ! ایسا کسی دشمن کی دھی کے ساتھ بھی نہ ہو۔۔۔" تو پھر میں کیسے ان بڈھوں کی دعائیں مٹی کرتی۔ ایک اور طاہرہ غرق کر دیتی اور ایک اور ماں، پیو کو زندہ حالت میں مردہ کر دیتی اور پھر طاہرہ آپا کے چیچک کے داغ تو جانے کے نہ تھے پر میری دھی کا زخم تو ڈاکٹر کہتے ہیں بھلا چنگا ہو جائے گا اور چار دن میں اس کی سیوا کروں گی تو یہ کل کو میری ہڈیاں دبانے جوگی ہو گی نا! کیوں میری دھی! صحیح کہہ رہی ہوں نا میں؟"

خالہ کوثر نے ہما کا ماتھا چومتے اس سے استفسار کیا اور ہما بے چاری کیا کہتی، شرما کر دوبارہ گوڈے پہ سر دے مارا تھا۔ پاس بیٹھا ذوالفقار اور "نکی جنج جنیج" (بارات) محبت پاش نظروں سے ماں کو تک رہے تھے۔

جنہیں آج اندازہ ہوا تھا کہ ان کی ماں کتنی عظیم عورت ہے۔ ساری دنیا کے لیے بھلے سے وہ جو بھی تھی، کوئی اسے مطلبی، خود غرض کہتا تھا تو کوئی اس کی جلی کٹی سے خائف تھا۔ پر اس کا من خالص تھا جس نے آج ایک معذور لڑکی کو رانی بنا دیا تھا۔ وہ دردمند تھی، صاف نیت تھی، اور ایسے لوگوں پر رب اپنی رحمتیں ضرور نچھاور کرتا ہے۔ بھلا اس سے بڑھ کر جزا دینے والا کون ہے! پھر چاہے وہ دنیا میں نوازے یا آخرت میں۔۔۔!



آمنہ ریاض

مرگِ وفا

Hang-Ten سے نکلتے ہوئے میں اور نمل اچانک ایک دوسرے کے سامنے آگئے۔ چھ سال بعد ہونے والی یہ ملاقات اتنی غیر متوقع تھی کہ چند لمحے ہم صرف آنکھوں میں بے یقینی و خوشی کے رنگ سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے، پھر نمل بانہیں پھیلا کر مجھ سے لپٹ گئی۔

”نوریز! مجھے یقین نہیں آرہا، میں اتنے عرصے بعد تمہیں دیکھ رہی ہوں چھ سال....“

وہ خوشی سے بھرپور آواز میں بے تکان بول رہی تھی۔ میں نے بھی اسے پیار سے خود سے لپٹا کر کہا۔

”آؤ کسی قریبی کیفے میں بیٹھتے ہیں۔“

ہم دونوں ایک قریبی کیفے میں بیٹھ گئے۔ نمل شادی کے بعد ہالینڈ چلی گئی تھی۔ اس نے بتایا اس کے تین بچے ہیں۔ بچوں کو اکیلا گھر چھوڑ کر آئی تھی، اس لیے اسے جلدی گھر جانا تھا۔ اس نے کہا

”یہ تو بہت اچھا ہوا کہ تم سے یہاں ملاقات ہو گئی، میں بہت کم دنوں کے لیے پاکستان آئی ہوں۔ تم ایسا کرو، اس کاغذ پر مجھے اپنے گھر کا ایڈریس لکھ کر دے دو۔ ان شاء اللہ پہلی فرصت میں تمہارے گھر کا چکر لگاؤں گی۔ ہاں سنو۔ ایڈریس کے ساتھ اپنا کانٹیکٹ نمبر بھی لکھ دینا۔“

میں نے ایڈریس لکھ کر اسے پکڑا دیا۔

”اپنا کانٹیکٹ نمبر بھی دو مجھے۔“ میں نے کہا۔

”ہاں.... کیوں نہیں۔“ اس نے چٹ پر نظریں

مکمل ناول



ڈالتے ہوئے کہا۔

"ویسے نویرا! تمہیں دیکھ کر لگ نہیں رہا کہ میں چھ سال بعد تمہیں دیکھ رہی ہوں' بالکل ویسے کی ویسی ہو' پلیز یار! مجھے بھی تھوڑا سا وہ آبِ حیات دے دو جسے پی کر تم نے وقت کو خود پر روک لیا ہے۔"

"دکم آن..... تمہیں کیا ضرورت ہے وقت کو روکنے کی..... لک ایٹ یو..... پہلے سے زیادہ خوب صورت ہو گئی ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے اس کے صبیح چہرے پر نظریں ٹکا کر کہا۔

گو کہ وہ پہلے بھی خوب صورت تھی مگر اب اس کی خوب صورتی میں کئی گنا اضافہ ہو چکا تھا۔ ہاں وہ تھوڑی موٹی ضرور ہو گئی تھی۔ مگر اس چیز نے اس کی خوب صورتی کے تاثر کو کم نہیں کیا تھا۔

میری بات پر نمل نے ایک چھوٹا سا خوب صورت قہقہہ لگایا۔ "انہیں تو میرے موٹاپے کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ محترم فرماتے ہیں تین کے بجائے چھ بچوں کی اماں لگتی ہو۔"

"تمہاری تعریف نہیں کرتے؟" میں نے اس کی بات کو غیر سنجیدگی سے لیتے ہوئے پوچھا۔

"ارے..... تعریف کریں گے تو سر نہیں چڑھ جاؤں گی۔" نمل نے سابقہ انداز میں کہا۔ "ویسے بھی وہ صرف اپنی گرل فرینڈز کی تعریف کرتے ہیں۔"

میں اسی وقت اورنج جوس پی رہی تھی۔ مجھے پہلا ہی سپ اپنے حلق میں اٹکتا ہوا محسوس ہوا۔ نمل نے اپنی بات ختم نہیں کی تھی۔ وہ مستقل لاپروائی سے بول رہی تھی۔

"اس بار جب میرا پاکستان آنے کا پلان بنا تو میں نے ان سے کہا' آپ بھی اس بار ہمارے ساتھ چلیں۔ ایکچوئیلی بچے انہیں یہاں آکر بہت مس کرتے ہیں' تو میں نے کہا' آپ بھی چلیں' ایک مہینے کی تو بات ہے' کہنے لگے ایک مہینہ ہتھر کے بغیر رہنا بہت مشکل ہے۔ اچھا ہے تم اور بچے پاکستان چلے جاؤ' میں اطمینان سے ہتھر کے ساتھ یہ مہینہ گزاروں گا' میں نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا۔ ہتھر از ریئلی پریٹی۔ اب اتنی خوب صورت گرل فرینڈ کو چھوڑ کر کوئی بیوی کے ساتھ چھٹیاں برباد کیوں کرے گا؟"

اس نے رائے مانگنے والے انداز میں میری طرف دیکھا۔ ایک بیوی کے منہ سے اس کے شوہر کی گرل فرینڈ کا نام سن کر ہی میں تو ہکا بکا رہ گئی تھی۔

"کیا ہوا؟ تم حیران ہو؟" وہ میری شکل دیکھ کر ہنسی۔ "یار! شوہروں کو تھوڑی Spece دینا پڑتی ہے۔ ادھر ادھر منہ تو انہوں نے مارنا ہی ہوتا ہے تو پھر پابندی لگا کر اپنی زندگی کا سکون برباد کرنے کا کیا فائدہ؟ تمہیں یاد ہے۔ میں ہمیشہ کہا کرتی تھی مرد ہوتا ہی بے وفا ہے۔ مجھے اس کے مزاج کا شادی سے پہلے ہی پتا تھا۔ تب ہی شادی کے اگلے روز ہی میں نے اس سے کہہ دیا تھا جا ہے جتنی گرل فرینڈز رکھو' بس تمہیں کچھ باتوں کا خیال رکھنا ہو گا۔ وہ لے جے خوش ہوئے اس بات پر۔" وہ بلا توقف بول رہی تھی۔

"مجھے پتا تھا نویرا! مرد کے خون میں وفا نہیں ہوتی۔ تمہیں یاد تو ہو گا' شادی سے پہلے میں آذر کے سامنے بھی یہ ہی کہا کرتی تھی کہ مرد جھوٹا اور بے وفا ہوتا ہے۔ میرے ڈرائیور کی مس کال ہے۔ وہ پارکنگ میں پہنچ گیا ہو گا۔" وہ اپنے شاپنگ بیگز سمیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ تم اتنی فراخ دل ہو سکتی ہو کہ..... کہ اپنے شوہر کو گرل فرینڈ رکھنے کی اجازت دو۔"

جواباً اس نے پھر چھوٹا سا قہقہہ لگایا۔

"اسے فراخ دلی نہیں معاملہ فہمی کہتے ہیں۔ میں مرد کی فطرت سے آگاہ تھی۔ نویرا! میرے باپ نے ماں کے ساتھ کیا کیا تھا؟ ماموں' ممانی کا گھر اسی چخ چخ کی وجہ سے ٹوٹ گیا۔ ان دونوں کے پاس آپشن تھا' وہ ان مردوں سے الگ ہو سکتی تھیں جنہوں نے ان سے بے وفائی کی۔ مجھے اپنے شوہر کی بے وفائی پر اعتراض تب ہوتا' جب وہ مجھے دھوکا دیتا' اس نے تو شادی کے پہلے ہی روز جتا دیا تھا۔ وہ ایک پر اکتفا نہیں کر سکتا تو میں نے اسے خود اجازت دے دی۔ مجھے لگا اپنے سر پر سوکن کی تلوار لٹکانے سے بہتر ہے۔ میں اسے گرل فرینڈ رکھنے کی اجازت دے دوں اور دیکھ لو' اس ایک معاملے پر سیٹلمنٹ ہو جانے کے بعد ہم کتنی پرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔"

"لیکن تم..... تو آذر سے کہتی تھیں' میرا مطلب..... کسی لڑکی پر دوسری نظر ڈالنے پر تم تو اسے قتل کرنے پر تل جاتی تھیں۔" میں نے اسے یاد دلایا۔ وہ چند لمحے خاموش رہی پھر تلخی سے ہنسی۔

"وہ اس لیے کہ اس وقت آذر میرا منگیتر تھا۔ شوہر کے ساتھ مصلحت سے کام لینا پڑتا ہے ورنہ رشتہ قائم نہیں رہ سکتا۔ مرد بے وفا ہوتا ہے۔ میں تو اس بات کو یونیورسل ٹروتھ (آفاقی سچائی) مانتی ہوں۔ اگر کوئی یہ مانتا ہے کہ زمین گول ہے تو اسے یہ بھی مان لینا چاہیے کہ مرد بے وفا ہوتا ہے۔"

میں وہیں بیٹھی رہ گئی اور نمل اٹھ کر چلی گئی۔ میں نے گلاس وال سے اسے سڑک عبور کرتے اور پھر اس کار کی پچھلی سیٹ پر ایک شان کے عالم میں بیٹھتے دیکھا' جس کی ڈرائیونگ سیٹ کو ایک باوردی شوفر سنبھالے ہوئے تھا۔

پھر میری نظریں میز کے اس کونے کی طرف گئیں' جہاں کچھ دیر قبل نمل بیٹھی مرد کی فطرت پر روشنی ڈال رہی تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر وہ چھوٹی سی چٹ اٹھالی جس پر میں نے ایڈریس لکھ کر دیا تھا۔ نمل وہ چٹ اٹھانا "بھول" گئی تھی۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے وہ مجھے اپنا کانٹیکٹ نمبر دینا "بھول" گئی تھی۔

اور بھول تو شاید میں بھی گئی تھی' اس سے دوبارہ کانٹیکٹ نمبر مانگنا اور..... اور اس چھوٹی سی چٹ پر اپنا درست ایڈریس اور کانٹیکٹ نمبر لکھنا..... آپ صحیح سمجھے..... اپنی بہترین دوست سے چھ سال بعد بیس منٹ کی مختصر سی ملاقات کے بعد میں اس سے دوبارہ نہیں ملنا چاہتی تھی۔

کیفے سے باہر آکر میں نے وہ چٹ پھاڑ کر ہوا کے سپرد کی اور گھر آگئی۔ وہ دن اور آج کا دن ہے۔ میرے کانوں میں بار بار نمل کا فقرہ گونجنے لگتا ہے۔

"اگر کوئی یہ مانتا ہے کہ زمین گول ہے تو اسے یہ بھی مان لینا چاہیے کہ مرد بے وفا ہوتا ہے۔"

صرف یہ ہی نہیں مجھے رہ رہ کر وہ تمام واقعات یاد آرہے ہیں جنہیں بھول جانے کے باوجود اپنی زندگی سے نکال دینا میرے لیے ممکن نہیں۔

نمل سے ہونے والی اس ملاقات نے مجھے چھ سال پیچھے دھکیل دیا ہے۔ میں الجھ سی گئی۔

اچھا رکیے..... میں آپ کو پوری بات بتاتی ہوں' ممکن ہے آپ کسی نتیجے پر پہنچنے میں میری مدد کر سکیں۔ میرے کانوں میں تو واقعی بار بار نمل کا یہ جملہ گونج رہا

ہے مگر میں فیصلہ نہیں کرپارہی کہ۔۔۔
"کیا مرد واقعی بے وفا ہوتا ہے؟"

☼ ☼ ☼

وہ ایک دلکش شام تھی۔ جس وقت میں آفس سے نکلی، سرمئی بادلوں سے ڈھکا آسمان شہر پر جھک آیا تھا اور ہوا ہتھیلی پر خنکی اٹھائے سنہری تتلی کی طرح اڑتی پھر رہی تھی۔

بارش۔۔۔ میری ازلی کمزوری۔ مجھے یوں لگا جیسے دن بھر کی تھکن ریت کے ذروں کی طرح اس پھوار کے ساتھ بہہ رہی ہو، میں نے بازو پھیلا کر ہتھیلی پر بارش کو سمیٹنا چاہا اور وہیں برآمدے کے ستون سے ٹیک لگا کر نمل کا انتظار کرنے لگی۔ میں تقریباً" ساڑھے تین سال سے اس بینک سے منسلک تھی اور آج کل بطور آپریشنل مینیجر کام کر رہی تھی جبکہ نمل کی اپائنٹمنٹ چند مہینے کے ٹرائل پر ہوئی تھی۔ میں چونکہ اس سے سینئر تھی، پھر وہ میری بہترین دوست بھی تھی اور سب سے بڑی بات آذر کے حوالے سے وہ میرے لیے بہت ہی خاص تھی۔ ان تین وجوہات کی بنا پر میں بطور خاص اس کا خیال رکھتی تھی۔

پھر وہ صبح سے کچھ پریشان لگ رہی تھی۔ لنچ آورز میں بھی اس سے بات کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا، اس لیے میں چاہتی تھی گھر جانے سے پہلے اس کی پریشانی کی وجہ معلوم کرلوں۔

"بارش۔۔۔" مستقل برستی باریک پھوار بالکل ہی کن من میں بدل چکی تھی، جب میں نے اپنے عقب میں نمل کی اکتائی ہوئی آواز سنی، وہ بے زاری کے ساتھ موسم کے تیور ملاحظہ کر رہی تھی۔

"کتنا اچھا موسم ہو رہا ہے نا؟ آج تو واک کرتے ہوئے گھر جانا چاہیے۔" میں نے سرشاری کے عالم میں کہا، نمل کا منہ بن گیا۔

"یہ تم نہیں کہو گی تو کون کہے گا، تم جیسے لوگ جو اپنی Santro سے صرف موسم انجوائے کرنے کے لیے پاؤں باہر رکھتے ہیں، یہاں سے چلو گی تو ان سیدھی سیدھی سڑکوں پر واک کرتی آرام سے گھر پہنچ جاؤ گی۔ مسئلہ تو ہم غریبوں کے لیے ہے۔ ان چند چھینٹوں کی بدولت گڑھی شاہو کی ان تنگ تنگ گلیوں میں گھٹنوں تک پانی کھڑا ہو گیا ہو گا۔" میں کہہ کر پچھتائی۔

"اچھا آؤ۔۔۔ میں تمہیں ڈراپ کردیتی ہوں۔"

"رہنے دو۔۔۔ کہاں تمہارا گلبرگ فیز تھری، کہاں ہمارا گڑھی شاہو۔۔۔ میں لوکل سے چلی جاؤں گی۔"

"نخرے کرنا بند کرو نمل! یا میں گارڈ سے کہوں، تمہیں اٹھا کر گاڑی میں ڈال دے؟" یہ دھمکی کارگر رہی، نمل چپ چاپ میرے ساتھ ہولی۔

"میں تو کہتی ہوں ابھی گھر جانے کا خیال ہی دل سے نکال دو۔ بوا جی نے ضرور کچھ مزے کی چیز پکائی ہوگی، میری طرف چلو، ڈنر کے بعد آٹھ بجے تک میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں گی۔"

گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے میں نے اس کے خفا خفا چہرے پر نظر ڈالی۔

"اف بوا جی کے ہاتھ کا کھانا، تم نے ابھی ضرور یاد کروانا تھا نوری! اب گھر جا کر وہ پتلی دال کھانے کو کس کا دل چاہے گا۔" اس نے بے ساختہ چٹخارہ لیتے ہوئے کہا۔ میں اس انداز پر ہنس دی۔

"اسی لیے تو کہہ رہی ہوں میری طرف چلو۔"

"رہنے دو یار! بس ذرا اسپیڈ بڑھا کر جلد از جلد گھر پہنچا دو، ایسا نہ ہو جھڑکیوں کے ساتھ پتلی دال بھی نہ ملے، گھر پہنچنے میں ذرا سی بھی تاخیر ہو گئی تو میری سوتیلی اماں نے چیخ چیخ کے آسمان سر پر اٹھا لینا ہے اور ان کی دیکھا دیکھی سگے ابا نے مجھے ہی دنیا سے اٹھا دینا ہے۔"

وہ بظاہر ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی لیکن اس کی ہنسی میں جو تلخی تھی، میں اسے محسوس کرسکتی تھی۔ میرا دل حسب معمول دکھ سے بھر گیا۔

"کبھی کبھی میں سوچتی ہوں ابا کی بے وفائی اور رنگین مزاجی نے اماں کا بڑا فائدہ کردیا۔ اس گھر میں رہتیں تو سوکھی روٹی کے ساتھ میٹھی آلو کا شوربا یا پتلی کالی دال کھانا پڑتی۔ اب فیصل آباد میں ماموں جان کے گھر مرغیاں بھون بھون کے کھاتی ہوں گی۔"

"تمہیں کیسے پتا؟"

"مجھے سب پتا ہے، مجھے سچے خواب آتے ہیں۔"

میں اس کی عادت سے واقف تھی۔ حد درجہ خود ترسی میں مبتلا ہونے کے باوجود اس کی حس مزاح ماند نہیں پڑی تھی۔

"دل جلانا بند کرو، یہ بتاؤ قلفی کھاؤ گی۔" میں نے ایک سگنل پر گاڑی روکتے ہوئے پوچھا۔

"میرا دل کوئلے کی طرح سلگ رہا ہے، ایک قلفی سے کیا ہوگا اس کا۔" اس نے بے چارگی سے کہا۔ جواباً" میں نے اسے گھور کر دیکھا۔

"اب پورا ٹھیلا تو خرید کردینے سے رہی۔" میں نے اس کے لیے قلفی خرید کر اسے پکڑا دی اور گاڑی آگے بڑھائی۔

"البتہ آذر سے کہہ کر دیکھنا وہ قلفی کا ٹھیلا تو کیا قلفیوں کی پوری فیکٹری بھی خرید دے گا تمہیں۔"

"اتنا اچھا نہیں ہے تمہارا آذر [illegible] ابھی میرا دل جلانے سے فرصت ملے گی تو فیکٹری خرید کردے گا۔" نمل نے قلفی پر ایسے دانت گاڑے جیسے وہ قلفی نہیں آذر کی گردن ہو۔

"آذر سے پھر جھگڑا ہوا ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا، گو کہ پوچھنا نہیں چاہیے تھا، کیونکہ اس کی پریشانی اور میرے سوال کا جواب اس کے چہرے پر لکھا تھا۔

"میں کیوں جھگڑا کروں گی، تمہیں پتا ہے میں کتنی پولائٹ ہوں۔" میں نے مسکراہٹ چھپانے کے لیے کھڑکی کی طرف چہرہ موڑ لیا۔ آذر سے جھگڑا کرنے کے بعد نمل اکثر سیاسی لیڈروں جیسے بیانات دیا کرتی تھی۔

"اب کس بات پر ناراضی ہو گئی؟"

"میں کیوں ناراض ہوں گی؟ ویسے بھی ناراض اپنوں سے ہوا جاتا ہے، ایروں غیروں سے نہیں۔" وہ نروٹھے پن سے بولی اور اس بار میں اپنی ہنسی روک نہیں سکی۔

"ایرے غیرے کی دی ہوئی انگوٹھی پہن کر پھرتی ہو، ناراض نہیں ہوسکتیں۔"

میں نے شرارت سے اسے دیکھا۔

"اس کی تو بات ہی مت کرو نوری! وہ بھی میرے ابا سے مختلف نہیں ہے۔ ویسا ہی بے وفا، دھوکہ باز اور فراڈ، میں تو کہتی ہوں تم کو بھی حسن پر نظر رکھنا چاہیے۔ مرد سے ایکچوئیلی وفا کی امید ہی فضول ہے۔"

اس نے اپنا من پسند فقرہ تھوڑے سے ردوبدل سے دہرایا، مجھے برا لگا۔

"تم صرف اپنے ابا کی بات کرو، سب کے بارے میں ایسا کیسے کہہ سکتی ہو؟" میں نے اپنی ناگواری چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے اسے ٹوک دیا۔

"رائے قائم کرنے کے لیے ہمیشہ خود تجربہ نہیں کرنا پڑتا۔ دور جانے کی ضرورت نہیں، تم اپنے اردگرد ہی دیکھ لو، کتنی ایسی خواتین ہیں جن کی زندگیاں مرد کی بے وفائی نے برباد کی۔ میری ماں، تمہاری بوا جی، آذر کی اماں جان، کوئی ایک بھی ایسی عورت ہے ان میں، جس کی زندگی کو تنہائیوں میں نہ جھونکا ہو مرد نے۔۔۔؟"

نمل کے پاس دلائل کی کمی نہ تھی۔

"میرا نظریہ یہ تھا کہ تین، چار افراد کے تلخ تجربے کو سامنے رکھتے ہوئے پوری میل کیٹیگری کو بے وفا یا دھوکہ باز قرار دینا کہاں کا انصاف ہے۔"

میں نے اپنے بابا کو دیکھا تھا جنہوں نے میری ممی کے ساتھ ایک بھرپور زندگی گزاری تھی۔ میرے بھائی جو اپنی بیویوں سے پوری طرح مخلص تھے۔ پھر آذر تھا جو میرے حساب سے تو نمل کے ساتھ مخلص تھا۔ (یہ الگ بات کہ نمل کو اس کے اخلاص پر ہمیشہ شک رہا۔) اور سب سے بڑی حسن کی مثال تھی، اس کی وفا پر شک کیا جا ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ شخص سترہ سال سے میرے ساتھ وفا نبھا رہا تھا۔

"پلیز نمل! حسن کا نام تو تم ان مردوں کے ساتھ مت لیا کرو۔ مجھے اس پر خود سے زیادہ بھروسہ ہے۔ اور آذر بے چارے نے کیا وفائی کی ہے تمہارے ساتھ؟"

"منگنی سے پہلے جتنے وعدے کیے ان میں سے ایک بھی پورا نہیں کیا۔ کیا اس دھوکہ دہی کو بے وفائی نہیں

کہتے؟" اس نے سلگ کر پوچھا۔ مجھے ہنسی آگئی۔

"نمل! خدارا پہیلیاں بجھوانے کے بجائے تم مجھے واضح لفظوں میں بتادو' اس بار تم دونوں کا جھگڑا کس بات پر ہوا ہے۔"

نمل چند لمحے خاموشی سے باہر دیکھتی رہی۔

"آذر اسکاٹ لینڈ کے لیے اپلائی کر رہا ہے تاکہ وہاں سے Culinary Art میں بیچلرز کرسکے۔" بالآخر بلی تھیلے سے باہر آگئی۔

"پھر؟" میں نے پوچھا۔

"پھر؟" وہ بری طرح چڑ گئی۔

"کم آن نوری! آذر تمہارا کزن ہے تو اسے جسٹی فائے کرنے کی کوشش مت کرنا' دنیا ترقی کر رہی ہے لوگ آگے بڑھنے کے راستے ڈھونڈ رہے ہیں اور یہ محترم باورچی بننے کی تیاریوں میں ہیں' سی اے اسی لیے کیا تھا تاکہ کل کو کسی ڈھابے پر "چھوٹے" کی نوکری کرسکے؟"

نمل دل کی بری نہیں تھی' لیکن زبان کی بے حد کڑوی تھی' خصوصاً" جب اس کی جذباتیت پر حملہ ہوتا تو وہ بھول جاتی تھی کہ اس کی زبان تیز دھار تلوار کی طرح دوسروں کے دل پر چرکے لگا سکتی ہے۔ یکایک میں آذر کے لیے فکر مند ہونے لگی۔

"آذر ہمیشہ اپنے لیے سوچتا ہے' اسے میری اور میرے خوابوں کی کوئی پروا نہیں۔ میں بہت پریشان ہوں نوری! اگر آذر کی ضد کی یہی صورت حال رہی تو... تو شاید ہم ایک ساتھ نہ چل سکیں۔" اس بار وہ قدرے تحمل سے بول رہی تھی۔

"کم آن نمل!" میں نے فوراً" اسے ٹوک دیا۔

"میں آذر کو سمجھاؤں گی' لیکن پلیز' یہ اتنی بڑی بات نہیں ہے کہ تم لوگ اپنے راستے ہی الگ کرنے کا سوچنا شروع کردو' آذر! Culinary art (پکانے کے فن) میں کچھ کرنا چاہ رہا ہے تو کرنے دو' بڑا پرانا شوق ہے یہ اس کا اور پھر وہ کون سا اسے پروفیشن بنائے گا اور سچی بات ہے اگر پروفیشن بنانے کا سوچے بھی تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اتنی پراپرٹی ہے اس کی' اگر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر گھر میں بیٹھا رہے' تب بھی مزے سے زندگی گزر سکتی ہے اس کی۔"

"اوہ پلیز... اب یہ بات تم آذر کے سامنے نہ کہہ دینا' اسے پہلے ہی بڑا مان ہے اپنے صاحب جائیداد ہونے پر' تب ہی پیسہ برباد کرنے کے لیے اسکاٹ لینڈ جانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ بہرحال تم اسے بتادینا جو بھی کرنا ہو سوچ سمجھ کر کرے' میں کسی باورچی سے شادی نہیں کروں گی۔" اس نے حتمی انداز میں کہہ کر بات ہی ختم کردی تھی۔

☼ ☼ ☼

نمل کو ڈراپ کرکے میں نے واپسی کا قصد کیا تو آسمان پر بادل نا صرف بہت گہرے ہوچکے تھے بلکہ گرج بھی رہے تھے اور بجلی بھی چمکنے لگی تھی۔ میں نے اسپیڈ بڑھادی لیکن اس سے پہلے بوا جی کو تاخیر سے واپسی کی اطلاع دینا نہیں بھولی۔

"نوری! تم ایسا کرو گھر جانے کے بجائے آذر کی طرف ہی آجاؤ۔ یہ لڑکا زبردستی مجھے اٹھا کر لے آیا ہے کہ بیسن کی روٹی بنا کر کھلائیں۔ اب تم بھی ادھر ہی آجاؤ اور سنو گاڑی احتیاط سے چلانا۔"

بوا جی نے تاکید کرکے فون بند کردیا۔ میں مطمئن ہوگئی کیونکہ آذر سے نمل کے سلسلے میں تو بات کرنا ہی تھی۔ آذر اور نمل کو چھوٹی چھوٹی باتوں پر بڑے بڑے جھگڑے کرنے کی عادت تھی اور میں چونکہ ان دونوں کی دوست ہونے کے باوجود عمر کے اعتبار سے ان کی آپا جی تھی' اس لیے ان کے جھگڑوں میں ثالث کا کردار ادا کرنا پڑتا تھا۔

آذر میری امی کی خالہ زاد بہن کا بیٹا تھا۔ بارہ سال کی عمر تک وہ ٹیکساس میں رہا۔ اس کے بعد کسی معمولی سی بات کو بنیاد بنا کر آذر کے والد نے شارقہ خالہ کو طلاق دے دی۔ شارقہ خالہ کے پاس چونکہ نیشنلٹی نہیں تھی' اس لیے ان کو فوراً" پاکستان آنا پڑا' مگر جب آذر کی کفالت کی بات آئی تو فیصلہ آذر پر چھوڑ دیا گیا کہ وہ ماں اور باپ میں سے جس کے ساتھ چاہے رہ سکتا ہے۔

آذر نے شارقہ خالہ کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی۔ جب شارقہ خالہ اور آذر پاکستان آئے تو میری امی نے حق دوستی ادا کرتے ہوئے شارقہ خالہ کا بہت ساتھ دیا۔

مجھے یاد ہے ابتدا کے دو' تین سال تو خالہ اور آذر ہمارے گھر میں ہی رہے پھر خالہ نے اپنا زیور بیچ کر ہمارے گھر کے قریب ہی ایک چھوٹا مگر خوب صورت سنگل اسٹوری مکان خرید لیا۔

کچھ عرصہ بعد آذر کے والد کی اس سے ناراضی ختم ہوئی جو کہ انہوں نے آذر کی طرف سے شارقہ خالہ کے ساتھ رہنے کے فیصلے پر اختیار کر رکھی تھی تو انہوں نے پاکستان میں موجود اپنی ساری پراپرٹی آذر کے نام کردی۔

آذر کو اسی اسکول میں داخل کروایا گیا جہاں میں پڑھتی تھی۔ اسکول میں' میں اس کا چھوٹے بھائیوں کی طرح خیال رکھتی لیکن آذر غضب کا ذہین بچہ تھا۔ پہلے ہی مہینے میں اسے ڈبل کے بجائے ٹرپل پروموشن ملا اور یوں تین سال چھوٹا ہونے کے باوجود وہ میرا کلاس فیلو بن گیا۔ بس یہیں سے ہماری دوستی کی شروعات ہوئی تھی۔

گریجویشن تک ہم اکٹھے پڑھتے رہے' پھر میں نے پنجاب یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا' جبکہ آذر جاپان جانے کے لیے رخت سفر باندھنے لگا۔ وہ جاپان جاکر Culinary Art سے متعلقہ کوئی ڈگری کورس کرنا چاہتا تھا۔ سب حیران تھے' اچھا بھلا کامرس کی فیلڈ میں پڑھتے ہوئے اسے پروفیشنل شیف بننے کا خیال کیسے آگیا۔ صرف میں اور شارقہ خالہ تھے جو اس کے شوق سے واقف تھے۔ کوکنگ میں وہ پہلے ہی بہت ماہر تھا۔ کسی پروفیشنل انسٹی ٹیوٹ سے ٹریننگ لیے بغیر ہی اسپینش' اٹالین اور کانٹی نینٹل ڈشز بنانے میں ماہر ہوچکا تھا۔ دنیا بھر کے ڈیزرٹ اسے بنانا آتے تھے۔

ہم کسی ہوٹل یا ریسٹورنٹ میں جاتے' کچھ دیر بعد آذر منظر سے غائب ہوجاتا اور ہمیشہ ہی وہاں کے کچن سے برآمد کیا جاتا۔ بہت ساری ڈشز کی تراکیب اس نے یوں ہی گھومتے پھرتے حاصل کی تھیں۔ کبھی ایسا ہوتا کہ کوئی ترکیب ریسٹورنٹ والے کسی قیمت پر بتانے پر راضی نہ ہوتے' ایسے میں آذر گھر آکر اس ڈش پر تب تک محنت کرتا جب ریسٹورنٹ جیسا ذائقہ نہ بن جاتا۔

اپنے شوق کو بالآخر اس نے پروفیشن بنانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

ان ہی دنوں نیڈو نے اپنی پروڈکٹس کی پروموشن کے سلسلے میں ورکشاپ کا اہتمام کیا۔ آذر نے بھی اس ورکشاپ میں شرکت کی اور جب واپس آیا تو اپنا دل بڑی بڑی آنکھوں اور بے حد گوری رنگت والی نمل کے پاس چھوڑ آیا تھا اور ہاتھ میں ایک پمفلٹ تھا جس پر نمل کا ایڈریس لکھا ہوا تھا جو آذر نے جانے کن دقتوں سے حاصل کیا تھا۔

اب آذر صاحب نے محبت کی رسم مذہبی فریضہ سمجھ کر ادا کی اور مطمئن ہوگئے۔ مصیبت میں آگئی میری جان' کیونکہ وہ میں ہی تھی جسے آذر کی جذباتی دھمکیوں سے متاثر ہوکر نمل کو اس سے ملوانے کا بندوبست کرنا تھا۔ اور یہ کام میں نے کن دقتوں سے کیا' یہ ایک الگ ہی داستان ہے' مگر سچی بات ہے نمل سے دوستی کرکے اس کے گھر تک پہنچنے میں مجھے دانتوں پسینہ آگیا تھا۔

نمل غریب گھرانے کی خوب صورت لڑکی تھی' اس کی زندگی میں دو المیے غضب ڈھا رہے تھے' ایک اس کے باپ کی ماں سے بے وفائی' دوسرے حد سے بڑھی ہوئی غربت' سوتیلی ماں کی گالیاں اور آدھے درجن سوتیلے بہن' بھائیوں کی چیخ چیخ ذیلی المیے شمار کیے جاسکتے تھے۔

بہرحال ان تمام چیزوں نے مل کر نمل کے مزاج میں تلخی بھردی تھی۔

نمل اور آذر تو خیر محبت کی ڈور میں بندھ گئے' آذر مجھ سے تین سال چھوٹا تھا تو نمل پانچ سال چھوٹی تھی' عمروں کے فرق کے باوجود ہم تینوں کی دوستی مضبوط سے مضبوط ترین ہوتی چلی گئی۔ دوستی کے ان کئی سالوں کے دوران جہاں آذر نے اپنی عادت و مزاج کو

نمل کی مرضی کے مطابق ڈھالا وہیں نمل کے مزاج کی تلخی بتدریج کم ہوتی رہی، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس نے اپنی رائے میں ردوبدل کرنا سیکھ لیا تھا بلکہ اپنی بات پر ڈٹے رہنے کی عادت میں تو مزید شدت آگئی تھی۔

دروازہ آذر نے کھولا اور کھولتے ہی مجھ پر برسنے لگا۔

"انسان میں تھوڑا صبر ہونا چاہیے نویرہ آپا! یہ نہیں کہ گھنٹی پر ہاتھ رکھا اور بھول گئے۔"

کچن ایپرن باندھے، ٹی شرٹ کی آستین کہنیوں تک فولڈ کیے وہ سخت جھنجلایا ہوا لگ رہا تھا۔ میں سمجھ گئی، اب اس کے کام میں خلل ڈالنے کی کچھ سزا تو مجھے ملنا ہی تھی، لیکن اپنے نام کے ساتھ آپا کا لفظ سن کر میں چڑ گئی۔

"تم اگر اپنی سستی کو ایک طرف رکھ کر دروازہ جلدی کھول دیا کرو تو میں گھنٹی پر ہاتھ رکھ کر کبھی نہ بھولوں اور اب تم نے دوبارہ مجھے آپا کہا تو میں تمہارے دانت توڑ دوں گی۔"

"اب خود سے اتنی بڑی کزن کو آپا بھی نہ کہوں تو کیا کہوں؟ نہ بھئی نہ، میری اماں نے بچپن سے سکھایا ہے کہ بڑوں کو ادب احترام سے مخاطب کرنا چاہیے۔" اس نے بن کر کہا، میں نے غصے کے اظہار کے طور پر دوبارہ گھنٹی پر ہاتھ رکھ دیا۔

"اور ٹائم دیکھا ہے تم نے؟ میں بواجی سے تمہاری شکایت لگاتا ہوں، یہ کوئی وقت ہے گھر آنے کا۔" وہ دروازہ بند کر کے میرے پیچھے ہی چلا آیا۔

"تمہاری منگیتر کو اس کے گھر چھوڑنے چلی گئی تھی اور میری۔۔۔"

میری بات سنے بغیر ہی آذر کچن کی طرف چلا گیا۔ یکایک مجھے احساس ہوا معاملہ سنگین تھا۔ ورنہ آذر اور نمل کا نام آتے ہی اتنی سنجیدگی کا مظاہرہ کرے، ممکن ہی نہیں۔

میں شارقہ خالہ کے کمرے میں آگئی، بواجی بھی وہیں تھیں، میں ان دونوں سے حال احوال دریافت کرنے لگی۔ چند منٹ بعد میں کچن میں آگئی۔ کچن خوشبوؤں سے بھرا ہوا تھا اور کھڑکی سے لان میں برستی بارش دکھائی دے رہی تھی۔

"کچھ کھانے کو ملے گا؟" میں نے فریج میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"خشک دودھ کا حلوہ ہے، کھانا چاہو تو مائیکرو ویو میں گرم کر لو۔" آذر نے چاپنگ بورڈ پر سبزیاں کاٹتے ہوئے مصروفیت بھرے انداز میں جواب دیا۔ میں نے فریج سے حلوہ برآمد کر کے مائیکرو ویو میں رکھا اور ٹائم سیٹ کر کے آذر کے پھرتی سے سبزیاں کاٹتے ہاتھ دیکھنے لگی۔

"ویسے ایک بات تو ہے، تم سے شادی کے بعد نمل کے تو مزے ہو جائیں گے۔" میں مائیکرو ویو سے پلیٹ نکال کر کچن ٹیبل پر آبیٹھی اور رشک بھرے انداز میں کہا۔

"ہر روز نہ سہی، لیکن ہفتے میں ایک بار تو تمہارے ہاتھ کا بے حد لذیذ کھانا تو ضرور ہی کھانے کو ملا کرے گا۔"

"ہاں۔۔۔ اور تو مجھے کوئی کام ہو گا نہیں، محترمہ کے لیے کھانا بناتا رہوں گا۔" آذر نے جل کر کہا۔

"آذر! اس بار جھگڑے کا ایجنڈا کیا ہے؟" میں نے پوچھ ہی لیا۔ آذر کی عادت سے میں واقف تھی، بنا پوچھے وہ اصل بات کبھی نہ اگلتا، ہاں پہیلیاں ضرور بجھواتا رہتا۔

"تم نمل کو گھر چھوڑ کر آرہی ہو، اس نے نہیں بتایا؟" اس کا انداز طنزیہ ہو گیا تھا۔

"کم آن آذر! تم دونوں بچوں کی طرح کب تک جھگڑتے رہو گے۔ جھگڑا کرنے کے بعد تم دونوں ایک دوسرے سے بات کرنا بھی چھوڑ دیتے ہو۔ تم دونوں ایک دوسرے کا پوائنٹ آف ویو سمجھنے کی کوشش تو کرو۔"

"تم یہ ساری باتیں اپنی سہیلی کو سمجھاؤ۔" اس نے سرعت سے میری بات قطع کرتے ہوئے کہا۔

"اس محبت کو نبھانے کے لیے آج تک نمل نے کیا کیا ہے، ہمیشہ میں ہی اپنے خیالات بدلتا رہا۔ اپنی ترجیحات، اپنی خواہشات کو پس پشت ڈالتا رہا اور اس کے بدلے میں مجھے کیا ملتا ہے؟ نمل صاحبہ ہر بار معمولی سی بات کو بنیاد بنا کر میری ساری محنت پر پانی پھیر دیتی ہیں، تم مانو گی نویرہ، اس لڑکی کو آج تک یقین نہیں آیا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ محبت اور کیسے کی جاتی ہے؟ تمہیں یاد ہے میں نے گریجویشن میں ہی ڈیسائیڈ کر لیا تھا کہ میں پروفیشنل شیف بنوں گا، لیکن پھر مجھے نمل مل گئی، اس نے کہا۔ "شیف کا کوئی کیریئر نہیں ہوتا، کوئی انکم نہیں ہوتی، مجھ سے محبت کرتے ہو، مجھ سے شادی کرنی ہے تو کوئی ایسی ڈگری لو جس سے مجھے تمہارا فیوچر سیکیور (محفوظ) نظر آئے" تو صرف نمل کی خواہش پوری کرنے کے لیے میں نے بی۔ اے کیا۔ تمہیں پتا ہی ہے نویرہ! مجھے بی اے میں کوئی انٹرسٹ نہیں تھا۔ کتنی دقتوں سے ڈگری کمپلیٹ کی میں نے، کیوں؟ صرف نمل کی خوشی کے لیے اور صرف نمل کی خوشی کے لیے ہی پچھلے چھ سالوں سے اس ملٹی نیشنل کمپنی میں کام کر رہا ہوں، لیکن نمل کسی طرح خوش ہی نہیں ہوتی، کسی طرح مطمئن نہیں ہوتی، آج سے نو سال پہلے میں جاپان جانا چاہتا تھا تو وہاں کے کوکنگ آرٹ اسکول میں مجھے اسکالر شپ مل رہا تھا، جسے میں نے صرف اور صرف نمل کے لیے ڈراپ کر دیا۔ اب اگر میں وہاں ایڈمیشن کے لیے جاؤں تو مجھے گیٹ بھی کراس کرنے نہیں دیا جائے گا، کیونکہ میں اوور ایج ہو چکا ہوں، میں نے نمل سے کہا، چلو شادی کر لیتے ہیں، مگر اس کی وہ ہی رٹ کیریئر بنا لیں، روپیہ جمع کر لیں، شادی کر لی تو فیملی میں پڑ جائیں گے اور فیملی صرف محبت سے نہیں روپے، پیسوں سے نبھائی جاتی ہے۔ میں نے کہا، میں اتنا کما سکتا ہوں کہ اسے اور اپنے بچوں کو ایک بہترین مستقبل دے سکوں، لیکن نمل کے پتا نہیں کون سے تحفظات ہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے وہ شادی ہی نہیں کرنا چاہتی، ٹرخا رہی ہے مجھے۔" وہ جیسے پھٹ پڑا تھا۔

"ایسے مت سوچو آذر! محبت تو نمل بھی کرتی ہے تم سے۔" میں نے فوراً کہا۔

"ایسے کی جاتی ہے محبت؟" وہ تڑخ کر بولا۔ "میں محض اس کی خاطر اپنی خواہشات سے دستبردار ہو گیا اور اتنے سالوں کے بعد بھی وہ مجھے میری چھوٹی سی خواہش پوری نہیں کرنے دینا چاہتی۔"

"مطلب؟"

"بتایا نا تمہیں، جاپان کے کوکنگ اسکول میں تو مجھے اسکالر شپ مل رہا تھا۔ اب جب نمل نے کہا کہ شادی کے لیے دو تین سال مزید رک جائیں تو میں نے سوچا اس دوران اپنا شوق پورا کر لیتا ہوں، میں نے آفس سے ایک سال کی چھٹی کے لیے درخواست دی اور اسکاٹ لینڈ کے Chaffey college (شیف کالج) میں ایڈمیشن کے لیے اپلائی کر دیا۔ نمل کا خیال ہے میں یہ جو ٹریننگ کورس کے لیے جا رہا ہوں تو وقت اور پیسے دونوں ضائع کر رہا ہوں، وہ یہ نہیں سوچتی، شیف ٹریننگ لینا میرا کتنا بڑا شوق ہے۔"

"تم یہ ہی بات اسے پیار سے بٹھا کر بھی تو سمجھا سکتے ہو، جھگڑنا ضروری ہے؟" میں نے تحمل سے کہا۔

"پچھلے کئی سالوں سے یہ ہی کوشش کر رہا ہوں۔" وہ پھر جل کر بولا۔

"لیکن پیار سے کہی بات اس کی سمجھ میں ہی نہیں آتی، وہ اس لیے کیونکہ اس کے اپنے دل میں میرے لیے پیار محبت جیسی کوئی چیز نہیں ہے، میں ہی احمق پاجی ہوں جو گدھوں کی طرح اتنے سالوں سے اس سے محبت کیے جا رہا ہوں۔"

"خدارا۔۔۔ آذر! اس طرح مت سوچو، تم جانتے ہو نمل ہمیشہ سے ایسی ہی ہے، اسے کبھی بھی اس کے ماں، باپ۔۔۔ خصوصاً" باپ سے محبت نہیں ملی، نہ ہی توجہ، پھر انہوں نے نمل کی امی کو اس وقت چھوڑ دیا جب نمل بہت چھوٹی تھی، اسی لیے اسے کسی پر بھی یقین نہیں رہا۔ اب جب تم سے محبت ملتی ہے تو وہ

شاید بداعتمادی کا شکار ہو جاتی ہے اور چاہتی ہے' تم وہ ہی سب کرو جو اسے ٹھیک لگے۔ شاید اس طرح....." میری بات پھر بیچ میں رہ گئی' کیونکہ آذر نے میری بات کاٹ دی تھی۔

"مجھے اپنے اشاروں پر چلا کر وہ اپنی انا کی تسکین چاہتی ہے۔" آذر تلخی سے ہنسا۔ "اپنی سہیلی کو بتا دینا نوریہ! میں اس کی تسکین کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ جب اسے مجھ سے محبت ہی نہیں ہے' اس نے مجھ سے شادی ہی نہیں کرنی تو میں کیوں اس کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا رہوں' میں نے سوچ لیا ہے' میں اب اپنی زندگی کو اپنی مرضی سے گزاروں گا' نمل کی مرضی سے نہیں' اس لیے میں کل ہی ریزائن کرکے اسکاٹ لینڈ جانے کی تیاری کر رہا ہوں۔ وہاں جا کر میں شیف ٹریننگ لوں گا اور واپس آکر اپنا ذاتی انٹرنیشنل لیول کا ہوٹل بناؤں گا جہاں دنیا کا بہترین Cuisine (پکوان) سرو کیا جائے گا۔ تم دیکھنا نوریہ! ایک دن میں دنیا کا بہترین شیف بنوں گا' منو چندرا کو بھی پیچھے چھوڑ دوں گا' میری تصویر چھ ماہ تک بزنس ٹوڈے کے ٹائٹل پر لگتی رہے گی اور تمہاری نمل میری تصویر دیکھ کر آہیں بھرا کرے گی۔"

بے حد پرعزم انداز میں اپنے مستقبل کے متعلق پیشن گوئی کرتے ہوئے وہ لمحہ بھر کے لیے رکا۔

"اور ہاں..... میں تو تمہیں بھی بتا رہا ہوں' دنیا کے بہترین شیف سے آٹو گراف لینا ہو تو ابھی لے لو' کیونکہ آج سے چند سال بعد جب میں مشہور ہو جاؤں گا تو ممکن ہے مغرور ہو جاؤں اور اگر میں مغرور ہو گیا تو تم جیسے دوستوں کو آٹو گراف دینا تو دور کی بات ہے۔ تمہاری طرف دیکھوں گا بھی نہیں۔"

سنجیدگی کے عقب سے جھانکتی شرارت' جس کی چغلی اس کی آنکھیں کر رہی تھیں۔ اس سے قبل کہ ہماری بحث طول پکڑتی۔ شارقہ خالہ کچن میں آکر آذر سے کھانے کے متعلق پوچھنے لگیں۔

دونوں ہی اپنی ضد سے ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھے' نہ ہی دونوں یہ سمجھ پا رہے تھے کہ محبت سے بڑی ضد تو اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔

تقریباً" دس بجے کے قریب ہم نے کھانا کھایا جو کہ حسبِ معمول بہت اچھا تھا۔ میرے اور اپنے لیے اس نے ساسوجز کامبو بنایا تھا اور اس کا اصرار تھا۔ میں تسلیم کروں میں نے آج تک ایسا بہترین ساسوجز کامبو نہیں کھایا۔ میں کیوں مانتی جبکہ میں خود اس سے بہترین بنا سکتی تھی۔

"ہونہہ..... کبھی انڈہ تو ڈھنگ سے ابلا نہیں ہوگا' دعوا کر رہی ہیں ساسوجز کامبو بنانے کا۔" چونکہ شارقہ خالہ بھی میرے ہاتھ کے ذائقے کی تعریف کر چکی تھیں۔ اس لیے آذر جل کر خاک ہو گیا' اسی نوک جھونک میں گیارہ بج گئے اور نمل کے ایس ایم ایس آنے لگے۔ اسے تجسس تھا کیا میں آذر کو اس کا فیصلہ سنا چکی ہوں یا نہیں۔

[illegible] سے پہلے کہ [illegible] فیصلہ سناؤں' آذر کو [illegible] آذر کا اور سمجھاؤں بھی تو کس کو؟

"آذر! میرے ساتھ لان میں چلو' مجھے بات کرنی ہے۔" میں نے بزرگ خواتین سے نظر بچا کر آذر سے کہا' لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا اور وہیں اپنا لیپ ٹاپ آن کرکے بیٹھ گیا۔

"تم میری بات کیوں نہیں سن رہے آذر۔" مجھے غصہ آگیا۔

"کوئی عقل والی بات ہو تو سنوں۔"

"چلیے بوا جی! بہت دیر ہو گئی ہے گھر چلتے ہیں۔" میں نے ناراضی کے طور پر فوراً" بوا جی سے کہا۔

"ابھی بیٹھیے بوا جی! میں ذرا ایک ای میل کرلوں پھر آپ لوگوں کو چھوڑ آؤں گا۔" اور تم چپ چاپ بیٹھی رہو۔" آذر نے کہا۔

"اب بس بھی کرو۔ کیا بچوں کی طرح جھگڑ رہے ہو۔" شارقہ خالہ نے ہم دونوں کو ڈپٹا تو آذر فوراً" بولا۔

"ہے نا ای! حالانکہ نوریہ آپا تو مجھ سے عمر میں کتنی بڑی ہیں' ان کو تو مجھ سے نہیں جھگڑنا چاہیے۔"

"خالہ جان! اپنے بیٹے کو سمجھا لیں' آپ اگر اس نے مجھے آپا کہا تو میں بہت بری طرح پیش آؤں گی۔"

یہ ہمارا بڑا پرانا جھگڑا تھا۔ آذر ہمیشہ مجھے آپا کہہ کر چڑاتا تھا۔ میری بات سن کر شارقہ خالہ آذر کو ڈانٹنے لگیں، وہ خاموش تو ہو گیا، لیکن وقتاً فوقتاً شرارتی سی نظریں مجھ پر ڈال لیتا تھا۔

شارقہ خالہ مجھ سے حسن کے متعلق پوچھنے لگیں۔

"ابھی تو اس کا پاکستان آنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے خالہ۔"

"آج آذر نے بیسنی روٹی بنانے کی بات کی تو مجھے حسن یاد آگیا، وہ بہت شوق سے کھایا کرتا تھا، اب اپنوں سے اتنی دور بیٹھا ہے یہ شوق بھی یاد ہو گا کہ نہیں۔ پتا ہے آپا! صبح سے میرا دل بوجھل سا تھا، آذر پہلے بھی کہتا رہا کہ بوا جی کے پاس ہو آئیں، پھر شام میں جا کر آپ کو لے آیا اور وہ اچھا ہی ہوا، اسی بہانے نویر کو بھی خالہ سے ملنے کا خیال آگیا، ورنہ یہ تو ہمارے گھر کا رستہ ہی بھول گئی ہے۔" شارقہ خالہ نے ایک ساتھ ہم دونوں سے باتیں کر ڈالیں۔

"سال کے آخری دن چل رہے ہیں نا خالہ! تو بس۔۔۔ آفس میں کام بھی اسی حساب سے ہے، یقین مانیں، اتنی مصروفیت ہے کہ کھانا بھی وقت پر کھانے کی فرصت نہیں مل پا رہی۔"

"ہاں تو کیا ضرورت ہے خود کو اتنا تھکانے کی۔" شارقہ خالہ نے کہا۔

"حسن سے کہو واپس آئے اور تم دونوں شادی کر کے اپنا گھر بار سنبھالو، میں پوچھتی ہوں، کب کرو گے شادی۔۔۔ جب جسم میں جان ہی نہ ہو گی۔"

"میں تو خود اسے یہ ہی سمجھاتی ہوں۔" بوا جی نے بھی کہنا شروع کیا۔

"آخر کب تک اس طرح زندگی گزارتے رہنا ہے۔ اس کے ساتھ کی لڑکیاں اب تک دو، دو، تین تین بچوں کی مائیں بن چکی ہیں اور اسے نوکری سے ہی فرصت نہیں۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا حسن اور یہ سوچے کیا بیٹھے ہیں۔"

"آپ کو حسن اور نویر کی سمجھ نہیں آتی، میرے دماغ میں آذر اور نمل کے خیالات نہیں بیٹھتے۔ لو جی یہ بھی کوئی بات ہوئی، جب تک اسٹیبلش نہیں ہو جاتے، شادی نہیں کرنی، کوئی ان سے پوچھے اور کتنا اسٹیبلش ہونا ہے، نوکری دونوں کر رہے ہیں، کما رہے ہیں، اپنی مرضی کا، پھر سب سے بڑی بات یہ کہ آذر نے کون سا نمل کی کمائی کھانی ہے۔ میں اپنے بیٹے کو جانتی ہوں، شادی کے بعد نمل کماتی بھی رہی تو وہ اس کے پیسے کو ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔ مگر۔۔۔ بس اللہ ہی سمجھے ان بچوں کو۔" شارقہ خالہ بے زاری سے کہہ رہی تھیں۔

"کیا یہ بہتر نہیں ہو گا، آپ خواتین ہم پر غور و خوض فرمانا بند کر دیں۔" آذر نے کہا اور اٹھ کر کچن کی طرف چلا گیا۔ شارقہ خالہ بوا جی سے آذر کی شکایت کرنے لگیں، جب آذر واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں کیک تھا، وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا۔

"چلو اب تم فٹافٹ فلمی ہیروئنوں کی طرح کی ایکٹ کرنا شروع کر دو کہ او مائی گاڈ آج میرا برتھ ڈے ہے میں تو بھول ہی گئی تھی۔"

مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی، کیونکہ میں اپنی سالگرہ کا دن کبھی نہیں بھولتی تھی اور آذر ہر سال مجھے اور نمل کو وش کرنے کا کوئی نیا طریقہ ڈھونڈ لیتا تھا۔ آج کا ڈنر بھی اسی لیے ارینج کیا گیا تھا، تاکہ عین بارہ بجے مجھے وش کر سکے۔ پھر آذر نے باقاعدہ جنگل گا کر مجھے وش کیا، جبکہ شارقہ خالہ اور بوا جی نے مجھے گلے لگا کر ڈھیروں دعائیں دی تھیں اور جب کیک کاٹنے کی باری آئی تو آذر نے مجھ سے پوچھا۔

"کیک تو میں نے بیک کر لیا تھا، لیکن فیصلہ نہیں کر پایا اس پر موم بتیاں کتنی لگائی جائیں؟"

میں اس کی شرارت سمجھ رہی تھی، اس لیے خفا ہوئے بنا مسکراتی رہی۔

"موم بتیاں لگانا ضروری ہے کیا؟ ایسے ہی کیک کاٹ لو۔" شارقہ خالہ نے کہا۔

"خالہ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ویسے بھی 33 موم بتیاں کہاں سے لاؤ گے تم۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ جی ہاں آپ ٹھیک سمجھے، یہ میری زندگی کے تینتیسویں سال کا آغاز تھا۔

"تھینک یو سو مچ آذر! یو آر مچ آ گڈ فرینڈ آف مائین (تم میرے بہترین دوست ہو۔) تم ہمیشہ یاد رکھتے ہو اور میں اتنی بری ہوں کہ ہر بار تمہارا برتھ ڈے بھول جاتی ہوں لیکن میرا وعدہ ہے اس سال ضرور یاد رکھوں گی۔" چھری ہاتھ میں لیتے ہوئے میں نے کہا۔

جواباً آذر لاپروائی سے بولا۔

"برتھ ڈے بے شک یاد نہ رکھنا، بس میرا ایک کام کر دو۔"

"کون سا کام؟"

وہ ذرا سا جھجکا اور بزرگ خواتین سے نظر بچا کر مسکین سی شکل بنا کر بولا۔

"نمل سے میری صلح کرا دو۔ اس کے خیالات سے سخت اختلاف کے باوجود میں اس کے بغیر نہیں رہ سکوں گا۔"

آواز دبا کر اس نے بے چارگی سے کہا تھا اور میری ہنسی چھوٹ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"نویر! آج یہ ڈاکیہ دے گیا تھا۔" گھر آکر بوا جی نے کچھ لفافے مجھے پکڑا دیے۔ ان لفافوں کو کھولے بغیر بھی میں جانتی تھی، یہ حسن نے بھجوائے ہیں۔ وہ ہر سال میری سالگرہ سے پہلے مجھے کارڈز بھجواتا تھا اور ایک خاموش معاہدے کے تحت میں انہیں سالگرہ والے روز ہی کھولتی۔ میں نے لفافوں کو لے کر پرجوش انداز میں الٹ پلٹ کر دیکھا، حسن کی ہر چیز میرے لیے بے حد قیمتی اور عزیز تھی۔

"میں اپنے لیے کافی بنانے لگی ہوں بوا جی! آپ کے لیے دودھ گرم کر دوں۔" میں نے بوا جی سے پوچھا، لیکن وہ منع کر کے سونے چلی گئیں۔ وہ تہجد گزار تھیں۔ رات کو بھی جلدی سونے کی عادی، لیکن آذر نے اپنے سرپرائز کے چکر میں ان کی بھی نیند خراب کروا دی۔

میں اپنے لیے کافی بنا کر کمرے میں آگئی، لیکن اس سے پہلے اپنے کمرے میں موجود ٹیلی فون کی ایکسٹینشن کو لینڈ لائن سے جوڑنا نہیں بھولی تھی۔ میرے موبائل فون پر تقریباً سب ہی فرینڈز اور کولیگز کے Greeting Messages آچکے تھے۔ بھائی اور بہنوں کے بچوں کے بھی میسجز۔۔۔ آرہے تھے۔ اسجد، اصفاء اور سجاول نے تو سالگرہ کی مبارک کے ساتھ ہی ٹریٹ کا مطالبہ بھی کر دیا تھا۔ میں جانتی تھی صبح ہوتے ہی ان سب کی فون کالز بھی آنا شروع ہو جائیں گی، اتنی ڈھیر ساری محبتوں کے احساس سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ سچ تو یہ ہے کہ خود مختار زندگی گزارنے کے باوجود میرا دامن محبتوں اور چاہتوں سے خوب مالا مال تھا۔

سارے ایس ایم ایس چیک کرنے اور سب کو فرداً فرداً شکریہ ادا کرنے کے بعد میں نے حسن کا پہلا کارڈ اٹھایا ہی تھا کہ فون کی بیل بجنے لگی۔

میں نے جھپٹ کر ریسیور اٹھایا، لیکن حسن کے بجائے ماریہ بھابھی کی آواز سن کر مجھے تھوڑی سی مایوسی ہوئی تھی۔

"میں نے سوچا میں اپنی نند صاحبہ کو وش ہی کر دوں، بھئی تمہیں میری عادت کا تو پتا ہے، بولتی میں سچ ہوں، تینتیس سال کی عمر میں تو لڑکیاں اپنے بچوں کی سالگرہ منا رہی ہوتی ہیں، لیکن تمہاری تو نہ ابھی شادی ہوئی، نہ بچے ہیں، اپنی سالگرہ نہیں مناؤ گی تو کس کی مناؤ گی۔ لیکن میرے مشورے کو اپنی سالگرہ کا تحفہ ہی سمجھ لو، بس حسن سے کہو واپس آئے اور آکر گھر بسائے۔ تینتیس سال کم عمر نہیں ہوتی نویر! تمہیں وش کرنے کے لیے عفی الارم لگا کر سوئی تھی، لیکن اس عمر کی نیند کا تو تمہیں پتا ہے۔ کس قدر پکی ہوتی ہے۔ الارم بج بج کر بند ہو گیا، لیکن عفی کی آنکھ نہ کھلی، میں نے سوچا، میں ہی فون کر لوں، ویسے بھی آج کل میں اور تمہارے بھائی جان تمہارے لیے بہت پریشان ہیں۔ عفی کے لیے بڑا اچھا رشتہ آیا ہوا ہے، لڑکے کی فیصل آباد میں اپنی فیبورک مل ہیں۔ تمہارے بھائی تو

چاہ رہے تھے منگنی کر دیں۔ مگر تم خود سوچو، جس کی پھوپھی ابھی بن بیاہی بیٹھی ہے اس کی منگنی کا ہم کیسے سوچ لیں۔"

ماریہ بھابھی کی ساری دل دکھانے والی باتیں ایک طرف اور یہ آخری بات ایک طرف میں کوشش کے باوجود اپنی ناگواری چھپا نہیں پائی۔

"آپ میری وجہ سے عفی کے رشتے کو انکار مت کریں بھابھی! اگر رشتہ اچھا ہے تو ہاں کر دیں۔"

"ارے پاگل سمجھ لیا ہے کیا ہمیں۔ معاشرے میں رہنا ہے ہم نے۔ پھوپھی سے پہلے بھتیجی کا رشتہ کر کے دنیا کو کیا منہ دکھائیں گے۔"

"آپ دنیا کی پروا نہ کریں۔" میں نے کہا۔

"تمہارے لیے کہنا آسان ہے کیونکہ تم نے کبھی پروا نہیں کی۔ ہمارے لیے تو سوچنا بھی محال ہے۔ آج سے چند سال پہلے دنیا کی کم باتیں سنی ہیں ہم نے کہ بھائی کا گھر ہوتے ہوئے جوان جہان بہن الگ گھر میں رہ رہی ہے۔ اب کسی کو کیا پتا، بہن کا اپنا ہی گزارہ نہیں ہوتا تھا۔" ماریہ بھابھی نے حسب عادت مجھے جلی کٹی سنا کر فون بند کر دیا اور میرا دل بری طرح بوجھل ہو گیا۔ پچھلے کئی سالوں سے ماریہ بھابھی کی ایسی باتیں سننے کے باوجود نہ جانے میں عادی کیوں نہیں ہو پائی تھی۔

ماریہ بھابھی میرے بڑے بھائی فاروق غوری کی بیوی تھیں۔ بڑے بھائی کی حیثیت سے فاروق بھائی نے ہم چھوٹے بہن بھائیوں کو بہت شفقت سے نوازا تھا۔ وہ بہت بہترین شخصیت کے مالک تھے، بے حد نرم گو اور معاملہ فہم انسان تھے۔ ماریہ بھابھی مزاج میں ان کے بالکل برعکس تھیں۔ لہجہ طنزیہ ہوتا اور نرم انداز گفتگو تو اپنی عمر گزارنے کے باوجود انہیں نہ آسکا تھا۔ مجھ سے تو انہیں خصوصی پرخاش تھی، آج سے کچھ سال پہلے جب میں نے الگ گھر لے کر رہنے کا فیصلہ کیا تو اس کے پیچھے بھی ماریہ بھابھی کا ناروا رویہ تھا اور میرے اس اقدام کو اب تک بھابھی میری ہٹ دھرمی گردانتی تھیں۔

میں ماریہ بھابھی کی باتوں پر کڑھ رہی تھی کہ فون کی بیل پھر بجنے لگی اور اس بار دوسری طرف حسن ہی تھا۔

"کیا بات ہے، کچھ پریشان لگ رہی ہو؟" میری آواز سنتے ہی اس نے کہا اور میرے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ محبت کیسا طاقت ور جذبہ ہے، جو بنا کہے ایک دل کی کیفیت دوسرے دل پر اتار دیتا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی حسن نے کہا۔

"اگر پریشان بھی ہو تو خوش ہو جاؤ کیونکہ میرے پاس ایک خوش خبری ہے، میں پاکستان آرہا ہوں۔"

خوشی کے بے پایاں احساس نے جیسے مجھے گنگ ہی کر دیا تھا میں کچھ بول ہی نہیں سکی۔

☆☆☆

میں نے کہیں پڑھا تھا۔ "محبت کو اپنے وجود کی برداشت کے لیے کسی وجہ کے عنصر کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

اگر میں حسن کی محبت میں مبتلا نہ ہوتی تو یقیناً فوراً اس بات کو رد کر دیتی۔ حسن سے میری محبت کسی وجہ کی محتاج نہیں تھی۔ محبت ہمارے رشتے کی سب سے بڑی سچائی اور خوب صورتی تھی۔ میں نہیں جانتی پہلے پہل وہ مجھے کب اچھا لگا یا میرے دل میں اس کی محبت کی کونپل نے کب سر اٹھایا۔ میں ہمیشہ سے اس سے ملتی رہی تھی، وہ ہمیشہ سے ہمارے گھر آتا جاتا تھا۔

حسن میرے چچا کا بیٹا اور چار بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ وہ ہمارے ساتھ نہیں رہا، لیکن ہم بچوں کا بہت سا وقت اکٹھے کھیلتے، کودتے، شرارتیں کرتے گزرا تھا۔ مدثر چچا کے مالی حالات کبھی اچھے نہیں رہے۔ میں نے اپنے بابا اور دونوں پھوپھیوں کو ہمیشہ ان کے لیے پریشانی کا اظہار کرتے دیکھا تھا۔ مدثر چچا کو جواں عمری میں ایک روڈ ایکسیڈنٹ کے نتیجے میں اپنی ٹانگ کھونا پڑی۔ یہ جسمانی کمزوری ساری زندگی ان کے مالی حالات پر اثر انداز ہوتی رہی۔ میرے بابا نے ہمیشہ کوشش کی کہ کسی طرح مدثر چچا ان سے مالی مدد لینے کے لیے تیار ہو جائیں، لیکن مدثر چچا کی خودار طبیعت نے یہ منظور نہ کیا۔ وہ کرشن نگر میں ایک چھوٹا سا گھر

لے کر رہتے رہے، لیکن کبھی بہن، بھائیوں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلایا۔

چچا جان کے انتقال کے بعد یہی وتیرہ چچی جان نے اپنایا۔ حسن اس وقت چھوٹا تھا اور بہنیں اتنی پڑھی لکھی نہیں تھیں کہ گھر سے باہر جا کر کوئی ملازمت کر سکتیں۔ بابا جان نے بڑی منتوں سے چچی جان کو مالی مدد لینے کے لیے راضی کیا تھا۔ حسن اکلوتا ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے گھر میں سب سے چھوٹا بھی تھا۔ بابا جان نے چچی جان کی مرضی سے اسے اپنی سرپرستی میں لے لیا اور اس کی پڑھائی کا خاص خیال رکھنے لگے۔

حسن مجھ سے عمر میں تین سال بڑا تھا مگر اتنا بڑا بھی نہیں تھا کہ ہر وقت بڑے ابا کی طرح ری ایکٹ کرتا۔ وہ جب بھی ہمارے گھر آتا، کتابوں میں سر دیے بیٹھا رہتا۔ میں اور میری چھوٹی بہن فلک ہمیشہ اس کو تنگ کرتے۔ بابا جان کے سامنے اس کی سنجیدگی کا مذاق اڑاتے اور بابا جان سے ڈانٹ کھاتے۔

"حسن بہت قابل بچہ ہے۔ بہت ترقی کرے گا۔" بابا جان اکثر کہتے۔

مجھے اس کے روشن مستقبل پر کوئی شک نہیں تھا۔ بس میں یہ چاہتی تھی وہ اتنا سنجیدہ اور الگ تھلگ نہ رہا کرے۔ جب میں، آذر اور فلک کھیل رہے ہوتے وہ آسمان پر اڑتے پرندوں کو دیکھا کرتا یا ممی جان کے پاس کچن میں چلا جاتا اور ان کی مدد کرواتا۔

فلک کا خیال تھا، حسن قابل بچہ تو ہے یا نہیں۔ چالاک ضرور ہے اور بڑوں کے سامنے اچھا امپریشن بنا کر رکھتا ہے تاکہ جب ہم اس کے سڑیل پن کی شکایت کسی بڑے سے کریں تو وہ یقین ہی نہ کرے۔ مجھے فلک کی بات پر یقین تھا۔ لیکن میں نے کبھی اس بات پر غور ہی نہیں کیا کہ کھیل کے دوران ہم سب سے الگ تھلگ رہنے والا حسن ہر بار ہمارے گھر آتے ہوئے میرے لیے پسندیدہ چاکلیٹ کیوں لاتا تھا۔ کئی بار فلک نے اس سے شکوہ بھی کیا کہ حسن اس کے لیے چاکلیٹ کیوں نہیں لاتا۔ حسن اس کے شکوے کو ہنس کر ٹال دیتا۔

ایف ایس سی کے ایگزام سے فارغ ہوتے ہی حسن نے لیبیا جانے کا فیصلہ سنا دیا۔ ایک ایجنٹ کے ذریعے اسے لیب اسسٹنٹ کا ویزا مل رہا تھا۔ حسن یہ موقع ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ بابا جان کے علاوہ فاروق بھائی اور معظم بھائی نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ لیب اسسٹنٹ کا ویزا ترقی کا کوئی ایسا خاص دروازہ نہیں تھا جس کے کھلنے کی آس میں انسان گھر بار چھوڑنے کا ارادہ کرے۔ ان ہی دنوں حسن کی بڑی بہن منیزہ آپا کا رشتہ ہوتے ہوتے رہ گیا تھا اور اس کی وجہ ان کی کمزور مالی حالت بتائی گئی تھی۔ حسن کے دل کو اس بات نے ٹھیس پہنچائی تھی۔ بابا جان کے سمجھانے پر اس نے اپنی پٹاری سے یہ ہی وجہ نکال کر ان کے سامنے رکھ دی۔

"آپ کے پہلے ہی مجھ پر اور میرے گھرانے پر بہت احسانات ہیں تایا ابو! لیکن اب اور میں نہیں چاہتا۔ میں اپنی بہنوں کو ایک بہتر مستقبل دینا چاہتا ہوں۔ آج سے چند سال بعد بھی تو پڑھ لکھ کر مجھے ملازمت ہی کرنا ہے تو پھر میں ابھی سے کوشش کیوں نہ کروں۔ ٹھیک ہے میں مانتا ہوں لیب اسسٹنٹ کی جاب کوئی خاص نہیں ہے لیکن ایک بار میں لیبیا چلا جاؤں، کچھ عرصہ لیب میں کام کرنے کے بعد کوئی بہتر ملازمت تلاش کر لوں گا۔ میری جگہ ابو ہوتے تو وہ بھی یہ ہی کرتے۔"

حسن فیصلہ تو کر ہی چکا تھا، اب روکنے یا سمجھانے کا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ بابا جان خاموشی سے ایک طرف ہو گئے اور یوں حسن لیبیا چلا گیا۔

روانگی سے قبل وہ ہمارے گھر آیا۔ سب سے مل کر جس وقت وہ واپس جا رہا تھا۔ میں لان میں کتابیں لیے بیٹھی تھی۔ گیٹ کی طرف جانے کے بجائے وہ میرے پاس آ گیا۔

"میں کل جا رہا ہوں۔"

میں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ انیس سال کا سنجیدہ مزاج حسن اپنی آنکھوں میں جھجک لیے میری طرف بغور دیکھ رہا تھا۔ اس کے عقب میں چمکتی ہوئی دھوپ تھی اور ایک پل کے لیے بھی اس نے میرے

چہرے سے نظریں نہیں ہٹائی تھیں۔

"مجھے پتا ہے... وش یو گڈ لک۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

حسن خاموشی سے کھڑا میری طرف دیکھتا رہا۔ کرسی کی پشت پر رکھے اس کے ہاتھ اضطراری انداز میں ہل رہے تھے۔ مجھے اس کی نظروں سے الجھن ہونے لگی۔ وہ مستقل خاموشی سے مجھے دیکھ رہا تھا اور سولہ سال کی عمر میں محبت کے جذبے کو محسوس کیے بنا میرے لیے اس کی آنکھوں میں لکھی تحریر کو پڑھنا تقریباً "ناممکن تھا۔

محبت نہ ہو تو بات الگ ہوتی ہے لیکن محبت ہو تو دیکھنے، سوچنے، سمجھنے کا انداز بدل جاتا ہے۔ اگر آپ نے محبت کی ہو تو آپ کو اس کا اندازہ بخوبی ہوگا۔

بہرحال حسن کی خاموشی کو میں نے اس کی اداسی پر محمول کیا اور اسے تسلی دینے لگی۔

"تم پریشان کیوں ہو رہے ہو؟ دیکھنا تم اپنے سارے ارادوں میں کامیاب ہو جاؤ گے، منیزہ آپا اور مائدہ آپا کی شادیاں ہوں گی، تمہیں بہتر جاب مل جائے گی، پھر تم واپس آجانا اور پاکستان میں کوئی کاروبار کرلینا۔ اکثر لوگ ایسا کرتے ہیں... میں تمہارے لیے دعا کروں گی۔"

"نور..." اس نے میری بات قطع کردی۔ "مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے؟" مجھے اس کے انداز میں تذبذب دکھائی دیا۔

"پوچھو..."

"اگر میں چلا جاؤں گا... تو... تو کیا تم مجھے یاد کروگی؟" جھجکتے ہوئے اس نے پوچھا۔ میرا دل چاہا فوراً "کہہ دوں "نہیں" لیکن جاتے ہوئے شخص کو کیا اداس کرتی اس لیے محض اس کا دل رکھنے کے لیے میں نے کہا۔

"ہاں کیوں نہیں... صرف میں نہیں سب ہی یاد کریں گے۔"

حسن کے چہرے پر میں نے مسکراہٹ کو پھیلتے دیکھا، یوں لگا جیسے اس کے دل سے کوئی بوجھ ہٹ گیا ہو۔

"تم صرف اپنی بات کرو۔"

"میں تمہیں یاد کروں گی حسن!"

کیا خوشی صرف کسی کی مسکراہٹ سے ظاہر ہوسکتی ہے؟

شاید ہاں... کیونکہ میں نے حسن کے چہرے پر بے پایاں خوشی کو مسکراہٹ بن کر پھیلتے دیکھا۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں اور یوں لگا جیسے وہ اپنی خوشی چھپا نہ پا رہا ہو۔

"اور کیا تم میرا انتظار کروگی نور؟" اس نے پوچھا، اس سے پہلے کہ میں اس کا سوال سمجھ پاتی حسن نے کہا۔

"نور! میں چاہتا ہوں تم میرا انتظار کرو، کیونکہ یہاں سے جانے کے بعد میری زندگی کا کوئی ایک بھی لمحہ ایسا نہیں ہوگا جب میں تمہیں یاد نہ کروں۔ تمہیں پتا ہے کوئی کسی کو کب اتنا یاد کرتا ہے؟ جب وہ چاہتا ہے متعلقہ شخص ہمیشہ اس کے پاس رہے، میں چاہتا ہوں تم ہمیشہ میرے پاس رہو، میں اپنے گھر جانے کے بعد بھی تمہیں یاد کرتا ہوں، تم یقین کروگی اکثر رات کو سوتے ہوئے میں تمہارے بارے میں سوچ رہا ہوتا ہوں، صبح کو جب اٹھتا ہوں تو اکثر سب سے پہلے مجھے تمہارا خیال آتا ہے، مجھے تمہارا چہرہ اس طرح ازبر رہتا ہے کہ تمہیں خود بھی یاد نہیں رہتا ہوگا۔ اگر میری ڈرائنگ اچھی ہوتی تو یقیناً" میں آنکھیں بند کرکے تمہارا اسکیچ بنا سکتا تھا۔ مگر..." وہ ہنسا۔ جھجک آمیز ہنسی۔

"تم سوچ رہی ہوگی، حسن کو کیا ہوا ہے؟ میں لیبیا جارہا ہوں، تاکہ ڈھیر سارا پیسہ کما سکوں۔ بہنوں کی شادیوں اور اپنے بہتر مستقبل کے لیے ہی نہیں۔ میں خود کو اس قابل بنانا چاہتا ہوں، تاکہ کل کو بنا جھجکے تایا ابو سے تمہیں مانگ سکوں۔ میرا انتظار کرنا نور! تمہارا انتظار میرا حوصلہ اور ہمت ہوگا۔"

اس نے میری چہرے پر الوداعی بھرپور نظر ڈالی اور چلا گیا۔ یہ نظریں اتنی گہری تھیں کہ میرے دل کی سرزمین پر زلزلے سے پہلے والا سناٹا چھا گیا اور پھر اتنا شدید بھونچال آیا کہ دل تو دل میرا سارا وجود ہی ہل کر رہ گیا۔

بے شک اس وقت میں ٹین ایجر تھی، سولہ سال کی عمر میں ویسے بھی اتنی عقل نہیں ہوتی۔ لیکن "تنہائیاں" اور "دھوپ کنارے" جیسے سپرہٹ ڈرامہ سیریلز میں نے بھی دیکھ رکھے تھے اور میں جانتی تھی، جب کوئی بہت گھما پھرا کر بات کر رہا ہو تو اس کا مطلب کیا ہوتا ہے۔

میں چند روز شش و پنج میں مبتلا رہی، لیبیا جاکر حسن نے سب سے پہلی کال مجھے کی تھی، حال احوال پوچھ کر فون بند کردیا، اس کے بعد وہ لگاتار ہر روز چند منٹ کی کال کرکے حال پوچھتا اور فون بند کردیتا۔ واردات عشق میں یہ فون کالز بھی بے حد معاون ثابت ہوگئیں اور یوں نور احسان نے سولہ سال کی عمر میں محبت کے کلمہ حق پر لبیک کہہ دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

سولہ سال کی عمر میں محبت کا جذبہ کسی فینٹسی کی طرح ہوتا ہے۔ ایسی فینٹسی جیسے انسان اپنی جان سے بھی عزیز کرلیتا ہے۔

بہرحال بار بار "سولہ سال کی عمر میں محبت" کا کلمہ پڑھنے سے آپ یہ نہ سمجھے کہ پھر میں ساری زندگی اسی فینٹسی میں قید رہی... نہیں ایسا نہیں ہوا، شروع کے چند سال اس فسوں میں قید رہنے کے بعد مجھے اور حسن کو آٹے دال کا بھاؤ محاورتاً "نہیں حقیقتاً" سمجھ میں آنے لگا تھا۔

لیبیا میں حسن کے ابتدائی چند سال بہترین گزرے اس دوران منیزہ آپا کی شادی ہوئی۔ چچی جان حسن کی ترقی پر بے حد مسرور رہتیں، بابا جان بھی خوش تھے کہ حسن نے ان کے خدشات کو غلط ثابت کردیا تھا۔ ان ہی دنوں کسی بات پر اسپتال کے عملے سے اس کا جھگڑا ہوا اور اسے نکال دیا گیا۔ یہیں سے دراصل حسن کے مالی اعتبار سے برے دور کا آغاز ہوا۔ اس نے کسی بہتر ملازمت کی تلاش میں بہت دھکے کھائے۔ مگر کوئی خاطر خواہ نتیجہ حاصل نہ ہوسکا۔ تھک ہار کر اس نے مزدوری بھی کی تب ہی ایک مخصوص رقم چچی جان کو بھجوا پاتا، لیکن یہ رقم ایسی نہیں تھی کہ اس میں سے کچھ پس انداز کرکے بہنوں کی شادیوں کے لیے سنبھالا جاسکے۔

تب میں نے حسن کا ہاتھ بٹانے کا فیصلہ کیا، ان دنوں میں گریجویشن کے فائنل ایر میں تھی، پڑھائی کے ساتھ ساتھ میں نے ہوم ٹیوشن پڑھانا شروع کردی۔ کچھ عرصہ ایک کال سینٹر میں کام بھی کیا۔ اپنی کوششوں سے میں جتنا کماتی، وہ کسی بھی بہانے سے جاکر چچی جان کے ہاتھ پر رکھ دیتی۔ اگلے روز حسن کا فون آتا اور وہ میری اس روش پر خفگی کا اظہار کرتا۔

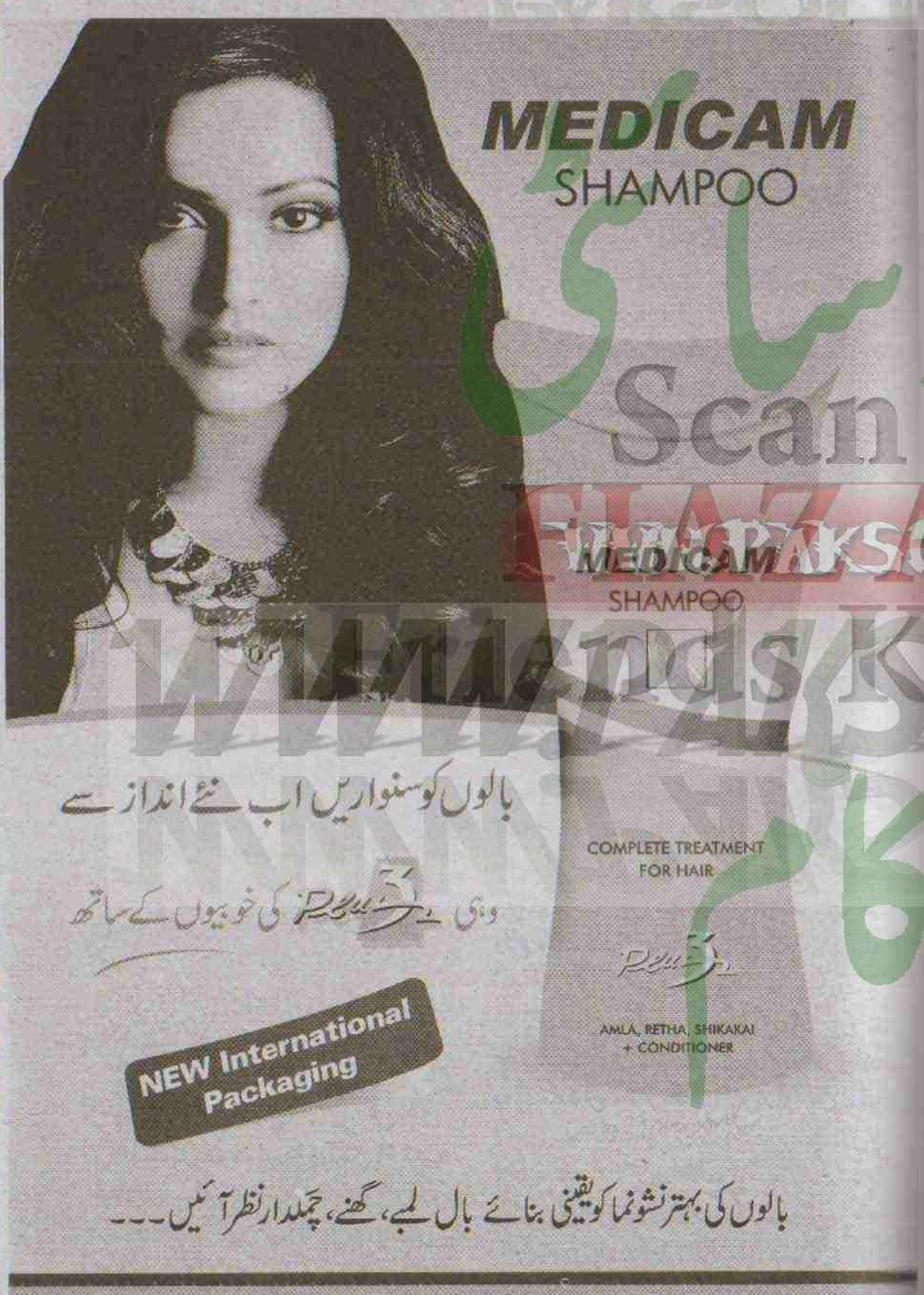
مجھے پہلی بار احساس ہوا۔ حسن، چچا جان کی طرح ہی خوددار تھا، جیسے وہ اپنے بھائیوں سے مدد لینا نہیں چاہتے تھے، اسی طرح حسن اس بات پر معترض تھا کہ میں اس کی مالی مدد کیوں کرنا چاہتی ہوں۔

"میں اپنی پریشانی کا ذکر تمہارے سوا کسی سے نہیں کرتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم مجھ پر ترس کھاتے ہوئے میری جھولی میں خیرات ڈالنا شروع کردو۔" وہ بے حد غصے میں تھا۔

"حد ہوتی ہے حسن! اگر میں تمہارا ہاتھ بٹانا چاہتی ہوں تمہارے مشکل وقت میں کام آنا چاہتی ہوں تو تم اسے خیرات تصور کروگے۔"

میرے اور حسن کے درمیان کئی بار اسی موضوع پر دھواں دھار بحث ہوئی۔ میں جانتی ہوں۔ میں نے کتنی وقتوں سے اسے اپنی تھوڑی سی مدد لینے پر راضی کیا۔ راضی بھی کہاں کیا... میں تو زبردستی اس کی مدد کر رہی تھی، لیکن پھر یہ سلسلہ چل نکلا، میں خوش تھی کہ محبت ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونے کا نام ہی تو ہے۔

بہرحال وقت یوں ہی گزرتا رہا۔ لیبیا میں حسن نے اور یہاں میں نے زندگی کو بہتر طریقے سے گزارنے کے لیے بڑی جدوجہد کی۔ اس دوران حسن نے اپنی کئی



ذمہ داریاں پوری کیں، جن میں سرفہرست منیزہ اور مائدہ آپا کی شادیاں تھیں اور عفاف آپا کا آپریشن تھا۔ ان کے دل میں بچپن سے سوراخ تھا۔ جس کا علاج اب کروایا جا رہا تھا جس روز مائدہ آپا کی رخصتی تھی حسن نے فون پر مجھ سے کہا۔

"تھینک یو سو مچ نوری! یہ سب صرف تمہاری وجہ سے ممکن ہو سکا۔ اگر تم جذباتی اور مالی اعتبار سے میری اتنی مدد نہ کرتیں تو میں کبھی اپنی ذمہ داریاں پوری نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے یہ سوچ کر ہی بہت خوشی محسوس ہوتی ہے کہ تم صرف میرا مقدر ہو۔"

وہ بے حد شکر گزار ہو رہا تھا میرا ڈھیروں خون بڑھ گیا۔ اس لیے نہیں کہ وہ شکر گزاری کا اظہار کر رہا تھا، بلکہ اس لیے کہ حسن دنیا کا وہ واحد شخص تھا جس کی خوشی اور اطمینان مجھے ایک ناقابلِ بیان مسرت میں مبتلا کر دیتا تھا۔

جس وقت عفاف آپا کی شادی ہوئی، حسن کو لیبیا گئے نو سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ میں اور حسن باقاعدہ ایک دوسرے سے منسوب نہیں ہوئے تھے، لیکن کسی نہ کسی طرح یہ خبر سارے خاندان میں پھیل چکی تھی۔ شاید اسی لیے انگوٹھی پہن کر ایک دوسرے سے منسوب ہونے کا خیال ہمیں نہیں آیا۔ پھر ہمارے گھر والے بھی اس رشتے کے حق میں تھے، سو ہمیں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

عفاف آپا سے چھوٹی شمسہ آپا تھیں جو عمر میں مجھ سے پانچ سال بڑی تھیں۔ چچی کا ارادہ تھا۔ شمسہ آپا کے ساتھ ہی میری اور حسن کی شادی کر دی جائے لیکن ان ہی دنوں ایک عجیب مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ حسن جس سپر اسٹور پر بطور منیجر کام کر رہا تھا۔ اس اسٹور کے مالک کا قتل ہو گیا اور شک کے گھیرے میں حسن بھی آگیا، کیونکہ وہ ان چند لوگوں میں سے تھا جنہیں واردات سے چند گھنٹے قبل اس آدمی کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔

بڑی مشکل گھڑی آن پڑی تھی، حسن کی تاکید تھی اس کے گھر میں یہ بات کسی کو نہ بتائی جائے، جبکہ میرے بابا جان، فاروق بھائی اور فیروز بھائی یہاں بیٹھ کر اس کی رہائی کے لیے کوششیں کر رہے تھے۔ کچھ باتیں یا یادیں۔۔۔ بیان کرتے ہوئے صرف ایک جملہ محسوس کرتی ہیں، لیکن جس پر بیتی ہو، اس کے لیے وہ پورا ایک زمانہ ہوتا ہے۔

حسن بے گناہ تھا۔ میں جانتی تھی، کیونکہ اس پر تو مجھے خود سے بھی زیادہ بھروسا تھا، لیکن لیبیا کی حکومت میرے بھروسے کو نہیں مانتی تھی۔ انہیں گواہ اور شواہد چاہیے تھے جو حسن کو بے گناہ ثابت کرتے۔ بابا جان نے عفاف آپا اور شمسہ آپا کی شادیاں اسی عرصہ میں کروائیں۔ اس کے بعد فاروق بھائی اور آذر لیبیا گئے۔ وہاں جا کر انہوں نے حسن کے لیے بہترین وکیل کیا اور یوں تقریباً" پانچ سال کی اذیت ناک کشمکش کے بعد حسن کو رہائی نصیب ہو سکی۔ حسن بے گناہ ثابت ہو چکا تھا، لیکن اس ملک کے قانون کے مطابق جب تک قانون کے مطابق اصل قاتل کا پتا نہ چل جاتا، حسن ملک سے باہر نہیں جا سکتا تھا۔

اور اب پورے سترہ سال کے بعد۔ جی ہاں۔ پورے سترہ سال بعد حسن پاکستان آرہا تھا۔ سترہ سال بظاہر دو لفظ ہی تو ہیں، لیکن میری اور حسن کی زندگی کا بہترین دور ان ہی سترہ سالوں کی جدوجہد کی نذر ہو گیا۔ کیا آپ ایسے انسان کی خوشی کا احساس کر سکتے ہیں جس نے ایک خوشی کے لیے سترہ سال انتظار کیا ہو؟

☼ ☼ ☼

"پتا ہے نور پھوپھو! میرا دل چاہتا ہے میں بھی جلد از جلد آپ کی عمر کی ہو جاؤں اور اس عمر میں اتنی ہی گریس فل اور ینگ لگوں جتنی کہ آپ لگتی ہیں۔" عفیرہ میرے ساتھ کمبل میں گھسی بیٹھی تھی۔

ماریہ بھابھی کی مجھ سے چپقلش کے باوجود ان کے بچے خصوصاً" عفیرہ مجھ سے بہت اٹیچ تھی۔ وہ فاروق بھائی کی سب سے بڑی اولاد تھی اور اپنے باقی بھتیجوں، بھتیجیوں میں مقابلے میں مجھے اس سے زیادہ محبت محسوس ہوتی تھی۔

"تم اتنی ینگ ایج میں بھی بہت گریس فل لگتی ہو۔" میں نے پیار سے اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"وہ اس لیے کیونکہ میں آپ کو کاپی کرتی ہوں، دیکھیں میں نے نیا ہیر کٹ بھی کرایا ہے۔ جویریہ لوگوں کو میں نے آپ کی پکچر دکھائی تھیں کہ دیکھو یہ ہیں میری پھوپھو۔ جن کی میں اتنی بڑی Admirer (معترف) ہوں۔ تو جب میں نے نیا ہیر کٹ کرایا تو میری فرینڈز کہنے لگیں عفیرہ! تم تو بالکل اپنی پھوپھو کی ٹوین سسٹر (جڑواں بہن) لگ رہی ہو۔ بلیو می! مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ بس۔"

عفیرہ بہت پرجوش ہو کر بول رہی تھی اور میں پیار سے اسے دیکھ رہی تھی۔ کندھوں تک آتا ہیر کٹ جو اس کی لمبی گردن کی وجہ سے اور بھی جچ رہا تھا۔

"لیکن ایک بات ہے نوری پھوپھو! میرا دل چاہتا ہے، میں بالکل آپ کے جیسی لگا کروں۔ جو جو خصوصیات آپ میں ہیں وہ سب مجھ میں بھی ہوں، لیکن۔۔۔ لیکن میں نہیں چاہتی کہ میرا دل آپ کے جیسا ہو۔" اس نے لمحہ بھر کا توقف کرتے ہوئے کہا۔

"ارے۔۔۔ کیوں بھئی۔۔۔ میرے دل میں کیا برائی ہے؟" میں نے اپنے بالوں کو ربڑ بینڈ میں جکڑتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کا دل ضرورت سے کچھ زیادہ ہی اچھا ہے۔ ایکچوئلی یہ ہی آپ کی سب سے بڑی برائی ہے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا، مجھے نہ جانے کیوں ہنسی آگئی۔

"کیا کسی کا دل اچھا ہونا اس کی شخصیت کی برائی ہو سکتا ہے؟ ناممکن۔"

"آپ کی اپنی بات ہے نا اس لیے آپ نہیں مانیں گی، بلکہ میں تو کہوں گی آپ اور حسن انکل دونوں ہی اس معاملے میں کورے ہیں۔ اپنی زندگی کا بہترین دور آپ دونوں نے اس جدوجہد کے نام کر دیا جس کا فائدہ صرف اور صرف حسن انکل کی بہنوں کو ہوا۔ میں نے تو سوچ لیا ہے گو کہ میں آپ کے جیسی ضرور بننا چاہتی ہوں، لیکن اتنا Sacrifice (ایثار) کبھی نہیں کروں گی۔

بائے دا وے نوری پھپھو! آپ کو عفاف آنٹی کی بھی کوئی خبر ہے؟" عفیرہ نے کچھ یاد آنے پر پوچھا، میں عفاف آپا کا نام سن کر چونک گئی۔

"میری فرینڈ ہے نا سطوت؟ اس کا گھر عفاف آنٹی کے گھر کے قریب ہی ہے میں نے اسے بتایا تھا کہ عفاف آنٹی میرے بابا کی فرسٹ کزن ہیں۔۔۔ سطوت بتا رہی تھی۔ دو، تین دن قبل عفاف آنٹی کے گھر میں بہت جھگڑا ہوا تھا اور ان کے ہزبینڈ نے عفاف آنٹی کو ٹارچر کرنے کے بعد گھر سے نکال دیا تھا۔"

عفیرہ سنجیدگی سے بتا رہی تھی اور میں ساری بات سن کر بھونچکا رہ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کبھی کبھی تو مجھے سخت بے زاری محسوس ہونے لگتی ہے، آخر تقدیر نے ہمارے لیے کیا سوچا ہے۔ سترہ سال بعد اگر ہمارے ملنے کی کوئی راہ نکل ہی رہی تھی تو تقدیر نے ایک نئے مسئلے کو لا کر ہمارے درمیان رکھ دیا۔"

تقریباً ایک ہفتہ کے بعد میری حسن سے بات ہو رہی تھی اور وہ بے حد پریشان اور دل گرفتہ لگ رہا تھا۔ میرے اپنے دل کی حالت بھی عجیب سی ہو رہی تھی۔ محض چند روز قبل میں کتنا خوش تھی مگر اب۔۔۔ عفاف آپا کے میاں بے حد لالچی طبیعت کے مالک واقع ہوئے تھے، جیسے ہی انہیں حسن کے پاکستان آنے کی اطلاع ملی۔ انہوں نے پانچ لاکھ روپے کی ڈیمانڈ سامنے رکھ دی۔ بقول ان کے وہ کوئی کاروبار شروع کرنا چاہ رہے تھے، جس کے لیے انہیں رقم درکار تھی اور بیوی کے بھائی کا فرض تھا کہ انہیں رقم فراہم کرتا۔ انہوں نے عفاف آپا کو مجبور کیا کہ جا کر اپنے بھائی یا بہنوں سے رقم لائیں۔ عفاف آپا کے انکار کرنے پر انہیں بری طرح زدوکوب کر کے گھر سے نکال دیا تھا۔ لیکن کچھ روز بعد وہ خود ہی عفاف آپا کو منیزہ آپا کے گھر سے واپس لے گئے تھے۔ حسن سے رقم کے مطالبے اور طلاق کی دھمکی کے ساتھ۔

"پریشان مت ہو حسن۔" میں نے تسلی دینا چاہی تھی، لیکن میں جانتی تھی، میرے الفاظ بالکل بے وزن تھے۔

"کیسے پریشان نہ ہوں۔ تمہیں پتا ہے میری جیب بالکل خالی ہے۔ پہلے کیس پر پیسہ لگتا رہا۔ سیونگ تو نہ ہونے کے برابر رہی ہے۔ اب میرے پاس صرف اتنی رقم ہے کہ میں ویزا لگوا کر واپسی کا ٹکٹ خرید سکوں۔ میں نے پاکستان میں کوئی کاروبار سیٹ کرنے کا سوچ رکھا ہے، پھر شادی کے اخراجات بھی ہیں۔ تم خود سوچو پانچ لاکھ عفاف آپا کو دیتا ہوں تو یہ ہمارے کام کیسے پورے ہوں گے۔"

"تم فکر مند نہ ہو حسن! اللہ کوئی نہ کوئی سبب بنا دے گا۔" میں نے بوجھل آواز میں کہا۔ آنسوؤں کا گولہ بری طرح حلق میں پھنس رہا تھا۔

"بہت سوچنے کے بعد مجھے تو ایک ہی راستہ دکھائی دے رہا ہے۔ جب عفاف آپا کی پریشانی دور کرنا ہی ہے تو جلد کچھ کرنا پڑے گا۔ میں جس فیکٹری میں کام کرتا ہوں وہاں سے ایڈوانس مل سکتا ہے۔۔۔ لیکن" وہ رکا۔

"لیکن کیا؟" میں نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"مجھے کنٹریکٹ بڑھانا پڑے گا اور اس دوران میں پاکستان بھی نہیں آسکوں گا۔ جو ایڈوانس دیں گے ان کی اپنی بھی کچھ سیکیورٹیز ہوں گی۔ ہماری شادی پھر موخر کرنا پڑے گی۔ ہم مزید کچھ سال ایک دوسرے سے نہیں مل سکیں گے۔ ہم پھر ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکیں گے۔"

حسن بوجھل اور دھیمی آواز میں کہہ رہا تھا، میں چپ تھی، بولنے کی کوشش کرتی تو آواز کی نمی پہلے اس تک پہنچ جاتی۔ اور یقیناً حسن جذبات میں آکر پاکستان آنے کا فیصلہ کر لیتا۔

☼ ☼ ☼

"بے چاری عفاف آپا! مرد کی بے وفائی کی جیتی جاگتی مثال۔" پوری بات سننے کے بعد نمل نے تاسف سے کہا تھا۔

آذر نے مجھے اور نمل کو ڈنر پر انوائیٹ کیا تھا۔ نمل کا بگڑا مزاج درست کرنے کی کوشش تھی اچھی بات یہ کہ نمل نے اپنی عادت کے برخلاف زیادہ نخرے نہیں دکھائے تھے، بلکہ اپنی ناراضی پس پشت ڈال کر آگئی تھی۔

"محض پانچ لاکھ کے لیے ایک عورت کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے، دیکھ لو نوری! میں کہتی ہوں نا، مرد بے وفا ہوتا ہے، یہ ایک اور مثال سامنے آگئی ہے۔"

"تمہیں شاید بے وفائی کا مطلب نہیں پتا۔" یک دم آذر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا تھا۔

"مجھے پتا ہے۔" نمل نے اپنے مخصوص "مجھے سب پتا ہے" والے انداز میں کہا۔

"غلط۔۔۔ بالکل غلط۔۔۔ تمہیں نہیں پتا، بے وفائی کیا ہوتی ہے، جس روز سامنا ہوگا بے وفائی سے۔۔۔ عقل ٹھکانے آجائے گی۔"

"دیکھ لو نوری! یہ ابھی سے مجھے دھمکیاں دے رہا ہے۔ شادی کے بعد کیا کرے گا۔" نمل نے تڑپ کر میری طرف رجوع کیا تھا۔

"پلیز یار! تم لوگ اب جھگڑا مت شروع کر دو، میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔" میں نے جھنجلا کر کہا۔

"پریشانی کی کیا بات ہے نوری! جتنی رقم عفاف آپا کو چاہیے اتنی تو میں بھی دے سکتا ہوں۔" آذر نے کہا۔

"عفاف آپا تم سے مدد لینے کے لیے کبھی راضی نہیں ہوں گی آذر۔" میں نے کہا۔ "الٹا ان کی خودداری پر تو بڑی بری چوٹ لگ جائے گی جب انہیں یہ پتا چلے گا کہ ان کے گھریلو حالات کی خبر سارے خاندان میں پھیل گئی۔"

"تو عفاف آپا کو بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ تم کہہ دینا حسن نے بھجوائے ہیں۔"

"تمہیں نہیں پتا آذر! حسن تو اور برا مانے گا، اگر میں نے تم سے پیسے لیے تو۔۔۔"

"ارے تو حسن کو بھی بتانے کی کیا ضرورت ہے،

کہہ دینا تمہارے اپنے ہیں۔" آذر نے جھنجلا کر کہا۔

"لیکن..."

"کوئی لیکن ویکن نہیں، مجھے پتا ہے کہ تم کتنی پریشان رہو گی۔ کیا میں اپنی فرینڈ کی اتنی سی بھی مدد نہیں کر سکتا۔ نمل! تم ہی اسے سمجھاؤ۔"

"آں... ہاں، آذر ٹھیک کہہ رہا ہے نور!" نمل نے جیسے ناچار کہا تھا۔ مجھے ہنسی آگئی، اب اتنا تو میں نمل کو جان ہی گئی تھی۔

"اور میں کون سا تمہیں یا حسن کو یہ رقم تحفتاً دے رہا ہوں، یار! اتنی مہنگائی کے دور میں کوئی کسی کو ایسا تحفہ نہیں دیتا۔ اس لیے جب تم لوگوں کے پاس اتنی رقم ہو، واپس لوٹا دینا۔" آذر نے بات جاری رکھی تھی۔

"شکریہ آذر۔" میں نے "تشکر" بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

"حسن نے اپنی فیکٹری میں بات کی ہے اگر اسے دو سال کی تنخواہ ایڈوانس میں مل گئی تو عفاف آپا کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔" میں کرسی کھسکا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ کھانا ہم کھا چکے تھے اور آذر اور نمل نے کافی آرڈر کی تھی۔

"دو سال؟" آذر نے تعجب سے کہا۔ "پھر تو حسن مزید دو سال پاکستان نہیں آسکے گا۔ تم دونوں اپنے ساتھ کر کیا رہے ہو نور! مجھ سے مدد لینے میں کیا دقت ہے؟

اگر کہو تو میں حسن سے بات کروں؟" مجھے خاموش دیکھ کر آذر نے پوچھا۔

"میں بات کروں گی۔" چند لمحے سوچنے کے بعد میں نے کہا۔ ایسا صرف میں نے آذر کو مطمئن کرنے کے لیے کہہ دیا تھا کیونکہ میں جانتی تھی حسن کبھی قائل نہیں ہوگا الٹا اس نے تو اسی بات پر خفا ہو جانا تھا کہ آذر عفاف آپا کی پریشانی سے واقف ہے۔

بعض اوقات خودداری بھی مصیبت بن جاتی ہے۔

"میں ذرا ایگزیبشن دیکھ کر آتی ہوں۔" ریسٹورنٹ کے اوپن ایئر میں ہینڈی کرافٹس کی نمائش لگی ہوئی تھی۔ میں آذر اور نمل کو کچھ دیر تنہائی فراہم کرنے کے خیال سے بہانا بنا کر وہاں سے ہٹ گئی۔ آذر کے اصرار پر کباب میں ہڈی بن کر آتو گئی تھی مگر میں جانتی تھی ان دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ وقت گزار کر گلے شکوے کرنے کی ضرورت تھی۔

کاریڈور کے کونے پر پہنچ کر میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ دونوں بھی شاید میرے منظر سے ہٹنے کے ہی منتظر تھے، اب آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ڈائیلاگز بولنے میں مصروف ہو چکے تھے مجھے ہنسی بھی آئی اور حسن کی یاد بھی۔ ایک گہری سانس بھر کر میں نے سر جھٹکا اور آگے بڑھی۔

تب ہی کسی نے مجھے میرے نام سے پکارا میں نے دیکھا لمبے قد اور مضبوط جسامت کا شخص تھا جس کی شکل مجھے کچھ جانی پہچانی سی لگی مگر فوری طور پر یاد نہیں آیا کہ اسے کہاں دیکھ رکھا ہے۔

"مس احسان! شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں میں باسط ملک ہوں۔ آپ سے بینک..."

وہ ابھی کہہ ہی رہا تھا کہ میرے ذہن میں جھماکہ سا ہوا اور منظر واضح ہوتا چلا گیا۔

"ارے باسط ملک! آپ تو ہمارے فیصل بینک کے اتنے بہترین کلائنٹس میں سے ہیں۔" میں نے پروفیشنل مسکراہٹ لبوں پر سجا کر کہا۔ باسط صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"اچھا ہوا۔ آج یہاں آپ سے ملاقات ہو گئی ورنہ کل میں آپ سے ملنے گلبرگ برانچ آہی رہا تھا۔" اس کی بات پر میں حیران ہوئی اور کچھ نا سمجھی سے اسے دیکھا۔

"آپ کو یاد ہو گا چند مہینے پہلے میں نے آپ کو بطور آر جے کام کرنے کی آفر دی تھی؟"

باسط ملک بینک آئے تھے۔ میں اسی حوالے سے انہیں جانتی تھی۔ وہ کسی ٹی وی اور ریڈیو چینل سے وابستہ تھے اور ان کے چینل کا زیادہ تر لین دین ہمارے بینک کے توسط سے ہوتا تھا، اسی سلسلے میں باسط ملک صاحب کا بینک آنا جانا لگا ہی رہتا تھا۔ ایک روز انہوں نے واقعی میری وائس کوالٹی (آواز) کی تعریف کرتے ہوئے مجھے اپنے ریڈیو چینل پر آر جے کے طور پر کام کرنے کی پیشکش کی تھی جسے میں نے فی الفور رد کر دیا کہ بہرحال۔

مجھے اس کام میں بالکل دلچسپی نہیں تھی دوسرے میرا خیال تھا آر جے بننے کے لیے محض وائس کوالٹی ہی ضروری نہیں ہوتی آپ کو بے تکان بنا رکے بولنے کا سلیقہ بھی آنا چاہیے۔ مجھے پتا تھا کوشش کے باوجود بھی میں اتنا نہیں بول پاؤں گی۔

"مجھے یاد ہے ملک صاحب! لیکن میرا نہیں خیال کہ میں اس کام کے لیے سوٹ ایبل ہوں۔"

میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا ملک صاحب پھر مسکرانے لگے جیسے کسی کی کم فہمی پر مسکرایا جاتا ہے۔

"مجھے اچھی طرح سے آپ کا جواب یاد ہے مس احسان! لیکن اس بار میں آپ کو anchoring (میزبانی) کے لیے نہیں کہہ رہا۔ دراصل میں ایک پروڈکشن ہاؤس سے منسلک ہوں اور ہم لوگوں نے عورتوں پر تشدد کے موضوع پر ڈاکیومنٹریز تیار کی ہیں میں چاہتا ہوں ان ڈاکیومنٹریز کی کمنٹری آپ سے کروایا جائے۔"

"لیکن ملک صاحب!" میں نے کہنا چاہا۔

"معذرت چاہتا ہوں کہ آپ کی بات کاٹ رہا ہوں۔ آپ ایک بار سنجیدگی سے اس آفر پر غور ضرور کریں۔

دراصل آپ لہجے کی خوب صورتی، الفاظ کی ادائیگی کا طریقہ کار، شین قاف سے درست تلفظ۔ اگر بالکل غیر جانب داری سے تجزیہ کیا جائے تو یہ ایسی خصوصیات ہیں جو فی زمانہ بہت کم لوگوں کے پاس ہیں اب اگر آپ ان خوبیوں کو بروئے کار نہیں لاتیں تو یقین مانئے یہ آپ کی ناانصافی بلکہ ناقدری ہوگی۔"

انہوں نے اتنے تاسف بھرے انداز میں کہا کہ مجھے فوراً ہنسی آگئی اور جسے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر میں نے بمشکل روکا۔

"اب تو آپ مجھے اموشنل کر رہے ہیں۔"

"آپ یہ میرا کارڈ رکھیے۔ اس آفر پر غور کریں میں جانتا ہوں آپ میں اتنی صلاحیت ہے کہ آپ بہت آگے تک جا سکتی ہیں۔ بس تھوڑی جھجک ہے جسے دور کرنا پڑے گا۔"

میں حیرانی سے باسط ملک کے اپنے بارے میں اندازے سن رہی تھی۔

"ہم شیڈول آپ کی سہولت کے حساب سے سیٹ کریں گے اس طرح کہ آپ کی ملازمت بھی متاثر نہ ہو پھر اس کام کے لیے آپ کو بہت معقول معاوضہ بھی ادا کیا جائے گا مس احسان! اس بارے میں ضرور سوچیے گا۔" اور اب میں نے اس کا وزٹنگ کارڈ پکڑ لیا۔

"میں آپ کو کل یا پرسوں تک سوچ کر انفارم کردوں گی۔"

"مائی پلیژر۔" وہ خوشی خوشی رخصت ہوا۔ میں وزٹنگ کارڈ کو دیکھتی روش کی طرف آگئی، جہاں نمل اور آذر میرا انتظار کر رہے تھے۔

"یہ تم کس ہینڈسم سے باتیں کر رہی تھیں۔ وہ بھی اکیلے اکیلے۔" نمل نے آنکھیں مٹکا کر پوچھا، میرا دماغ جو باسط ملک کی "معقول معاوضے والی بات" میں اٹکا ہوا تھا چونک سی گئی۔

"یہ باسط ملک تھے۔ ہمارے بینک کے اکاؤنٹ ہولڈر اکثر بینک آتے رہتے ہیں لیکن میرا خیال ہے جب سے تمہارا اپائنمنٹ ہوا ہے یہ ایک بار بھی نہیں آئے۔" میں نے بتایا۔

"واہ بھئی۔ بینک میں تو بڑے ہینڈسم لوگ آتے ہیں میرا خیال ہے اس جاب کو پھر مستقل کروانے کے لیے مجھے کوئی چلہ کاٹ لینا چاہیے۔" وہ ذرا بھی سنجیدہ نہیں تھی۔

"تھوڑی شرم کرو نمل! منگیتر کے سامنے کسی دوسرے کو ہینڈسم کہتے تمہیں لحاظ کرنا چاہیے۔" آذر نے بھی اسے غیر سنجیدگی سے لتاڑا۔

"اچھا ان منگیتر صاحب کا لحاظ اس وقت کہاں تھا

جب ساتھ والی ٹیبل کی اس حسینہ کو گھور رہے تھے کہ تنگ آکر مجھے خود ہی اٹھنا پڑا۔"

ان دونوں کا اپنا جھگڑا چھڑ گیا جو گھر پہنچنے تک بھی جاری رہا۔

☼ ☼ ☼

"مجھے لگتا ہے جس کام کے لیے آئے ہیں اسے پورا کیے بغیر ہی واپس جانا پڑے گا۔ فاروق! آخر آپ نوریز سے بات کیوں نہیں کرتے؟" فاروق بھائی اور ماریہ بھابھی شام سے آئے ہوئے تھے کھانا کھانے کے بعد بھائی جان نے مجھ سے چائے کی فرمائش کردی۔ میں چائے کی ٹرے لے کر لیونگ روم کی طرف آرہی تھی جب ماریہ بھابھی کی جھنجلائی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"میری اور نوریز کی بول چال بند تو نہیں ہے۔ پھر جب سے ہم آئے ہیں میں نوریز سے باتیں ہی تو کر رہا ہوں۔" بھائی جان نے لاپروائی سے کہا۔

"اب بنیں مت۔ آپ کو پتا ہے میں کیا کہہ رہی ہوں۔" بھابھی بے ناراضی سے کہا۔ "نوریز سے شادی کے متعلق پوچھیں۔ آخر کب تک ہم عفیرہ کو آپ کی بہن کی وجہ سے گھر میں بٹھا کر رکھیں گے۔"

"ماریہ! کبھی تو سوچ سمجھ کر بات کرلیا کرو۔" میں نے بھائی جان کی جھنجلائی ہوئی آواز سنی اس کے بعد کی بات میں سن نہیں سکی کیونکہ بھائی جان نے آواز بے حد دھیمی کرلی تھی۔

"بس جیسے ہی اس بہن کا ذکر آئے آپ بھڑک اٹھا کریں۔ آپ کیا چاہتے ہیں نوریز کی طرح عفیرہ بھی گھر بیٹھی بوڑھی ہوجائے۔"

"تمہیں نہیں پتا نوریز کی شادی کیوں ملتوی ہو رہی ہے۔ حسن آج پاکستان آجائے تو کل نوریز کی شادی کردیں۔"

"معاف کیجیے گا فاروق صاحب! لیکن مجھے لگتا ہے کہ حسن کے نہ آنے کا تو صرف بہانا ہی ہے دراصل تو آپ کی بہن صاحبہ ہی شادی کرنا نہیں چاہتیں۔ سچ ہے بھئی جن لڑکیوں کو آزادی زندگی گزارنے کا چسکہ لگ جائے پھر وہ گھر کیوں بسائیں گی۔"

"ماریہ! اب تم نے اپنی زبان بند نہیں کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"

میں نے فاروق بھائی کو کہتے سنا۔ اس کے بعد بھابھی تو خاموش ہوگئیں لیکن میرے اندر اتھل پتھل مچ گئی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی یہ بھی سوچ سکتا ہے کہ میں خود ہی شادی کو ٹال رہی ہوں۔ خصوصاً "میرے قریبی لوگ۔" اب میں ماریہ بھابھی کو کس طرح بتاتی کہ میں نے ان گزرے سالوں میں حسن کی کمی کو کتنا محسوس کیا ہے کتنی مرتبہ دنیا کی چبھتی ہوئی نظروں کا حوصلہ مندی سے مقابلہ کیا ہے۔ کتنی مرتبہ تنہائیوں سے لڑی ہوں صرف اور صرف اس لیے کیونکہ میں جانتی تھی ایک شخص ہے جو دیار غیر میں معاشی جدوجہد کرتے ہوئے مجھ تک پہنچنے کے لیے بے چین ہے۔ کہتے ہیں دنیا کی زبان دو دھاری تلوار ہوتی ہے۔ اور میرے لیے ماریہ بھابھی دنیا ہی تھیں۔ کوئی مانے یا نہ مانے لیکن دنیا کا خوف، دنیا کی زبان کا خوف، دنیا کی چھیدتی ہوئی نظروں کا خوف، دنیا کے الزامات کا خوف۔ انسان کے لیے ہر اس ڈر سے بڑا ثابت ہوتا ہے "عموماً" جو غیر مرئی مخلوق سے وابستہ ہوتا ہے۔ یہی خوف انسان سے بڑے بڑے فیصلے کروا لیتا ہے۔ کبھی سود مند کبھی نقصان دہ۔

میں جو باسط ملک سے معقول معاوضے کا سن کر بھی شش و پنج کا شکار تھی "دنیا" کے ایک ہی دھکے نے مجھے دھکیل کر نتیجے کی سرحد پر پہنچا دیا۔

میں نے اسی وقت اندر جا کر بھائی جان کو حسن کے پاکستان آنے کی اطلاع شادی اور اگلے روز آفس جا کر میں نے باسط ملک کو فون پر بتا دیا کہ میں ان کے ساتھ کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔

☼ ☼ ☼

پہلے ہفتے میں ہمیں نے دو پچیس پچیس منٹ کی ڈاکیومنٹریز کا وائس اوور (voice over) مکمل کروایا اور مجھے اس کا معقول معاوضہ ملا تھا۔ یہ معاوضہ میری توقعات سے کہیں زیادہ تھا۔ میری بڑھتی ہوئی دلچسپی اور آمادگی کو دیکھتے ہوئے باسط نے مجھے اپنے پروڈکشن ہاؤس کی طرف سے کچھ اور کام دلوایا۔ کچھ میں نے اپنے بینک سے لون لیا اور اپنا زیور بھی بیچا میرے پاس اتنی رقم جمع ہوگئی تھی کہ عفاف آپا کو دے سکوں۔ حسن کے فیکٹری میں ورک پرمٹ کے ابھی دو مہینے باقی تھے لیکن وہ بے حد مطمئن ہوچکا تھا اور میں بھی۔

آنے والی زندگی کو حسن کے ساتھ گزارنے کا خیال ہی اتنا خوش کن تھا کہ میں بن پروں کے ہواؤں میں اڑنے لگی تھی۔

اپنی کار اور منیزہ آپا کے لیے "ہاؤس فائنانس" کی صورت میں بینک سے حاصل کی ہوئی فیور (favoor) کی کٹوتی ہر مہینے میری تنخواہ سے ہوتی تھی جتنا تنخواہ آدھی رہ جاتی تھی کم رہ جاتی اور مجھے ہاتھ کھینچ کر خرچ کرنا پڑتا۔

☼ ☼ ☼

شیرٹن میں محفل موسیقی کا اہتمام کیا جا رہا تھا۔ باسط ملک نے انویٹیشن کارڈ کے ساتھ چھ انٹری پاس بھی بھجوائے تھے جنہیں دیکھ کر نمل اور آذر کا خیال آیا۔ نمل ایک ہفتے سے چھٹی پر تھی جبکہ اپنی بڑھتی ہوئی مصروفیت کی بنا پر کئی روز سے آذر سے ملاقات نہیں ہو پائی تھی۔ ساتھ ہی مجھے چند روز قبل نمل سے ہوئی گفتگو یاد آگئی۔

اس روز نمل کا موڈ بے حد خراب تھا دوبارا اسے مینجر صاحب سے ڈانٹ بھی پڑ چکی تھی۔ میں نے پوچھا تو جھنجلا کر بولی۔

"میری زندگی میں کوئی ایک مسئلہ نہیں ہے نوریز! کہاں تک سنو گے کہاں تک سنائیں۔" اس نے آرام سے مصرعہ بگاڑا۔ "مینجر صاحب چھٹی دینے پر راضی نہیں ہیں گھر میں والدہ صاحبہ کے میکے والے تشریف لا رہے ہیں۔ اوپر سے آذر بھی کم نہیں ہے تمہیں پتا ہے اب اس نے کیا کیا ہے؟"

میں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی اور نمل نے جو بتایا اسے سن کر میرا بھی دل چاہا اپنا سر پیٹ لوں۔ نمل تو ناراضی میں حق بجانب تھی۔

میں نے کارڈ اور پاس ایک طرف رکھ کر نمل کو فون ملایا لیکن نمل کا سیل فون آف ملا۔ لینڈ لائن پر کال کی تو پتا چلا کہ وہ گھر پر نہیں تھی۔ میں نے مہمانوں کی بابت پوچھا تو اس نے کہا سب لوگ جا چکے ہیں۔ صرف لئیق ماموں ہمارے یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔

میں نے آذر کو کال ملائی۔

"نمل سے تمہاری بات کب ہوئی تھی؟ میں تو کب سے ٹرائی کر رہی ہوں لیکن اس کا سیل آف ہے۔"

"دس روز پہلے بات ہوئی تھی۔ آج اس کا سیل آف ہے تو میں کیا بتا سکتا ہوں۔"

"دس روز پہلے۔" میں نے تعجب سے دوہرایا۔

"رومیو جولیٹ نے دس روز ایک دوسرے سے بات کیے بغیر صبر کیسے کرلیا؟" میں نے شرارتی انداز میں پوچھا۔

"تمہیں پتا تو ہے جولیٹ کتنی نخریلی اور جھگڑالو ہے۔ ناراضی اور غصہ تو اس کی ناک پر ہوتا ہے۔" اس نے بھی میرے انداز میں کہا۔

"تم نے حرکت ہی ایسی کی ہے آذر! کہ نمل اپنی ناراضی میں بالکل حق بجانب ہے۔ تمہیں کیا ضرورت تھی اچھی خاصی نوکری چھوڑ کر شیف بننے کی۔"

"تم سے کس نے کہا۔ میں نے نوکری چھوڑ دی؟" آذر کو جیسے میری باتیں سن کر دھچکا لگا تھا۔

"کون بتائے گا؟"

"نمل کا دماغ خراب ہے۔" وہ جھنجلا کر بولا۔

"میں نے اسے ساری بات تفصیل سے بتائی تھی۔ پھر بھی نوریز میں نے جاب چھوڑی نہیں ہے۔ کچھ عرصہ کی چھٹی پر ہوں ایک انٹرنیشنل ریسٹورنٹ کی چین کھل رہی تھی یہاں وہاں کچن اسٹاف کی ضرورت تھی۔ میں جسٹ فار فن انٹرویو دینے چلا گیا بلیو می

نوری میں یونہی چلا گیا تھا وہاں مستقل ملازمت کا ارادہ نہیں تھا میرا کیونکہ آج کل ریسٹورنٹ میں بھی صرف تجربے کی بنیاد پر نوکری نہیں ملتی۔ ڈگری چاہیے ہوتی ہے جو نمل بیگم کی مہربانی سے مجھے تاحال نہیں مل سکی۔ اس کے باوجود بطور اسسٹنٹ شیف میرا سلیکشن ہوا ہے سیلری پیکج اچھا ہے۔ میں نے سوچا نعمت غیر مترقبہ کو ٹھوکر مارنا کہاں کی عقل مندی ہے۔"

اس کی آواز خوشی سے بوجھل ہو رہی تھی۔

"یہ کام کرنا کتنا بڑا خواب تھا میرا! اب غیر متوقع پر اس خواب کو پورا کرنے کا موقع مل رہا ہے تو میں کیوں فائدہ نہ اٹھاؤں۔ نمل یہ بات نہیں سمجھ رہی کہ جس کام کو کرتے ہوئے میں دلی خوشی محسوس کر رہا ہوں، اسے چند مہینے کر لینے میں کیا برائی ہے۔ جلد یا بدیر مجھے اپنی پرانی جاب پر واپس چلے ہی جانا ہے۔ پھر جھگڑا کیسا؟ دل کی خوشی کے بغیر جب انسان کوئی کام کر رہا ہوتا ہے تو اس کی satisfaction (تسکین) نہیں ہوپاتی اور satisfaction کے بغیر روبوٹ کام کرتے ہیں انسان نہیں۔ مجھے لگتا ہے میں پچھلے کئی سالوں سے نیلسن کے سجے سجائے آفس میں بیٹھا روبوٹ کی طرح کام کر رہا ہوں دل کی خوشی اور satisfaction (اطمینان) کے بغیر، نمل سے کہو جو میں کرنا چاہتا ہوں کر لینے دے۔ صرف چند مہینوں کے لیے اسے ایک محفوظ اور خوش حال مستقبل فراہم کرنا میری ذمہ داری ہے۔ میں کیسے کروں گا۔ یہ بھی میری ذمہ داری ہے۔ پھر نمل کی ناراضی اور خدشات کس لیے ہیں۔"

وہ بے حد اکتایا ہوا اور ناسمجھی سے بول رہا تھا جیسے بڑی دقتوں کے بعد بھی نمل کا ذہن نہ پڑھ پا رہا ہو۔

"میں تمہاری ہر بات مانتی ہوں آذر! لیکن تم دونوں کب تک ایسی باتوں پر جھگڑتے رہو گے؟ ایک مرتبہ بیٹھ کر ان معاملات کو سلجھا کیوں نہیں لیتے۔" میں نے مخلصانہ انداز میں کہا۔

"یار نوری! یہ تو بڑے عام قسم کے جھگڑے ہیں جنہیں ایک نہ ایک دن سلجھ ہی جانا ہوتا ہے خصوصاً اگر محبت ہو تب تو ضرور ہی "سلجھ" جاتے ہیں۔ تم بے فکر رہو۔ میں نمل کو منا لوں گا۔"

نمل کی طرح آذر کی شکایات بھی ہنوز تھیں لیکن دلچسپ بات یہ کہ اس کے پاس ان شکایات کا توڑ بھی تھا جس کا نام تھا "محبت"

میں نے سب سنا اور گہری سانس بھر کر فون بند کر دیا۔

☼ ☼ ☼

اے عشق ہمیں اتنا تو بتا
انجام ہمارا کیا ہوگا
تقدیر بتا اب اس سے برا
انجام ہمارا کیا ہوگا

سارے میں منی بیگم کی دلکش آواز نے سماں باندھ رکھا تھا جب سارہ نے میرے قریب بیٹھتے ہوئے مجھے باسط کا پیغام دیا۔

"سر باسط! تمہیں باہر بلا رہے ہیں۔" میں سر ہلا کر غزل سنتی رہی کہ یہ غزل میری بہت پسندیدہ تھی پھر عفیرہ کو بتا کر ہال سے باہر آگئی۔ میری توقع کے برخلاف عفیرہ فوراً میرے ساتھ آنے پر راضی ہوگئی تھی اور اب بہت لطف اندوز بھی ہو رہی تھی۔

باسط کو میں نے برآمدے میں کھڑے دیکھا تھا۔ میرے قریب پہنچنے پر وہ جو اطمینان سے سگریٹ پی رہا تھا اس نے سگریٹ فوراً بجھا دی۔ مجھے اس کا یہ انداز اچھا لگا۔ باسط بلاشبہ بہترین انسان تھا اور مجھے اس کی کچھ عادات بہت ہی پسند آئی تھیں۔ اپنے کام سے بے حد لگاؤ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بہت تہذیب یافتہ اور مہذب بھی تھا۔

"آپ نے مجھے بلوایا تھا باسط!" اتنے دن ساتھ کام کرنے کی بنا پر تھوڑی بہت بے تکلفی تو پیدا ہو ہی چکی تھی کہ میں اسے نام سے پکارتی۔

"معذرت چاہتا ہوں کہ آپ کو زحمت ہوئی۔" اس نے جھینپتے ہوئے کہا۔

"معذرت کی تو خیر کوئی بات نہیں لیکن میں غزل

انجوائے کر رہی تھی۔ پتا نہیں منی بیگم کو لائیو سننے کا موقع دوبارہ ملے نہ ملے۔" میں نے خوش دلی سے کہا تھا۔

"منی بیگم آپ کو بہت پسند ہے؟"

"بہت۔" میں نے گرل پر بازو اٹکا کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "میرے پاس ان کا سارا کولیکشن ہے آج آٹوگراف بھی لے کر جاؤں گی بائے دا وے...." مجھے یکدم خیال آیا۔

"آپ باہر کیوں کھڑے ہیں، اس قدر خوب صورت غزلیں گائی جا رہی ہیں اندر۔"

"بس یونہی۔" وہ دو لفظی جواب دے کر سامنے دیکھنے لگا۔ مجھے اس کا کھویا کھویا سا انداز کچھ عجیب سا لگا تھا لیکن اس متعلق سوال کرنے کا خیال ترک کر کے میں نے پوچھا۔

"باسط! آپ نے مجھے کیوں بلوایا تھا؟"

اسی وقت ویٹر کافی لے کر آگیا تھا۔ باسط نے پہلے سے آرڈر کی ہوئی تھی تب ہی ایک کپ مجھے پکڑا کر دوسرا خود لے لیا۔

"مجھے آپ سے کچھ بات کرنا تھی۔"

"جی کہیے۔" تب باسط نے چند سیکنڈ سوچا پھر اپنے کوٹ کی جیب سے ایک خوب صورت مخملی ڈبیہ نکالی اور کھول کر اسے عین میرے سامنے گرل کے فریم پر رکھ دیا۔

میں سمجھی اور ناسمجھی کی کیفیت میں کبھی اس خوب صورت ڈائمنڈ رنگ کو تو کبھی باسط ملک کو دیکھ رہی تھی جس کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ تھی جبکہ آنکھوں میں پوری داستان۔

"میرا نہیں خیال اظہار محبت کا اس سے بہترین طریقہ کوئی اور ہو سکتا ہے۔" باسط کے کھنکتے لہجے نے جیسے مجھے ششدر کر کے رکھ دیا تھا۔

"صرف اظہار محبت ہی کیوں؟ پرپوز کرنے کے لیے بھی اس سے مناسب طریقہ اور کوئی نہیں ہو سکتا مگر شاید آپ کو کنونس کرنے کے لیے مجھے لفظوں کا سہارا لینا پڑے گا۔ دیکھیے نوری! میں بہت اسٹیٹ فارورڈ آدمی ہوں چاند ستارے توڑ کر لانے والے جھوٹے وعدے نہیں کر سکتا لیکن ایک بات طے ہے اگر آپ میرا ساتھ قبول کرتی ہیں میں آپ کو ہر وہ خوشی دوں گا جسے لانا میرے بس میں ہوگا۔ پہلی بار آپ مجھے کب اچھی لگیں، یہ تو مجھے پتا نہیں لیکن...."

"باسط پلیز...." میں نے بے ساختہ اس ٹوک دیا کہ اس کی باتوں نے محاورتاً "نہیں حقیقتاً" میرے اوسان خطا کر دیے تھے۔ میرے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ باسط نے مجھے یہ بات کرنے کے لیے بلایا ہوگا۔ میں نے محبت کا اختیار حسن کو دیا تھا دل و دماغ میں خود بخود یہ بات ثبت ہو چکی تھی کہ محبت کے اظہار کا حق بھی صرف حسن کو ہے۔

پریشانی کی ایک وجہ خود باسط بھی تھا نہ جانے اس بھلے انسان نے میرے کس انداز سے غلط امپریشن لیا تھا کہ میرے بارے میں اس طرح سوچنے لگا۔ مجھے سخت شرمندگی لاحق ہو رہی تھی۔ عجب کشمکش کا شکار تھی باسط نے میری خاموشی سے جانے کیا مطلب اخذ کیا کہ اس کے چہرے پر خجالت کی سرخی چھا گئی۔

"آئی ایم سوری نوری! آپ کو برا...." میں نے ایک بار پھر اسے ٹوک دیا آن واحد میں میں فیصلہ کر چکی تھی کہ مجھے باسط کو حسن کے بارے میں بتا دینا چاہیے۔

پھر میں نے یہی کیا۔ بے حد مناسب الفاظ میں اسے اپنے اور حسن کے بارے میں بتا کر معذرت کرلی۔ باسط کو پہلے یقین نہیں آیا پھر اس کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ بلکہ مسکراہٹ بھی کیا تھی، لگتا تھا زبردستی مسکرایا جا رہا ہو۔

"آپ نے پہلے کبھی ذکر ہی نہیں کیا۔"

"کبھی کوئی ایسا موقع آیا ہی نہیں باسط! کہ میں اپنے منگیتر کا ذکر کرتی۔ یقین کیجیے مجھے ذرا اندازہ ہوتا کہ آپ اس نہج پر سوچ سکتے ہیں تو.... تو میں پہلے ہی بتا دیتی لیکن.... میں بہت شرمندہ ہوں باسط۔"

"آپ کیوں شرمندہ ہو رہی ہیں۔ یہ تو میری قسمت تھی۔ بہرحال ایک بات ماننا پڑے گی۔ آپ کے حسن صاحب بہت خوش قسمت ہیں۔" اپنی

یاسیت پر قابو پاتے ہوئے اس نے خوش دلی سے کہا تھا۔

میں نے اسے بغور دیکھا پھر اس انگوٹھی کو دیکھا جواب تک گرل پر رکھی ہوئی تھی۔

"آپ بہت اچھے انسان ہیں باسط! مجھے یقین ہے، جو بھی لڑکی آپ کی زندگی میں آئے گی وہ بہت خوش قسمت ہوگی۔" میں نے صدق دل سے کہا تھا۔ واپس جاتے ہوئے میں نے ایک مرتبہ مڑ کر دیکھا' باسط ابھی تک اس انگوٹھی پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔ میرے دل پر بوجھ سا آن گرا اور یہ بوجھ اب یقیناً "ساری زندگی رہنا تھا۔

میں اتنی باحوصلہ نہیں تھی کہ کسی کا دل توڑ کر اتنی جلدی مطمئن ہو بیٹھتی کئی دن اسی کشمکش میں گزر گئے۔ لیکن اس کے بعد میں نے اسٹوڈیو جانا چھوڑ دیا۔ میں دوبارہ باسط سے کبھی نہیں ملنا چاہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

مجھے پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ اتنے زیادہ خواب نہیں دیکھنا چاہئیں کیونکہ پھر حقیقت پر بھی خواب کا گمان ہونے لگتا ہے جیسے کہ مجھے لگ رہا تھا۔

حسن میری گاڑی میں میرے ساتھ موجود تھا اور مجھے بار بار خواب کا گمان ہو رہا تھا۔

لیکن یہ خواب نہیں تھا۔ حسن میرے ساتھ موجود تھا۔ ایک اٹل اور میری زندگی کی سب سے خوش کن حقیقت کی طرح۔

یہ میری زندگی کا سب سے بہترین دن تھا۔

حسن کی خواہش تھی کہ اسے ریسیو کرنے کے لیے میں آؤں دل سے میں بھی یہی چاہ رہی تھی لیکن خود سے کچھ کہنا بھی مناسب نہیں لگ رہا تھا' پہلی بار میرا دل چاہ رہا تھا کہ کاش میں منگیتر کے بجائے حسن کی بیوی ہوتی۔

اچھی بات یہ ہوئی کہ "آپاؤں" نے مجھے بخوشی حسن کو ریسیو کرنے جانے کی اجازت دے دی تھی میں خوش ہوئی لیکن بچہ پارٹی مایوس ہو گئی تھی وہ سب شاید حسن سے ملنے کے لیے مجھ سے بھی زیادہ پرجوش تھے کیونکہ ان میں سے اکثر اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے جب حسن ملک سے باہر گیا۔ میں نے ناچار بچوں کو بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی لیکن چودہ سے سولہ سال کے ایج گروپ کے یہ بچے اتنے عقل مند تو تھے کہ کپل کے درمیان ہڈی بننے سے گریز کریں۔ سو سب نے میرے سر پر احسان جتاتے ہوئے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔

حسن کی آمد سے پہلے کا پورا ایک دن میں نے پارلر میں گزارا تھا۔ فیشل' ویکسنگ' مینی کیور' پیڈی کیور' نیا ہیئر کٹ یعنی اس روز جب میں پارلر سے نکلی تو بقول تمثیل خوب چمک رہی تھی۔ اگلے روز میں نے "تن زیب" سے خریدا ہوا حسن کی پسند کے رنگ کا ریڈی میڈ سوٹ پہنا' ہلکا سا میک اپ کیا اور بال بھی خوب اچھے طریقے سے سیٹ کیے۔ اور جب میں آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی تو سچ بات ہے کہ مجھے خود بھی جھجک محسوس ہونے لگی۔

میں حسن کی منگیتر تھی نہ بیوی' ہم فقط محبت کی ڈور میں بندھے ہوئے تھے اور اسی تعلق نے مجھے حسن کا پابند رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں خوش لباس' خوش اطوار تھی لیکن بننے سنورنے سے گریز کرتی۔

اور اب حسن آ رہا تھا تو میں بہت دل سے تیار ہوئی تھی۔

سترہ سال پہلے کے حسن اور نویر کی شخصیات میں' آج کے حسن اور نویر کے برعکس بہت فرق آچکا تھا نہ میں سولہ سال کی نویر رہی تھی نہ وہ انیس سال کا حسن لیکن آمنے سامنے آتے ہی ہمیں لمحہ بھی نہیں لگا ایک دوسرے کو پہچاننے میں۔

میں اور حسن سترہ سال بعد ایک دوسرے کو کیسے دیکھ رہے تھے۔ تو اس کا جواب محض یہ ہے کہ یہ حسن کی خواہش تھی اس نے کبھی اپنی تصویر بھجوائی نہ میری مانگی۔

وہ کہتا تھا "تصویر آدھی ملاقات ہوتی ہے اور ادھوری ملاقاتیں تشنگی بڑھاتی ہیں گھٹاتی نہیں' تمہاری تصویر تو دل میں بسا کر لایا تھا جب دل کرتا ہے آنکھیں بند کر کے دیکھ لیتا ہوں۔"

کبھی وہ موڈ میں ہوتا تو ایسے ڈائیلاگ بولتا تھا اور مجھے اس کی ہر بات پر بنا بحث سر جھکا دینے کی عادت سی ہو گئی تھی۔

ہم بنا پلکیں جھپکے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ ایئرپورٹ کی عمارت معاً "معدوم ہو گئی۔ آس پاس سے گزرتے لوگ دھند کا ایک جھونکا بن کر گزرنے لگے۔

وہاں صرف میں تھی اور وہ۔۔۔ وہ حسن میرا سب کچھ۔۔۔ میری محبت۔۔۔ دنیا میں میرا کل۔ میں نے سترہ سال اس کا انتظار کیا تھا۔ میرے ہاتھ جب بھی دعا کے لیے اٹھتے پہلی اور آخری دعا حسن کے نام کی ہوتی۔ میں اس کے مصائب ٹل جانے کی منتیں مانتی تھی۔ وہ میری محبت تھا' نہیں وہ میرا عشق تھا' میرا دیوتا تھا' میرا سائیں تھا' وہ میرا سب کچھ تھا۔ سب کچھ۔

میں اسے سترہ سال بعد دیکھ رہی تھی یا شاید میں اسے پہلی بار دیکھ رہی تھی کیونکہ جب وہ جا رہا تھا میں نے تب بھی اسے غور سے نہیں دیکھا تھا۔ اس شام جب سورج غروب ہونے کا وقت تھا اور حسن اس رخ سے کھڑا تھا کہ اس کے عقب سے نکل نکل کر اس معدوم ہوتے سورج کی تیز کرنیں میری آنکھوں میں گھس گئی تھیں۔ جب آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو وہ محبت کا تاثر چھوڑ کر جا چکا تھا۔ وہ میری تصویر دل میں بسا کر لے گیا تھا مگر میرے دل میں اس کی تصویر نہیں تھی صرف اس کا "تصور" تھا۔ میں اسی تصور کی محبت میں مبتلا تھی۔

اور میرا تصور مجسم ہو کر میرے سامنے کھڑا تھا۔

میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور مجھے پتا بھی نہ چل سکا یہ آنسو کب میرا چہرہ بھگوتے چلے گئے۔ پتا نہیں یہ خوشی کے آنسو تھے یا اس کے بغیر گزارے ان سترہ سالوں پر محیط صبر آزما ہجر کی تکلیف کے۔

میں نے حسن کے چہرے پر مسکراہٹ کی کرنوں کو پھیلتے دیکھا پھر وہ چند قدم چل کر میرے قریب آیا اور دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے میرے آنسو پونچھ ڈالے۔

میں نے آنکھیں موند کر اپنی پیشانی اس کے کندھے سے لگا دی اور اس درد کو آنکھوں سے بہہ جانے دیا جو اسے سامنے پا کر دل کی سرزمین پر پھیل رہا تھا۔

حسن کے دونوں ہاتھ مجھے محبت سے سمیٹے ہوئے تھے میں اس کا لمس محسوس کر سکتی تھی۔ وہ ایک حصار تھا جس کے دائرے نے مجھے محفوظ کر دیا تھا۔

مجھے اردگرد کی پروا نہیں تھی مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔ لوگ ہمیں دیکھ رہے ہوں گے۔ اشارے کر رہے ہوں گے مگر میں کسی سے خائف نہ تھی حسن میرا آدم تھا اور میں اس کی حوا۔ میں اس کی پسلی سے تخلیق ہوئی تھی۔ جنت میں ہم اکٹھے رہتے تھے۔ پھر شرم لاج کیسی؟ خوف کس کا؟ دنیا کا؟ دنیا والوں کا؟

"ارے لوگو! یہ میرا جنت کا ساتھی ہے اور جب یہ میرے ساتھ ہے تو دنیا ہی میری جنت ہے۔" میری روح خوشی و سرشاری سے جیسے دیوانی ہوئی جاتی تھی۔

تب ہی کسی منچلے نے سیٹی بجائی۔ میں سٹپٹا کر حسن سے دور ہو گئی۔ حیا سے لال پڑ گئی' میری روح بھول گئی تھی یہ دنیا ہے اور دنیا جنت کا پرتو ہو سکتی ہے مگر جنت کبھی نہیں ہو سکتی۔ روح تو اپنے ازلی ساتھی کے سینے سے پیشانی ٹکائے اپنی تنہائی کے دن یاد کرتی تھی زمانہ نجانے کیا سمجھا۔

میں نے کہیں قریب سے خود پر قہقہے لپکتے محسوس کیے تھے۔ خفت سے سر جھکا کا جھکا رہ گیا۔

"تم بالکل نہیں بدلی ہو نویر! بالکل ویسے کی ویسی ہو' جیسی سترہ سال پہلے تھی۔ چھوٹی سی بچی۔" اس نے کھنکتے لہجے میں میرے آنسوؤں کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا تھا۔

میں روتے ہوئے مسکرا دی۔

"سترہ سال پہلے میری بصارت تو شاید یہیں رہ گئی تھی آج تمہیں دیکھ کر میری آنکھوں کی تسکین ہوئی ہے۔"

میں نے سر اٹھا کر دیکھا حسن کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ جذب سے بول رہا تھا اور اس کی والہانہ نظریں میرے چہرے کے ایک ایک نقش کو جذب کر رہی تھیں، میں نے فوراً" پلکیں جھکالیں۔

لیکن لرزتی پلکوں کے باوجود میں اپنی بے ساختہ مسکراہٹ روک نہیں پائی پھر مسکراہٹ بے ساختہ ہنسی میں بدل گئی۔ وہ شخص جس کی محبت میں آپ پور پور ڈوبے ہوں اس کے منہ سے ایسی باتیں سن کر کیسا لگتا ہے۔

محبوب کا اظہار' اس کا والہانہ پن۔ وہ اسم ہوتا ہے جو عورت کے وجود کو روئی کے گالے میں ڈھال دیتا ہے اور عورت تفکرات زمانہ سے آزاد ہو کر ہلکی پھلکی ہو کر ہوا میں اڑنے لگتی ہے۔ بارش کی ننھی ان چھوٹی بوند بن کر فضا میں تیرنے لگتی ہے۔ پانی کی نازک لہر بن کر بہنے لگتی ہے اور یہ ایک ایسا دلفریب احساس ہوتا ہے جس کا کوئی نعم البدل ہو ہی نہیں سکتا۔

حسن میری ہنسی میں شامل تھا وہ میرے ہر جذبے میرے ہر احساس میں برابر کا شریک تھا۔

میں زمانے کی نظروں سے خائف ہو کر اس سے دور رہتی تھی لیکن اسے زمانے کی پروا نہیں تھی وہ دنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنے دل کی ماننے پر یقین رکھتا تھا۔ تب ہی اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور دوسرے ہاتھ سے ٹرالی دھکیلتے ہوئے ہم ائیرپورٹ کی عمارت سے باہر آگئے۔

روڈ کراس کرتے ہوئے میں نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ میں سچ مچ چھوٹی سی بچی بن گئی تھی۔

اور اب ہم ساتھ ساتھ تھے اور میں گردن موڑ موڑ کر اسے دیکھ رہی تھی۔ میرے سیل فون پر بار بار منیزہ آپا کے گھر سے کسی نہ کسی کی کال آرہی تھی وہ سب حسن سے رابطہ کرنے کے لیے بے چین تھے۔ تنگ آکر حسن نے ڈیش بورڈ سے سیل فون اٹھا کر آف کردیا۔

"کیا کر رہے ہو حسن! گھر میں سب پریشان ہو جائیں گے۔ ایک بار اٹینڈ کر کے کہہ دو۔ ہم بس پہنچ رہے ہیں۔" میں نے جلدی سے اسے فون آف کرنے سے روکتے ہوئے کہا۔

"کتنی مرتبہ؟" حسن نے کہا۔

"پندرہ مرتبہ تم کہہ چکی ہو سولہویں مرتبہ میں بھی یہی بات کہوں گا تو کسی اور کا فون آنے لگے گا اس لیے اب جو بھی بات ہو گی گھر پہنچ کر ہی ہو گی۔" اس نے سیل فون واپس ڈیش بورڈ پر رکھتے ہوئے کہا تھا۔

"اور تم ایک کام کرو گاڑی سائیڈ پر روک کر مجھے جی بھر کر دیکھ لو تاکہ تمہیں بار بار میری طرف نہ دیکھنا پڑے۔ گھر آرام سے چلے جائیں گے۔"

اس نے یک دم میری چوری پکڑتے ہوئے کہا تھا میں بری طرح جھینپ گئی حسن نے قہقہہ لگایا پھر ریلیکس انداز میں بازو پھیلاتے ہوئے کہنے لگا۔

"پاکستان آکر بہت اچھا لگ رہا ہے۔"

"گھر والوں سے مل کر اور بھی اچھا لگے گا۔" میں نے کہا تو وہ گردن گھما کر میری طرف دیکھنے لگا۔

"لیکن جتنا اچھا تم سے مل کر لگا ہے اتنا اچھا کسی اور سے مل کر نہیں لگے گا۔" اس بات کا جواب میرے پاس نہیں تھا حسب معمول مسکراتے ہوئے میں ایک موڑ احتیاط سے کاٹنے لگی۔ ہم منیزہ آپا کے گھر سے کچھ ہی دور تھے۔ لیکن مجھے اپنے چہرے پر حسن کی نظریں مستقل محسوس ہو رہی تھیں وہ اطمینان سے کچھ ترچھا ہو کر بیٹھا مجھے دیکھ رہا تھا۔

"اس طرح کیا دیکھ رہے ہو حسن۔" میں نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بے تکلفی سے کہا۔

"میں دراصل تم کو دیکھ کر حیران رہ گیا ہوں۔" حسن نے پھر کہا۔

"چند سالوں میں انسان میں تبدیلی آجاتی ہے لیکن تم کو دیکھ کر مجھے لگ رہا ہے میں سترہ سال پہلے والی نوریز کو ہی دیکھ رہا ہوں۔ صرف تمہارے بال لمبے ہوئے ہیں اور قد لمبا ہوا ہے ورنہ تم بالکل ویسی ہی ہو جیسی میں چھوڑ کر گیا تھا۔ اتنی ہی انوسینٹ (معصوم) اتنی

گریس فل کاش میں اپنی آنکھوں سے دکھا سکتا۔"

پھر کچھ خیال آنے پر اس نے پہلو بدلتے ہوئے جیب سے والٹ نکالا اور والٹ کھول کر میرے سامنے کردیا۔ اس کے والٹ میں میری تصویر لگی ہوئی تھی جس میں میں ہنس رہی تھی اور میری آنکھوں میں پانی تیر رہا تھا تصویر میں میرے بال کندھوں تک آرہے تھے۔ مجھے یاد آیا میٹرک تک میرے یہی ہیر کٹ ہوتا تھا۔

"یہ تصویر تمہارے پاس کہاں سے آئی؟"

"تمہیں یاد ہے نا نائنتھ کلاس میں اچھے مارکس لینے پر تم نے اپنی فرینڈز کو پارٹی دی تھی۔ تب ہی میں نے چھپ کر یہ تصویر کھینچی تھی۔" والٹ میں لگی تصویر کو محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے حسن نے فخریہ انداز میں اپنا کارنامہ بتایا۔

"تم میری تصویر ساتھ لے گئے تھے۔" میں نے ناراضی سے کہا۔ "میرے پاس تمہاری ایک بھی تصویر نہیں تھی حسن!"

"بھئی تم تو اس وقت بھی اتنی خوب صورت تھیں اب بھی اتنی ہی خوب صورت ہو لیکن میں تو تب کم ڈھینگ سا ہوتا تھا۔ اگر تب ہی اپنی تصویریں دکھاتا رہتا تو کبھی مجھ سے محبت نہ ہوتی تمہیں۔ اب دیکھو میں کتنا ہینڈسم ہو گیا ہوں۔ تصویر کے بجائے تم مجھے فیس ٹو فیس دیکھ لو اور خود پر فخر کرو کہ کتنے شاندار ہینڈسم بندے سے محبت ہوئی ہے تمہیں۔" اس نے نیم سنجیدگی سے اتراتے ہوئے کہا تھا۔

"زیادہ ہی خود پسند نہیں ہو گئے تم۔" میں نے اسے چڑایا۔ "کس نے غلط فہمی میں ڈال دیا کہ تم ہینڈسم ہو؟"

"جب سے آیا ہوں کسی کی آنکھیں مستقل مجھے بتا رہی ہیں اس سے بڑی گواہی اور کیا ہو گی محترمہ!" حسن نے شریر لہجے میں کہا تھا۔

"ابھی جب گھر جائیں گے تو دیکھنا" آپائیں کیسے میری بلائیں لیتی ہیں۔

منیزہ آپا کی طرف سب آئے ہوں گے؟" یکدم کچھ خیال آنے پر اس نے پوچھا۔

"ہاں تقریباً"۔۔۔" میں اسے سب کے متعلق بتانے لگی اور یہ بھی اگلے کچھ روز تک اسے کس کس نے اپنے یہاں انوائیٹ کر رکھا ہے ان میں سرفہرست فاروق بھائی جان تھے جنہوں نے کل ہی اپنی طرف اس کے لیے لنچ رکھا تھا۔

"کل۔۔۔؟" اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ "کل اگر فاروق بھائی کی طرف جانا ہے تو مکان دیکھنے کب جائیں گے۔ تم نے پراپرٹی ڈیلر سے تو بات کی ہے نا؟"

"پراپرٹی ڈیلر سے تو بات کی ہے لیکن مکان دیکھنے کی اتنی جلدی کیا ہے۔ دو چار روز آرام کرلو سب سے مل لو پھر اطمینان سے مکان دیکھ لینا۔"

"اور اتنے دن کیا منیزہ آپا کی طرف رہوں؟ نہیں یار! بہنوں کے گھر بھائی رہتے اچھے نہیں لگتے۔ دو ایک روز میں گھر لے لوں پھر اطمینان سے شادی کی تیاریاں شروع کریں گے۔"

شادی کا لفظ سن کر میری مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی میرا دل چاہا حسن سے کہوں آخر نیا گھر خریدنے کی کیا ضرورت ہے۔ شادی کے بعد وہ میرے گھر میں شفٹ ہو سکتا تھا۔ جو میرا تھا وہ اسی کا تھا لیکن ایک بار پہلے بھی ایسی بات "اشارتاً" کر کے میں اس کی خفگی برداشت کر چکی تھی اس لیے اس بات کو کسی اور وقت پر ٹال دیا۔

ہم منیزہ آپا کے گھر پہنچے تو وہاں سب لوگ جمع تھے حسن کے استقبال کے لیے۔ حسن کی چاروں بہنیں' ان کے شوہر اور بچوں کے علاوہ میرے بہن بھائی' بھابیاں اور بہنوئی کے ساتھ بواجی بشارت خالہ بھی موجود تھے۔

اتنے افراد کو ایک ساتھ دیکھ کر حسن تھوڑا سا سٹپٹا گیا۔

"سارا خاندان ہی جمع ہے ایک قاضی کا بندوبست بھی کرلیتے تو یہ معاملہ بھی نبٹ جاتا پھر ولیمہ کی تقریب کے لیے ہی خرچا کرنا پڑتا۔" اس نے سنجیدہ انداز میں شرارت سے کہا تھا۔ میں فقط مسکرادی۔



☼ ☼ ☼

"ایک بات تو بتاؤ نوری! تم پہلے بھی خوب صورت تھی یا حسن کی آمد کا اثر ہے کہ خوشی کے مارے تمہارے چہرے پر نور جھلکنے لگا ہے؟"

میں منیجر صاحب کے آفس سے نکل کر اپنے کیبن میں آئی ہی تھی کہ نمل نے اپنی کرسی سے اٹھ کر میری طرف آتے ہوئے پوچھا۔ اس کا سوال سن کر میں خوش دلی سے مسکرانے لگی۔ نور کا تو پتا نہیں لیکن بات بے بات مسکراہٹ ضرور میرے چہرے پر جھلک رہی تھی۔ نمل مجھے مسکراتا دیکھ کر حسن کے متعلق پوچھنے لگی وہ کیسا لگ رہا تھا، تم سے کیسے ملا؟ کیا کیا باتیں ہوئیں؟ تمہارے لیے کیا لایا ہے وغیرہ۔

"میرا کل ہی بہت دل چاہ رہا تھا کہ حسن سے ملوں بڑا تجسس تھا کہ ان محترم کو دیکھوں جن کے اتنے قصے سنے ہیں۔ لیکن کل اتنی تھکن ہو گئی تھی کہ دوبارہ گھر سے نکلنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔"

"ہاں تو تم اب میرے ساتھ چلو فاروق بھائی کی طرف حسن اور اس کی بہنوں کی فیملی کی دعوت ہے۔ آذر کو بھی بھائی جان نے انوائیٹ کیا ہوا ہے۔ حسن کو بھی دیکھ لینا آذر سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔" میں نے فٹ دعوت دے ڈالی۔

"نہیں نویرا! آج نہیں جاسکتی۔ آذر کا ارادہ ہے حسن کو اور تمہیں کسی روز ڈنر پر لے جانے کا۔ اور ظاہر ہے یہ ڈنر میرے بغیر مکمل تھوڑا ہی ہوگا۔ حسن سے اس روز مل لوں گی۔ ابھی تھوڑی دیر میں لئیق بھی آنے والے ہیں مجھے ان کے ساتھ شاپنگ کے لیے جانا ہے۔"

"تم پھر کہیں جارہی ہو؟" ابھی میں منیجر صاحب سے ہاف لیو کا پوچھنے گئی تو وہ کہہ رہے تھے۔ "نمل بی بی تو پھر دوسرے تیسرے ہاف لیو لیتی رہتی ہیں۔ آپ کیوں اتنا جھجک رہی ہیں لیو لیتے ہوئے۔" مجھے اچانک یاد آیا تو میں اسے سمجھانے لگی۔

"نمل اس طرح تو تم اس جاب کو بھول ہی جاؤ۔ اتنی چھٹیاں کروگی تو ملازمت مستقل ہونا تو دور کی بات تمہارا کانٹریکٹ Extand (مدت میں توسیع) بھی نہیں کیا جائے گا۔"

"میں کیا کروں نوری! ہر دوسرے تیسرے روز تو والدہ صاحبہ کے مہمان آتے رہتے ہیں ان کی خدمتیں نہ کروں تو والد صاحب خفا ہو جاتے ہیں۔ مجبوراً مجھے چھٹی کرنا پڑتی ہے۔ اب دیکھو ان لئیق صاحب کی شاپنگ بھی میرے سر منڈھ دی ہے۔" اس نے بے زاری سے کہا۔

"لئیق کون؟"

"سوتیلی والدہ ماجدہ کے بھائی صاحب۔" سوتیلی ماں کے بارے میں وہ ہمیشہ اسی طرح طنز سے بات کرتی تھی۔

"افریقہ سے آئے ہیں اور جب سے آئے ہیں۔ ہمارے گھر ڈیرا ڈالے بیٹھے ہیں۔ کسی دوست کی شادی میں جانا ہے اور مجھے حکم ملا ہے کہ ساتھ جا کر اچھا سا گفٹ خریدوں کیونکہ لئیق صاحب کو ایسی شاپنگ کا کوئی تجربہ نہیں۔"

"تم نے کب سے حکم ماننے شروع کر دیے۔" میں نے کسی قدر تعجب سے کہا لیکن نمل ہال کی انٹرنس کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔

"وہ دیکھو۔ لئیق آ بھی گیا۔ میں چلتی ہوں۔"

میں نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا ایک اونچا لمبا مڈل ایجڈ آدمی چلا آرہا تھا۔ شکل و صورت، صحت واجبی لیکن سوٹ قیمتی پہن رکھا تھا ہاتھ میں مہنگا موبائل اور کلائی پر بیش قیمت گھڑی۔ جس کے ڈائل کی چمک اتنی دور سے بھی محسوس ہوتی تھی۔

"اس کی تو اچھی خاصی عمر لگ رہی ہے نمل! تم ماموں نہیں تو کم سے کم بھائی ہی کہہ لیا کرو۔"

میری بات سن کر نمل نے اپنے ہی ہاتھ پر ہاتھ مار کر قہقہہ لگایا۔

"یہ بڑا دلچسپ قصہ ہے یار! یہ محترم اپنی عمر کے معاملے میں عورتوں سے بھی زیادہ کانشس رہتے ہیں۔ شروع شروع میں زینب اور تحریم کی تقلید

میں میں نے بھی ماموں کہہ دیا تو پاگل آدمی رونے بیٹھ گیا۔ اپنی بہن کے سامنے کہ کیا میں اتنا بڑا لگتا ہوں کہ نمل کی عمر کی لڑکیاں مجھے ماموں کہیں۔ لماں جی نے فساد ڈال دیا کہ نمل نے جان بوجھ کر میرے بھائی کا دل دکھایا ہے۔ دل تو میرا چاہا کہ بیلن سے دونوں بہن بھائی کی اتنی پٹائی کروں کہ صرف دل نہ دکھیں۔ پورے کے پورے دکھیں مگر ابا کے خوف آڑے آ رہا تھا۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ میں بھائی کہہ لوں گی اس پر جناب منہ بسور کر بولے۔ آپ مجھے لئیق ہی کہہ لیا کریں۔ ویسے بھی خوب صورت لڑکیوں کے منہ سے مجھے اپنا نام سننا اچھا لگتا ہے۔" نمل تو ہنس ہنس کر بتاتی رہی۔

میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"بی کیئر فل نمل! مجھے تو یہ بندہ بہت عاشق مزاج لگ رہا ہے۔"

"ارے ایسا ویسا۔" نمل پھر چہکی۔ "کبھی کبھی تو مجھے کہتا ہے نمل پلیز میرا نام لیجیے نا آپ کے منہ سے اپنا نام سننا مجھے سعادت لگتا ہے۔"

اس نے چہرے پر ہاتھ رکھ کر ڈرامائی سے انداز میں کہا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں بھی ہنسنے لگی۔

"تم نے آذر کو بتایا ان کے متعلق؟" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"لیکن میرا خیال ہے مجھے آذر کو خبردار کر دینا چاہیے۔" میں نے شرارتاً کہا۔

"خدا کو مانو یار!" نمل نے بے ساختہ ہاتھ جوڑ کر اور آواز دبا کر کہا کہ وہ بندہ قریب آ گیا تھا۔

"آذر کو دیکھو اور اس کو دیکھو۔ کیا یہ آدمی اس قابل ہے کہ اسے آذر پر فوقیت دی جائے۔ یہ تو ایسا بھی نہیں ہے کہ اس کا موازنہ آذر سے کیا جائے۔"

اس نے ناگواری سے کہا پھر مجھے اللہ حافظ کہتی اپنے ٹیبل کی طرف چلی گئی اور چیزیں سمیٹنے لگی میں نے دور سے دیکھا لئیق بہت لجاجت بھرے انداز میں نمل سے باتیں کر رہا تھا۔

✲ ✲ ✲

آفس سے سیدھی میں فاروق بھائی جان کی طرف آ گئی تھی۔ حسن سمیت سب مہمان آ چکے تھے صرف میرا انتظار تھا دیر سے پہنچنے پر سب ہی نے حتی المقدور میری کھنچائی کی۔ ماریہ بھابھی تو فٹافٹ کھانا لگانے کی غرض سے کچن میں چلی گئیں۔

میں "فردا" "فردا" سب سے ملنے لگی تب ہی میری نظر حسن پر پڑی۔ وہ مجھے دیکھ کر خوش دلی سے مسکرایا اور منیزہ آپا کی طرف جھک کر ان کے کان میں کوئی بات کہی۔ منیزہ آپا، فلک کی کسی بات پر ہنس رہی تھیں۔ حسن کی بات سن کر ان کے تاثرات یک دم بدل گئے مجھے یوں لگا جیسے وہ پریشان ہو گئی ہوں۔

میں سب سے ملتے ہوئے ان کی طرف آ گئی۔

"کیا بات ہے منیزہ آپا! آپ پریشان لگ رہی ہیں؟" میں ان کا حال احوال دریافت کرنے کے بعد خود کو پوچھنے سے روک نہیں سکی۔

"نہیں پریشانی کیسی؟" انہوں نے جلدی سے کہا مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ مجھے ٹال رہی ہوں لیکن اس متعلق کوئی سوال کرنا مناسب نہیں تھا سو میں خاموش رہی۔

"اور یہ تم نے اپنا حال کیا بنا رکھا ہے۔ میں تو اتنے دن بعد مل رہی ہوں دیکھ کر حیران رہ گئی کتنی کمزور ہو گئی ہو۔" آپا نے فکرمندی سے کہا تھا۔ میں ہنس دی کیونکہ میں آپا کو ہمیشہ کمزور ہی لگتی تھی۔

"آپ مجھے اتنی محبت والی نظروں سے نہ دیکھا کریں آپا! یہ آپ کی محبت ہے کہ میں آپ کو ہر بار دبلی لگتی ہوں۔"

"تو اپنا خیال بھی تو تم نہیں رکھتیں میری جان! نائن ٹو فائیو والی جاب آسان تو نہیں ہوتی مرد تک تھک جاتے ہیں تم تو پھر نازک سی لڑکی ہو۔ بس اب حسن آ گیا ہے "فوراً" سے پیشتر استعفیٰ دو اور اپنا گھر بار سنبھالنے کی کرو۔" انہوں نے دھونس بھرے انداز میں کہا تھا۔

میں ان کی محبت بھری ناراضی پر مسکرا رہی تھی۔ تب ہی عفیرہ آ گئی اور عجلت میں مجھے کھینچتی ہوئی اپنے کمرے میں لے گئی۔

"کیا کر رہی ہو عفیرہ! مجھے منیزہ آپا سے بات تو کرنے دیتیں۔" میں نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔

"اب ساری زندگی آپ نے ان سے باتیں ہی کرنا ہیں۔ اپنی بڑی نند صاحبہ کو Buttering (خوشامد) پھر کسی وقت کر لیجیے گا، فی الحال میری بات سن لیں۔" اس نے مجھے چڑاتے ہوئے کہا۔ میں نے اسے گھور کر دیکھا، پھر بازو باندھتے ہوئے کہا۔

"جی فرمایے۔" وہ میرا طنز سمجھی یا نہیں، لیکن کمر پر دونوں ہاتھ رکھے اپنی چمکتی آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی اور مسکراتی رہی، پھر یک دم بانہیں پھیلا کر مجھ سے لپٹ گئی۔ اس نے مجھے اتنی زور سے لپٹایا کہ میری چیخ نکل گئی اور میں گھبرا بھی گئی۔

"کیا کر رہی ہو عفی!" میں نے بے ساختہ کہا۔

"میں آپ کے لیے بہت خوش ہوں نوری! بہت بہت بہت خوش۔" اس نے الگ ہوتے ہوئے پرجوش اور کھنک دار لہجے میں کہا۔

"آپ نے حسن انکل کو دیکھا ہے؟ مجھے آپ کی قسمت پر رشک آ رہا ہے۔ جب تک حسن انکل کو دیکھا نہیں تھا، ان سے ملی نہیں تھی، مجھے خدشہ ہی رہتا تھا کہ وہ کوئی اونگے بونگے (معمولی) سے انسان ہوں، کیونکہ آپ خود اتنی اچھی ہیں کہ کوئی آپ کو برا ہی نہیں لگتا۔ میں سوچتی تھی جو انسان آپ کا شریکِ حیات ہے اسے بھی اتنا ہی بہترین ہونا چاہیے اور حسن انکل اتنے اچھے ہیں، حقیقت میں وہ آپ کا پرفیکٹ میچ ہیں۔"

وہ خوشی سے بولتی، پھر مجھ سے لپٹ گئی۔ میں اس کے جوش اور دیوانگی نما خوشی پر حیران بھی تھی اور مسرور بھی۔۔۔ حسن کی تعریف میری تعریف تھی اور حسن مجھے دنیا میں سب سے عزیز تھا۔

"اچھا اب ہٹو۔۔۔ میں ماریہ بھابھی سے پوچھ لوں، کوئی کام ہو تو بتا دیں، ورنہ بعد میں شکوہ کریں گی کہ میری وجہ سے اتنے لوگوں کا کھانا کیا اور میں نے کسی کام کے لیے بھی نہیں پوچھا۔" میں نے شرارتی انداز میں کہا۔

عفیرہ اپنی چمک دار آنکھیں پھیلا کر بولی۔

"آپ میری ممی کو کتنی اچھی طرح جانتی ہیں نوری!" پھر ہم دونوں ہنس دیے، لیکن آج ماریہ بھابھی کے انداز ہی بدلے ہوئے تھے۔ وہ بڑی خوش دلی سے مہمان نوازی کا فریضہ نبھا رہی تھیں اور دلچسپ بات یہ کہ انہوں نے ایک بار بھی کوئی کڑوی کسیلی بات مجھے نہیں جتائی تھی۔

زیادہ افراد ہونے کی وجہ سے بھابھی نے ڈائننگ ٹیبل کا تکلف نہیں برتا تھا، بلکہ ڈائننگ ہال کو خالی کروا کر وہاں فرشی نشست کا اہتمام کر لیا تھا۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ گاؤ تکیے رکھے گئے تھے اور درمیان میں دسترخوان کی چوکی تھی ہال کو عرب طرز پر سجانے کے بعد کھانا بھی اسی انداز میں یعنی بڑے بڑے تھالوں اور پیالیوں میں پیش کیا گیا تھا اور سارا مینو بھی انہوں نے عرب طرز معاشرت کو مدنظر رکھتے ہوئے تیار کیا تھا۔

ماریہ بھابھی ان معاملات میں بہت سوجھ بوجھ رکھتی تھیں، کھانے کے بعد جب چاندی کی چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں قہوہ سرو کیا گیا تو سب ہی نے بھابھی کو بے حد سراہا۔

"بھئی سارا کریڈٹ حسن اور نوری کو جاتا ہے۔ آخر آج کا لنچ اپنی دونوں کی وجہ سے ارینج کیا گیا ہے۔" ماریہ بھابھی نے خوش دلی سے مسکرا کر میری طرف دیکھتے ہوئے کسی کی بات کے جواب میں کہا تھا۔

میں ان کی بات پر جتنا بھی حیران ہوتی کم تھا۔ وہ مجھے بالکل بدلی ہوئی ماریہ بھابھی لگ رہی تھیں۔ ممکن ہے حسن کی آمد نے ان کے اعتراضات کا قلع قمع کر دیا ہو اور اپنے پچھلے رویوں کی تلافی کے لیے وہ اتنی اچھی بن رہی ہوں۔ مجھے کئی طرح کے خیال آ رہے تھے۔ خاموشی سے ایک ایک کے چہرے پر تشکر کی نظریں ڈالتے ہوئے میں چونکی۔ صرف وہ چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا جو میری خوشیوں میں برابر کا حصے دار تھا۔

حسن پتا نہیں کہاں غائب ہو گیا تھا۔

میں چپکے سے سب کے درمیان سے اٹھی اور حسن کو تلاش کرتی باہر آگئی۔ اندر کے شور کے مقابلے میں باہر بے حد سناٹا پھیلا ہوا تھا، آسمان سے شام کے رنگ جھڑ رہے تھے اور ان جھڑتے رنگوں میں لان کے بیچ و بیچ نصب فوارہ چپ چاپ کھڑا تھا لیکن اس کے دامن میں پانی کا عکس دکھائی دیتا تھا۔

ہوا چپکے چپکے بہہ رہی تھی۔

میں نے دیکھا برآمدے کی سیڑھیوں پر حسن سر جھکائے چندنا کی شاخ سے پتے توڑ توڑ کر نیچے پھینک رہا تھا۔ شاید کسی گہری سوچ میں تھا اور بے دھیانی میں پتے نوچ رہا تھا۔ میں نے گلا کھنکار کر متوجہ کیا تو بنا چونکے گردن گھما کر مجھے دیکھنے لگا۔

"آؤ نوری۔"

"کیا بات ہے حسن! تم باہر کیوں بیٹھے ہو؟" میں نے سیڑھیاں اتر کر اس کے سامنے آتے ہوئے پوچھا، یوں کہ میرے عقب میں فوارہ تھا اور سامنے حسن جبکہ حسن کی پشت پر برآمدے میں وہ دروازہ کھلتا تھا جس سے میں باہر آئی تھی۔

"بس یوں ہی باہر آکر بیٹھ گیا۔ اندر اتنی گیدر رنگ میں میرا دل گھبرا رہا تھا۔" اس نے بے زاری سے کہتے ہوئے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا یوں جیسے اپنے تاثرات مٹانا چاہ رہا ہو۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے حسن۔" میں نے تشویش سے پوچھا۔

"ہاں... طبیعت ٹھیک ہے۔" حسن نے سابقہ انداز میں کہا، پھر دوبارہ سے ہاتھ میں پکڑی شاخ کے پتے نوچنے لگا۔

"کل جب میں نے تمہیں دیکھا تو میرے دل میں خود بخود یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ جس طرح سترہ سال تم پر اپنا اثر چھوڑے بغیر گزر گئے ہیں، اس طرح باقی سب کے قریب سے بھی دبے قدموں گزر گئے ہوں گے۔ لیکن میں غلط تھا۔ سترہ سالوں نے تو میرا بہت نقصان کروا کر گزرے ہیں۔ امی گزر گئیں۔ آخری وقت میں میں ان کا چہرہ بھی نہیں دیکھ پایا۔ کل سارا دن میں ان کو یاد کرتا رہا اور آج یہاں آکر تایا ابو اور تائی امی یاد آرہے ہیں۔ میرے قیمتی لوگ یہ سترہ سال لے اڑے۔ پتا نہیں کچھ خیالات کیسے خود بخود اپنی جگہ بنا لیتے ہیں۔"

میں نے بڑھ کر اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"نہیں سب کچھ تو نہیں بدلا۔ کل تم نے خود ہی کہا تھا نوری! تم بالکل نہیں بدلی۔ کیوں؟ کیا نہیں کہا تھا؟" میں نے مسکرا کر کہا۔ جواباً" حسن نے سر اٹھا کر بغور مجھے دیکھا۔ وہ چند لمحے مجھے اسی طرح دیکھتا رہا، پھر پھیکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر بے دار ہو گئی۔

"ہاں... تم نہیں بدلیں۔" اس کا لہجہ بھی بے حد پھیکا تھا، میں نے بڑی شدت سے اس کی اداسی و غمگینی کو محسوس کیا تو اس کا ہاتھ تھپتھپا کر پیچھے ہٹ گئی۔

"تم بچوں سے ملے؟" فوارے کی دیوار سے کمر ٹکاتے ہوئے میں نے موضوع بدلنے کی غرض سے پوچھا۔ حسن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"سب تم سے ملنے کے لیے بہت ایکسائیڈ تھے۔ اسپیشلی عفیرہ۔"

فوارے کے دامن میں جمع صاف شفاف پانی کی سطح پر انگلی کی پور سے لکیر کھینچنے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے بتایا۔

ساتھ ہی اس کا جوش و خروش یاد کر کے میرے لبوں پر دلفریب مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

"عفیرہ نے تو مجھے مخمصے میں ڈال دیا تھا۔ اس کو دیکھ کر لگا میرے سامنے سترہ سال والی نوری کھڑی ہو۔ فاروق بھائی تعارف نہ کرواتے تو میں شاید اسے نوری کہہ کر ہی پکار بیٹھتا۔" حسن جھینپے ہوئے لہجے میں بتا رہا تھا۔

"واقعی!" مجھے خوش گوار سی حیرت ہوئی۔ "عفیرہ سنے گی تو بہت خوش ہوگی۔ وہ ہمیشہ میرے جیسی نظر آنا چاہتی ہے۔ تمہیں پتا ہے حسن! اتنا شارٹ ہیئر کٹ بھی اس نے اسی لیے کروایا ہے کہ میرا ہیئر کٹ ٹین ایج میں ایسا ہوتا تھا۔"

"اپنے شوق کے لیے دوسروں کو مخمصے میں ڈالنا کہاں کا انصاف ہے۔" حسن نے پوری قوت سے برہنہ ٹہنی دور اچھالتے ہوئے کہا تھا۔

مجھے اس کے اعتراض پر ہنسی آگئی۔

"عفیرہ میں میری شباہت ہے، لیکن اتنی بھی نہیں کہ کوئی مخمصے کی بات کرے، میرا خیال ہے حسن! عفیرہ کو دیکھ کر تم ہی الجھ گئے تھے۔" میں نے لاپروائی سے خیال ظاہر کیا۔

"ہاں۔" حسن نے گہری سانس بھر کر کہا۔ "شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو نوری! میں ہی الجھ گیا تھا۔"

تب ہی دروازہ کھلنے کی آواز پر میں نے سر اٹھایا، عفیرہ جالی کا دروازہ دھکیلتی اپنے دونوں ہاتھوں میں آئس کریم کے کرسٹل باؤل پکڑے آرہی تھی۔ آنکھوں میں ازلی شرارتی چمک اور لبوں پر دل جلی سی ہنسی۔ چونکہ حسن کی اس طرف پشت تھی، اس لیے آنکھیں مٹکا کر اشارے کرنے لگی۔

"تم نے سنا ہے عفی! حسن کیا کہہ رہے ہیں؟ ان کو تم بالکل میرے جیسی لگی ہو۔" میں نے اس کے انداز نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"ریلی۔" وہ پرجوش ہو کر چیخی، پھر جلدی سے سیڑھیاں اتر کر میرے ساتھ آکھڑی ہوئی۔

"آپ نے مجھے اتنی اچھی خبر سنائی ہے، اسی خوشی میں آئس کریم کھائیں۔"

"میں آئس کریم نہیں کھاتا۔" میں نے تو باؤل فوراً" پکڑ لیا، لیکن حسن نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا تھا۔

"میں اتنے پیار سے لے کر آئی ہوں آپ پلیز کھالیں۔" اس نے منت سے کہا، حسن نے ناچار باؤل پکڑ لیا۔

"حسن انکل! کیا شادی کے بعد آپ نوری کے آئس کریم کھانے پر پابندی لگا دیں گے؟" عفیرہ نے حسن کو چمچے کے ساتھ کھیلتا دیکھ کر پوچھا۔ اس کے سوال پر حسن نے تعجب سے پہلے اسے اور پھر مجھے دیکھا۔

"نہیں... میں نے تو ایسا کبھی نہیں کہا۔"

"اکثر آدمی ایسا کرتے ہیں، جو چیز انہیں خود پسند نہ ہو اس کے لیے اپنی بیویوں پر بھی پابندی لگا دیتے ہیں۔ مجھے ایسے آدمی اچھے نہیں لگتے۔" عفیرہ نے ناک چڑھا کر کہا تھا۔

اس کے انداز پر ہم دونوں کو ہنسی آگئی۔ حسن نے شاید عفیرہ کا دل رکھنے کے لیے ہی آئس کریم کھانا شروع کر دی تھی۔

"لیکن... پلیز... نوری پر آپ کوئی پابندی نہ لگائیے گا اور ان کو بہت خوش رکھیے گا۔"

"اور کوئی حکم۔"

"میں حکم نہیں دے رہی ریکوسٹ کر رہی ہوں۔" عفیرہ بری طرح جھینپتے ہوئے بولی۔

"اور اگر میں آپ کی ریکوسٹ نہ مانوں تو..."

حسن کے انداز میں کچھ ایسا تھا کہ عفیرہ ہراساں ہو کر میرا چہرہ دیکھنے لگی۔

"پلیز حسن! ہماری عفیرہ کو تنگ مت کرو۔" میں یک دم عفیرہ کو اپنی بازو کے حصار میں لیتے ہوئے کہا۔ حسن مسکرا کر سر جھکا گئے۔

عفیرہ چند لمحے حسن کو دیکھتی رہی، جیسے کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو، پھر سر جھٹک کر بولی۔

"نوری! آپ کے پاس آذر بھائی کا سیل نمبر ہو گا۔ ممی کہہ رہی ہیں انہیں فون کر کے پوچھیں ابھی تک آئے کیوں نہیں۔" تب ہی گیٹ کی طرف سے آذر آتا دکھائی دیا۔ وہ عجلت میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہماری طرف آرہا تھا۔

"نوری! اگر میں آذر بھائی کو شیطان کہوں تو یہ گستاخی تو نہیں ہوگی۔" اس نے شرارت کے ساتھ سنجیدگی سے پوچھا۔

"تمہارا تو پتا نہیں البتہ میں کہوں گی تو گستاخی نہیں ہوگی۔ میں اس سے بڑی جو ہوں۔" ہم دونوں ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسنے لگیں۔

"السلام علیکم۔" آذر دور سے ہی بازو پھیلاتا آیا اور حسن سے بغل گیر ہو گیا۔ پھر حال احوال دریافت

ہونے لگے' فون پر تو دونوں کا رابطہ تھا' بے تکلفی بھی تھی۔

"آپ نے آنے میں بہت دیر کردی آذر بھائی! کھانا تو سارا ختم ہوچکا۔" عفیرہ نے آذر سے کہا۔

"تمہیں اتنی توفیق نہ ہوئی کہ بھائی کے لیے پہلے تھوڑا سا نکال کر رکھ لو۔" وہ بھی کہاں چوکنے والا تھا' اطمینان سے اس کے سر پر چپت لگا کر بولا۔

"تم کہاں گئے تھے آذر۔" میں نے پوچھا۔

"میرے دوست کا ایکسیڈنٹ ہوگیا اسی کو لے کر اسپتال جانا پڑا' بس اسی کی وجہ سے آنے میں دیر ہوگئی۔"

"اچھا اندر چلیں.... میں آپ کے لیے کھانا لگا دیتی ہوں۔" عفیرہ نے اس سے کہا۔

"نہیں عفیرہ! کھانے کا تو اب ٹائم ہی نہیں رہا۔ مجھے ابھی واپس اسپتال بھی جانا ہے' اس لیے کھانا پھر کبھی سہی۔ فاروق بھائی اور بھابھی سے میں خود بات کرلوں گا یہاں تو صرف حسن سے ملنے آیا ہوں۔ یہ بتایئے حسن صاحب! ہمیں کب اپنی مہمان داری کا موقع دے رہے ہیں۔" عفیرہ سے بات کرتے ہوئے وہ حسن کی طرف مڑا۔

"یار آذر! آخر اس تکلف کی کیا ضرورت ہے۔ سب سے ملاقات تو ہوگئی۔ اب اسپیشلی کھانا ارینج کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تھوڑے دن کی بات ہے' پھر میں اور نویر تم سب کو اپنی شادی کی دعوت کھلائیں گے۔ کیوں نویر؟"

"ہاں بالکل۔" میں نے کہا۔ "آذر! کسی فارملٹی میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"کمال کرتی ہو نویر! اس میں فارملٹی کی کیا بات ہے۔ بھئی میری خوشی ہے۔ بس تم لوگ ڈیسائیڈ کرلو' کس روز میرے ساتھ ڈنر کر رہے ہو' پرسوں یا جس روز تم چاہو۔" آذر نے حتمی انداز میں کہا اور ہم دونوں کی طرف دیکھا۔

"کس قدر غلط بات ہے آذر بھائی' میں بھی یہیں موجود ہوں' آپ صرف ان دونوں کو انوائیٹ کر رہے ہیں' مجھے نہیں بلائیں گے۔" عفیرہ نے کہا۔

"یہ بڑے لوگوں کا ڈنر ہوگا' بچوں کا وہاں کیا کام؟" آذر حسب معمول اسے چڑاتے ہوئے بولا۔

"میں بچی نہیں ہوں۔" وہ چلائی۔

"اچھا۔" آذر نے تمسخر اڑایا۔ "تو پھر چھوٹی بچیوں کی طرح چھوٹی چھوٹی پونی ٹیل کیوں بناتی ہو۔"

"آپ کو کیا پتا۔ یہ آج کل کا فیشن ہے۔ نمل آپا سے جاکر پوچھئے گا۔" حسب معمول جھگڑا شروع ہوگیا۔ تب مجھے بیچ بچاؤ کروانا پڑا۔

"خدارا! جھگڑا مت کرو۔ عفیرہ! تم میرے ساتھ چلنا آذر کے انویٹیشن کی کیا ضرورت ہے۔"

"حسن بھائی! آپ تیار رہیں۔ شادی کے بعد یہ لڑکی اسی طرح آپ کی جیب خالی کرواتی رہے گی۔" آذر نے چڑ کر حسن کو خبردار کرنا چاہا تھا تو وہ گہری سانس بھر کر بولا۔

"وہ محاورہ نہیں سنا۔ اوکھلی میں سر دیا تو موسل سے کیا ڈرنا۔" ان دونوں نے میرے گھورنے کی پروا کیے بغیر ایک زوردار قہقہہ لگایا تھا۔

"پھر ہفتے کا پروگرام فائنل ہے نا؟" آذر نے پھر پوچھا تو حسن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☼ ☼ ☼

"میرا خیال تھا منیزہ اور حسن شادی کی تاریخ کے بارے میں کوئی بات ضرور کریں گے' لیکن انہوں نے تو ذکر ہی نہیں کیا۔"

سب مہمانوں کے رخصت ہونے اور لنچ کا بکھراوا سمٹ جانے کے بعد ہم لیونگ روم میں بیٹھے چائے پی رہے تھے' جب ماریہ بھابھی نے اچانک کہا۔ چائے پی کر میرا اور بواجی کا ارادہ گھر جانے کا تھا' عفیرہ مجھ سے مسلسل رات اپنے یہاں رکنے کے لیے اصرار کررہی تھی۔

"فاروق! میں کیا کہہ رہی ہوں' آپ نے میری بات سنی؟" وہ کچھ فاصلے پر بیٹھی فاروق بھائی سے مخاطب تھیں۔ میں بظاہر عفیرہ کی طرف متوجہ تھی' لیکن کان ان ہی کی طرف لگے ہوئے تھے۔

"سن لی ہے بھئی تمہاری بات' اب کیا جواب دوں؟" بھائی جان نے بے زاری سے کہا۔

"میری مانیں اس معاملے میں اب دیر نہ کریں' پہلے شادی ہوجائے دعوتیں تو بعد میں بھی کھائی جاسکتی ہیں۔ آپ صبح ہی فون پر منیزہ سے بات کریں کہ وہ لوگ آکر تاریخ طے کرنے کی رسم کرلیں۔" بھابھی نے زور دے کر کہا۔

"ماریہ! تم ایک چیز کے پیچھے ہی پڑ جایا کرو' میری بات ہوئی تھی حسن سے۔ وہ پہلے گھر خریدنا چاہ رہا ہے۔ اس کے بعد ہی شادی کی تیاریاں شروع ہوں گی اس کی طرف۔ ہم اپنی تیاری مکمل کرتے ہیں' پھر دیکھ کر کوئی تاریخ رکھ لیں گے۔ حسن شادی کرنے ہی آیا ہے' پھر چند روز کے انتظار سے کون سی قیامت آجائے گی۔ تم تو ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہتی ہو۔"

بھائی جان کے لہجے میں بے زاری ہی بے زاری تھی' بھابھی برا منا کر خاموش ہوگئیں' لیکن بھائی جان کا حسن کا دفاع کرنے پر مجھے ازحد خوشی ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

تیسرے روز ہم آذر کے ڈنر پر گئے۔

یہ پورا دن حسن نے اپنے پرانے دوستوں سے ملنے ملانے میں گزارا تھا۔ شام سات بجے میں نے حسن اور عفیرہ کو ہوٹل جانے کے لیے پک کیا۔ عفیرہ اپنے گیٹ سے نکلتے ہی ہم دونوں کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔

"پہلے مجھے بتائیں' میں کیسی لگ رہی ہوں؟" اس نے سی گرین اور گولڈن امتزاج کا بے حد اسٹائلش سوٹ پہنا ہوا تھا دوپٹے کے دونوں پلوؤں کو پوری بازو سے پھیلا کر اس نے گھوم کر پوچھا۔

"ہمیشہ کی طرح بہت اچھی لگ رہی ہو۔ اب فٹافٹ بیٹھو' ہم پہلے ہی لیٹ ہوچکے ہیں' آذر کا دوبار فون بھی آچکا ہے۔"

عفیرہ کے بیٹھتے ہی میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

"یہ آذر بھائی کی کون سی ٹرین چھوٹ رہی ہے جو انہیں ڈنر کھلانے کی جلدی ہے۔ سات بجے کون ڈنر کرتا ہے۔" عفیرہ نے پہلا نکتہ اعتراض اٹھایا۔

"نمل کو دیر تک گھر سے باہر رہنے کی اجازت نہیں ہے' جتنی جلدی ڈنر ختم ہوگا اتنی جلدی وہ گھر پہنچے گی۔" میں نے فوراً وجہ بتادی۔

"میں آج آذر بھائی کی جیب خوب خالی کروانے والی ہوں۔ مجھے جو ہر وقت چڑاتے رہتے ہیں' خوب مزہ چکھاؤں گی۔" اس نے ارادہ ظاہر کیا تو میں نے فوراً ٹوک دیا۔

"کوئی اوٹ پٹانگ حرکت کرنے کی ضرورت نہیں ہے نہ ہی تم آذر سے کوئی فرمائش کروگی۔ بے شک تمہیں بہن مانتا ہے' لیکن کسی کی جیب پر اتنا بوجھ نہیں ڈالتے۔ جو سب آرڈر کریں گے' تم بھی وہ ہی کھالینا۔"

"پھر آپ مجھے یہیں اتار دیں' سب کی پسند کا ہی کھانا' کھانا ہے تو گھر میں ممی کی پسند کا ہی کھالوں گی' ہوٹل جانے کی کیا ضرورت ہے۔" اس نے بسور کر کہا۔

"عفیرہ! اب منہ بنا کر بیٹھنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے ڈپٹ کر کہا۔ میرے آگے کی بچی تھی اور میں چونکہ اس کی رگ رگ سے واقف تھی۔ سو کچھ نصیحتیں کرنا ضروری سمجھا۔

"آپ مجھے ڈانٹ رہی ہیں۔ وہ بھی حسن انکل کے سامنے۔"

"کوئی بات نہیں عفیرہ! نویر کو کہنے دو۔ مجھے برا نہیں لگ رہا۔" حسن نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

"واٹ؟" عفیرہ نے صدمے سے چور آواز میں کہا۔ میں اور حسن ایک ساتھ ہنس دیے۔

"آپ کو برا نہیں لگ رہا' لیکن مجھے لگ رہا ہے۔ میں سوچ رہی تھی۔ آپ اتنی دیر سے خاموش کیوں بیٹھے ہیں۔ لیکن اب سوچ رہی ہوں' اس سے تو اچھا تھا آپ خاموش ہی رہتے۔" اس نے پھر خفگی سے کہا۔ ایک تو یہ کہ کم عمر تھی دوسرے بات کرنے کے



انداز میں بے ساختگی بھی بہت تھی جو دل میں آتا ہے بے دھڑک بولتی۔

"بھئی میں خاموش رہ کر سوچ رہا تھا۔ یہ سی گرین کلر تمہیں بہت سوٹ کر رہا ہے۔ کل رائل بلیو کلر بھی خوب لگ رہا تھا۔ تمہیں ایسے رنگ پہننا چاہئیں۔ اچھے لگتے ہیں تم پر۔"

"دیکھا نویر۔" عفیرہ اپنی تعریف سن کر چہکی۔ "اس طرح تعریف کی جاتی ہے، یہ نہیں کہ صرف اتنا کہہ دیا۔ ہمیشہ کی طرح اچھی لگ رہی ہو۔"

"ہمیں تو ایسی ہی تعریف کرنا آتی ہے۔" میں نے بے بسی سے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"اونہہ... ایسی بے کار تعریف کا کیا کرنا ہے۔ حسن انکل! اگلی بار مجھے تعریف سننا ہوگی تو آپ کے پاس جاؤں گی۔"

میں نے بے ساختہ عفیرہ کو بیک مرر سے گھورا۔ اسے بولتے ہوئے تھوڑی احتیاط کرنی چاہیے۔ میں سوچ رہی تھی کچھ باتیں بچوں کے منہ سے اچھی نہیں لگتیں۔ انہیں نہیں کرنی چاہئیں۔

"اپنی پھوپھو سے بھی کہو۔ کبھی ڈارک کلرز پہنا کریں۔" مجھے ایک نظر دیکھتے ہوئے حسن نے شرارتی انداز میں عفیرہ سے کہا۔

"میں تو کئی بار کہہ چکی ہوں، لیکن انہیں پھیکے سیٹھے شیڈز سے فرصت ملے تب نا۔" عفیرہ نے بے زاری سے جواب دیا۔

"مجھے لائٹ کلرز پسند ہیں۔" میں نے حسن پر ایک نظر ڈالتے ہوئے صفائی پیش کرنے والے انداز میں کہا۔

"اور یہی بات ہے ان کو سوٹ بھی کرتے ہیں، بلکہ کچھ کچھ شیڈز دیکھ کر مجھے لگتا ہے یہ بنے ہی ان کے لیے ہیں۔" عفیرہ نے پھر کہا۔

"ہاں، لیکن کبھی کبھار ڈارک شیڈز بھی ٹرائے کرنا چاہئیں۔ تبدیلی اچھا تاثر لاتی ہے۔" حسن نے کہا۔

"ٹھیک ہے میں شادی کے کپڑوں میں دو، تین جوڑے ڈارک شیڈز کے رکھ لوں گی۔" میں نے فوراً حسن کی بات مان لی کہ اس کی بات پر میرے لیے بہت اہمیت رکھتی تھی۔

"واہ... حسن انکل! نویر آپ کی بہت مانتی ہیں، ورنہ میں کئی بار ڈارک شیڈ ٹرائے کرنے کا کہہ چکی ہوں، مگر مجال ہے، جو انہوں نے میری سنی ہو، آپ کی بات پر کس طرح فوراً "ہاں" کہہ دی۔"

حسن نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ معنی خیز انداز میں مسکراتے شیشے سے باہر دیکھنے لگے۔

چند منٹ ہم تینوں خاموش رہے، پھر حسن نے پوچھا۔

"تم نے آفس سے کل کی چھٹی لی؟"

میں نے مایوسی سے سر نفی میں ہلا دیا۔

"ایک تو یہ کہ کل اسٹاف میٹنگ ہے، اس لیے بھی چھٹی ملنا مشکل ہے۔ ایک کام ہو سکتا ہے اگر تم بارہ، ساڑھے بارہ تک آفس آجاؤ تو مجھے ایک دو گھنٹوں کے لیے جانے کی اجازت مل جائے گی۔" میں نے خیال آنے پر کہا۔

"اتنی فٹنگ لینے کی کیا ضرورت ہے نویر! جس روز تم فری ہو گی اطمینان سے دیکھ لیں گے۔" حسن نے کہا، لیکن میرے اصرار پر ناچار اسے ہامی بھرنا پڑی۔

آذر اور نمل ہمارے منتظر تھے۔ نمل نے سیاہ رنگ کا جوڑا پہن رکھا تھا اور اتنی خوب صورت لگ رہی تھی کہ آذر تو آذر میں بھی اس پر سے نظریں نہ ہٹا سکی۔ عفیرہ کی طرح اس کی بھی حسن سے پہلی ملاقات تھی اور عفیرہ کی ہی طرح اس نے بھی فوراً ہی حسن کو اوکے کر دیا۔ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں حسن کو سراہ رہی تھی۔

کھانا ہم نے خوش گوار موڈ میں کھایا۔ اسی دوران میں تو خاموش ہی رہی ان چاروں نے خوب باتیں کیں، نمل نے تو حسن کا اچھا خاصا انٹرویو کر ڈالا اور کھانا ختم کرتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ آذر فون کرنے ہال سے باہر گیا تھا۔ نمل زبردستی مجھے اپنے ساتھ باہر لے آئی۔

"مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔" اس نے میرے

استفسار پر جواب دیا اور عفیرہ اور حسن کو اللہ حافظ کہتی باہر آگئی۔

"بتاؤ۔ اتنی سمجھ بوجھ والی لڑکی اور عقل نام کو بھی نہیں۔ مجھے تم پر ترس آرہا ہے نویر۔" وہ باہر آتے ہی مجھ پر برسی۔

"کیا ہو گیا نمل؟" میں حیران ہوئی۔

"یار! اتنا شاندار منگیتر ہو۔ اور تم نے سترہ سال سے اسے کھلا چھوڑا ہوا تھا۔ آفرین ہے تم پر۔"

"تم پاگل ہو نمل۔" مجھے اس کے انداز پر ہنسی آگئی۔

"جی نہیں۔ پاگل نہیں ہوں، بہت عقل مند ہوں اور دور اندیش بھی۔ دیکھنا ایک دن یہ بات تم خود مانو گی، بہر حال میں تمہارے لیے بہت خوش ہوں۔ حسن بہت اچھا لگا ہے مجھے۔ اللہ کرے وہ تمہیں اتنی ہی محبت سے رکھے، جتنی محبت تم ڈیزرو کرتی ہو، لیکن...."

"کیا لیکن؟"

"کچھ نہیں۔" اس نے جیسے کچھ کہنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے فقط اتنا کہا۔

"تم نے سچی خوشیوں کے لیے بہت اسٹرگل کی ہے، میں اللہ سے دعا کروں گی، تمہیں تمہاری خوشیاں ضرور ملیں۔" تب ہی آذر آگیا، ہم انٹرنس سے کچھ فاصلے پر کھڑے تھے وہاں جہاں پام کے درخت تھے۔

"اتنی جلدی کیوں جا رہی ہو نمل! میں تمہیں ڈراپ کردوں گا، تھوڑی دیر تو اور رکو۔"

"تمہارے ساتھ آتا دیکھ کر سوتیلی امی جان نے مجھے زندگی سے ڈراپ کردینا ہے۔" اس نے اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں کہا۔

"سوتیلی امی سے اتنا ڈرتی ہو تو آذر سے شادی کیسے کرو گی؟" میں نے تعجب سے کہا۔

"شادی کے معاملے میں کسی کی نہیں سنوں گی میں۔ شادی تو اپنی مرضی سے ہی کروں گی۔" اس نے دوٹوک کہا۔

"میں تو کہتی ہوں تم بھی تیاری پکڑو۔ ایک ہی دن شادی کرتے ہیں۔ بہت ایکسائٹمنٹ رہے گی۔" میں نے خیال ظاہر کیا تو آذر فوراً بولا۔

"کس قدر بہترین خیال ہے۔ میں تو فوراً راضی ہو گیا ہوں، ویسے تو مجھے اس وقت بھی کوئی اعتراض نہیں۔ نمل اتنی پیاری لگ رہی ہے کہ میں کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں، لیکن افسوس.... کورٹ تو اس وقت تک بند ہو چکا ہو گا۔" اس نے نیم سنجیدگی کے ساتھ اور معنی خیزی سے نمل کو دیکھتے ہوئے کہا تھا اور میں حیران رہ گئی، کیونکہ پہلی بار میں نے آذر کی کسی بات پر نمل کو شرماتے دیکھا تھا۔

"تم آذر...." نمل نے سٹپٹا کر اسے بری طرح گھورا، لیکن وہ آذر ہی کیا جو باز آجائے۔

"اچھا نویر! تم جاؤ نا، مجھے نمل کو اور بلش ہوتے دیکھنا ہے بھئی۔" نمل نے جہاں اپنا سر پیٹا، وہیں میں نے بے تکلفی سے ایک چپت اس کے کندھے پر رسید کردی۔

"بہت ہی بدلحاظ ہو تم تو آذر۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا اور واپس ہال کی طرف چل دی۔

✵ ✵ ✵

"عفیرہ کہاں ہے؟"

میں نے حسن کو تنہا بیٹھا دیکھ کر پوچھا۔ جواباً حسن نے کچھ بھی کہنے کے بجائے ہاتھ کی خفیف سی جنبش سے ایک سمت میں اشارہ کردیا۔ میں نے دیکھا، عفیرہ ہال کے دوسرے کونے پر اس گلدان کے پاس کھڑی دکھائی دے رہی تھی، جس میں خوش رنگ پھولوں کی کلیاں بصارت کو متوجہ کرتی تھیں۔

"وہاں کیا کر رہی ہے؟" میں نے آنکھوں کو سکوڑ کر عفیرہ کو دیکھتے ہوئے حسن سے پوچھا۔ حسن دائیں کہنی میز پر ٹکائے بند مٹھی اپنے مسکراتے لبوں پر رکھے دلچسپ نظروں سے عفیرہ کو دیکھ رہا تھا۔

میرے سوال پر وہ اسی طرح اس طرح دیکھتا رہا، پھر اس نے کہا۔

"مجھ سے شرط لگا کر گئی ہے کہ اس ٹیبل سے چپس کا پیکٹ اٹھا کر لائے گی۔"

"واٹ؟" مجھے بری طرح دھچکا لگا۔ "اس کا تو دماغ خراب ہے۔" میں تیزی سے کرسی گھسیٹ کر اٹھی، تاکہ عفیرہ کو کوئی غلط حرکت کرنے سے روک سکوں، لیکن ایک بھی قدم اٹھانے سے پہلے ہی حسن نے میرا ہاتھ پکڑ کر روک دیا۔

"بیٹھو تو سہی، دیکھنے تو دو، وہ کیا کرتی ہے؟"

"حسن! آر یو میڈ؟ ہم پبلک پلیس پر ہیں، ابھی یہاں اچھا خاصا تماشا کھڑا ہو جائے گا۔" میں نے اسے صورت حال کی نزاکت کا احساس دلانا چاہا، لیکن وہ لاپروائی سے بولا۔

"کچھ بھی نہیں ہو گا نویر! عفیرہ ابھی خالی ہاتھ واپس آجائے گی۔ میں نے بغیر سوچے سمجھے اس سے شرط نہیں لگائی۔"

"حسن! وہ بچی ہے، تمہیں تو کچھ سوچنا چاہیے تھا۔" میں نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔ حسن نے رخ بدل کر مجھے گہری نظروں سے دیکھا۔

"بیٹھ جاؤ نویر۔" میں بیٹھی تو نہیں، لیکن ہنوز پریشانی سے اس طرف دیکھ رہی تھی۔ میرا ہاتھ ابھی بھی حسن کے ہاتھ میں تھا، ورنہ میں کب کی عفیرہ کے سر پر پہنچ چکی ہوتی۔

حسن نے ٹھیک کہا تھا عفیرہ واقعی چند منٹ کے بعد خالی ہاتھ منہ بسورتی واپس آگئی۔

"آپ شرط جیت گئے۔ میں تو ٹیبل کے قریب بھی نہیں جا سکی، چپس کا پیکٹ خاک اٹھاتی۔ میں اب آپ کو انکل نہیں کہوں گی۔"

"مجھے پتا تھا، تم ہار جاؤ گی۔" حسن نے میری ناراضی کی پروا کیے بغیر خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"اب تمہیں باقی بچوں کو بھی منع کرنا ہو گا کہ وہ مجھے انکل نہ کہیں۔ غضب خدا کا، میں اتنا بوڑھا تو نہیں ہوں کہ انکل انکل کہہ کر میرے ناک میں دم کیا جائے۔"

"یہ کس کا آئیڈیا تھا؟" میں نے مداخلت کی۔

"کون سا آئیڈیا؟" عفیرہ چونکی۔

"یہ ہی کہ تم چوری کرنے اس ٹیبل تک جاؤ گی۔" میں نے اسی طرح درشت لہجے میں پوچھا۔

"یہ چوری نہیں صرف ایک ایڈونچر تھا نویر۔" حسن نے کہا۔

"اور اگر عفیرہ پکڑی جاتی تو ہم یہ بات کس کس کو ایکسپلین کرتے۔"

"وہ خالی ہاتھ واپس آئی ہے نویر۔" حسن نے تحمل سے کہا تھا۔

"لیکن گئی تو چوری کرنے کے ارادے سے ہی تھی۔" میں نے زور دے کر کہا۔

"تم ایک ہی بات کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہو نویر۔"

"حد ہے حسن! بجائے اس کے کہ تم عفیرہ کو اس کی غلطی کا احساس دلاؤ، تم اس کی طرف داری کر رہے ہو۔"

"پلیز نویر! آپ حسن کو کچھ نہ کہیں۔" عفیرہ نے ہمارے تیز لہجوں سے گھبرا کر کہا۔ "شرط میں نے لگائی تھی، انہوں نے تو صرف اتنا کہا تھا اگر میں ہار گئی تو ان کو انکل کہنا چھوڑ دوں گی اور باقی سب کو بھی منع کروں گی کہ وہ انہیں انکل نہ کہیں۔"

"تم میں کچھ عقل ہے کہ نہیں؟ کبھی کبھی اسے استعمال کر لیا کرو، بچی نہیں رہی ہو بڑی ہو گئی ہو اب.... کہ ایسی اوٹ پٹانگ حرکتوں کو نظر انداز کردیا جائے۔"

میں نے دبی ہوئی آواز میں اسے جھڑکا، مجھے غصہ کم آتا تھا، خصوصاً اپنے بھائی بہنوں کے بچوں پر تو بالکل بھی نہیں، لیکن اگر کسی بات پر دماغ گھوم جاتا تو اس کے چکر آرام سے رکنا مشکل ہوتا۔ عفیرہ کی حرکت نے مجھے بے حد طیش دلا دیا تھا، میرے ذہن میں رہ رہ کر یہ ہی بات آرہی تھی کہ اگر وہ پکڑی جاتی تو یہاں اچھا خاصا تماشا کھڑا ہو جاتا۔

آذر واپس آیا تو ہم تینوں ہی بالکل خاموش بیٹھے تھے، میں بھی اپنا غصہ محض حسن کی وجہ سے دبا گئی تھی کہ میں اپنی بھتیجی کو اس کے سامنے شرمندہ نہیں کرنا چاہتی تھی، لیکن عفیرہ کا سر مستقل جھکا ہوا تھا اور چہرے پر شرمندگی کے تاثرات تھے۔ میں نے اس کی

کلاس لینے کا کسی اور وقت تک ارادہ ٹال دیا' لیکن پھر اس کے بعد ہم زیادہ دیر نہیں رکے۔ ہم جلدی ہی گھر جانے کے لیے اٹھ گئے۔

☼ ☼ ☼

راستے بھر ہم تینوں خاموش رہے' لیکن جس وقت میں نے گاڑی فاروق بھائی کے گیٹ پر روکی۔ عفیرہ نے اپنی غلطی کے لیے معافی مانگ لی۔

"مجھے واقعی ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اگر پکڑی جاتی تو صرف میری نہیں بلکہ آپ سب کی بھی انسلٹ ہوتی۔" میری طرف کے شیشے پر جھکی وہ شرمساری سے کہہ رہی تھی۔ مجھے بے اختیار اس پر پیار آیا' وہ میری بھتیجی تھی اور مجھے خوشی تھی کہ کم عمری کے باوجود اس میں سمجھ داری اتنی تھی کہ اس نے فوراً "اصل نکتہ" سمجھ لیا تھا۔

"آپ اب تو خفا نہیں ہیں۔ میں اگلی بار خیال رکھوں گی کہ کوئی ایسی شرارت کی کوشش نہ کروں۔"

"نہیں... میں خفا نہیں ہوں۔" میں نے پیار سے اس کا گال تھپتھپایا۔ تب عفیرہ ذرا سا جھکی اور میرے گال کا بوسہ لے لیا۔

"تھینک یو نوریہ' آپ کو میرا برتھ ڈے یاد ہے نا۔" وہ پھر چہکی۔

"کیسے بھول سکتی ہوں۔" میں مسکرائی۔

"حسن! آپ کو بھی پرسوں میری برتھ ڈے پارٹی میں آنا ہوگا۔"

"شیور۔" حسن نے محض اتنا کہا تب عفیرہ اللہ حافظ کہتی اندر چلی گئی' میں نے گاڑی آگے بڑھائی۔

راستہ پھر خاموشی سے کٹنے لگا۔

مجھے حسن کی خاموشی بہت محسوس ہو رہی تھی' پھر جب مجھ سے صبر نہ ہو سکا تو خود ہی اسے مخاطب کر لیا۔

"کیا سوچ رہے ہو حسن!"

"تمہیں عفیرہ کو اتنا نہیں ڈانٹنا چاہیے تھا۔" وہ غالباً "میری طرف سے پہل کا منتظر تھا۔ لیکن مجھے اس سے یہ جملہ سن کر عجیب لگا۔ ہاں ٹھیک ہے اسے وہاں ہوٹل میں میرے غصے پر ناگواری ہوئی تھی' مگر یہ ایسی بات نہیں تھی کہ اسے طول دیا جاتا۔

"میں نے عفیرہ کو کم ڈانٹا ہے' وہ زیادہ کی مستحق تھی۔"

"یہ کم تھا؟ تو زیادہ کتنا ہوگا؟"

"جتنا بھی تھا ٹھیک تھا۔ میں بڑی ہوں اس کی' کیا ڈانٹ نہیں سکتی؟ ماریہ بھابھی ہوتیں تو وہ بھی یہ ہی کرتیں۔"

"ماریہ بھابھی' عفیرہ کی ماں ہیں' انہیں حق ہے کہ وہ اسے ڈانٹیں۔"

"میں نے عفیرہ کو ہمیشہ اپنی بیٹی کی طرح سمجھا ہے۔ اتنا پیار کرتی ہوں کیا غلط بات پر ڈانٹنے کا حق نہیں ہے مجھے؟"

"تمہیں ساری دنیا کو ڈانٹنے کا ان کی غلطیاں پوائنٹ آؤٹ کرنے کا حق ہے۔ بزرگ [illegible] ہو [illegible] لی۔" حسن نے اچانک تیز لہجے میں کہا۔ میں نے کسی قدر حیرانی سے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"عفیرہ نے تمہارے سامنے مجھ سے ایکسکیوز کیا ہے' اسے اپنی غلطی کا احساس تھا' تب ہی ایکسکیوز کیا۔ جب اسے ہی اعتراض نہیں تو تمہیں کیوں اعتراض ہو رہا ہے۔"

"کیونکہ تم نے ان ڈائریکٹلی مجھے جتایا ہے کہ عفیرہ کو شرارت پر اکسا کر میں نے غلطی کی۔" حسن نے سابقہ لہجے میں کہا۔

میں ایک پل کو ٹھٹک گئی۔ سمجھ نہیں پائی' مجھے حسن کو کس طرح مطمئن کرنا چاہیے۔

"میں نے یہ نہیں کہا کہ تم نے عفیرہ کو اکسایا تھا' لیکن تم نے اس کی شرارت میں ساتھ دیا تھا جو کہ غلط تھا۔ تم بڑے تھے' وہ بچی تھی' وہ نا سمجھی کر رہی تھی تو تم اسے سمجھا دیتے۔ تمہاری جگہ میں ہوتی تو یہ ہی کرتی۔"

منیزہ آپا کے گھر کے سامنے گاڑی روک کر میں نے تحمل سے اپنا نکتہ نظر اسے سمجھانا چاہا۔

"بزرگ بننے کا شوق تمہیں ہے' مجھے نہیں۔" دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھے ہوئے اس نے درشتی سے کہا۔

"لیکن ہم عفیرہ کے بزرگ ہیں حسن!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا تھا۔ حسن نے جھٹکے سے دروازہ کھولا اور جھٹکے سے بند کر کے چلا گیا۔ میں نا سمجھی سے اسے جاتا دیکھتی رہی۔

☼ ☼ ☼

وہ رات بڑی بے چینی میں گزری۔

حسن کی خفگی کا احساس میری روح پر سل کی طرح دھرا ہوا تھا۔

ساری رات میں نے کروٹیں بدل کر گزاری۔ پھر ذرا دیر کو آنکھ لگی تو فجر کی پہلی اذان کے ساتھ نیند ٹوٹ گئی اور حواس میں آتے ہی جو پہلا خیال مجھے آیا وہ یہ ہی تھا کہ اپنی غلطی [illegible] کے باوجود مجھے حسن کو منا لینا چاہیے [illegible] بیٹھ گئی اور سائیڈ ٹیبل پر رکھا [illegible] فون اٹھا کر حسن [illegible] ملانے لگی۔

پہلی بیل بجتے ہی میرا دل ہنگامی انداز میں دھڑکنے لگا۔ دھڑکن کی آواز مجھے کانوں میں سنائی دے رہی تھی۔ دوسری بیل بجنے تک میرا دل خدشات سے بھر گیا۔ حسن مجھ سے کبھی خفا نہیں ہوا تھا' لیکن اگر آج خفا ہو گیا تو... مجھے عجیب و غریب وسوسے اتنی سی دیر میں بری طرح ستانے لگے تھے۔ وسوسے اور دھڑکن سوئیوں کی طرح دوڑ رہے تھے۔ جیسے کوئی خطرے کی گھڑی ہو' تیسری بل بجی۔

"ہیلو...!" میرے اردگرد سکون پھیل گیا۔

میں نے سکون سے گہری سانس بھری گویا تختہ دار پر کھڑے شخص کو پھانسی ٹل جانے کی اطلاع مل گئی ہو۔

"تم اب تک جاگ رہی ہو نوریہ!" اس نے پوچھا۔

"تم بھی تو جاگ رہے ہو۔" میں نے آہستگی سے کہا کہ میں اس کی آواز کے ہر تاثر سے واقف تھی۔

"میں سوچ رہا تھا ہماری جو بحث ہوئی وہ نہیں ہونا چاہیے تھی۔" اس نے کہا' میں مسکرائی۔

"میں بھی یہ ہی سوچ رہی تھی۔"

"تمہارے خیالات بہت ملتے ہیں۔"

"پوچھ رہے ہو یا بتا رہے ہو؟" میں نے ہنس کر کہا۔

"پتا نہیں۔" وہ خاموش ہو گیا' میں بھی خاموش رہی' پھر حسن نے کہا۔

"نوریہ! تم ساری زندگی خوش رہنا' تمہاری خوشی میری پوری زندگی کے لیے ایک بڑا اطمینان ہوگی۔"

"تم مجھے خوش رکھنا حسن! تمہارا ساتھ' تمہاری محبت' تمہاری توجہ میری ساری زندگی کی خوشی ہوگی۔" میں نے بے ساختہ کہا تھا۔

"ہاں۔" میں نے حسن کی آواز میں مسکراہٹ کا تاثر محسوس کیا۔

"چلو اب سو جاتے ہیں۔" اس نے کہا۔

"ہاں... اب سو جاتے ہیں۔" میں نے کہا' لائن کٹ گئی۔ میں نے پرسکون ہو کر سیل فون کو دیکھا اور اپنی روح پر رکھے ہر طرح کے بوجھ سے آزاد ہو کر وضو کرنے کے لیے اٹھ گئی۔

☼ ☼ ☼

بارہ بجتے ہی میں نے لاشعوری طور پر حسن کا انتظار شروع کر دیا اور ٹھیک ساڑھے بارہ بجے جب اس نے آفس میں قدم رکھا تو میرے لبوں پر مسکراہٹ اور خانہ دل میں روشنیاں سی بکھر گئیں' لیکن مجھے ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ یہ روشنیاں میرے چہرے سے چھلک کر سب کو متوجہ کرنے کا سبب بن رہی ہیں۔

"نوریہ! تم نے اپنے اندر بلب فٹ کروایا ہے؟"

"یار! بلب کو چھوڑو' یہ بتاؤ' یہ ہینڈسم کون ہے' جس کو دیکھ کر اتنا مسکرایا جا رہا ہے۔" سارہ کی بات کے جواب میں وردہ نے کہا۔

"کچھ دن میں نوریہ کی شادی ہونے والی ہے' تم لوگوں کے خیال میں یہ حسن بھائی کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے؟" کمل نے ان دونوں سے کہا تھا' ہم

چاروں کے کیبن ساتھ ساتھ ہی تھے۔

نمل نے ان چاروں کو بتایا تھا، لیکن چند منٹ میں حسن کی آمد کی خبر سارے میں پھیل گئی۔ ہمارے آفس کا ماحول بے حد دوستانہ تھا، صرف یہ ہی نہیں بفضل خدا اپنے سارے اسٹاف ممبرز سے اچھی صاحب سلامت بھی تھی، تب ہی حسن کی خوب پذیرائی ہوئی۔ سب لوگ بہت اچھے طریقے سے ملے اور تو اور مینیجر صاحب اس سے چائے کے لیے اصرار کرنے لگے۔ حسن نے معذرت کرنا چاہی تو مینیجر صاحب نے خوش دلی سے کہا۔

"آپ کا کوئی ایکسکیوز قابل قبول نہیں ہو سکتا حسن صاحب۔ آپ کو نہیں پتا مس نویر کی وجہ سے آپ ہمارے لیے کتنے اسپیشل ہیں، اس طرح بغیر کچھ کھائے پیے تو ہم آپ کو جانے نہیں دیں گے، کیوں نویر بیٹے! آپ ہی ہماری سفارش کیجیے۔"

لیکن میری سفارش کی ضرورت ہی نہیں پڑی حسن نے چائے پینے کی ہامی بھرلی تھی۔

✡ ✡ ✡

تقریباً" ڈیڑھ گھنٹہ بعد جب ہم آفس سے نکلے تو حسن کو ملنے والی پذیرائی نے مجھے بے حد مسرور کر دیا تھا۔ لیکن حسن کے ایک جملے نے جیسے میری خوشی پر پانی ڈال دیا۔

"کیا ضرورت تھی اپنے کولیگز کو میرے بارے میں بتانے کی؟"

میں گاڑی اسٹارٹ کر رہی تھی، جب حسن کے استفسار نے مجھے اتنا حیران کیا کہ چند لمحے کے لیے میں ٹھٹک سی گئی۔

"یہ کیسا سوال ہے حسن! سب کو پتا ہے میری شادی ہونے والی ہے، شادی کے سلسلے میں لیو اپلیکیشن بھی میں کچھ روز میں سمٹ کروا دوں گی۔ تم کہہ رہے ہو مجھے نہیں بتانا چاہیے تھا اور اب کیا کہتی ہاف لیو لے کر کسی اجنبی کے ساتھ جا رہی ہوں۔" میں نے گاڑی پارکنگ سے نکالتے ہوئے کہا۔

حسن چپ چاپ شیشے سے باہر دیکھ رہا تھا۔

"تمہیں اتنا اسپیشل پروٹوکول ملا، تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟" میں نے پوچھا۔

"ایسی بات نہیں ہے۔" اس نے تیزی سے کہا۔

"پھر کیسی بات ہے؟"

"پتا نہیں۔" اس نے اکتاہٹ کے ساتھ کہا۔ میں حیران تھی، آخر ایسی کون سی بات ہو گئی جو حسن کو پسند نہیں آئی اور اب وہ بے زار لگ رہا تھا۔

"تم ذرا اسپیڈ بڑھا دو۔ ڈیلر بے چارہ ہمارے انتظار میں سوکھ رہا ہو گا۔"

اس نے سابقہ انداز میں کہا تھا۔ میں حیرانی د ناسمجھی کے ہنڈولے میں جھولتی اس کے پل میں تولہ پل میں ماشہ والے مزاج پر غور کرتی رہی۔

✡ ✡ ✡

"نہیں جمیل صاحب! آپ کے دکھائے ہوئے دونوں بنگلے ہمیں پسند نہیں آئے، کل فون پر آپ کو اپنی ساری Requirments (ضروریات) بتا تو دی تھیں۔ آپ پھر بھی ایسے بنگلے دکھانے لے آئے ہیں۔"

"سیٹلائٹ ٹاؤن میں بھی ایک بہت اچھا بنگلہ ہے سر! چلیے میں آپ کو وہ دکھا دیتا ہوں۔ مجھے امید ہے آپ کو ضرور پسند آجائے گا۔" پراپرٹی ڈیلر جمیل اختر نے کہا۔

"آپ نے پہلے دو بنگلوں کی دفعہ بھی یہ ہی کہا تھا۔" حسن نے رکھائی سے کہا۔

"لیکن سر!"

"دیکھیے، لیکن ویکن کچھ نہیں۔ آپ اگلے ایک، دو روز تک ہمیں ہماری Requirment کے مطابق گھر دکھائیں ادر وائز ہم کوئی اور ایجنٹ ہائر کر لیں گے۔"

حسن نے مجھے آگے چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے جمیل اختر سے کہا۔ مجھے حسن کی تلخی سمجھ نہیں آرہی تھی، اس نے بہت معمولی باتوں کی بنا پر دونوں بنگلے

ریجیکٹ کر دیے تھے۔ حالانکہ مجھے دونوں ہی اچھے لگے تھے۔

"میرے سر میں شدید درد ہے۔" ہم گاڑی میں واپس آکر بیٹھے تو حسن نے اپنا سر سہلاتے ہوئے کہا۔

"پھر تو گھر چلتے ہیں، تم آرام کر لینا۔ میں خود ہی مارکیٹ چلی جاؤں گی۔" میں نے تشویش سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مارکیٹ کیوں جانا ہے؟" حسن نے پوچھا۔

"تم بھول گئے، کل عفیرہ کا برتھ ڈے ہے۔ مجھے اس کے لیے گفٹ لینا ہے۔"

"گفٹ تو مجھے بھی لینا تھا۔" حسن نے کہا۔

"چلو پھر پہلے گفٹ لے لیتے ہیں۔"

"لیکن حسن! تمہاری طبیعت؟" میں تذبذب سے بولی۔

"تھکن دوری نہیں ہوئی اس لیے سر میں درد ہے۔" حسن نے کسی قدر بے زاری ولاپروائی سے کہا۔

"مجھے تو عفیرہ کی پسند ناپسند کا نہیں پتا۔ اب تم ساتھ ہو تو میری طرف سے بھی کوئی گفٹ خرید لینا۔"

حسن کے کہنے پر میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور ہم گلبرگ جانے کے بجائے مارکیٹ آگئے۔ اپنی طرف سے میں نے عفیرہ کے لیے Gucci پرس اور بوتیک سے ایک خوب صورت جوڑا خرید لیا، لیکن جب حسن کی طرف سے تحفہ خریدنے کی باری آئی تو جو چیز مجھے پسند آتی اس کے لیے حسن انکار کر دیتا اور جو حسن پسند کرتا مجھے یقین ہوتا وہ عفیرہ کو پسند نہیں آئے گا۔

"حسن! میں سوچ رہی تھی جمیل اختر سے ہی کہوں میرے گھر کو فروخت کروا دے۔" ایک گفٹ شاپ پر ریک میں ڈس پلے کیے گفٹ آئٹمز کو دیکھتے ہوئے میں نے حسن سے کہا۔

"رخصتی تو میری فاروق بھائی کے گھر سے ہی ہونی ہے۔ شادی کی تاریخ طے ہوتے ہی میں اور بوا جی ان کی طرف شفٹ ہو جائیں گے۔ پھر اس گھر کو سنبھال کے کیا کرنا ہے؟"

"اتنی جلدی کیا ہے فروخت کرنے کی۔" حسن نے کہا۔ "کبھی اچانک بھی کسی چیز کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔"

میں نے کن انکھیوں سے اس کا موڈ بھانپنے کی کوشش کی اور جھجکتے ہوئے کہا۔

"حسن! میرا گھر اچھا خاصا ہے، میں سوچ رہی تھی کیوں نہ شادی کے بعد ہم یہاں ہی شفٹ ہو جائیں۔"

"ناممکن۔۔۔ لوگ کیا کہیں گے، میں تمہیں ایک گھر بھی لے کر نہیں دے سکا۔ نہیں بھئی۔ مجھے دنیا کی باتیں نہیں سننی۔"

"دنیا کی تو تم نے خوب کہی، دنیا کا تو کام ہی باتیں بنانا ہے حسن!"

"پلیز نویر! اس ایشو کو یہیں ختم کر دو، میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا، مجھ سے اس بارے میں بات مت کرنا۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" میں نے فوراً" کہا، مبادا وہ خفا ہو جائے۔ "میں جمیل اختر سے کہہ دیتی ہوں وہ ہمیں کوئی پے انگ گیسٹ تلاش کر دے۔"

حسن چند لمحے خاموش رہا اور ریک سے ایک بے حد نفیس ٹیبل لیمپ اٹھا کر دیکھنے لگا۔

"اتنی جلدی کیوں ہے تمہیں اپنا گھر خالی کرنے کی؟" اس نے ٹیبل لیمپ واپس رکھتے ہوئے کہا۔

"تم وہاں آکر رہنے پر راضی نہیں ہو۔ شادی کرنی ہے تو خالی کرنا ہی پڑے گا۔ اچھا ہے کرائے دار رہیں گے تو حفاظت بھی ہوتی رہے گی۔"

"میرا نہیں خیال۔۔۔ ہمیں یہاں کوئی چیز عفیرہ کی پسند کے مطابق ملے گی۔ چلو کسی اور شاپ میں دیکھ لیتے ہیں۔ یا کوئی جیولری پسند کر لو، میں نے دیکھا ہے عفیرہ شوق سے استعمال کرتی ہے جیولری۔" میری بات کے جواب میں حسن نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

"ہاں جیولری اسے پسند ہے۔۔۔ لیکن۔۔۔" تب ہی میری نظر ریک کے ایک کونے میں بڑے سے واز کے

پیچھے رکھی کرسٹل کی گڑیا پر پڑی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر گڑیا اٹھالی۔

پیور کرسٹل سے بنی ہوئی یہ گڑیا بے حد خوب صورت اور نفیس تھی۔ ایک ہاتھ برابر ہوگی' اپنے پیروں تک آتے نفیس ملبوس کو اس نے چٹکیوں میں پکڑ کر خفیف سا اوپر اٹھا رکھا تھا۔ اس عمل سے فراک کی فرل پر ایک ہلکی سی لہر پیدا ہو رہی تھی۔ تمکنت سے اٹھی صراحی دار گردن' کمر تک آتے سلکی بالوں کی آبشار اور سر پر رکھا نازک تاج۔

اس کرسٹل کے شاہکار کو ہاتھوں میں پکڑے میں حیران کھڑی تھی۔ آخر اس چمکتے دمکتے روشنیوں سے مزین ڈسپلے سینٹر میں اتنی بہترین چیز کو ایک کونے میں کیوں رکھا گیا تھا۔

"حسن! یہ ڈول بہت خوب صورت ہے عفیرہ کو یقیناً" پسند آئے گی۔" میں نے حسن کو دکھاتے ہوئے کہا۔ حسن کی آنکھوں میں بھی چمک سی اتر آئی۔

"عفیرہ خود بھی اس گڑیا جیسی ہے۔ ہاں اسے ضرور پسند آئے گی۔" اس نے کہا۔ ساتھ ہی اس نے سیلزمین کو اسے پیک کرنے کے لیے کہا۔

"سر! اسے آپ یہیں رہنے دیں' میں آپ کو فریش پیس نکال دیتا ہوں۔" سیلزمین ایک طرف چلا گیا۔ میں اور حسن کاؤنٹر کی طرف آگئے۔ لیکن میں نے گڑیا کو ریک میں واپس نہیں رکھا تھا' بلکہ ساتھ ہی لے آئی تھی اور لا کر کاؤنٹر پر رکھ دیا تھا۔

چند منٹ بعد سیلزمین واپس آیا تو اس نے اس دوسرے کرسٹل پیس کو بھی لا کر کاؤنٹر پر رکھ دیا۔

"یار! تم نے خوامخواہ ٹائم ضائع کروایا' یہ دونوں پیس ایک سے ہیں' اس پہلی والی گڑیا کو ہی پیک کردینا تھا۔" حسن نے سیلزمین سے کہا۔ لیکن میری نظریں ان دونوں گڑیوں کا موازنہ کر رہی تھیں۔

کاؤنٹر کے عین اوپر روشن آرائشی لیمپ کی روشنی ان پر منعکس ہو رہی تھی اور فرق صاف دکھائی دے رہا تھا۔ گو کہ دونوں گڑیا ایک سی تھیں' ہو بہو ایک سی لیکن ان میں ایک فرق تھا' ایسا فرق جو سیلزمین کی لا کر رکھی ہوئی گڑیا کو میری ریک سے اٹھا کر لائی ہوئی کرسٹل کی گڑیا سے زیادہ خوب صورت دکھا رہا تھا۔

"ٹھیک ہے سر! اگر آپ کو یہ ہی پسند ہے تو میں اسے پیک کردیتا ہوں۔" سیلزمین نے حسن کی بات کے جواب میں کہا تھا۔

"نہیں... آپ اسی ڈول کو پیک کریں جسے ابھی آپ نکال کر لائے ہیں۔"

"یہ زیادہ خوب صورت ہے۔" یہ مختصر جملہ میں نے حسن سے کہا تھا۔ میری بات پر حسن نے آنکھیں سکوڑ کر ان کرسٹل پیز کو دیکھا' پھر جھلا کر بولا۔

"دونوں ایک سی ہیں نور! ایک نقطے کا بھی فرق نہیں ہے۔"

"ہاں دونوں ایک سی ہیں' دونوں خوب صورت ہیں' لیکن دوسری ڈول زیادہ اچھی ہے۔ بہتر چیز کی خرابی اس وقت سامنے آتی ہے جب بہترین چیز نظر آئے کیونکہ وہ ریک میں ڈس پلے نہیں ہوئی تھی۔ اس پر گرد کی ہلکی سی تہ بھی نہیں پڑی' نہ ہی ہاتھ در ہاتھ پکڑے جانے سے کرسٹل کی شفاف سطح دھندلائی ہے۔"

حسن چپ چاپ ان ڈولز کو دیکھتا رہا' پھر اس نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں گہری سوچ کی پرچھائیاں ہلکورے لے رہی تھیں۔

"کیا سوچ رہے ہو حسن!" میں نے اس کی خاموشی سے اکتا کر کہا۔

"تمہارے پاس چوائس ہے۔ بہتر چیز اور بہترین چیز سامنے ہو تو بہترین کو چن لینا چاہیے۔ اس کو پیک کردیں۔"

میں نے سیلزمین سے کہا تھا۔

✡ ✡ ✡

میں آفس سے نکل رہی تھی کہ فاروق بھائی کا فون آگیا۔

"تم گھر جانے سے پہلے میری طرف سے ہو کر جانا۔" انہوں نے چھوٹتے ہی کہا۔

"فاروق بھائی! میں آج بہت تھکی ہوئی ہوں' صبح آفس جاتے ہوئے آپ کی طرف کا چکر نہ لگالوں۔" میں نے مضمحل سی آواز میں پوچھا۔ اس سے پہلے کہ فاروق بھائی کوئی جواب دیتے' ان کے پیچھے سے مجھے ماریہ بھابھی کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔

"نہیں... آپ نور سے کہیں' گھر جانے سے پہلے ہماری طرف چکر لگائے۔ آپ بتا دیں نا' ضروری بات کرنی ہے اس سے۔"

"نور بیٹے! تم ادھر سے ہو کر جاؤ' تم سے کچھ کام ہے' صبح عجلت میں بات نہیں ہو سکے گی' کھانا بھی ہمارے ساتھ کھانا۔ بوا جی کو میں فون کردیتا ہوں کہ تمہیں واپسی میں دیر ہو جائے گی۔"

وہ جیسے سب سیٹ کیے بیٹھے تھے۔ ماریہ بھابھی کی بات سن کر میری پیشانی پر بل پڑا تھا' لیکن فاروق بھائی کی بات سن کر کئی بل پڑ گئے۔ لیکن فاروق بھائی کو مثبت جواب دے کر میں نے فون بند کردیا اور موبائل فون کو بے زاری و لاپروائی سے ساتھ والی سیٹ پر اچھال دیا۔

آخر فاروق بھائی جان کو کیا ضرورت تھی ماریہ بھابھی سے ڈکٹیشن لینے کی؟ اس خیال نے میری دن بھر کی تھکاوٹ میں اضافہ کردیا اور مجھے بے پناہ اکتاہٹ محسوس ہونے لگی تھی' کیونکہ میں جانتی تھی ماریہ بھابھی' فاروق بھائی جان کے ذریعے مجھ سے کون سی ضروری بات ڈسکس کروانا چاہتی ہیں۔ انہیں ایک ہی بے چینی لاحق تھی آخر میری اور حسن کی شادی کی تاریخ کیوں فائنل نہیں ہو رہی؟

دس روز سے میری حسن سے تفصیلی بات نہیں ہو سکی تھی۔ وہ اپنے بھانجوں اور دوستوں کے ساتھ ناردرن ایریاز چلا گیا تھا۔ مکان خریدنے کا معاملہ ہنوز کھٹائی کا شکار تھا۔ اب ایسی صورت حال میں شادی کی تاریخ کیسے رکھی جاسکتی تھی۔

فاروق بھائی مجھے برآمدے میں ٹہلتے ہوئے ملے۔ ان کی آنکھوں میں سرخی تھی اور چہرہ ستا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

"کیا بات ہے بھائی! آپ... آپ پریشان لگ رہے ہیں۔" میں نے بغور انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں پریشانی کیسی؟ تم اندر آؤ۔" انہوں نے گڑبڑا کر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

ٹی وی لاؤنج میں ماریہ بھابھی اور عفیرہ دونوں موجود تھیں۔ عفیرہ بھابھی کے گھٹنے پر سر رکھے صوفے پر لیٹی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میرے مسکرا کر سلام کرنے پر وہ دونوں خاموش رہیں' پھر ماریہ بھابھی نے کچھ گڑبڑاتے ہوئے جواب دیا۔

"آؤ... نور! وہاں کیوں کھڑی ہو۔" عفیرہ اسی طرح چپ چاپ مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کے تاثرات کچھ ناقابل فہم سے تھے اور صرف اسی کے تاثرات نہیں ماریہ بھابھی کے تاثرات بھی مجھے چونکا رہے تھے۔

"کیا بات ہے عفیرہ گڑیا! طبیعت ٹھیک ہے میری چندا کی۔" میں نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے پیار سے پوچھا۔ میرا اتنا پوچھنے کی دیر تھی' عفیرہ کی آنکھوں میں تیزی سے پانی جمع ہونے لگا۔ اس نے اپنے لبوں کو بھینچ لیا تھا۔ اگلے ہی پل وہ جھٹکے سے مجھ سے لپٹ گئی اور گھٹ گھٹ کر رونے لگی۔

"عفیرہ... چندا کیا ہوا ہے؟" میں حیران پریشان اس کے بالوں کو سہلانے لگی' ساتھ ہی میں نے فکرمندی سے فاروق بھائی کو دیکھا جو سر جھکائے کھڑے تھے۔

"عفیرہ! پلیز مجھے بتاؤ۔ تمہیں کیا ہوا ہے؟" اس کے یوں رونے پر میں بے حد پریشان ہوگئی تھی۔

"عفیرہ! میں نے تم سے کیا کہا تھا۔" ماریہ بھابھی نے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

"آئی ایم سوری نور! ایکسٹریملی سوری۔" عفیرہ تیزی سے مجھ سے الگ ہوئی اور بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں بند ہوگئی۔

میں ہکا بکا کبھی بند دروازے کو تو کبھی فاروق بھائی

اور بھابھی کو دیکھ رہی تھی۔

"عفیرہ کو کیا ہوا ہے بھائی! بھابھی! مجھے بتائیں۔"

"تم بیٹھ جاؤ نویرا!" ماریہ بھابھی اسی انداز میں جس میں عفیرہ سے مخاطب ہوئی تھیں، مجھ سے کہا۔

"بھائی جان پلیز، مجھے بتائیں کیا ہوا ہے آخر؟ عفیرہ کیوں رو رہی ہے؟ آپ نہیں بتائیں گے؟ میں عفیرہ سے پوچھتی ہوں۔"

"نہیں نویرا۔ عفیرہ سے مت پوچھو.... میں بتاتا ہوں۔" بھائی جان نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا، پھر وہ آہستگی سے چلتے ہوئے میرے قریب آکر بیٹھ گئے۔

وہ جیسے لفظ تلاش کر رہے تھے۔ میرا سارا وجود گویا سماعت بنا بیٹھا تھا۔

"بات یہ ہے نویرا! آج.... منیزہ آئی تھی، اسے حسن نے بھیجا تھا، حسن نے، دراصل عفیرہ کے لیے اپنا پرپوزل بھجوایا ہے۔"

جھکی ہوئی نظریں۔ شرمسار لہجہ۔

میرے دل کو کسی شکنجے نے اس قوت سے جکڑا کہ میرا سارا وجود بے جان سا ہو گیا، میں دم بخود.... ششدر سی بیٹھی رہ گئی۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں، بہت دیر تک منہ سے کچھ بول سکی نہ سانس لے سکی۔

بس چپ چاپ بھائی جان کو دیکھتی رہی۔

"آپ.... کیا کہہ رہے ہیں بھائی جان؟"

"تمہارے بھائی جان بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں نویرا! حسن نے واقعی عفیرہ کے لیے پرپوزل بھجوایا ہے۔ منیزہ بہت شرمندہ ہو رہی تھیں۔ بہت رو رہی تھیں کہ حسن نے انہیں مجبور کیا ہے، لیکن میں نے منیزہ کی بہت بے عزتی کی۔ اگر حسن کی آنکھوں کا لحاظ ختم ہو ہی گیا ہے تو انہیں حسن کا ساتھ دینے کی کیا ضرورت تھی۔ اسے سمجھانا چاہیے تھا۔ نہ کہ منہ اٹھا کر ہمارے گھر آجانا چاہیے تھا۔"

"بھابھی! جھوٹ کہہ رہی ہیں نا بھائی جان۔ آپ.... آپ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہوگی۔" میں نے سنا میری آواز کانپ رہی تھی۔

"ہمیں کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی نویرا! نہ ہی تمہاری بھابھی جھوٹ بول رہی ہیں۔" بھائی جان نے تیزی سے کہا۔ ان کی آنکھوں میں بے بسی بھی تھی اور نمی بھی۔

"مجھے حسن سے ایسے گھٹیا پن کی توقع نہیں تھی، اس نے تو حد ہی کر دی۔ میری بہن کا منگیتر ہو کر میری بیٹی کے لیے رشتہ بھجوا رہا ہے۔ کیا اس کی حرکت کو شرافت کے کسی بھی معیار پر پرکھا جاسکتا ہے؟ اچھا ہوا اس نے منیزہ کو بھجوایا۔ خود آنے کی ہمت کرتا تو اپنے پیروں پر چل کر واپس جانے کے قابل میں اسے ہرگز نہ چھوڑتا۔" آنکھوں میں نمی لیے وہ عالم طیش میں بول رہے تھے۔

"فاروق بھائی! پلیز.... آپ حسن کے بارے میں اس طرح بات نہ کریں۔" یک دم میرا دل اس شکنجے سے آزاد ہوا تھا اور میں نے بے قراری سے کہا تھا۔

"نویرا! تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟" ماریہ بھابھی نے کہا۔ "تم نے سنا بھی ہے تمہارے بھائی جان کیا کہہ رہے ہیں۔"

"بھابھی! آپ غلط بیانی نہ کریں۔"

"نویرا ہوش کرو.... میں یا فاروق کیوں غلط بیانی کریں گے۔ حسن نے سچ مچ منیزہ کو ہمارے پاس بھجوایا یہ کہہ کر کہ وہ عفیرہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ سنا تم نے.... شادی۔" ماریہ بھابھی نے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا تھا۔

"حسن ایسا نہیں کہہ سکتا بھابھی! میں اسے بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے، میرے علاوہ کسی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ پھر عفیرہ.... وہ تو میری بیٹی جیسی ہے۔ حسن اس کے بارے میں کبھی نہیں کہہ سکتا۔ منیزہ آپا کو غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ میں حسن سے پوچھتی ہوں۔" میں تیزی سے دروازہ کی طرف لپکی۔ اسی سرعت سے بھائی جان نے میرا ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔

"نویرا! منیزہ دودھ پیتی بچی نہیں ہے۔ اس نے وہ

ہی کہا جو حسن نے اسے کہنے کے لیے بھیجا تھا۔" وہ پیار سے سمجھا رہے تھے۔

"نہیں.... بھائی جان! ایسا نہیں ہو سکتا، میں مان ہی نہیں سکتی کہ حسن نے ایسا کہا ہوگا۔ آپ مجھے اس سے پوچھ لینے دیں۔"

"اب کیا اس کی منتیں کرو گی؟" بھائی جان نے صدمے سے کہا۔

"میں صرف ثابت کروں گی، اس نے کچھ نہیں کہا۔ ابھی وہ آپ کے سامنے آکر سب سچ بتائے گا۔ مجھے پوچھ لینے دیں اس سے۔"

بھائی جان نے جیسے مجبوراً میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ میں شکر گزاری سے انہیں دیکھتی دروازے کی طرف دوڑی۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں فاروق! نویرا کو روکیں۔ اب کہاں جا رہی ہے اس گھٹیا آدمی کے پاس۔" میں نے اپنے پیچھے بھابھی کو کہتے سنا۔

"جانے دو ماریہ۔ سترہ سال میں حسن نے اس کے گرد گمان کی عمارت کھڑی کی تھی۔ حسن کے لفظ ہی اس عمارت کو گرائیں گے۔ میری بہن کو ابھی بہت اذیت سہنا پڑے گی۔" فاروق بھائی جان کی متاسف آواز نے میرا تعاقب کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

منیزہ آپا کے گھر تک ڈرائیو کر کے میں کس طرح صحیح سلامت پہنچی، میں نہیں جانتی۔ میرے دل و دماغ میں بے یقینی کے جھکڑ چل رہے تھے اور اس کشمکش کے زور سے سارا وجود لرز رہا تھا۔

گیٹ منیزہ آپا کے چھوٹے بیٹے نے کھولا۔

"اسد! تمہارے حسن ماموں گھر پر ہیں؟" اسد نے ابھی گردن کو اثبات میں خفیف سی حرکت ہی دی تھی کہ میں تیزی سے اندر کی طرف لپکی۔

ٹی وی لاؤنج میں گھر کے سب ہی افراد موجود تھے۔ منیزہ آپا کے بچے اور شوہر ٹی وی دیکھ رہے تھے منیزہ آپا دوسرے کمرے سے نکل رہی تھیں۔ انہوں نے نماز کے انداز میں دوپٹہ لپیٹا ہوا تھا اور ان کے ہاتھوں میں جائے نماز تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ ٹھٹک کر رک گئیں، پھر تیزی سے میری طرف بڑھیں۔

"وہاں کیوں کھڑی ہو نویرا! اندر آؤ نا۔" ان کی آنکھیں روئی روئی تھیں، لیکن وہ مسکرانے کی کوشش کر رہی تھیں اور ان کی گھبراہٹ چھپائے نہ چھپتی تھی۔

"حسن کہاں ہے منیزہ آپا؟" میں نے بے قراری سے پوچھا۔

"حسن.... وہ...." وہ گڑبڑا گئیں۔

"آپ فاروق بھائی کے گھر گئی تھیں؟ آپ کیوں گئی تھیں آپا۔ آپ نے ان سے کیا کہا ہے؟ پتا ہے وہ کیا سمجھ رہے ہیں کہ حسن، عفیرہ سے شادی کرنا چاہتا ہے غلط ہے نا منیزہ آپا؟ آپ نے جھوٹ کہا ہے نا؟"

"فاروق بھائی نے غلط بیانی نہیں کی۔ منیزہ آپا کو میں نے ہی ان کے پاس بھیجا تھا، کیونکہ میں تم سے نہیں عفیرہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" اور مجھے یوں لگا جیسے دل کی دھڑکن یک دم تھم گئی ہو۔ میرے اردگرد اتنا سناٹا چھا گیا جیسے میں اس کائنات میں تنہا رہ گئی ہوں۔

میں بے یقین ٹھہری ہوئی آنکھوں سے حسن کو دیکھ رہی تھی جو دوسری منزل کے زینے پر کھڑا تھا اور مجھ سے نظریں چرا رہا تھا۔

میں پتا نہیں کتنی دیر یوں ہی ساکت و صامت کھڑی رہی، پھر حسن آہستگی سے چلتا میرے قریب آیا اور اس نے میرا ہاتھ تھام کر سیڑھیوں کی جانب پیش رفت کی۔

"بس کرو حسن! خدا را بس کرو۔ کیوں کسی کی آہ لے رہے ہو۔" منیزہ آپا نے سسکتے ہوئے میرا ہاتھ چھڑوانے کی کوشش کی تھی، لیکن حسن نے نرمی سے ان کا ہاتھ ہٹا دیا۔

"مجھے نویرا سے بات کرنے دیں منیزہ آپا!" وہ اسی طرح میرا ہاتھ پکڑے مجھے اپنے کمرے میں لے آیا۔ میں ایک تنویمی عمل کے تحت چلتی اس کے ساتھ آگئی

تھی۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور ایک کرسی اٹھا کر میرے سامنے رکھ دی۔

"بیٹھ جاؤ نویرا!" اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"تم میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہو حسن۔" میرے لبوں سے سسکی نکلی تھی۔

"نویرا..." اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ اس نے میرے کندھوں پر اپنی ہتھیلیوں کا ہلکا سا بوجھ ڈال کر مجھے بٹھا دیا' پھر خود بھی بیڈ کے کنارے پر ٹک گیا۔

"پلیز نویرا! اب تم خاموش رہو' مجھے کہنے دو' میں نے بڑی مشکل سے کچھ کہنے کا حوصلہ اکٹھا کیا ہے۔ تم بہت اچھی ہو نویرا! اتنی اچھی عورت... میرا نہیں خیال دنیا میں اور کوئی ہو سکتی ہے۔ تم نے سترہ سال تک میرا بہت ساتھ دیا۔ میرے ہر اچھے برے وقت میں میرا ہاتھ بٹایا۔ تمہاری جگہ اگر میری بیوی ہوتی تو شاید وہ بھی اتنی مستقل مزاجی اور حوصلہ مندی سے میرا ساتھ نہیں دے سکتی تھی' جس طرح سے تم نے دیا اور صرف تم ہی نہیں تمہارے گھر والوں کے بھی مجھ پر بہت احسانات ہیں۔ احسان مندی اپنی جگہ لیکن ان احسانات کا قرض چکانے کے لیے باقی کی ساری زندگی تمہیں خود پہ مسلط نہیں کر سکتا۔"

جھکی ہوئی نظروں اور شرمسار لہجے کے ساتھ اس کے جملے ماؤف ہوتے ذہن کے ساتھ... سن رہی تھی۔

"لیکن... تم کو تو... تمہیں تو محبت تھی مجھ سے۔" میں نے یاد دلانا چاہا۔

"نہیں۔ مجھے تم سے محبت نہیں تھی نویرا! میں جس نویرا سے محبت کرتا تھا اس کی عمر سولہ سال تھی' تینتیس سال نہیں' اس نویرا کے چہرے پر معصومیت تھی' رعنائی تھی' دل فریبی تھی' پختگی نہیں' بے حسی کی حد تک سنجیدگی نے اس کے چہرے کو پتھر نہیں کیا تھا۔ میں نے جس چہرے سے محبت کی تھی۔ وہ ایک جوان چہرہ تھا نویرا! ڈھلتی ہوئی عمر کی کسی عورت کا بے رنگ چہرہ نہیں تھا۔"

"لیکن تم نے کہا تھا' میں بالکل نہیں بدلی... ویسی... ہی ہوں... جیسا تم چھوڑ گئے تھے۔"

"ہاں میں نے کہا تھا' کیونکہ اس وقت تک میں نے عفیرہ کو نہیں دیکھا تھا۔" اس نے میرے اعصاب پر ایک اور حملہ کیا تھا۔

"تمہیں یاد ہے اس روز گفٹ شاپ میں ان کرسٹل ڈولز کو دیکھ کر تم نے کیا کہا تھا؟"

تم نے خود مجھے بہترین کو چننے کی ترغیب دی تھی نویرا! پھر بتاؤ میں تم سے شادی کرنے کی ہامی کیسے بھر لوں؟

جب میں نے ایئرپورٹ پر تمہیں دیکھا تو واقعی سمجھا' وقت تو تم پر تھم چکا ہے' لیکن پھر اگلے روز میں نے عفیرہ کو دیکھا تو میں ٹھٹک گیا۔ عفیرہ کی شکل میں مجھے وہ نویرا نظر آگئی تھی جس کی تصویر میں والٹ میں نہیں اپنے دل میں بھی لے کر گیا تھا۔ وہ نویرا اور تھی' عورت نہیں جسے میں نے ایئرپورٹ پر دیکھا۔ پھر میں نے منیزہ آپا کو منع کر دیا کہ وہ ابھی شادی کی تاریخ کی بات فاروق بھائی سے نہ کریں۔ در حقیقت لاشعوری طور پہ میں خود کو وقت دینا چاہ رہا تھا۔

پھر میں نے تم سے کہا؟ عفیرہ کی طرح ڈارک کلرز پہنو' شاید میں تم پر عفیرہ کا عکس چڑھا کر اپنی تسکین کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اسی روز تم نے کسی بات پر عفیرہ کو ڈانٹ دیا۔ تب تم مجھے پہلی بار بری لگیں' میں نے سوچا تم اپنی ڈھلتی عمر کا بدلہ اس کی شخصیت سے رعنائی ختم کر کے لینا چاہتی ہو' لیکن گھر آکر میں پھر ڈبل مائنڈڈ ہو گیا۔ مجھے تمہاری جدوجہد' تمہاری قربانیاں یاد آنے لگیں۔ دل اور دماغ عفیرہ کی طرح کھینچ رہے تھے۔ ضمیر... ضمیر تمہارا نام لیوا تھا۔

صبح ہونے تک میرے دل و دماغ ضمیر کے سامنے سجدہ ریز ہو چکے تھے' لیکن تمہارے آفس میں جب میں تمہارے نام سے جانا گیا تو مجھے پھر اکتاہٹ محسوس ہونے لگی' مجھے لگا سب سے متعارف کروا کے تم مجھے باؤنڈ کرنا چاہتی ہو۔

لیکن پھر اس گفٹ شاپ میں تمہاری باتیں سن کر جیسے میری ساری کشمکش ختم ہو گئی۔ میں سوچتا تھا میرا دل و دماغ عفیرہ کی طرف کیوں کھنچتا ہے تو مجھے اپنے ہر سوال کا جواب مل گیا۔ تم در اصل ریک میں رکھی گڑیا ہو جس کی چمک ہر گزرتے سال نے کم کر کے بڑھاپے کی پرت جما دی ہے۔ جبکہ عفیرہ! اس کی چمک تم سے بہت زیادہ ہے' اس پر وقت کی گرد نہیں پڑی' نہ ہی ماہ و سال کی مشقت نے اس کی شفاف سطح کو دھندلایا ہے۔

تو میں نے اسی دن طے کر لیا کہ مجھے بہتر چیز کے بجائے بہترین کا انتخاب کر لینا چاہیے۔ اب منیزہ آپا مجھ سے خفا ہیں' تم بتاؤ نویرا! میں نے کیا غلط کیا ہے؟ بہتر چیز اور بہترین چیز سامنے ہو تو بہترین کو چن لینا چاہیے' کیا تم نے نہیں کہا تھا؟"

میرا سر خود بخود اثبات میں ہلنے لگا۔

"لیکن چیز اور انسان میں فرق ہوتا ہے حسن۔" سسکیوں کے بوجھ تلے دبے لفظ بدقت تمام میری زبان سے ادا ہوئے تھے۔

"ایک ہی بات ہے نویرا! بنیادی کلیہ تو وہی ہے۔" حسن نے جھکے ہوئے انداز میں کہا تھا۔

"میں تم سے بہت شرمندہ ہوں نویرا! لیکن ایک بار تم خود کو میری جگہ پر رکھ کر سوچو۔ مجھے تمہاری جیسی کسی بوڑھی ہوتی لڑکی کے بجائے عفیرہ جیسی بھرپور لڑکی کی ضرورت ہے۔ تمہاری سنگت مجھے بھی بوڑھا کر دے گی۔ کبھی میں تھک کر بیٹھ گیا تو تم بھی تھک کر ستانے لگو گی' لیکن عفیرہ جیسی... زندگی کی رعنائیوں سے بھرپور لڑکی مجھے آگے بڑھنے کا شوق دے گی۔ مجھ پر تم نے بہت احسانات کیے ہیں' ایک اور احسان کرنا۔ تم سے شادی نہ کرنے کے فیصلے پر میرے سب اپنے مجھ سے خفا ہو گئے ہیں۔ میری بہنیں' میری بات سننے پر راضی ہی نہیں ہیں۔ ہو سکے تو میرا بھرم رکھ لینا' یہ احسان بھی ساری زندگی یاد رکھوں گا۔"

حسن کے لہجے میں حقیقی شرمندگی تھی۔

☆ ☆ ☆

میں حسن کے کمرے سے نکلی تو میرے وجود سے روح کو پرواز کیے پچیس منٹ گزر چکے تھے۔

حسن بن مدثر نے میری سترہ سال کی ریاضت کو چار دن پرکھنے کے بعد پچیس منٹ میں رد کر دیا تھا۔ (بس اتنی سی تھی میری اوقات) اس نے مجھے رد کر دیا تھا۔ میری محبت کو رد کر دیا تھا۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں چھوڑا تھا حسن نے۔ میں بھرے ہاتھوں کے ساتھ اس سے جواب طلبی کرنے آئی تھی' خالی ہاتھ ہو کر جا رہی تھی۔

مجھے سیڑھیاں اترتا دیکھ کر منیزہ آپا لپک کر میرے پاس آئی تھیں۔ انہوں نے مجھے روکنے کی کوشش کی تھی' لیکن میں کس لیے رکتی۔ اب کیا فائدہ تھا اس بات کا۔

☆ ☆ ☆

بواجی نے سر اٹھا کر دیکھا' پھر سر کے خفیف سے اشارے سے مجھے قریب آنے کے لیے کہا۔ میں چھوٹے چھوٹے مضمحل قدم اٹھاتی ان کے پاس جا کر بیٹھ گئی اور چپ چاپ خالی الذہنی سے ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ میرے اعصاب پر ایک بوجھل سی غنودگی پھیلی ہوئی تھی' جبکہ سارے چہرے پر آنسوؤں کے خشک نشانات کی وجہ سے کھنچاؤ محسوس ہوتا تھا۔

بواجی قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھیں۔ چند منٹ بعد انہوں نے رحل میں رکھے قرآن پاک میں نشانی لگا کر اسے بند کیا اور میرا چہرہ ہاتھوں میں تھام کر میری پیشانی پر دم پڑھ کر پھونکنے لگیں' پھر انہوں نے میرا سر اپنے کندھے سے لگا لیا۔

بواجی کے شانے سے لگتے ہی میرے دل میں ٹھہرا غم پھر سے بہہ نکلا اور سینے میں سسکیاں ڈوبنے ابھرنے لگیں۔

"بس میرا بچہ... بس... مرد کی فطرت میں ہی دغا بازی ہے۔ ناقدرا ہوتا ہے مرد۔ نہ رو نویرا! اپنا حساب اللہ کے سپرد کر دے۔ وہ ہے نا سب کے کھاتے درست کرنے والا۔"

بوا جی مجھے ساتھ لپٹائے دیر تک سمجھاتی رہیں' انہیں خبر نہیں تھی میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت تو کل روح کے ساتھ ہی رخصت ہو چکی تھی۔

اور پھر یہ معمول بن گیا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ میرا غم بڑھتا چلا جاتا تھا۔ بوا جی سارا سارا دن مجھے سمجھانے میں گزارتیں۔ دن تو خیر کسی نہ کسی طرح گزر جاتا رات میرے لیے قیامت ہوتی۔

بھوک پیاس کا احساس رفتہ رفتہ بالکل مٹتا جا رہا تھا۔ بوا جی مجبور کر کے مجھے کھانے کے لیے بٹھاتیں اور میں دیر تک یوں ہی پلیٹ سامنے رکھے بیٹھی رہتی اور ایک بھی نوالہ منہ میں ڈالے بغیر اٹھ جاتی۔

آئینہ دیکھنا میں نے چھوڑ دیا تھا' لیکن کبھی کبھار لاشعوری طور پر میں آئینے کے سامنے جا کر کھڑی ہو جاتی اور دیر تک اپنے چہرے میں بڑھاپے کا سراغ لگانے کی کوشش کرتی رہتی۔

معاً" آئینے کی سطح پر دھواں سا پھیل جاتا اور میرا عکس دھندلا جاتا۔ اور جو عکس نظر آتا اندر کو دھنسی ہوئی سیاہی زدہ آنکھیں' لٹکی ہوئی کمزور جلد' لاغر پن سے جھکے ہوئے کندھے اور ہاتھوں کی لٹکی ہوئی جلد میں سے ابھری ہوئی نسیں۔

میری سسکیاں اور آہیں در و دیوار ہلانے لگتیں۔ میں پوری رات روتی رہتی اور دعا کرتی کہ جب دن طلوع ہو تو میرے اس بے روح' تینتیس برس کے بوڑھے وجود سے زندگی کی رمق ختم ہو چکی ہو۔

لاحاصل محبت۔۔۔ دراصل انسانی وجود کو ایک قبرستان بنا دیتی ہے' جس میں وہ اپنی تشنہ خواہشات اور نامکمل آرزوؤں کی قبریں اٹھائے پھرتا ہے۔

"عفیرہ! تم سے شرمندہ ہے۔" ماریہ بھابھی آئیں تو انہوں نے جتایا۔ "اسے لگتا ہے' جو کچھ تمہارے ساتھ حسن نے کیا' اس کی ذمہ دار وہ ہے۔"

عفیرہ پاگل تھی۔ میری قسمت کی کارگزاری میں اس کا کیا قصور؟

"ہر تیسرے چوتھے ہفتے حسن کی بہنوں میں سے کوئی نہ کوئی آ جاتی ہے' فاروق کے پاس' کہ ہمیں معاف کر دیں' حسن نے جو کیا اس کے لیے ہم شرمندہ ہیں۔ بتاؤ ایسی ہی شرمندگی ہے تو بھائی کے لیے لڑکیاں کیوں دیکھتی پھر رہی ہیں؟ اونہہ۔۔۔ ساری ڈرامے بازی' سب کی سب بڑی ہیں حسن سے۔ کان سے پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی لاتیں اسے یہاں' تو کیا مجال تھی اس کی کہ معافی نہ مانگتا۔ میں تو سچی بات ہے جب بھی ان میں سے کوئی آتی ہے خوب باتیں سناتی ہوں۔ تم اور تمہارے بھائی اللہ جانے کس مٹی سے بنے ہو۔ میں کہتی ہوں نوریہ! اتنا بھی صبر اچھا نہیں ہوتا۔ ایک بار حسن سے جھگڑا کرو' اسے برا بھلا کہہ لو' کم سے کم تمہارا دل ہی ہلکا ہو جائے گا۔"

میں صم' بکم بھابھی کی باتیں سنتی رہی۔ کچھ کہنے کی تمنا تھی' نہ حسرت' میں انہیں سمجھا ہی نہیں سکتی تھی کہ میرے دل میں صبر نہیں تھا سناٹا تھا۔ جو میری رگوں کو چیرتا تھا' وحشت میں مبتلا کرتا تھا' لیکن شور میں نہ ڈھلتا تھا اور اچھا ہی تھا۔ اب شور کر کے کیا اپنے گرد مجمع اکٹھا کرتی۔

"اسی لیے میں بار بار حسن کو بلوانے پر اصرار کرتی تھی۔ پتا نہیں کیوں اس کی طرف سے ہمیشہ میرا دل خدشات کا شکار رہتا تھا اور دیکھ لو' میرے خدشات غلط ثابت نہیں ہوئے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مرد کی ذات بڑی ہی ناقابل بھروسہ ہوتی ہے اور پھر ایسا مرد جو سترہ سال سے تنہا رہ رہا ہو۔"

بھابھی کہہ رہی تھیں میں انہیں بتا نہ سکی' نمل بھی یہی کہتی ہے اور آج سے نہیں ہمیشہ سے' ابھی چند روز قبل آئی تو کہہ رہی تھی۔

"اب تو مان ہی لو نوریہ! کہ مرد بے وفا ہوتا ہے۔" وہ ہر بار آتی اور میرے غم میں شریک ہوتی۔

"حسن کو پہلی بار دیکھتے ہی میں کھٹک گئی تھی۔ وہ جس طرح عفیرہ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جو کچھ تھا' وہ ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ مجھے البتہ حیرانی ضرور ہوئی تھی کہ جو محسوس کر رہی ہوں' وہ تم نے کیوں نہیں دیکھا۔ پھر میں نے سوچا' ضرور مجھے غلط فہمی ہوئی ہو گی۔ سترہ سال کے ریلیشن شپ میں کوئی اتنا بڑا دھوکہ نہیں کر سکتا۔ بلیو می نوریہ! پہلی بار میں نے سوچا کہ میں' جو ہر وقت کہتی رہتی ہوں مرد ناقابل بھروسہ ہوتا ہے تو میں غلط ثابت ہو جاؤں اور مجھے افسوس ہے' میں ہی صحیح ثابت ہوئی۔"

وہ جو ہمیشہ میرے پاس اپنے دکھڑے رونے آتی تھی اب میرے دکھ سنے بغیر ہی مجھ سے ہمدردی جتاتی رخصت ہو جاتی۔ آذر بھی اکثر آ جاتا' لطیفے سنا کر مجھے ہنسانے کی کوشش کرتا۔ اسکول' کالج کے قصے دہرا کر میرا دل بہلانے کی کوششوں میں لگا رہتا۔

دن پر دن گزرتے رہے۔ میں دنیا سے منہ چھپا کر پڑی رہتی۔ آفس جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اس روز میری کولیگ سارہ کا فون آ گیا۔

"تم کہاں غائب ہو نوریہ! تمہیں ذرا بھی اندازہ ہے تمہاری لمبی رخصت [illegible] تمہیں بڑی مشکل میں ڈال سکتی ہے۔ انکوائری والے پہلے ہی کسی ایمپلائی کی ذرا سی غلطی کی تلاش میں ہیں کہ جیسے ہی کوئی کمزوری دکھائے اس پر کیس بنا دیا جائے۔" وغیرہ وغیرہ۔

ناچار اگلے روز سے مجھے آفس جانا پڑا۔ کچھ انکوائری کمیشن کا ڈر' کچھ اس بے روح جسم کی طبعی موت سے پہلے کی کچھ ضروریات تھیں جنہیں بہرحال مجھے ہی پورا کرنا تھا۔ میری بربادی کی داستان کسی نہ کسی طرح یہاں بھی پہنچ ہی چکی تھی' رہی سہی کسر میری اجڑی ہوئی حالت نے پوری کر دی۔

میری شادی کے اچانک ملتوی ہو جانے سے یہاں سب کے ذہنوں میں سوال اٹھ رہے تھے میری بجھی بجھی ہوئی آنکھوں نے سب سوالوں کے جواب دے دیے۔ جنہیں پھر بھی کچھ شبہ رہ گیا تھا براہ راست پوچھنے لگے۔ میں کبھی حوصلہ مندی سے جواب دے دیتی۔ کبھی خاموشی سے ٹال دیتی۔ لیکن جینا اب اور مشکل لگنے لگا تھا۔

بعض اوقات بھرم قائم رکھنا زندگی کا مشکل ترین کام بن جاتا ہے۔ میری زندگی کا یہ مشکل ترین دور تھا۔

☼ ☼ ☼

پھر کب تک کوئی میرے غم میں شریک ہونے کے لیے اپنے اپنے کاروبار زندگی چھوڑ کر بیٹھ سکتا تھا' سب اپنی اپنی زندگیوں میں مصروف ہونے لگے۔ صرف میں تھی جو مصروفیت کے باوجود بولائی بولائی پھرتی۔

پھر ایک روز میں نے بینک کی پارکنگ میں باسط کو دیکھا تو وہیں سے گاڑی واپس موڑ لی۔ اس بھلے آدمی سے مل کر میں اسے آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ جانتی تھی' بینک میں اس کے اتنے واقف کار تھے' کوئی نہ کوئی اسے میرے بارے میں بتا ہی دیتا۔

پھر وہ ہی ہمدردی' پھر وہ ہی تسلیاں اور بالآخر ہمدردی میں اٹھایا ہوا ایک قدم' جو وہ پہلے پسندیدگی میں اٹھا چکا تھا اور یہ ہی نہیں چاہتی تھی۔ آج سے چند سال بعد اگر باسط بھی مجھے وہ ہی کہہ کر چھوڑ دیتا جو حسن نے کہا تھا تو میں کیا کر لیتی۔

غم نے مجھے پاگل ہی نہیں وہمی بھی بنا دیا تھا۔

لیکن باسط کو دیکھ کر مجھے وہ دو' تین مرد اور یاد آ گئے جنہوں نے کبھی نہ کبھی میری طرف پیش قدمی کی کوشش کی تھی اور میں نے انہیں ویسے ہی مایوس کر دیا تھا جیسے باسط کو کیا تھا۔ میں ہمیشہ حسن کی پابند رہی تھی' حتیٰ کہ میں نے اپنے خیالات تک میں کسی دوسرے مرد کو دخل اندازی کی اجازت نہ دی تھی' پھر بھی حسن نے مجھے چھوڑ دیا۔

میں دیر تک سڑکوں پر گاڑی دوڑاتی رہی' پھر گھر آئی تو فاروق بھائی اور ماریہ بھابھی آئے بیٹھے تھے۔ چند ادھر ادھر کی باتوں کے بعد بھابھی نے اصل قصہ چھیڑا۔ وہ بہت چھان پھٹک کر میرے لیے کوئی رشتہ لائی تھیں۔

"میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا' بھابھی! میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔" میں نے دوٹوک کہا۔

"کیوں نہیں کرنا چاہتیں؟" بھابھی نے ترنت پوچھا۔

"اس خود غرض انسان کے لیے کب تک اپنی زندگی برباد کرو گی؟ ابھی تو وقت تمہارے ہاتھ میں ہے' اسے بھی تو پتا چلے اگر اسے تمہاری پروا نہیں تھی تو تمہیں بھی نہیں ہے۔" میں گہری سانس بھر کر رہ گئی۔

"اب یہ ہی دیکھ لو تم تو اس کا جوگ لیے بیٹھی ہو اور وہ محض پانچ مہینوں کے اندر اندر دوسری لڑکی تلاش کر کے آج ہی منگنی بھی کروا رہا ہے۔" بھابھی کی آواز نے جیسے مجھے کسی کنویں میں دھکیل دیا تھا۔

"ماریہ!" بھائی جان نے بھابھی کو خاموش کروانا چاہا' مگر بھابھی بولتی رہیں۔

"پلیز فاروق! مجھے خاموش ہونے کا نہ کہیں تو اچھا ہو گا۔ اسے بھی تو پتا چلنے دیں جس کے لیے اپنی زندگی کے یہ قیمتی سال بھی گنوا رہی ہے۔"

بھابھی بولتی رہیں' میں خلا میں معلق خود کو بچانے کے لیے ہاتھ پیر بھی نہ چلا سکی' پھر اس روز رات گئے دیر تک میں خالی خالی نظروں سے چھت کو گھورتی رہی۔

آج وہ کسی اور کا ہونے جا رہا تھا' اور یہ احساس میرے ایک ایک عضو کو کند آری سے کاٹ رہا تھا۔

اس رات میں پھر آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی' پھر میرا عکس ابھرا۔ ایک بار پھر دھواں پھیلا اور جب چھٹا تو اذیت کی ایک تیز لہر میرے پورے جسم میں گردش کرتی دماغ تک پہنچ گئی' ہوش و خرد سے بے گانہ ہونے سے محض ایک لمحہ پہلے میں نے اللہ سے بڑی شدت سے دعا کی تھی۔

"اے اللہ! اب مجھے قیامت تک بے دار نہ ہونے دینا۔"

☼ ☼ ☼

اسپتال میں پڑے مجھے نواں دن تھا' اس رات نروس بریک ڈاؤن ہونے کی وجہ سے میں اگلے دو روز بے ہوش رہی اور پھر بالآخر زندہ بچ گئی۔ پتا نہیں میرے اعصاب اتنے مضبوط کیسے تھے۔

اسپتال میں میرے پاس عیادت کرنے والوں کا آنا جانا لگا ہوا تھا۔ وہ سب میری ہمدردی میں آ رہے تھے' لیکن میرا دل کسی کی شکل دیکھنے کو نہ چاہتا۔ پھر وہ ہی ہمدردی' پھر وہ ہی ترس' نئی زندگی شروع کرنے کی صلاح اور آخر میں حسن جیسے خود غرض کو بھولنے کی تاکید۔

پھر اسی روز ایک عجیب بات ہوئی' ایسی بات' جس کی شدت سے خواہش مند ہونے کے باوجود میں توقع نہیں کر رہی تھی۔

حسن مجھ سے ملنے اسپتال چلا آیا۔

اس وقت میں کمرے میں تنہا تھی۔ فلک چند گھنٹے بعد آنے کا کہہ کر اپنے گھر گئی ہوئی تھی۔ مسکن ادویات کی وجہ سے میرا ذہن بار بار غنودگی میں چلا جاتا اور بار بار ہڑبڑا کر بے دار ہو تا تھا' معاً اس نیم غنودہ کیفیت میں مجھے کچھ عجیب سا احساس ہوا تو میں نے آہستگی سے آنکھیں کھول دیں اور اگلے ہی پل ہڑبڑا کر سیدھی ہو بیٹھی۔ حسن بیڈ کے پائنتی کی جانب کھڑا بغور مجھے دیکھ رہا تھا۔

میرے ہاتھ پر کینولا کی مدد سے ڈرپ لگی ہوئی تھی' اس طرح اچانک اٹھ کر بیٹھنے سے ہاتھ میں زبردست کھنچاؤ پیدا ہوا اور تکلیف کی تیز لہر میرے سارے بازو میں دوڑ گئی' لیکن تکلیف کے ہر احساس سے بے نیاز ہو کر میں یک ٹک حسن کو دیکھ رہی تھی۔

"تمہاری طبیعت کیسی ہے؟"

میرے پاس اس کے لہجے سے جھلکتی سرد مہری کو محسوس کرنے کی صلاحیت تھی' نہ اس کے سوال کا جواب دینے کے لیے الفاظ کہ میری آنکھوں سے بری طرح آنسو بہنا شروع ہو گئے تھے۔

"اس طرح مت روؤ نویرا!" اس نے مجھے روتے دیکھ کر کہا۔

"تمہارے آنسو' دنیا کی طرح مجھے بھی تمہاری ہمدردی میں ضرور مبتلا کر سکتے ہیں' لیکن تمہارے حق میں قائل نہیں کر سکتے۔"

یک دم اس نے میرے سر پر ہتھوڑا کھینچ مارا تھا۔

"میں نے تم سے گزارش کی تھی نویرا! میرا بھرم رکھ لینا اور تم نے کیا کیا؟ ساری دنیا کے سامنے میرا تماشا لگا کر رکھ دیا۔ میں نے سب کچھ تو تمہیں بتا دیا تھا' سب کچھ سمجھانے کی کوشش کی تھی' مگر تم.... تمہیں شوق ہے سب کی ہمدردیاں بٹورنے کا۔" اس نے آتشی لہجے اور بے زاری سے کہا تھا۔

"مجھے کسی کی ہمدردی نہیں چاہیے حسن! مجھے تم چاہیے ہو۔" میں نے روتے ہوئے کہا۔ "پچھلے پانچ مہینوں سے میں خود کو سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ تم میری قسمت میں نہیں ہو' مجھے تم کو بھولنے کی کوشش کرنا چاہیے' مگر میرا دل نہیں سمجھتا' خدا کے واسطے' میرے ساتھ یوں نہ کرو' مجھے مت نکالو اپنی زندگی سے' مر جاؤں گی میں تمہارے بغیر۔"

میں محض رو نہیں رہی تھی' میں بلک رہی تھی' میں اس کی منتیں کر رہی تھی' یہ دیکھے بغیر کہ حسن کی نظروں میں میرے لیے محبت تھی' نہ ہمدردی' ہاں اکتاہٹ تھی' بے زاری تھی۔

"کوئی کسی کے بغیر نہیں مرتا' بی پریکٹیکل نویرا!" اس نے چٹختے ہوئے کہا۔ "اور رونا بند کرو' تم کوئی ٹین ایجر امیچور لڑکی نہیں ہو کہ کسی کے نہ ملنے پر مرنے جیسی باتیں کرو۔"

"ٹین ایجر نہیں ہوں' امیچور نہیں ہوں' لیکن کیا میرے پاس دل بھی نہیں ہے؟ عمر بڑھ جانے سے کیا دل کی ضروریات ختم ہو جاتی ہیں؟" میں جرح کرنے لگی۔

"دل کی ضرورت ختم ہو یا نہ ہو' لیکن مرد کو صرف عورت کا دل نہیں چاہیے ہوتا' اس کی کچھ اور ترجیحات ہوتی ہیں' کچھ اور ضروریات ہوتی ہیں' جو ایک ڈھلتی عمر کی عورت پوری نہیں کر سکتی۔" یک دم حسن نے ٹھہرے ہوئے سرد اور معنی خیز لہجے میں کہا تھا۔

میں چپ کی چپ رہ گئی' لیکن حسن چپ نہیں ہوا وہ بولتا چلا گیا اور پھر اس نے میرے سامنے وہ ساری تفصیلات بیان کیں جو ان سترہ سالوں میں اس نے بہت چھان پھٹک کر جمع کی تھیں اور جن میں ایشیا خصوصاً" پاکستانی عورت کی ایوریج عمر اور صحت مندی کے متعلق اتنا لمبا ایسا بیان تھا کہ میرا دل چاہا زمین پھٹے اور میں اس میں سما جاؤں۔

"شادی ہی زندگی میں خوشیوں کی علامت نہیں ہوتی' کچھ اور چیزیں بھی ہوتی ہیں۔ میں ابھی ترس کھا کر تم سے شادی کر لوں اور چند سال بعد مجھے اپنے فیصلے پر افسوس ہو تو کیا ہو گا؟ تم ابھی سینتیس سال کی ہو۔ میں تم سے کہوں اگلے کچھ سالوں تک میں فیملی اسٹارٹ نہیں کرنا چاہتا تو.... تو کیا چند سال بعد تم مجھے صحت مند اولاد دینے کے قابل ہو گی؟ یہ سترہ سال تمہیں پتا ہے نویرا! میں نے کس طرح گزارے ہیں۔ میں نے اپنے قدموں کو کسی غلط راستے پر پڑنے نہیں دیا۔ کیا اتنی احتیاط بھری زندگی گزارنے کا صلہ یہ ہے کہ مجھے ایک بوڑھی ہوتی عورت مل جائے اور چند سال بعد جب وہ میری ضروریات پوری کرنے کے قابل نہ رہے تو مجھے غیر اخلاقی راستے تلاش کرنا پڑیں۔ آئی ایم سوری نویرا! سترہ سال تک میری مدد تمہاری اپنی چوائس تھی' میں نے تمہیں کبھی مجبور نہیں کیا تھا۔ اب ان احسانات کے بدلے میں اپنی پوری زندگی نہیں دے سکتا تمہیں۔ چند روز پہلے میں نے منگنی کر لی ہے۔ فاروق بھائی کا خیال تھا۔ وہ مجھے عفیرہ کا ہاتھ نہیں دیں گے تو کوئی اور لڑکی بھی نہیں ملے گی مجھے۔ میں اپنی منگیتر کو ان سے ضرور ملواؤں گا۔ تاکہ ان کا گھمنڈ ختم ہو سکے۔ میں جانتا ہوں میں نے تمہیں بہت ہرٹ کیا ہے۔ لیکن سترہ سال میں نے اپنی بہنوں کی ذمہ داریاں پوری کرنے کے چکر میں اپنی خوشیوں سے منہ موڑے رکھا۔ اب تمہارا احسان چکانے کے چکر میں پھر اپنے دل کی خوشی چھوڑ دوں تو اپنی پسند کی زندگی کب گزاروں گا میں۔ چلتا ہوں امید ہے تم نے کھلے دل اور کھلے ذہن سے سب باتوں کو تسلیم کر لیا ہو گا۔ ٹیک کیئر نویرا!"

دروازہ کھلا پھر بند ہو گیا اور میرے اردگرد سناٹا پھیل گیا۔ پتا نہیں یہ سناٹا زیادہ گمبھیر تھا یا وہ سناٹا جو پہلی بار حسن کے منہ سے اپنے ٹھکرائے جانے کا انکشاف سن کر میرے چاروں جانب پھیل گیا تھا۔

پتا نہیں میں کتنی دیر ایسے ہی بیٹھی رہی۔ میری حالت ایک ایسے انسان کی سی ہو رہی تھی جو کسی بلند عمارت کی سب سے آخری منزل سے منہ کے بل زمین پر گرا ہو' لیکن جسم میں جان باقی ہو اور تکلیف

کی شدت سانس بھی نہ لینے دیتی ہو۔ تب ہی میں نے سنا کوئی میرا نام لے کر پکار رہا تھا۔ میں نے دیکھا' وہ آذر تھا جو میرا سر ہلاتے ہوئے پریشان نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"نوریہ! کیا ہوا ہے تمہیں۔ اس طرح کیوں بیٹھی ہو۔ طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟" مجھے اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ کچھ مطمئن ہوا۔

"فلک نے فون کر کے کہا تھا تمہارے لیے کھانا لے جاؤں؟" اس نے میرے سامنے ٹیبل سیٹ کرتے ہوئے کہا۔

"نوریہ! میں نے ابھی حسن کو جاتے ہوئے دیکھا' اس نے کچھ کہا تم سے؟"

وہ جھجکتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ میری آنکھ سے ایک آنسو تیزی سے بہہ نکلا۔ آذر گہری سانس بھرتا بیڈ کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ کر حسب معمول مجھے سمجھانے لگا۔ وہ ہی سب باتیں دہرانے لگا جو سب سمجھاتے تھے۔

"حسن کو بھول جاؤ' وہ تم جیسی اچھی لڑکی کے قابل نہیں تھا۔ برا وقت جو گزر چکا۔ زندگی میں اور کچھ بھول جاؤ' سب آسان ہے' وغیرہ وغیرہ۔"

میں جو اب تک یہ سوچ رہی تھی اگر حسن کی تھوڑی سی منت سماجت کر لی ہوتی تو یقیناً" وہ مجھے چھوڑنے کا فیصلہ بدل دیتا تو اب میرے پاس ایسی کوئی بھی امید باقی نہیں رہی تھی۔ میں بری طرح لہولہان تھی' اس پر سے آذر کی نصیحتیں.... میرا دماغ بھک سے اڑ گیا اور میں اسی پر برس پڑی۔

"کہنا بہت آسان ہوتا ہے' سہنا مشکل' جسے دیکھو مجھے سمجھانے چلا آرہا ہے' تمہیں کیا پتا آذر ٹھکرائے جانے کی اذیت کیا ہوتی ہے؟ سیلف ریسپکٹ ہرٹ ہوتی ہے تو کیسا لگتا ہے' نمل نے تمہارے ساتھ وہ ہی کیا ہوتا جو حسن نے میرے ساتھ کیا تو میں بھی پوچھتی تم اپنا دکھ کیسے چھپاتے ہو' تم جاؤ یہاں سے آذر' مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں نے ہاتھ مار کر ڈرپ نکال دی۔ ڈرپ اسٹینڈ کر گیا۔ پھر میں بے بس ہو کر خود ہی رونے بیٹھ گئی۔ آذر خاموشی سے بکھرا ہوا سامان سمیٹنے لگا۔

✡ ✡ ✡

اس روز منیزہ آپا کے مکان کی آخری انسٹالمنٹ کا فارم بھرتے ہوئے میری آنکھوں کے کنارے جلنے لگے تھے۔

"اتنی محنت' اتنی جدوجہد کس کے لیے کی تھی میں نے؟"

میری آنکھوں میں جلن بڑھنے لگی تھی' نا صرف آنکھوں کی جلن بڑھ گئی تھی بلکہ سر بھی درد سے پھٹنے والا ہو رہا تھا۔ میں سارہ سے فارم بھرنے کا کہہ کر میز پر سے اپنی چیزیں سمیٹنے لگی۔ گیارہ مہینے کے بعد اب آنسو بہنا بند ہو چکے تھے۔

"نوریہ! تم نے سنا زارا کی منگنی ہو گئی ہے۔ عنقریب تمہیں ٹریٹ دے گی۔" سارہ نے فارم مجھے واپس پکڑاتے ہوئے بتایا۔

"اچھا.... مبارک ہو۔" میں نے زارا کی طرف دیکھتے ہوئے فارم فائل میں لگا دیا۔

"شادی کب تک ہو گی زارا؟" سارہ نے ہی پوچھا۔

"تین سال تک تو ابھی شادی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ عبید کہہ رہا تھا جب تک اس کی ملازمت مستقل ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی بہنوں کی شادی نہیں ہو جاتی' وہ شادی نہیں کرے گا۔" زارا نے تفصیل سے بتایا۔

"تین سال میں اس کی بہنوں کی شادیاں ہو جائیں گی' اس بات کی کیا گارنٹی ہے؟" سارہ نے پھر پوچھا۔

"امید پر دنیا قائم ہے یار!" زارا نے ہنس کر کہا۔ میں بے دھیانی میں اس کا چمکتا ہوا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔ میرا دل چاہا اس سے کہوں کسی مرد پر بھروسہ کر کے دھوکہ مت کھانا۔ مرد اس قابل نہیں ہوتا کہ اس پر بھروسہ کیا جائے۔

"تمہیں بہت مبارک ہو زارا! میں دعا کروں گی اللہ تمہیں بہت خوشیاں دے۔" میں نے پرس کندھے پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"تمہیں کیا ضرورت تھی نوریہ کو میری منگنی کے بارے میں بتانے کی؟" کیبن کی سائیڈ سے نکلتے ہوئے میں نے زارا کی سرگوشی سنی تھی۔

"میرے بارے میں سن کر اس بے چاری کا دل کتنا خراب ہوا ہو گا۔"

میرا دل اور بوجھل ہو گیا۔ یہ ترس اور ہمدردی بھرے جملے جیسے میری جان کا عذاب ہی بن گئے تھے۔ مینیجر صاحب کو اپنے جانے کا بتا کر میں گھر آگئی۔ بوا جی عصر کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تھیں' مجھے اتنی جلدی گھر میں دیکھ کر حیران ہوئیں۔

"آفس میں کام نہیں تھا بوا جی! اسی لیے آگئی۔" میں نے کہا' بوا جی کو اتنے دنوں میں میرے جھوٹ سننے کی عادت ہو گئی تھی۔ اثبات میں سر ہلا کر رہ گئیں۔

"تم بھی نماز پڑھ لو' پھر میں چائے بنا دیتی ہوں۔" میں سر ہلا کر اٹھی اور نماز ادا کر کے لاؤنج میں آ بیٹھی۔ بوا جی کچن میں تھیں۔

میری زندگی عجیب ڈھب پر چل پڑی تھی۔ حسن کو میں یاد نہیں کرتی تھی' البتہ اس کی باتیں بھلائے نہ بھولتیں۔ اچھا لگنے کی تو اب بات ہی نہ تھی۔ عجیب سی سرد مہری مجھے گھیرے رکھتی۔ سر میں درد اتنا رہتا کہ دل چاہتا سر پر پتھر باندھ لوں۔ نیند بھی بمشکل دو یا تین گھنٹے آتی۔ بوا جی کہتیں چلو ڈاکٹر کے پاس چلو۔ لیکن میں جانتی تھی ڈاکٹر کے پاس میرا علاج نہیں تھا جس کے پاس تھا وہ اپنی پسند کے مطابق کم عمر لڑکی سے شادی کر کے اور اپنا گھر بسا کر چین و راحت کی بنسی بجا رہا تھا۔ منگنی کی خبر سن کر میں جس شکست و ریخت کا شکار ہوئی تھی شادی کی خبر سن کر ایسا کچھ بھی نہ ہوا' شاید اس لیے کیونکہ مجھے یقین آچکا تھا جب مرد دل کے جذبات سے زیادہ جسم کی ضروریات کی بات کرنے لگے تو پھر اسے دنیا کی کوئی منت سماجت قائل نہیں کر سکتی۔

بوا جی میرے پاس آکر بیٹھیں تو چائے کے کپ کے ساتھ فرنچ فرائز کی پلیٹ بھی تھی۔ وہ مجھ سے کھانے کے لیے اصرار کرنے لگیں۔ میں نے بھوک نہ ہونے کے باوجود ان کی بات مان لی۔

تب ہی میری نظر ٹیبل پر پڑے اخبارات کے نیچے دبے سنہرے لفافے پر پڑی۔ میری نظروں کے تعاقب میں دیکھتے ہوئے بوا جی نے سر پر ہاتھ مارا۔

"بتاؤ.... یہ تو میں تمہیں دینا ہی بھول گئی۔" انہوں نے لفافہ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔

"تین روز پہلے نمل اپنی شادی کا کارڈ دے گئی تھی۔ یہاں اخباروں میں ہی دبا رہ گیا۔"

"نمل کی شادی کا کارڈ۔" میں حیران ہوئی' میری کئی روز سے اس سے ملاقات نہ ہوئی تھی۔

"آذر اور نمل شادی کر رہے ہیں' کسی نے مجھے بتایا ہی نہیں' پرسوں آذر آیا ہوا تھا' اس نے بھی اشارتاً" ذکر نہیں کیا۔ آناً" فاناً" تو شادی نہیں ہو رہی نا۔"

گیارہ مہینے کی بددلی میں ذرا سی خوشی کی دیا سلائی چمکی بھی تو اس خیال سے فوراً" بجھ گئی کہ وہ دونوں بھی زارا کی طرح اپنی خوشیوں کو میری بد نظری سے بچانا چاہ رہے ہوں گے۔

"تم سے کس نے کہا آذر کی بھی شادی ہے۔ بھئی یہ صرف نمل کی شادی کا کارڈ ہے۔" بوا جی نے بےزاری سے کہا' میں حیران پریشان کارڈ کھول چکی تھی اور ہرے رنگ کے کارڈ پر سنہری حروف میں نمل کے ساتھ لئیق احمد کا نام دیکھ کر میں بالکل دنگ رہ گئی تھی۔

"پچھلے کئی مہینوں سے تم تو دنیا سے کٹ کر بیٹھی ہو نوریہ! تمہیں کچھ بھی نہیں پتا یہ بھی نہیں کہ ساڑھے پانچ ماہ پہلے آذر اور نمل کی منگنی ختم ہو گئی تھی۔ اور اس کے فوراً" بعد نمل نے کہیں اور منگنی کروالی تھی۔

جن دنوں تم اسپتال میں تھیں یہ اس سے کچھ روز پہلے کی بات ہے۔ بے چاری شارقہ تو بہت پریشان رہی۔"

بوا جی مسلسل میرے سر پر انکشافات کے گولے برسا رہی تھیں اور میں ہکا بکا کبھی انہیں' تو کبھی ہاتھ میں پکڑے اس کارڈ کو دیکھتی رہی جس پر چمکتے الفاظ

میں نمل اور لیئق احمد کا نام لکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ہم تو عجیب مشکل میں پھنس گئے ہیں، سمجھ ہی نہیں آرہا، لیئق ماموں کی بھانجیوں کے طور پر شادی میں شرکت کریں یا نمل باجی کی بہنوں کے طور پر۔"

واپسی پر نمل کی چھوٹی بہن مجھے دروازے تک چھوڑنے آئی تھی اور مسلسل چہک رہی تھی۔

"اچھا نویر باجی! آپ نمل باجی کے مایوں میں تو شرکت نہیں کررہیں، لیکن شادی میں تو آئیں گی نا؟"

جس وقت میں اپنی گاڑی کا لاک کھول رہی تھی اس نے مجھ سے پوچھا۔ اسی طرح کے سوال پر میں نمل کو انکار کر آئی تھی، لیکن اس کی بہن کو میں نے گول مول سا جواب دیا اور کار اسٹارٹ کرکے گڑھی شاہو کی تنگ گلیاں عبور کرنے لگی۔

جب میں نمل سے ملنے آرہی تھی تو بے یقین تھی اور واپسی کے اس سفر میں میرا ذہن خالی ہوچکا تھا۔ میرے پاس سوچنے، حیران ہونے یا بے یقین ہونے کے لیے کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ نمل نے میرے ذہن سے ہر سوچ کو کھرچ ڈالا تھا۔

"زندگی میں بعض فیصلے کرنا بہت مشکل ہوتا ہے، تم اندازہ نہیں لگا سکتیں نویر! لیئق سے شادی کا فیصلہ میں نے کس قدر سوچ بچار کے بعد کیا ہے۔"

میرے استفسار پر نمل نے کہا تھا وہ مایوں کے زرد جوڑے میں ملبوس تھی اور جھکی ہوئی نظروں کے ساتھ اچھی خاصی شرمسار دکھائی دیتی تھی۔

"اتنا ہی مشکل تھا تو کیوں کیا یہ فیصلہ؟ تمہیں ذرا بھی اندازہ ہے نمل تم آذر کے ساتھ کتنی ناانصافی کررہی ہو، محبت کرتا ہے وہ تم سے، تمہیں کوئی حق نہیں ہے کہ اس کے ساتھ ایسا کرو۔" میں نے بے حد غصے میں کہا تھا۔

"نویر! اس انداز میں تو آذر نے بھی مجھ سے سوال نہیں کیا، جس طرح تم کررہی ہو۔" نمل نے تعجب سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں تم سے اس لیے پوچھ رہی ہوں کیونکہ میں اس کیفیت سے گزری ہوں جس سے آذر گزر رہا ہوگا؟ رد کیا جانا کتنا تکلیف دہ عمل ہوتا ہے، تم نہیں سمجھ سکتیں، لیکن میں جانتی ہوں، خدارا آذر کے ساتھ وہ نہ کرو جو حسن نے میرے ساتھ کیا۔" میں نے اس کے سامنے گڑگڑاتے ہوئے کہا تھا۔

"پلیز مجھے حسن کے ساتھ کمپیئر مت کرو۔" نمل نے درشتی سے کہا۔

"میں آذر کے ساتھ وہ نہیں کررہی جو حسن نے تمہارے ساتھ کیا۔ میرا اور آذر کا کیس تو تمہارے معاملے سے بالکل مختلف ہے، تمہیں شاید یہ نہیں پتا کہ آذر نے مجھے اپنا راستہ الگ کرنے کی اجازت خود دی ہے۔ ہم نے ہنسی خوشی ایک دوسرے کو منگنی کی انگوٹھیاں واپس کی تھیں اور تمہیں تو شاید یہ بھی نہیں پتا کہ آذر کی جائیداد اور اس کی ساری پراپرٹی پر اس کے چچا کے بیٹے قبضہ کرچکے ہیں اور وہ بالکل کنگال ہوچکا ہے۔"

نمل نے ایک ساتھ میرے سر پر انکشاف کے دو گولے برسائے تھے۔

"تو کیا تم نے آذر سے اس کی دولت اور روپے پیسے کے لیے محبت کی تھی؟" چند منٹ بعد میں نے صدمے کی کیفیت میں پوچھا۔

"نہیں۔" وہ گہری سانس بھر کر بولی۔ "میں نے اس کی دولت کے لیے محبت نہیں کی تھی، لیکن میرے لیے وہ ایک پرفیکٹ چوائس ضرور تھا۔ خوش شکل، باکردار اور دولت مند، اس میں ایسی کوئی خامی نہیں تھی کہ اس سے محبت نہ کی جاتی۔ اسی لیے میں نے اس سے محبت کی، لیکن اب میں سوچتی ہوں نویر! صرف محبت کی خاطر تو میں اسے خود پر مسلط نہیں کرسکتی۔ اس جیسے کنگلے کے ساتھ رہتے ہوئے کل کو جب مجھے اپنی چھوٹی چھوٹی ضروریات کے لیے ترسنا پڑے گا تو میں کیا کروں گی اس محبت کا۔" بے حد بے درد لگی تھی وہ اس وقت مجھے۔

"محبت صرف نہیں ہوتی نمل!" میں نے دکھ سے

کہا تھا۔

"محبت پھر کیا ہوتی ہے؟" نمل نے دوبدو کہا۔ "میں تمہیں بتاؤں نویر! محبت اس دنیا کی سب سے بے کار چیز ہے، محبت آپ کا پیٹ نہیں بھر سکتی، بیماری میں دوائی نہیں دے سکتی، کسمپرسی میں سر پر چھت فراہم نہیں کرسکتی۔ اچھے کپڑے، اچھی ضروریات زندگی نہیں دے سکتی، پھر کیا فائدہ ہے ایسی محبت کا؟" اس نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

"اگر محبت اتنی ہی بے کار چیز ہوتی ہے تو اتنے عرصے سے تم آذر کو محبت کے نام پر دھوکہ کیوں دے رہی تھیں۔"

"نہیں دھوکا نہیں دیا میں نے۔ مجھے سچ مچ آذر سے محبت ہے سچی اور خالص محبت۔ اس کا دل دکھانے کے خیال سے مجھے بھی تکلیف ہوتی ہے لیکن پیسہ محبت سے بھی زیادہ ضروری ہوتا ہے وقتی طور پر نہیں ساری زندگی کے لیے۔ جب اس نے مجھے بتایا کہ اس کی پراپرٹی پر اس کے چچا کے بیٹوں نے قبضہ کرلیا ہے تو میں نے سوچا۔ اس کے پاس ایک زبردست ملازمت تو ہے۔ کسی ملٹی نیشنل کمپنی کی اتنی اچھی پوسٹ پر ہونا کوئی معمولی بات نہیں ہوتی لیکن اپنی عقل کے ہاتھوں اس نے وہ پوسٹ بھی گنوادی۔ میں نے اس سے کہا تھا باورچی مت بنو لیکن اس نے میری ایک نہیں مانی۔ کمپنی نے اسے ہٹادیا کیونکہ اس سے ان کی گڈول متاثر ہوتی تھی۔ اور آذر یہ رول جانتا تھا پھر بھی اس نے یہ کیا۔"

"ٹھیک ہے میں تمہارا سارا پوائنٹ آف ویو سمجھ گئی۔ دولت کبھی بھی آسکتی تھی لیکن محبت۔ تمہیں آذر ہمیشہ بہترین لگتا تھا نمل۔" میں نے تیزی سے یاد دلایا۔

"ہاں وہ مجھے بہترین لگتا تھا تب تک جب تک میں لیئق سے نہیں ملی تھی۔" اس نے تحمل سے کہا۔ "میں نے ایک بات بہت بچپن میں سیکھ لی تھی نویر! زندگی جب بھی آپ کو دو چیزوں میں سے ایک چیز چننے کا موقع دے تو وہ چیز چننا چاہیے جو Excellent (بہترین) ہو۔ آذر میرے لیے بہتر تھا لیکن لیئق Excellent ہے ہاں ٹھیک ہے اس کے پاس آذر کی طرح اچھی شکل و صورت نہیں ہے لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے شکل و صورت کو تو ایک نہ ایک دن ڈھلنا ہی ہوتا ہے۔ لیئق کے پاس دولت ہے، کاروبار ہے۔ وہ میری ہر خواہش پوری کرسکتا ہے۔ میں آذر پر کمپرومائز کیوں کروں جبکہ میں لیئق کو چن سکتی ہوں۔

تمہیں پتا ہے نویر! میں بہت بار ڈبل مائنڈڈ ہوئی ہوں دل اور ضمیر آذر کی طرف جھکتے تھے لیکن دماغ۔۔۔ دماغ نے ہر بار لیئق کو چنا پھر میں ایک روز اس کے ساتھ مارکیٹ گئی لیئق نے کہا میں اس کی طرف سے کوئی تحفہ لے لوں۔ میں نے شرارت میں اسے وہ بریسلیٹ خرید کردینے کے لیے کہہ دیا جس کے لیے ایک مرتبہ آذر مجھے انکار کرچکا تھا کیونکہ وہ بہت مہنگا تھا لیکن تمہیں پتا ہے نویر! کیا ہوا؟ لیئق نے بنا کسی اعتراض کے وہ بریسلیٹ مجھے خرید دیا۔ بس اسی وقت میں مطمئن ہوگئی اور میں نے لیئق کے حق میں فیصلہ کرلیا۔ وہی میرے لیے بہترین تھا کیونکہ اس کی دولت دن بہ دن بڑھ رہی تھی گھٹ نہیں رہی تھی آذر کی طرح۔"

مجھے بے اختیار حسن یاد آیا۔

"تم دراصل ریک میں رکھی گڑیا ہو نویر! جس کی چمک ہر سال کم ہورہی ہے جبکہ عفیرہ کی چمک تم سے چالیس نہیں پچاس گنا زیادہ ہے۔"

"دولت کی اہمیت اور چمک، وجاہت کے مقابلے میں ہمیشہ زیادہ ہوتی ہے۔" مجھے خاموش پاکر نمل نے دوبارہ کہا۔

"لیکن محبت سے زیادہ تو نہیں ہوتی پھر دولت ایک "چیز" ہے انسان ایک "وجود" زندہ، سانس لیتا۔ چیز اور انسان میں فرق ہوتا ہے نمل!" میں نے وہی کہا جو حسن سے کہہ چکی تھی۔

"لفظوں کو جیسے بھی توڑ مروڑ لو، بات تو ایک ہی ہے۔" اس نے بھی وہی جواب دیا جو حسن نے دیا تھا۔

"تمہیں نہیں لگتا تمہارے بغیر آذر کی زندگی بہت

مشکل ہو جائے گی۔"

"اوہ۔ کسی کی زندگی کسی کے بغیر مشکل نہیں ہوتی۔ آذر میچور ہے' ٹین ایجر تو نہیں کہ غم دل سے لگا کر بیٹھ جائے۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"اس کے پاس دل تو ہے نا نمل!" وہ اور ہنسی۔

"تم جانتی ہو نویر! میں نے اپنی زندگی کتنی محتاط ہو کر گزاری ہے' خوب صورت عورت کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا' وہ جو چاہے کر سکتی ہے' جو راستہ چاہے اختیار کر سکتی ہے لیکن میں نے دولت کے حصول کے لیے بھی کوئی غلط راستہ اختیار نہیں کیا۔ اتنی احتیاط بھری زندگی گزارنے کا صلہ یہ ہے کہ میں شادی کے بعد بھی محرومی کی زندگی گزاروں۔ روپیہ روپیہ خرچ کرتے ترسوں اور جب تھک ہار جاؤں تو کوئی غیر اخلاقی راستہ اختیار کروں۔ نہیں نویر! مجھے اس راہ پر نہیں چلنا تھا تب ہی ساری بات آذر کو بتا دی اور اس نے مجھے بہ خوشی لئیق سے شادی کرنے کی اجازت دے دی۔"

"اس کا مطلب تم نے آذر کو ہمیشہ ایک آپشن سمجھا۔" میں نے اس کے پلنگ سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ نمل نے بولنا چاہا لیکن میں نے ٹوک دیا۔

"وہ خوش شکل' دولت مند تھا پھر تم سے محبت کرتا تھا تم نے سوچا اس کا ساتھ اپنا کر تمہارا مستقبل محفوظ ہو گا۔ تب ہی تم اس کی پیش قدمی کا مثبت جواب دیتی رہیں لیکن جوں ہی زندگی نے ایک دوسرا آپشن تمہارے سامنے لا کر رکھا تو تم نے بہترین اور پرفیکٹ کو چن لیا۔ تم نے کہا تھا نمل! میں تمہیں حسن سے کمپیئر مت کروں لیکن کیا فرق ہے تم میں' اور حسن میں۔ اس نے مجھے چھوڑ دیا اور تم نے آذر کو۔" میں سرد مہری سے بول رہی تھی۔

"تم ابھی تک حسن کی طرف سے ملے صدمے کے زیر اثر ہو نویر! اسی لیے تمہیں ہر کسی کے عمل میں حسن کے طرز عمل کی جھلک نظر آتی ہے۔" اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے کہا۔

"یقیناً" حسن بھی اسی طرح مطمئن رہتا ہو گا۔" میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"تم تو ہمیشہ کہتی تھیں نویر! مرد بے وفا ہوتا ہے' جب حسن نے مجھے چھوڑا تو مجھے تمہاری بات پر یقین آ گیا تھا لیکن آج میں الجھ گئی ہوں۔ تم تو مرد نہیں ہو نمل! پھر تم نے آذر کے ساتھ بے وفائی کیوں کی؟ کیا آج تمہارے پاس اس سوال کا جواب ہے کہ مرد بے وفا ہوتا ہے یا عورت؟"

پھر نمل مجھے آوازیں دیتی رہ گئی لیکن میں ایک پل کے لیے بھی وہاں نہیں رکی۔ میرا دل و دماغ ہر سوچ سے خالی ہو چکا تھا۔

لیکن جب یہی سوال میں نے آذر سے پوچھا تو وہ ہنسنے لگا اس کی ہنسی سے اس دکھ کی آنچ آئی تھی جو نمل نے اسے پہنچایا تھا۔

"مرد بے وفا ہوتا ہے نہ عورت' دراصل بے وفا انسان ہوتا ہے۔" آذر نے میرے ساتھ برآمدے کی سیڑھیوں میں بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

"جس انسان کی ترجیحات جس قدر مادیت پر مبنی ہوں گی' وہ اتنا ہی بڑا دھوکہ باز ہو گا۔ وہ دوسرے سے اتنی ہی بڑی بے وفائی کرے گا۔ جب نمل کہتی تھی "مرد بے وفا ہوتا ہے" میرے پاس تب بھی اس کے سوال کا جواب موجود ہوتا تھا لیکن دقت یہ تھی کہ وہ سوال نہیں کرتی تھی۔

اپنی Authentic (مستند) رائے دیتی تھی کیونکہ اس کے باپ نے اس کی ماں سے بے وفائی کی تھی۔ میرے ساتھ ایک عورت نے دھوکا کیا ہے تو کیا میں ساری عورتوں کو فریبی ماننا شروع کر دوں۔ نہیں یار! یہ تو درست طرز عمل نہیں ہے اگر ہم انسان اسی طرح سوچنے لگے تو امید تو دنیا سے ختم ہی ہو جائے گی۔ کسی نہ کسی سے دھوکہ کھا کر ہمارے سینوں میں پتھر فٹ ہو جائیں گے اور پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے کے بھی روادار نہ رہیں گے۔

بچپن میں' میں نے ایک فکشن مووی دیکھی تھی جس میں روبوٹس بنا کر ان کے سینوں میں اصل دل لگا دیا جاتا ہے جبکہ انسانوں کے سینوں سے دل نکال کر وہاں مشینری فٹ کر دی جاتی ہے۔ یہ روبوٹس اور

انسان ایک ہی دنیا میں قیام کرتے ہیں لیکن معاملہ سارا الٹا ہو جاتا ہے۔ روبوٹس کے پاس چونکہ اصلی دل ہوتا ہے اس لیے وہ انسانوں کی طرح سوچنے لگتے ہیں اور عمل کرنے لگتے ہیں جبکہ انسان' جو ان روبوٹس سے تعداد اور طاقت دونوں میں زیادہ ہوتے ہیں مشینری بن جاتے ہیں اور ان اصل دل والے روبوٹس پر قابو پا لیتے ہیں حکومت کرنے لگتے ہیں ایک وقت ایسا آتا ہے جب روبوٹس دل برداشتہ ہو کر دنیا چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور دنیا پر صرف انسانوں کی حکومت باقی رہ جاتی ہے۔

جب میں نے مووی دیکھی تھی تو سوچا تھا کس قدر احمقانہ خیال پیش کیا گیا ہے اس فلم میں' لیکن جوں جوں میں عمر کی منازل طے کرتا گیا مجھ پر مووی کا اسپیکٹ واضح ہوتا چلا گیا اور مجھے پتا چلا میرے اردگرد کئی ایسے انسان بستے ہیں جو بظاہر انسان کا وجود ضرور رکھتے ہیں لیکن دل کی جگہ ان کے سینوں میں مشینری فٹ ہے وہ جذبات کے بجائے ضروریات پر دھیان دیتے ہیں۔ میں ایسا انسان نہیں بننا چاہتا تھا تو [illegible] خاموشی سے نمل کے راستے سے ہٹ گیا میں نے سوچا۔ میں نہ سہی وہ تو خوش رہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ میں باقی ساری زندگی اس کا جوگ لے کر گزاروں گا۔ اس نے میری' میرے جذبات کی قدر نہیں کی لیکن مجھے خود تو اپنی قدر کرنا چاہیے۔ نمل اس قابل نہیں تھی کہ میں اس پر اپنے خالص جذبے نچھاور کرتا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح حسن تم جیسی اچھی لڑکی کے قابل نہیں تھا۔"

اس نے بڑی سہولت سے بات موڑ دی میں اس کی باتیں سن کر بے آواز رو رہی تھی۔ آذر نے میرا ہاتھ نرمی سے پکڑ لیا۔

"بس کرو۔ تمہارے آنسو بہت قیمتی ہیں' اسے کسی ایسے شخص کے لیے ضائع مت کرو جس نے تمہارے دل کی قدر و قیمت نہیں پہچانی۔"

"میں صرف اپنے لیے نہیں۔ ہم دونوں کے لیے رو رہی ہوں۔" میں نے کہا۔

"میرے لیے کس خوشی میں۔۔۔؟" آذر نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

"میں نے تو اپنے آنسو ضائع نہیں کیے' اپنی اتنی اچھی دوست کے آنسو کیسے ضائع ہونے دوں۔" اس نے میرے آنسو اپنے ہاتھوں سے پونچھ دیے۔

"آئی ایم سوری آذر! اس روز ہسپتال میں میں تم پر ناحق برسی۔ مجھے نہیں پتا تھا جب مجھ سے اپنا صدمہ سنبھالا نہیں جا رہا تھا تم بھی اسی کیفیت سے گزر رہے ہو۔ تم بہت باحوصلہ ہو آذر! کاش میں بھی ہوتی۔" میری آنکھوں میں آنسو ابھی بھی نہیں رکے تھے۔

"چلو چھوڑو نا اتنی پرانی بات کو۔" آذر نے لاپروائی سے کہا۔ "جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب کب تک ہم اپنی باتوں کا افسوس کریں گے۔"

"آذر ایک بات سچ سچ بتانا تم سچ مچ نمل کی بے وفائی بھول چکے ہو یا برداشت کر گئے ہو۔ کیا تمہیں دکھ نہیں ہوا؟" میں دل میں آیا سوال زبان پر لانے سے روک نہ سکی۔

"اب جب کچھ تمہیں پتا چل ہی چکا ہے تو اس معاملے میں جھوٹ بول کر کیا کروں گا یار نویر! انسان ہوں میں' جب نمل نے مجھے اپنا فیصلہ سنایا کہ اب ہم ساتھ نہیں چل سکتے تو وہ رات میرے لیے بہت مشکل تھی پہلے ہی پراپرٹی کیس اور ملازمت سے برطرفی کی خبر نے مجھے پریشان کر رکھا تھا اس پر سے نمل کا فیصلہ۔۔۔ وہ رات واقعی بہت مشکل تھی لیکن اس رات سے صبح بیدار ہونے تک میں خود کو سمجھا چکا تھا کہ نمل جیسی مادی چیزوں کو اہمیت دینے والی لڑکی میرے جذبوں کے قابل نہیں تھی۔

ہمارے تعلق کو ختم ہوئے اتنے دن گزر چکے۔ کبھی کبھی نمل یاد آ بھی جاتی ہے ممکن ہے آئندہ زندگی میں بھی آئے لیکن اس کے لیے نہیں روؤں گا۔

میری نصیحت اپنے پلو سے باندھ لو۔ خود غرضوں کے لیے اپنی زندگی برباد کرنا نری حماقت ہے۔ اچھا تم

بیٹھو میں چائے لاتا ہوں اور چائے پیتے ہوئے ہم ان دونوں کو ہرگز یاد نہیں کریں گے کوئی اچھی بات کریں گے۔"

وہ میرا سر تھپتھپا کر کچن کی طرف چلا گیا اور میں، میں وہیں بیٹھی رہی۔ میرے دل میں عجیب طرح کا سناٹا پھیلا ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

چند ہفتوں کے بعد آذر ایک شام میرے پاس آیا۔ یہ ایک خوش گوار شام تھی، ہوا سبک ہو کر چل رہی تھی میں موسم سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اپنے گھر کے چھوٹے سے باغیچے کو پانی دینے لگی تھی اور ساتھ ساتھ ٹینا ثانی کی غزلیں سننے کا کام بھی جاری تھا۔

تقریباً" سال بھر کے بعد میری زندگی معمول پر آنا شروع ہو گئی تھی۔ حسن کے ہاتھوں زخم کھا کر بالآخر مجھے صبر آگیا تھا۔ لیکن میں آپ کو بتاؤں "صبر کرنے" اور "صبر آجانے" میں بہت فرق ہوتا ہے اپنے دل پر جبر کر کے اپنا حوصلہ آزما کر چپ سادھ لینا اول الذکر جبکہ رو دھو کر، اپنا غم منا کر آنکھوں میں آنسوؤں کی قلت ہو جانے کے بعد خاموشی اختیار کر لینا موخر الذکر کے زمرے میں آتا ہے۔

صبر کوئی کوئی "کرتا" ہے۔
صبر ہر ایک کو "آ" جاتا ہے۔

آذر نے کیا وہ صبر تھا اور مجھے صبر آگیا تھا۔ وقت نے میرے دل پر حوصلہ مندی اور برداشت کی پرت چڑھا دی تھی۔ بہرحال آذر آیا تو بے حد خوش تھا۔

"میرے پاس دو خوش خبریاں ہیں۔ پہلے کون سی سناؤں؟"

"پہلی دوسری کا کیا سوال ہے، دونوں اکٹھی سنا دو۔" میں نے پانی کی پتلی دھار سے سرسبز پودوں کے چہرے دھوتے ہوئے دلچسپی سے کہا۔

"ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔" آذر نے کہا۔

"پہلی خوش خبری یہ ہے کہ شہباز چچا کے بیٹوں کے ساتھ میری سیٹل منٹ ہو گئی ہے، وہ میری پراپرٹی پر سے قبضہ چھوڑ رہے ہیں اور دوسری خبر یہ ہے کہ میں شادی کر رہا ہوں۔"

"اچھا... مبارک باد... دونوں ہی اچھی خبریں ہیں۔ مٹھائی کہاں ہے؟"

"مٹھائی تو امی لے کر آئیں گی۔"

"شارقہ خالہ سے کہنا، لڑکی کی تصویر بھی لے کر آئیں۔" میں نے تندہی سے پودوں کو پانی دیتے ہوئے کہا۔

"اپنی تصویر دیکھ کر کیا کرو گی؟" آذر نے کرسی پر جگہ سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

"کیا مطلب...؟ کس سے شادی کر رہے ہو تم؟"

"تم سے۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ پلاسٹک کا پائپ پکڑا ہوا میرا ہاتھ تھم گیا۔

"میں تم سے تین سال بڑی ہوں آذر۔" میں نے سادگی سے کہا۔ پائپ کو [illegible] سا جھٹکا دینے کی وجہ سے دوسرا سرا پانی کے نل سے الگ ہو گیا اور پانی بے تحاشا [illegible] کی صورت میں برآمدے کے فرش کو بھگونے لگا تھا۔ میں پائپ کیاری میں رکھ کر سرعت سے نل کی طرف لپکی۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" میں نے آذر کی آواز سنی تھی۔

"فرق پڑتا ہے آذر! اگر تم غور کرو تو... تین سال بڑی ہونے کا مطلب ہے کہ میں تم سے تین سال پہلے بوڑھی ہو جاؤں گی۔" میں نے پائپ کا سرا نل سے منسلک کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

آذر نے بے ساختہ قہقہہ لگایا تھا۔

"جب بوڑھی ہو گی تو دیکھا جائے گا ابھی تو بوڑھی نہیں ہو۔ پھر میں کسی بھی لڑکی سے شادی کروں گا۔ بوڑھی تو ایک نہ ایک دن اس نے ہو ہی جانا ہے تو کیا اس ڈر سے شادی ہی نہ کروں؟" اس نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

"تم مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتیں تو اس کے لیے کوئی اسٹرانگ ریزن دو۔ اوٹ پٹانگ نہ ہانکو۔"

"آذر..." میں نے لاچاری سے کہا۔ ایک تو پائپ لگ نہیں رہا تھا۔

دوسرے آذر کی بات نے مجھے تذبذب میں مبتلا کر دیا تھا گو کہ میں جانتی تھی جلد یا بدیر آذر مجھے پرپوز ضرور کرے گا لیکن ایک بھی بار میں نے اس بات پر غور نہیں کیا تھا کہ مجھے آذر کو کیا جواب دینا چاہیے۔

"حسن جیسے ناقدرے شخص کا جوگ لے کر مجھے ریجیکٹ کرو گی تو بہت برا کرو گی۔ میں بتا دوں میں ہزاروں نہیں لاکھوں میں ایک ہوں۔ ایک نہیں چار ٹیوب لائٹس لے کر ڈھونڈو گی تب کہیں جا کر ملوں گا۔ نمل نے میری قدر نہیں کی۔ تم تو کرو۔" آذر نے غیر سنجیدگی سے کہا تھا۔

"پلیز ان دونوں کا ذکر نہ کرو۔" میں نے جھنجلا کر پائپ کا سرا پھینک دیا۔ اتنی سی دیر میں پانی کے چھینٹوں نے مجھے اچھا خاصا بھگو دیا تھا۔

"تم شادی کے لیے [illegible] بھی تو [illegible] میں ان کا ذکر نہیں کروں گا۔" آذر نے سادگی سے کہتے ہوئے آگے بڑھ کر نل کا بند کر دیا۔ پانی کی تیز بوچھاڑ کا شور اچانک تھم گیا تھا۔ آذر نل کے قریب پنجوں کے بل بیٹھ کر پائپ کا سرا نل کے منہ سے جوڑنے لگا۔

"زندگی میں کچھ کام مشکل نہیں ہوتے اپنی کم فہمی کی وجہ سے ہم انہیں مشکل بنا دیتے ہیں۔" اس نے پائپ کے سرے کو نل سے جوڑ کر اس پر رسی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا باندھتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی مسکرا کر مجھے دیکھا۔

"میں نے پہلے بھی کہا تھا جس انسان نے تمہاری قدر نہیں کی اس کی یاد کو بھی اپنی زندگی سے نکال دو۔ اب جلدی سے بتاؤ مجھ سے شادی کرنا ہے کہ میں کوئی اور لڑکی تلاش کروں۔" یکدم اس نے پینترا بدلتے ہوئے احسان کرنے والے انداز میں پوچھا۔ میں اس کی بات دھیان سے سن رہی تھی۔

"اب اتنا اصرار کر رہے ہو۔ شادی کے لیے ہامی تو بھرنی پڑے گی۔" میں نے بھی احسان کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن تم کو مجھ سے ایک وعدہ کرنا پڑے گا شادی کے بعد تم مجھے خود سے بڑا ہونے کا طعنہ نہیں دو گے نہ ہی مجھے آپا کہو گے۔"

"پیار سے تو کچھ بھی کہنے کی اجازت ہو گی نا؟" اس نے کان کھجا کر پوچھا اس سوال کا جواب میری بھرپور ہنسی تھی۔ آذر نے ہنسنے میں میرا ساتھ دیا تھا۔

"ہم دونوں پر جو گزری وہ ایک سی مصیبت تھی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میں نے کسی کو خبر ہی نہیں ہونے دی کہ میں کس بری طرح ٹوٹ کر بکھرا ہوں لیکن ہم دونوں ایک دوسرے کے دل کی حالت سے باخبر ہیں دونوں ایک طرح سے ٹوٹ کر بکھرے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کا حوصلہ اور سہارا بنیں گے تو ایک بھرپور زندگی ہمارا استقبال کرے گی —

ان شاء اللہ"

آذر نے میرے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے پرعزم لہجے میں کہا تھا۔ احساس تشکر سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے کیونکہ میں جانتی تھی۔ آذر کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں تھی محض میری خاطر وہ اتنی جلدی شادی کا فیصلہ کر رہا تھا۔ مجھے اس سے دوستی پر فخر

محسوس ہو رہا تھا۔ اور نمل پر ترس آرہا تھا جس نے لئیق جیسے شخص کی دولت کے لیے آذر کو ٹھکرا دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

سنا ہے جوڑیاں آسمانوں پر بنتی ہیں؟ پہلے پہل مجھے اس بات پر یقین نہیں تھا لیکن آذر سے شادی کے بعد یقین آگیا ہم دونوں نے اپنی اپنی زندگیوں کے بہترین سال جن لوگوں کے لیے برباد کیے تھے۔ وہ دونوں ہماری قسمتوں میں نہیں تھے۔ اللہ نے آسمان پر ہماری قسمتوں کے فیصلے کرتے ہوئے دو بہترین انسانوں کو ہم دونوں کے لیے چنا تھا۔ اللہ نے ہم دونوں کو ایک دوسرے کے لیے چنا تھا۔ ہاں ہمارے حصے کی کچھ آزمائشیں تھیں جن کو بہرحال ہمیں سہنا ہی تھا اور ہم نے سہہ بھی لیں۔

آج میں اور آذر کامیاب ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں ہماری اتنی اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہے۔ ایسی زبردست ذہنی ہم آہنگی ہے کہ عمر کا فرق کبھی مسئلہ نہیں بنا۔ آذر کی پراپرٹی اسے واپس مل چکی ہے شادی کے کچھ عرصے بعد ہی اس کی پرانی ملازمت پر اسے بحال کر دیا گیا تھا۔ پارٹ ٹائم میں وہ اپنی شیف والی جاب بھی کرتا رہا آج کل آذر اپنے ذاتی ریسٹورنٹ کی اوپننگ کی تیاریاں کر رہا ہے۔ ان چھ سالوں میں اللہ نے ہمیں تین صحت مند بچوں سے نوازا۔ میں خود کو پہلے سے زیادہ انرجیٹک (توانا) محسوس کرتی ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ میں پہلے سے زیادہ خوب صورت ہو گئی ہوں۔

حسن کے خدشات شادی کے اولین دنوں میں مجھے پریشان رکھتے تھے لیکن پھر یہ خدشات اپنی موت آپ مر گئے۔ میرے تین بچے اس کے "واہیات خیالات و خدشات" کی تردید کے لیے کافی تھے۔ سنا ہے۔ وہ اپنی کم عمر، حسین، جوان بیوی کے ساتھ بہت خوش ہے۔ کبھی کبھار میرا دل چاہتا تھا کہ اس سے جا کر پوچھوں۔ کیا کبھی اس کے ضمیر نے اسے ملامت نہیں کی؟

لیکن نمل سے مل کر مجھے اس سوال کا جواب بھی مل چکا ہے۔ ہر خود غرض مطلب پرست، مادیت پرست انسان اپنی تسلی کے لیے اپنے ضمیر کا گلا گھونٹنے کے لیے کچھ نہ کچھ توجیحات ضرور تیار رکھتا ہے، جیسے نمل نے تیار کر رکھی ہیں۔ یقیناً" حسن نے بھی ضرور تیار کر رکھی ہوں گی، جب اس وقت اس نے میری قدر نہیں کی تو کس طرح ممکن ہے کہ آج اس کا ضمیر اسے کوئی ملامت کرتا ہو۔

نمل آج بھی اسی وسوسے کے حصار میں ہے کہ مرد بے وفا ہوتا ہے۔ حالانکہ اس نے خود آذر کے ساتھ وہی سب کچھ کیا تھا جو حسن نے میرے ساتھ کیا تھا۔

نمل نے آذر کو دولت کے لیے اور حسن نے مجھے کم سنی یا جوان العمری یا شباب کے لیے چھوڑ دیا تھا۔

ان دونوں نے ہم دونوں کو ان دو چیزوں کے لیے ترک کر دیا۔ ہماری قربانیوں، ہماری وفاؤں، ہماری محبتوں کو ٹھوکر مار دی جن کے ہمیشہ رہنے کی گارنٹی کوئی بھی نہیں دے سکتا۔

تو کیا فرق ہے مرد اور عورت میں؟

میں نے کہا تھا ممکن ہے۔ آپ کسی نتیجے پر پہنچنے میں میری مدد کر دیں لیکن اب مجھے مدد کی ضرورت نہیں کیونکہ میں سمجھ چکی ہوں بے وفائی صرف مرد کی میراث نہیں ہے عورت بھی خود غرضی کے اس کھیل میں برابر کی شریک ہے۔

باقی رہی آپ کے دل کی بات تو اس کا اختیار آپ کے پاس ہے دل کو دل بنا رہنے دیجیے یا مشینری میں ڈھال کر خود غرضوں کی صف میں شامل ہو جائیے۔



راحت نذیر

وہ آج صبح ہی سے کام میں جتی ہوئی تھی۔ گو کہ رات سے اس کی کچھ طبیعت خراب تھی، بے چینی سی تھی۔ جی بھی متلا رہا تھا، رات کو اسے قے بھی ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے وہ کچھ کمزوری محسوس کر رہی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ جتی رہی۔ صبح اس نے اٹھ کر ناشتا تیار کیا۔

نثار ناشتا کر کے آفس چلا گیا۔ تو اس نے بھی چند لقمے زہر مار کیے۔ پھر وہ گھر کے کاموں میں لگ گئی۔ سب سے پہلے صحن صاف کیا، شہتوت کے زرد پتوں کو ایک جگہ اکٹھا کر کے آگ لگائی، پھر کمرہ اور برآمدہ دھویا، سردیوں کی صبح میں ٹھنڈے پانی سے فرش دھونا گویا اس کے لیے کے ٹو سر کرنے کے مترادف تھا۔ اسے پانی برف کی طرح ٹھنڈا لگ رہا تھا۔ لیکن وہ لگی رہی۔

برآمدہ دھونے کے بعد اس نے مشین لگائی اور ہفتہ بھر کے کپڑے دھونے لگی۔ دوپہر کے وقت دھوپ دیکھ کر دل چاہا کہ تھوڑی دیر دھوپ میں لیٹ کر کمر سیدھی کر لی جائے۔ ایسی عیاشی اس کے لیے پہلے کہاں ممکن تھی۔ پچھلی دو سالہ شادی شدہ زندگی اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئی جہاں ساس اور اس کی اکلوتی نند کی طرف سے قدم قدم پر ملنے والا "کام چور" کا طعنہ اسے یاد آگیا۔

وہ سارا سارا دن گھر کے کام کرتی رہتی، کھانا پکانا، برتن دھونا، کپڑے دھونا، سارے گھر کی صفائی ستھرائی کرنا، لیکن جب بھی وہ تھک کر دو گھڑی آرام کرنے کو بیٹھتی "کام چور" کا طعنہ مل جاتا اور وہ پھر سے اٹھ کر کوئی کام ڈھونڈنا شروع کر دیتی۔ کام چوری کا لاحقہ اس کے نام کے ساتھ ایسا جڑا کہ جہاں اس کا نام سکینہ آتا۔

اس کی ساس اور نند کام چور کا لاحقہ فوراً" لگا دیتیں۔ اب تک تو شاید وہ اپنے حلقہ احباب میں "سکینہ کام چور" کے نام سے مشہور ہو چکی تھی۔ اسے ان سب کی پروا نہیں تھی۔

وہ سارا دن طعنے سنتی رہتی، لیکن رات کو نثار کی دو چار میٹھی باتیں اسے یہ طعنہ وقتی طور پر بھلا دیتیں اور وہ خوش ہو جاتی۔ نثار نے کبھی بھی اسے کام چور نہیں کہا تھا۔ اپنی ماں اور بہن کے پٹیاں پڑھانے کے باوجود بھی شاید وہ جانتا تھا کہ سارا دن سکینہ ہی کولہو کے بیل کی طرح جتی رہتی ہے۔ سردیاں شروع ہوتے ہی اس کی ساس کو نمونیہ ہو گیا۔ جو دن بدن بگڑتا گیا۔ آخر ایک دن وہ اسی مرض کے ہاتھوں رخصت ہو گئیں۔ سکینہ دل ہی دل میں مطمئن تھی۔ راستے کا ایک کانٹا تو نکل گیا تھا۔ اب ایک رہ گیا تھا۔ اس کی نند یعنی شبانہ کا کانٹا، تو اس میں بھی اس کی کوششیں بر آئیں۔ اپنے دور پار کے عزیزوں میں رشتہ کروا دیا کوئٹہ میں اب لاہور اور کوئٹہ... فاصلہ ہی کتنا ہے۔

اگر انسان آنے کی خواہش بھی کرے تو ٹائم نکالتے نکالتے سال چھ مہینے تو ضرور نکل جائیں۔ ہفتہ بھر پہلے ہی شبانہ کی شادی ہوئی تھی۔ شادی کا پھیلاوا سمیٹتے سمیٹتے وہ دہری ہو گئی۔ اب جو گھر کا خیال آیا تو شہتوت کے پتوں کو پورے صحن میں آوارہ گردی کرتے پایا۔ پورا صحن "تقریباً" زرد ہو چکا تھا۔ یرقان کی وجہ سے نہیں... پیلے پتوں کی وجہ سے، سارے گھر کے فرش پر فٹ فٹ دھول جمی ہوئی۔ جس میں سے فرش پر بنی ہوئی جا بجا جوتیوں کے نشانات ہلکے ہلکے نظر آ رہے تھے۔

شادی سے ایک دن پہلے بارش ہوئی تھی کچا صحن ہلکا ہلکا گیلا ہو گیا تو کمروں میں فرش پر نشانات تو بننے ہی بننے تھے۔ اس نے شادی میں شرکت کے لیے آئی ایک دو لڑکیوں سے جھاڑو بھی لگوائی لیکن ہلکے ہلکے نشان ابھی بھی باقی تھے۔ ہفتے بھر کے کپڑے بھی اس کا منہ چڑھا رہے تھے۔

صبح نثار جاتے ہوئے اسے کہہ گیا تھا۔

"گھر کی صفائی کرو۔ یہ گھر ایسا منظر پیش کر رہا ہے جیسے یہاں انسان نہیں جن بھوت بستے ہوں۔"

ویسے وہ بھی پورے گھر پر ایک نظر ڈال کر نثار کی حس مزاح کی قائل ہو گئی تھی۔ اپنی خراب طبیعت کو نظر انداز کرتے وہ جت گئی۔ فرش دھونے کے بعد وہ کپڑے دھونے لگی۔ دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے آج کوئی بھی اسے روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا۔

دوپہر تک وہ کپڑے آدھے سے زیادہ دھو چکی تھی۔ سو وہ مشین میں کپڑے ڈال کر صحن کے بیچوں بیچ چارپائی ڈال کر لیٹ گئی۔ گرم گرم دھوپ کے تھپیڑے جب اس کے جسم سے ٹکرائے تو اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ دنیا و مافیہا سے بےگانہ ہو چکی تھی۔ مشین نے ایک دو بار ہارن بھی بجایا مگر مجال تھی جو سکینہ بی بی نے کروٹ بھی بدلی ہو۔ اس کی جب آنکھ کھلی تو سورج ڈھلنے کے قریب تھا۔ مغرب سے آسمان ہلکا ہلکا نارنجی ہو گیا تھا۔ بادلوں کی چھوٹی بڑی... سفید ٹکڑیاں روئی کے گالوں کی طرح آسمان میں تیر رہی تھیں اور ڈوبتے سورج کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے میں مصروف تھیں۔

وہ جلدی سے اٹھی، اپنے آپ کو لعنت ملامت کرتی پھر سے کام میں جت گئی۔ جب فارغ ہوئی تو سورج ڈھل چکا تھا۔ نثار کے آنے کا بھی وقت ہو رہا تھا۔

دودھ والا دودھ دے گیا تھا۔ اس نے جلدی سے دودھ پتیلی میں ڈال کر چولہے پر رکھا، فریزر میں سے گوشت کا پیکٹ نکالا اور اسے پکانے لگی۔ نثار جب تک آفس سے واپس آئے وہ کھانا تیار کر چکی تھی۔ یہ پہلا دن تھا جب اس نے دل لگا کر کام کیا تھا۔ شاید اسے آج کوئی بھی کام چور کہنے والا نہیں تھا۔

"سکینہ! دستر خوان لگاؤ... زوروں کی بھوک لگی ہے۔" اتنا کہہ کر نثار واش روم میں گھس گیا۔ فریش ہونے کے لیے جبکہ سکینہ جلدی جلدی ہاتھ چلانے لگی۔ جب تک وہ فریش ہو کر باہر نکلا، سکینہ دستر خوان لگا چکی تھی۔

دستر خوان پر بیٹھتے ہی سکینہ کی طبیعت کا بوجھل پن زیادہ ہو گیا۔ کچھ تھکاوٹ تھی اور کچھ کمزوری کہ اسے چکر آنے لگے۔ دو تین بار اس نے سر جھٹکا لیکن چکر مسلسل آ رہے تھے۔

"کیا ہوا...؟" نثار نے فکرمندی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں... وہ طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔" وہ ہولے سے بولی۔

"کچھ کھا پی لو... ٹھیک ہو جائے گی طبیعت... کمزوری کی وجہ سے ہے۔ پچھلا پورا ہفتہ گھن چکر بنی رہی ہو۔" نثار کے لہجے کی مٹھاس تو سکینہ کے دل میں اتر گئی۔

وہ چند لمحوں میں ہی خود کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گئی کہ وہ بھلی چنگی ہے۔ وہ خود کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ زندگی یکدم ہی بہت زیادہ خوب صورت ہو گئی تھی۔ اس ایک پل کو یاد کر کے وہ اپنی پچھلی دو سالہ زندگی کو بھی بھلانے کو تیار تھی۔

"کیا تھا اگر یہ دو سال درمیان میں نہ ہوتے۔" کھانا کھاتے ہوئے وہ سوچے گئی "میری زندگی شروع ہی یہاں سے ہوتی۔" یہ سوچ کر وہ مسکرائی اور کن اکھیوں سے نثار کو دیکھا جو کھانا کھانے میں مشغول تھا۔

دو سال پہلے ان کی ایک جاننے والی خاتون نے یہ رشتہ کروایا تھا۔ سکینہ کے والدین کو جو بائیو ڈیٹا پتا چلا تو فوراً" ہاں کر دی۔

"چھوٹا سا کنبہ ہے... بس ایک نند ہے اور ایک ساس اور کوئی جھنجھٹ نہیں۔"

یہ تو صرف وہ جانتی تھی اس نے صرف ایک نند اور ساس کو دو سال کیسے برداشت کیا تھا۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" نثار کی آواز اسے ماضی سے حال میں کھینچ لائی۔

"کھانا کیوں نہیں کھا رہیں؟" اس نے شرمندگی سے ہاتھ میں پکڑے ہوئے نوالے کو دیکھا... اور پھر نثار پر ایک نظر ڈالی جو کھانا کھا کر فارغ ہو چکا تھا۔ بلکہ ہاتھ دھو کر تولیے سے خشک کر رہا تھا۔

"دودھ کہاں رکھا ہے...؟" نثار نے حسب معمول اپنا روزانہ کا فقرہ دہرایا وہ کھانے کے فوراً" بعد دودھ پینے کا عادی تھا۔

"میں نے گلاس میں ڈال کر فریج میں رکھا ہے۔ چینی میں نے ڈال دی ہے۔ ٹھہرے میں دیتی ہوں۔" وہ نوالہ پلیٹ میں رکھ کر اٹھنے لگی۔

"نہیں رہنے دو... تم آرام سے کھانا کھاؤ میں لے لیتا ہوں۔" نثار اسے کہہ کر کچن کی طرف بڑھ گیا۔

کھانا کھانے کو اس کا دل نہیں کر رہا تھا، وہ بھی جلدی جلدی برتن سمیٹنے لگی۔ جونہی کچن میں آئی نثار دودھ کا گلاس ہاتھ میں پکڑے کھڑا تھا۔ اسے کچن میں داخل ہوتے دیکھ کر اسے ہی گھور رہا تھا۔

"کیا ہوا...؟" اس نے جلدی سے پوچھا۔

"پھوہڑ عورت۔" وہ غصے میں زیر لب بڑبڑایا جو اسے صاف سنائی دیا تھا۔ دودھ والا گلاس اس نے تقریباً" پٹخنے کے انداز میں شیلف پر رکھا، تیز تیز قدم اٹھاتا کچن سے نکل گیا۔

وہ سن کھڑی نثار کے کہے گئے الفاظ پر غور کر رہی تھی۔ اس کی ساری امیدیں سارے خواب خاک میں مل گئے تھے۔ ایک پل میں ہی وہ ہواؤں سے زمین پر آ رہی تھی۔ یکدم ہی اس کے کانوں میں "کام چور" بم بن کر گونجا۔

وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی شیلف کے پاس گئی۔ دودھ کا گلاس اٹھایا اور منہ سے لگایا۔ اسے بڑا تیز اچھو لگا تھا۔

اس نے بے دھیانی میں دودھ میں چینی کے بجائے نمک ڈال دیا تھا۔ وہ مرے مرے قدموں سے کچن سے باہر آئی۔

پورے گھر پر ایک نظر دوڑائی۔ اسے محسوس ہوا تھا جیسے تار پر دھلے کپڑے، صحن کے ایک کونے میں جلے ہوئے شہتوت کے پتے اور لش پش کرتا فرش مل کر اس پر ہنس رہے ہوں اور مل کر اسے ایک بات کا طعنہ دے رہے ہوں۔ "کام چور"

☆

ناولٹ



جام جم سے میرا جام سفال اچھا ہے

انسان شخصی ارتقا کے ابتدائی ادوار میں "گیلی مٹی" کی مانند ہوتے ہیں۔ جنہیں معاشرے کا "کمہار" تربیت کے "چاک" پر دھرتا ہے اور بازار حیات کی "مانگ" کو نظر رکھ کر اپنی نیت اور چاہت کے ہاتھوں سے ایک خاص سانچے میں ڈھالتا ہے۔ اس قالب سازی کے دوران اس کی "انگلیاں" ہر "برتن" کے بدن پر رتوں، رواجوں، مذہب، سیاست، جذبوں، خوابوں اور سرابوں کی ان گنت پیچیدہ تحریریں رقم کرتی ہیں۔

گیلی مٹی کے یہ "سانچے" حالات کے "آوے" میں ڈھلتے ہیں۔ ان مراحل سے گزرتے ہوئے ہر برتن کا "ظرف" اور "نصیب" اس کی ہیئت کا تعین کرتا ہے۔ کچھ "سفال گر" کی بے توجہی کا شکار ہو جاتے ہیں کچھ اس کے اناڑی پن کی نذر ہوتے ہیں۔ کچھ "آوے" کی "دہک" برداشت نہیں کرپاتے اور ترخ جاتے ہیں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بازار تک تو پہنچتے ہیں مگر انہیں کوئی "خریدار" میسر نہیں آتا۔ ان کا نصیب اور بازار کا اسلوب ہر "ظرف" کا مقام طے کرتا ہے۔ گل دان اور پیک دان میں ساخت کا فرق بھلے نہ ہو مگر نصیب کا فرق ضرور ہوتا ہے۔

یہ ہی میرے ناول کی تھیم ہے۔

محض چند واقعات کو اپنے انداز میں آپ کے سامنے پیش کر رہی ہوں۔ کرداروں کے ساتھ انصاف کرنے کی زحمت میں نے نہیں اٹھائی کیونکہ میرا فہم و ادراک ناقص اور نامکمل ہے۔ میں یہ کام آپ پر چھوڑ رہی ہوں میں آپ کو خود سے بہتر منصف پاتی ہوں۔ میں اپنی رائے بھی نہیں دے رہی۔ صرف آپ کی رائے مانگ رہی ہوں۔

آپ اس ناول کو جس بھی تناظر میں دیکھیں مگر اسے مٹی کے بے جان برتنوں کی کہانی مت سمجھیے گا۔

یہ جیتے جاگتے وجود رکھنے والے اور جہد کرنے والے انسانوں کی داستان ہے۔

بشریٰ سعید

بشریٰ سعید

سفال گر



صوفیہ بچپن سے ناسازگار حالات سے گزر رہی ہے۔ اسے نہیں معلوم کہ اس کا باپ کون ہے جبکہ اس کی ماں البا گرانٹ کے عشق میں پاگل تھی۔ ماں کے انتقال کے بعد گرانٹ نے اس کی پرورش کی ہے۔ صوفیہ کو نہ اپنے والدین سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ ہی مذہب سے۔ وہ پابندیوں سے آزاد زندگی گزارنا چاہتی ہے۔ کلاس میں جیسیکا اور گیلی کو مستقبل کے حوالے سے وہ بتاتی ہے کہ وہ غلط راستے پر چلنا چاہتی ہے۔ میبل صوفیہ کے پڑوس میں رہتا ہے۔ وہ صوفیہ کا خیال رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ گرانٹ صوفیہ کو پوسٹ آفس خط ڈالنے کو دیتا ہے۔ جسے وہ ہر مرتبہ کی طرح لاپروائی سے ہوا برد کردیتی ہے۔ کارل میکار تھی کالج کا سب سے ہینڈسم اور فلرٹ لڑکا ہے۔ لیکن صوفیہ اس پر توجہ نہیں دیتی۔ وہ کارل کے لیے ٹیڑھی کھیر ثابت ہو رہی ہے۔

عمر کی پرورش حکیم بیگم کے ہاتھوں ہوئی ہے جن کا خمیر محبت اور جفاکشی سے اٹھا ہے۔ انہوں نے عمر کی گھٹی میں "اللہ" سے محبت بھردی ہے۔ حکیم بیگم کو اللہ سے عشق ہے۔ عمر کی خواہش ہے کہ بے جی (حکیم بیگم) کو اس کی ذات سے دکھ نہ پہنچے لیکن ہر مرتبہ کچھ نہ کچھ غلط ہو ہی جاتا ہے۔ عمر کو حکیم بیگم نے ایک عیسائی عورت سے گود لیا تھا۔ عمر کو اپنی ماں کے بارے میں جاننے کا تجسس ہے۔ ماسٹر صاحب کا قلم اٹھانے پر حکیم بیگم عمر پر سورۃ الناس اور سورۃ الفلق پڑھ کر پھونکتی ہیں تاکہ وہ آئندہ کوئی غلط حرکت نہ کرپائے ان کی ایک بیٹی آمنہ امریکہ میں رہتی ہے۔ شادی کے بارہ برس گزرنے کے باوجود وہ بے اولاد ہے۔ حکیم بیگم ہر وقت اس کے لیے اولاد کی دعا مانگتی ہیں۔ عمر کو بے جی کی لگن حیران رکھتی ہے۔

پرنیاں آئزک کو پارک میں ایک اجنبی gloxinia کا پھول دے کر پرپوز کرتا ہے تو وہ ششدر رہ جاتی ہے۔ بعد میں وہ صرف اسی شناسا اجنبی سے ملنے پارک جاتی ہے۔ اس ملاقات میں پرنیاں پر کھلتا ہے اجنبی (گرانٹ) کو اداکاری کا جنون ہے۔ وہ اپنے آپ کو مستقبل کا عظیم اداکار سمجھتا ہے۔ وہ اپنے کردار کی ریہرسل کے لیے پارک میں موجود لڑکیوں کو پرپوز کرنے کی اداکاری کرتا ہے۔ یہ جان کر پرنیاں کو دھچکا لگتا ہے۔ گرانٹ اس سے ملاقات کا وعدہ کرکے اپنی دوست البا مارسیلو کے ساتھ چلا جاتا ہے۔

ابراہیم چالیس کی دہائی میں اپنے تایا کے پاس امریکہ چلا آیا۔ جو وہاں فرنیچر کا کاروبار کرتے تھے۔ تایا کی بیٹی ماریہ سے شادی کرکے اس کی لاٹری نکل آتی ہے۔ وہ ان کی جائیداد کا وارث بھی بن جاتا ہے۔ ماریہ کی رفاقت ہر پل اسے اپنی خوش بختی کا احساس دلاتی ہے۔ بدقسمتی اس وقت ابراہیم کے دروازے پر دستک دیتی ہے۔ جب ماریہ اسے ایک بچے کا تحفہ دے کر اپنے رب سے جاملتی ہے۔ اسپتال جلدی پہنچنے کے لیے وہ اسٹون کی بیش قیمت کار ادھار لیتا ہے۔ جو اس کی بداحتیاطی سے تباہ ہوجاتی ہے۔ ساتھ ہی دو ملین کی رقم بھی آگ کی نذر ہوجاتی ہے۔ اس کی قیمت اسے اپنی تمام جائیداد اور تین انگلیاں اسٹون کے ہاتھوں کٹوا کر چکانی پڑتی ہے۔ وہ اکلوتے بیٹے احمد سمیت سڑک پر آجاتا ہے۔

احمد کی وجہ سے اسے کئی جگہ نوکری سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔ ہر مرتبہ اس کا دل احمد کو ختم کرنے کا چاہتا ہے۔ آخر کار وہ کتابوں کی اپنی دکان کھول کر زندگی کی گاڑی گھسیٹنے لگتا ہے۔ اس کا رجحان مذہب کی جانب بڑھ جاتا ہے۔ جبکہ احمد کا دل تمام تر کوششوں کے باوجود اللہ کی جانب مائل ہونے سے انکاری ہے۔

احمد جتنا اللہ سے بھاگتا ہے۔ ابراہیم زبردستی اسے دین کی جانب لانے کی کوشش کرتا ہے۔ ہالی ووڈ اسٹار بننے کا خواب احمد کو بے چین رکھتا ہے۔ باپ کی سختی اور مار پیٹ اسے اور شدت سے شوق کی تکمیل کے لیے اکساتی ہیں۔ اسکول میں وہ لڑکیوں کی "پسندیدہ" ہستی ہے۔ ایک مینٹنی شو کے عوض وہ کسی بھی لڑکی کو اپنا قیمتی وقت دے سکتا ہے۔ وہ اداکاروں کا زبردست نقال ہے۔ کیری گرانٹ اس کا پسندیدہ اداکار ہے۔ اپنے خواب کی تکمیل کے لیے گھر سے بھاگنے کا فیصلہ کرتا ہے عین اس وقت جب وہ دہلیز سے باہر قدم رکھ رہا تھا۔ ابراہیم کو فالج ہوجاتا ہے اور اس کا جسم ناکارہ ہوکر رہ جاتا ہے۔ دن رات کی خدمت سے تنگ آکر وہ ابراہیم کو مار ڈالتا ہے۔ احمد کو یقین ہے کہ اب قسمت اس پر اپنی مہربانی ضرور کرے گی۔ اس کے خواب اس وقت چکنا چور ہوجاتے ہیں جب دو پولیس اہلکار گرفتار کرکے اسے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔

دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر پرنیاں گرانٹ کو فون کرتی ہے تو وہ اس کا خیر مقدم کرتا ہے۔ دونوں کے درمیان دوستی پروان چڑھنے لگتی ہے۔ گرانٹ کی ساری گفتگو اداکاری کے گرد گھومتی ہے جو کہ اس کا پہلا عشق بھی ہے۔ پرنیاں گرانٹ کو متاثر کرنے کے لیے کیری گرانٹ کے متعلق معلومات اکٹھی کرتی ہے۔ داؤد اسے ان مشکوک سرگرمیوں پر ٹوکتا ہے۔ کچھ ہی

دنوں میں گرانٹ کے سامنے تمام اصلیت آجاتی ہے۔ وہ پرنیاں کے جذبے کی پذیرائی کرتا ہے۔ ہوٹل میں دعوت پر گرانٹ اپنی دوست البا کو لاتا ہے تو البا ہسپانوی زبان میں اسے "کتیا" کہتی ہے۔ پرنیاں کو البا کی حرکاتیں ایک آنکھ نہیں بھاتی۔

صوفیہ پروم نائٹ پر کارل میکار تھی کی ساتھی بننے کی پیش کش قبول کرلیتی ہے۔ شو کے لیے ڈریس تک وہ کارل کے پیسوں سے خریدتی ہے۔ کارل اس پر تلملانے کے علاوہ کچھ نہیں کرپاتا۔ کارل صوفیہ کے ساتھ چند لمحات قربت میں بتانا چاہتا ہے جس کے لیے وہ صوفیہ کو اضافی رقم دیتا ہے۔ صوفیہ اس پیش کش کا جواب بھی مثبت دیتی ہے۔ کارل اپنے دوست کے ساتھ مل کر صوفیہ کی نازیبا ویڈیو بنانا چاہتا ہے تاکہ صوفیہ کو بلیک میل کرسکے۔

عمر کو اس کی ماں حکیم بیگم سے واپس مانگنے اٹھارہ سال بعد آجاتی ہے۔ لامحالہ حکیم بیگم کو عمر کو لوٹانا ہی پڑتا ہے۔ عمر کی ماں (آپا) عیسائی ہے اور ایک مقامی اسکول میں ٹیچر ہے۔ وہ شد و مد سے عمر کو عیسائی بنانے کی کوششیں کرتی ہے لیکن عمر دین اسلام سے اپنا قلبی تعلق ختم نہیں کرتا۔ وہ ہر دم حکیم بیگم کو یاد کرتا رہتا ہے۔ آپا عمر کو اس کے حال پر چھوڑ دیتی ہے۔ آپا کے لیے شوکت صاحب کا التفات عمر کو ناگوار گزرتا ہے۔ جو ان کے اسکول کا پرنسپل بھی ہے آپا اسے غیر ضروری ڈھیل دیتی ہیں جو عمر کو گراں گزرتی ہے۔ لیکن وہ ماں سے اس کا اظہار نہیں کرتا۔

آپا نازیبا فلمیں خریدنے عمر کے ساتھ مارکیٹ جاتی ہے تو عمر شرم سے گڑ کر رہ جاتا ہے۔ اس کی رائے ماں کے کردار کے متعلق ـــــ خراب ہوجاتی ہے۔

پروم نائٹ پر رقص کے دوران اچانک گرانٹ پہنچ کر کارل کا منصوبہ خاک میں ملادیتا ہے۔ گرانٹ صوفیہ کو مارتے پیٹتے ہوئے گھر لے جاتا ہے۔ اس بے عزتی پر وہ کسی سے نظریں ملا نہیں پاتی۔

ٹیٹر کیک عرف میبل کو داڑھی کی بے حرمتی پر گرفتار کرلیا جاتا ہے تو وہ خوف کے مارے سچ اگلنے کو تیار ہو جاتا ہے جسے سن کر انسپکٹر کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

احمد باہر نکلتا ہے تو اسے پولیس پکڑ لیتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اسے ابراہیم کے قتل پر پولیس نے پکڑا ہے جبکہ اسے سسٹر سونا کی شکایت پر پکڑا گیا ہے۔ پکڑے جانے پر احمد بھاگنے کی کوشش میں کانسٹیبل کو قتل کردیتا ہے عدالت اس قتل پر اسے سات سال قید سناتی ہے اس دوران اسے خدا ٹوٹ کر یاد آتا ہے۔ ساتھ ہی ابراہیم کے ساتھ کیے سلوک پر پچھتاوا ہونے لگتا ہے۔

پرنیاں گرانٹ کے عشق میں ڈوب چکی ہے۔ اسی اثناء میں اس پر انکشاف ہوتا ہے کہ گرانٹ نیوڈ ماڈلنگ کرتا ہے۔ یہ بات اسے ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ تب بھی وہ گرانٹ سے بے اعتنائی نہیں برتتی۔ گرانٹ اس سے محبت کا اظہار کرتے ہوئے پرپوز کردیتا ہے۔ ساتھ یہ انکشاف بھی کرتا ہے کہ احمد گرانٹ اس کا اسکرین نیم ہے اس کا اصل نام احمد ابراہیم ہے۔ وہ مسلمان ہے یہ چیز پرنیاں کو ساکت کردیتی ہے۔ وہ احمد کو بتادیتی ہے کہ وہ اپنا مذہب تبدیل نہیں کرے گی اس لیے احمد اس سے شادی کا ارادہ دل سے نکال دے۔

ہالی ووڈ میں حالات احمد کو بری طرح پسپا کرتے ہیں۔ اسے تھرڈ کلاس جگہ پر رہائش اختیار کرنا پڑتی ہے۔ تمام بڑی ایجنٹ کمپنیاں اسے بری طرح ریجیکٹ کرتے ہوئے mocking bird (نقال پرندہ) قرار دیتی ہیں۔ وہ اپنے مالک مکان سے کسی جاب کی بات کرتا ہے سب ادارے احمد کو ایکسٹرا کا کردار قبول کرنے کا مشورہ دیتے ہیں جو اسے قبول نہیں ہے۔ ایک ادارے کا اشتہار پڑھ کر احمد آڈیشن دینے جاتا ہے۔

حکیم بیگم کی دعائیں رنگ لاتی ہیں اور شادی کے 20 سال بعد آمنہ کے یہاں اولاد کی خوش خبری سننے کو ملتی ہے۔ عمر اسے صرف حکیم بیگم کی مستقل لگن قرار دیتا ہے۔ حکیم بیگم کے داماد یوسف اسے پڑھائی کے لیے امریکہ بلوانے کا کہتے ہیں تو وہ انہیں اپنی رضامندی دیتا ہے۔

پرنیاں کو اطلاع ملتی ہے کہ پاکستان میں اس کے والد آئزک کی طبیعت بے حد ناساز ہے اور اسے جلد پاکستان جانا ہوگا۔ آنا فانا "پرنیاں اور داؤد کا رشتہ طے کردیا جاتا ہے۔ جس پر پرنیاں گم صم رہ جاتی ہے۔ وہ داؤد سے کہتی ہے کہ وہ رشتے سے انکار کردے۔ داؤد اس سے وجہ پوچھتا ہے تو وہ اسے سچ بتادیتی ہے۔ وہ پرنیاں کی بات ماننے سے انکار کردیتا ہے۔ پرنیاں دل

کے ہاتھوں مجبور ہو کر مسلمان ہونے کے باوجود احمد اسے شادی کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ احمد کو "ایشیائی ہونے" کی بنیاد پر بری طرح مسترد کر دیا جاتا ہے۔ اسے ایک بار میں ذلت آمیز نوکری کرنا پڑتی ہے۔ رائن کے گھر میں رہائش اس کے لیے ناقابل برداشت ہے۔ ایک حادثہ احمد کی ملاقات البا سے کرواتا ہے۔ جو اس کے یک طرفہ عشق میں مبتلا ہے۔ ناپسندیدگی کے باوجود وہ البا سے قطع تعلق نہیں کرتا۔ اسے البا کی حرکتیں بعض مرتبہ مشکوک بھی کرتی ہیں۔ البا' احمد کی ایک نظر التفات کے لیے اپنی بھانجی صوفیہ کو گھر چھوڑ کر آتی ہے۔ ایک بی کلاس فلم میں احمد کو ایک لائن کا کردار ملتا ہے تو وہ اسے نعمت غیر مترقبہ سمجھتا ہے۔ وہ اس اطالوی جملے کی ریہرسل کے لیے پارک میں ہر لڑکی کو gloxinia کا پھول پیش کرتا ہے' وہیں اس کی پرنیاں آئزک سے ملاقات ہوتی ہے۔ اس کی خوب صورتی احمد کو متاثر کرتی ہے۔

رائن اپنے سامان سمیت بغیر بتائے اپارٹمنٹ سے غائب ہو جاتا ہے۔ ساتھ ہی احمد گرانٹ کی جمع کی گئی رقم بھی لے جاتا ہے۔ مالک مکان سے اسے سننے کو ملتا ہے کہ چھ مہینے سے اس نے کرایہ نہیں دیا۔ یہ صورت حال اسے چکرا کر رکھ دیتی ہے۔ البا اسے ایک غیر معروف میگزین کے فوٹوگرافر سے ملواتی ہے۔ جو اسے نیوڈ ماڈلنگ کی پیش کش کرتا ہے۔ وہ اس پیش کش کو مسترد کرتے ہوئے البا سے بھی شدید ناراض ہو جاتا ہے۔ لیکن پے در پے ناکامیوں اور بار سے نوکری ختم ہونے پر اسے ناچاہتے ہوئے بھی یہ پیش کش قبول کرنا پڑتی ہے۔ اس دوران پرنیاں اس سے دوبارہ رابطہ کرتی ہے تو اس کی دل کی کلی کھل اٹھتی ہے۔ البا کو کسی کا بھی گرانٹ کے قریب آنا پسند نہیں ہے۔ رائن اپنی گرل فرینڈ کی بے وفائی کے بعد دوبارہ اپارٹمنٹ لوٹ آتا ہے اور کہتا ہے کہ جلد ہی وہ سالومن موریل کی فلم میں ایکسٹرا کے کردار اسے اور البا کو دلوا دے گا۔ فلم میں چھوٹا سا کردار ہی اسے بہت اہم محسوس ہوتا ہے۔ رائن سب کے سامنے یہ انکشاف کرتا ہے کہ البا نیوڈ ماڈل ہے۔ جس پر اسے فلم سے نکال دیا جاتا ہے۔ موریل اپنی کاسٹ میں کسی بدنام اداکار کو برداشت نہیں کرتا۔ کچھ دنوں بعد ہی رائن کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے وہ کچھ مہینوں کے لیے اسپتال میں رہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ایک چھوٹے سے واقعے سے احمد گرانٹ' سالومن کی نظر میں آ جاتا ہے اور اسے ایک ناول پر مبنی فلم میں اہم کردار مل جاتا ہے۔ احمد گرانٹ کو اپنی خوش بختی کا یقین نہیں آتا۔

پرنیاں اور احمد فوری طور پر شادی کر لیتے ہیں۔ پرنیاں اس وقت محبت کے علاوہ کچھ نہیں سوچنا چاہتی۔ اس کے لیے احمد کے ساتھ گزارے لمحات زندگی کا حاصل ہیں۔ وہ گرانٹ کو اپنا پاکستان کا مکمل پتا اور فون نمبر دیتی ہے۔ پاکستان آکر اسے آئزک کی خرابی صحت کا صحیح طور سے پتا چلتا ہے۔ وہ مرنے سے پہلے پرنیاں کو دلہن بنا دیکھنا چاہتا ہے۔ پرنیاں کو حالات کی سنگینی کا احساس ہوتا ہے اور وہ احمد گرانٹ سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ لیکن ہر بار اسے ناکامی ہوتی ہے وہ آنسرنگ مشین پر اس کے نام پیغام بھی چھوڑتی ہے اور اسے رابطے کے لیے دو دن کی مہلت دیتی ہے۔

احمد گرانٹ' پرنیاں سے رابطہ کر کے اسے تسلیاں دے کر فون رکھ دیتا ہے۔ پرنیاں ایک مرتبہ پھر اس کی باتوں میں آکر اعتبار کر بیٹھتی ہے' لیکن انتظار' انتظار ہی رہتا ہے۔ وہ اپنی ماں ویٹس کو اپنی شادی کا بتاتی ہے' تو وہ اسے تسلیم کرنے سے ہی انکاری ہو جاتی ہے۔ اس کی نظر میں مسلمان سے شادی کی کوئی اہمیت نہیں۔ وہ اسے خدا کا واسطہ دے کر داؤد سے شادی کا کہتی ہے۔ وہ اپنی ماں کو یہ بتا نہیں پائی کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ پرنیاں ان حالات میں گھر چھوڑنے کا فیصلہ کرتی ہے۔

آپا' عمر کو نجی دورے پر شوکت صاحب کے ساتھ اسلام آباد جانے کا بتاتی ہے تو وہ ساتھ چلنے کو کہتا ہے۔ وہ عمر کو لے جانے سے صاف منع کر دیتی ہے۔ جس پر عمر ششدر رہ جاتا ہے۔ اس کا اکیلے شوکت صاحب کے ساتھ اتنی دور جانا اسے ناگوار گزرتا ہے۔ عمر کو سردی سے بخار ہو جاتا ہے۔ موٹی چادر کی تلاش کے دوران اسے آپا کے صندوق سے ایکس ریٹڈ فلموں کی کیسٹس' پورنوگرافک میگزین کے ساتھ ہی ایک خط بھی ملتا ہے' جسے پڑھ کر عمر کی رائے ماں کے متعلق مزید خراب ہو جاتی ہے' وہ ماں سے اصل حقیقت جاننے کا فیصلہ کرتا ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

۸

آٹھویں قسط

وہ کتنی ہی دیر سر پکڑ کر بیٹھا رہا۔ اسے کچھ بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ داؤد کے لہجے اور انداز نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ وہ غلط بیانی نہیں کر رہا تھا تو پھر پرنیاں کہاں تھی۔ اچانک سے خیال آیا کہ اگر پرنیاں نے اس کی خاطر گھر چھوڑا تھا۔ تو پھر وہ اس کے پاس آ رہی ہو گی۔ عین ممکن تھا کہ وہ لاس اینجلس پہنچ چکی ہو۔

خود سے الجھتا ہوا وہ لاس اینجلس واپس آ گیا۔ آتے ہی سب سے پہلے اس نے اپنی لینڈ لیڈی اوما کو ٹیلی فون کیا اور پرنیاں کے متعلق تفصیل سے سمجھانے کے ساتھ ساتھ اپنا برنٹ ووڈ والا پتہ بھی لکھوا دیا تاکہ پرنیاں اسے ڈھونڈتی ہوئی وہاں تک آئے تو خالی اپارٹمنٹ دیکھ کر مایوس ہو کر لوٹ نہ جائے۔

ایک پورا دن گزر گیا اور اوما کی طرف سے کوئی اطلاع وصول نہیں ہوئی۔ دوسرے روز شام کو اس نے خود اوما کو فون کر کے پوچھا۔ اس کا جواب نفی میں تھا۔ تیسرا دن بھی بے ثمر بیت گیا۔ چوتھا دن' پانچواں' ایک ہفتہ...

دسویں دن اس نے ایک بار پھر پاکستان فون کیا۔ جس عورت نے ریسیور اٹھایا' اس کی باتوں سے احمد کو اندازہ ہوا کہ وہ پرنیاں کی ماں تھی' داؤد کی طرح اس نے احمد کو گالی تو نہیں دی تھی' البتہ وہ بھی انہیں باتوں کو دہرا رہی تھی جو وہ داؤد کی زبانی سن چکا تھا۔ وہ متواتر اس کی منت کرتی رہی کہ وہ پرنیاں کو واپس گھر بھجوا دے۔ وہ اس کی کوئی بات سمجھنے پر آمادہ ہی نہیں تھی۔ تنگ آکر اس نے فون بند کر دیا۔ آخر پرنیاں کہاں رہ گئی تھی؟ شاید اسے امریکہ کا ٹکٹ خریدنے کے لیے رقم کی فراہمی میں مشکل درپیش ہو۔ بہت سوچ بچار کے بعد اسے یہی وجہ سمجھ میں آئی تھی۔

وہ پرنیاں کے چچا کے گھر بھی گیا' اسے وہاں سے کوئی مدد ملنے کی امید نہیں تھی اور داؤد سے سامنا ہونے کی صورت میں بدمزگی کا بھی اندیشہ تھا۔ پھر بھی کوشش کرنے میں کیا حرج تھا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ وہ لوگ ابھی پاکستان سے نہیں لوٹے تھے۔ وہ خود کو بے بسی کی انتہا پر پاتا تھا۔ پرنیاں کے ساتھ جڑنے والی ڈوری کا آخری سرا بھی اس کے ہاتھ سے پھسل گیا تھا اور اتنی بڑی دنیا میں وہ کہیں کھو گئی تھی۔

فلم کا پری پروڈکشن کا کام "تقریباً" مکمل تھا اور پرنسپل فوٹوگرافی کے آغاز میں بہت کم وقت باقی تھا۔ اس کی مصروفیات میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ سالومن نے اسے فرنچ سکھانے کے لیے ایک استاد مقرر کر دیا تھا وہ کسی بھی معاملے میں سالومن کو مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا لہٰذا اس کی ہر ہدایت پر بے چوں و چرا عمل کر دیا تھا۔

اسے برنٹ ووڈ والے فلیٹ میں رہتے ہوئے ایک ماہ سے زائد عرصہ بیت چکا تھا کہ ایک روز کہیں باہر سے لوٹنے پر اسے البا فون پر کسی سے بات کرتی دکھائی دی۔ اس نے کوٹ اتار کر کھونٹی پر ٹانگا اور بیٹھ کر جوتوں کے تسمے ڈھیلے کرنے لگا۔

"اس کے چہرے کے تاثرات سے مجھے بالکل محسوس نہیں ہو رہا کہ وہ تم سے بات کرنے میں کچھ دلچسپی رکھتا ہے' کیا کہا تم نے گرانٹ؟ فون بند کر دوں؟ نہیں ایسا مت کہو۔"

وہ چونک کر سیدھا ہوا۔ ایک لمحے میں اسے پتہ چل گیا تھا کہ وہ پرنیاں سے مخاطب تھی اس نے اضطراری کیفیت میں ہاتھ پھیلا کر ریسیور لینا چاہا۔ البا بیہودہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے اس کی دسترس سے دور ہو گئی۔ وہ تیزی سے آگے آیا اور البا کو بازو سے دبوچ کر کھینچا۔ اس کی آنکھوں میں تمسخر اترا اور اس کا سر دوبارہ دائیں بائیں ہلنے لگا۔ وہ رک گیا۔ اس کے اور البا کے درمیان ایک معاہدہ ہوا تھا اور اس معاہدے کی خلاف ورزی احمد کو بہت مہنگی پڑ سکتی تھی۔ وقتی جوش نے اس حقیقت کو کچھ ساعتوں کے لیے دھندلا دیا تھا لیکن وہ اپنی جگہ جوں کی توں موجود تھی۔

الباکی ہنسی اس کے اعصاب پر چابک بن کر پڑی۔ وہ چاہتا تو زبردستی اس سے ریسیور چھین سکتا تھا۔ مگر نتائج کے خوف نے اس کے ہاتھ پاؤں سن کر دیے تھے۔ وہ جو کچھ پرنیاں سے کہہ رہی تھی' اسے سن کر وہ اس قدر تلملا تا تھا تو پرنیاں کی حالت کیا ہو رہی ہو گی۔ شاید اسے کمرے سے چلے جانا چاہیے تھا۔ پاؤں مفلوج تھے ورنہ وہ ایسا ہی کرتا۔ کسی بے عزت غلام کی طرح سر جھکائے وہ سب کچھ سنتا رہا۔ ان لمحات میں اسے الباسے زیادہ اپنی بزدلی سے نفرت ہو رہی تھی۔

البا نے ریسیور کان سے ہٹا کر ماؤتھ پیس پر ہتھیلی پھیلائی اور بولی۔ "تمہیں میری باتوں کی تائید کرنا ہو گی۔"

"میں تمہارے لیے پہلے ہی بہت کچھ کر چکا ہوں۔ تم نے سب ختم کر دیا ہے۔ اب تائید یا تردید سے کیا فرق پڑے گا۔"

"کیا تمہارا مجھ سے تکرار کرنا مناسب ہے؟ مجھے ناخوش کرنے کی غلطی ہرگز نہ کرنا۔" اس کا انداز تحکم بھرا تھا۔ "سالومن کا گھر یہاں سے کتنے فاصلے پر ہے۔؟ دو بلاک یا شاید اس سے بھی کم۔ وہاں جانے کے لیے کسی سواری کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ صرف چار دن بعد فلم کی شوٹنگ شروع ہو رہی ہے۔ تمہیں بہت ذہین سمجھتی ہوں ہم کبھی کوئی بے وقوفی کا کام نہیں کرتے۔ تم نے میری مرضی کے خلاف کچھ کیا تو میں کتنی دکھی ہو جاؤں گی اور دکھ میں تقریباً "پاگل" ہو جاتی ہوں میں کیا تم چاہتے ہو کہ میں پاگل ہو جاؤں اور اپنے پاگل پن میں سالومن کے سامنے کوئی غیر مہذب بات کہہ بیٹھوں۔ وہ کس قدر نفیس ذوق کا مالک ہے۔"

احمد نے نچلے ہونٹ کو اتنے زور سے دانتوں تلے دبا رکھا تھا کہ اس سے خون رسنے لگا تھا۔ اس کی حیثیت ایسی نہیں تھی کہ وہ الباسے بحث کر سکتا۔ اس نے البا کے ہاتھ سے ریسیور لے لیا۔ کیا معلوم اس فون کے بعد پرنیاں کا دوبارہ کوئی سراغ نہ ملے۔

"میں پاکستان جاؤں گا جیسے ہی حالات میرے قابو میں آئے میں اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔ صرف اس وقت کسی بھی طرح مجھے اس معاملے کو نمٹانا ہے۔" اسے کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔ کیا کہنے سے پرنیاں کو کم سے کم چوٹ پہنچے گی۔ اسے اپنے گلے میں ویسا درد محسوس ہوا جیسا لڑکپن میں پہلی بار سگریٹ پینے پر ہوا تھا۔

"اس نے سچ کہا ہے۔" اس نے ایک جملہ گھڑ لیا اور زبان سے ادا کرتے ہی خود پر لعنت بھیجی وہ اس سے کم تکلیف دہ جملے بھی سوچ سکتا تھا جیسے "میں شرمندہ ہوں" یا "مجھے معاف کر دو۔"

پرنیاں جو کچھ کہہ رہی تھی اس سے زیادہ اذیت دینے والے الفاظ اس نے تمام زندگی میں نہیں سنے تھے۔ ٹوٹتے ہوئے کانچ کی کرخت دھار نے دل کی رگوں کو کاٹ ڈالا تھا۔

البا نے ریسیور پر ہاتھ ڈال کر جھٹکا دیا اور فون بند کر دیا۔

"وہ۔ پریگننٹ ہے۔ میرا بچہ۔۔"

احمد کسی لقوہ زدہ کی طرح اٹک کر بولتا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس نے Paddock جوتے اور جودھ پوری پتلون پہن رکھی تھی۔ اس ملبوس میں وہ چست اور پھرتیلا نظر آتا تھا۔ وہ ایک کمیت یابو پر سوار تھا۔ فلم کا یونٹ اپنی تمام تر تیاری کے ساتھ موجود تھا۔ صرف دو لوگوں کی آمد کا انتظار تھا۔ سالومن اور سمون ہوٹل کے سویٹ سے اکٹھے ہی آنے والے تھے۔ ان کے آتے ہی شوٹنگ کا آغاز ہو جاتا۔ بادل ایک دوجے سے پرے جا رہے تھے سورج بے حد چمک دار ہو گیا تھا۔ کیسا خوبصورت دن تھا۔ ہر لحاظ سے مکمل۔

احمد نے گھوڑے کی چال کے ساتھ جسم کی حرکت کو متوازی بناتے ہوئے سوچا۔

عقب میں ایک گاڑی کے انجن کی آواز گونجی۔ سائیس نے اسے گھوڑا موڑنے کو کہا۔ شاید سالومن

اور سمون آ چکے تھے۔ چوڑی پختہ سڑک کے کنارے ایک خاکستری جیپ رکی ہوئی تھی۔ اس میں سے ایک دبلا پتلا شخص باہر آیا۔ اس کی شکل پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے پاس جاتے ہوئے اس سے کچھ کہا۔ جانے اس نے ایسا کیا کہہ دیا تھا کہ ہر طرف اضطراب کی لہر سی دوڑ گئی۔ احمد کو کسی گڑبڑ کا احساس ہوا' وہ شخص کوئی ایسی خبر لے کر آیا تھا جو سرسراتی ہوئی سارے یونٹ میں ابتری پھیلا رہی تھی۔ پھر وہ احمد تک بھی آن پہنچی۔

سالومن موریل رات کے کسی پہر ہارٹ اٹیک سے مر گیا تھا۔ اسے اتنی مہلت بھی نہ ملی تھی کہ وہ اپنے ساتھ موجود سمون کو مدد کے لیے آواز دے پاتا اور صدمے سے بے ہوش سمون فاکس مین اس وقت ہسپتال میں تھی۔ احمد نے غیر ارادی طور پر لگامیں پیچھے کھینچیں اور گھوڑے کے شکم میں Paddock جوتوں کی نکیلی ایڑیاں زور سے چبھو دیں۔ گھوڑے نے اگلے سم اوپر کو اٹھا کر زمین سے ٹکرائے اور ایک دم گردن نیچے جھکا دی۔ دھچکا لگنے سے احمد کا توازن بگڑا اور وہ آگے کے رخ گر گیا۔ گھوڑے کی کنوتیوں کے درمیان سے اسے زمین بہت نزدیک نظر آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

سالومن کی موت نے سب کچھ بدل ڈالا تھا۔ فلم بندی روک دی گئی۔ فلم یونٹ واپس لاس اینجلس آ گیا۔ بہت سے دن یونہی گزر گئے۔ پھر نئے ڈائریکٹر کا تقرر ہوا۔ نئے سرے سے شیڈول ترتیب دیا گیا۔ نئے ہدایت کار نے کاسٹ میں کچھ ردوبدل کیا' اسکرین پلے میں چند تبدیلیاں کیں۔ احمد کو جو خوف لاحق تھا کہ وہ بھی ان تبدیلیوں کی نذر نہ ہو جائے۔ باطل ثابت ہوا تھا۔

ڈائریکٹر برینڈن اس سے مطمئن تھا۔ اسے الباکی جانب سے پہلے جیسے خدشات نہیں رہے تھے پھر بھی وہ اسے ناراض کرنے اور اکسانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس نے ایک پورنو میگزین کے لیے کام کیا تھا اور اسٹوڈیوز کو اس بات سے لاعلم رکھا تھا' یہ راز کھل جاتا تو اس کا بلیک بال ہونا یقینی تھا۔

سالومن کا مرنا اتنا بھی برا ثابت نہیں ہوا تھا جتنا وہ قیاس کر رہا تھا۔ اسے صرف ایک پریشانی تھی اور وہ بھی ایسی سنگین نوعیت کی نہ تھی۔ سالومن کی زندگی میں ہی سمون کا رویہ اس کے ساتھ ہتک آمیز تھا۔ اب تو وہ اس سے بات تک کرنا گوارا نہ کرتی تھی۔ اگر اس کا اسٹوڈیوز کے ساتھ معاہدہ نہ ہوا ہوتا تو شاید وہ اس فلم کو لات مار کر چلی جاتی۔ اس کی رائے میں یہ فلم ہالی وڈ کی تاریخ کی عظیم ترین box office bonbs (ناکام) کی فہرست میں شامل ہونے والی تھی اور اس کی وجہ صرف احمد تھا۔ بہر حال سمون کی بد مزاجی برداشت کرنا ایسی قیمت نہیں تھی جو وہ اتنے بڑے مقصد کو پانے کے لیے ادا نہ کر پاتا۔

ایک صبح وہ سیٹ پر آیا تو خلاف معمول سمون پہلے سے وہاں موجود تھی۔ عام طور پر وہ سب سے آخر میں آیا کرتی تھی۔ اسے لوگوں کی نظروں میں کچھ عجیب سا تاثر نظر آیا تھا۔ اس کے قریب پہنچنے سے قبل سمون اپنی جگہ سے اٹھی اور تیز قدموں سے چل کر اس کے پاس آئی۔ احمد نے اس کی پیشانی پر پڑی سلوٹوں کو گہرا ہوتے دیکھا تھا۔ کچھ دیر وہ خاموشی سے کھڑی اسے گھورتی رہی پھر اچانک ہاتھ اٹھا کر تہہ کیا ہوا اخبار اس کے منہ پر اچھال دیا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا' اتنی ذلت کو سہنے کا حوصلہ وہ اپنے اندر نہیں پا رہا تھا لیکن بدن میں گھستی ہوئی لوگوں کی نگاہوں کے بیچ آنکھیں جھکائے کھڑا رہا۔

"اسے اٹھاؤ اور پڑھو۔ اپنے بارے میں کچھ ضروری معلومات فراہم کرنا تم بھول گئے ہو۔" اس کا دل اتنی زور سے دھڑکا جیسے ابھی پسلیوں کو توڑ کر باہر آ جائے گا۔ اس کے ہاتھ بے اختیار کپکپانے لگے تھے۔ کیا کسی نیوز رپورٹر نے اسے اس پورنو گرافک رسالے میں شناخت کر لیا تھا اور اس حوالے سے خبر چھاپ دی تھی۔ اس کے علاوہ کیا ہو سکتا تھا۔ جس پر سمون اس درجہ بھڑکی ہوئی تھی۔ جھک کر اس نے

اخبار اٹھایا اور وہ خبر تلاش کرنے لگا۔ گھبراہٹ میں وہ بار بار صفحات کو الٹ پلٹ رہا تھا۔ سمون نے اس کی مشکل آسان کردی۔ مطلوبہ خبر پر انگلی رکھتے ہوئے وہ بولی۔

"یہ الفاظ تمہاری توجہ کے طالب ہیں۔ غور سے پڑھو اور اپنی ماہرانہ رائے بھی دو۔ ہر چیز کے بارے میں تمہارا ایک منفرد اور دو ٹوک نقطہ نظر ہے۔"

احمد نے وہ خبر دیکھ لی۔ اس کے ساتھ وہ mug shots شائع ہوئے تھے جو تیرہ سال قبل اسپرنگ فیلڈ کے ایک پولیس اسٹیشن میں لیے گئے تھے ان میں سے فرنٹ ویو والے شاٹ میں وہ مسکراتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ mug shots کے لیے مسکرانا کس قدر معیوب لگ سکتا ہے۔ یہ اسے اس روز معلوم ہوا تھا۔ اس نے سمون اور وہاں موجود دوسرے لوگوں کو بتانا چاہا کہ تصویر میں نظر آنے والی مسکراہٹ غیر ارادی تھی۔ اس نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا تھا۔ وہ اتنا بے وقوف کیسے ہو سکتا تھا۔ خبر کو پڑھ لینے کے بعد اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ سب نظریں اس پر ٹکی تھیں۔ اس کا کہیں چھپ جانے کو جی چاہا لیکن بعض اوقات چھپنے سے بات نہیں بنتی۔

"تم نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ یہ خبر یقیناً" جھوٹی ہوگی۔ تمہاری نیک نامی کو گزند پہنچانے کی ایک سازش۔"

اس نے سمون کو چیختے سنا۔ "تمہیں دیکھتے ہی میری چھٹی حس پکارنے لگی تھی کہ تم کسی گندے جوہڑ کے کیڑے ہو۔ خدا کی لعنت ہو تم پر۔"

اس نے جواب میں کچھ کہنا چاہا مگر ان کی آواز نہ نکلی۔ اس کے ہونٹ ذرا سا کھل کر بند ہوگئے' آخر وہ کہہ بھی کیا سکتا تھا۔ اسے احساس تھا کہ اس کی خاموشی اس کے قصوروار ہونے پر تصدیق کی مہر لگا رہی تھی مگر وہ الفاظ کہاں سے لاتا۔

"میں اس فلم میں کام نہیں کروں گی۔ میرا کنٹریکٹ terminate (ختم) کردیا جائے' چاہے سارے موی اسٹوڈیوز میرا بائیکاٹ کردیں۔ میں کوئی بھی قیمت چکانے کو تیار ہوں مگر تم اس فلم کا حصہ رہے تو میرا سفر یہیں ختم ہوتا ہے۔ تم rapist ہو۔ قاتل ہو۔ جانے اور نہ جانے کیا کیا ہو جس کا ہمیں ابھی پتہ نہیں۔" سمون نے اس سے زیادہ ڈائریکٹر برینڈن کو سناتے ہوئے کہا جو ابھی ابھی سیٹ پر آیا تھا' وہ ابھی تک اخبار میں شائع ہونے والے قصے سے لاعلم تھا۔ اس کے استفسار پر سمون نے احمد کے بے جان ہاتھ میں معلق اخبار کھینچ کر اس کے حوالے کردیا۔ اس خبر کو دیکھ کر برینڈن کا چہرہ متغیر ہوگیا تھا۔

"کیا یہ خبر سچ ہے؟ تم کسی موناا سٹوکر سے واقف ہو۔"

وہ چپ رہا۔

"میرے ساتھ آؤ۔ میں تم سے علیحدگی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ اسے لے کر ایک تنہا گوشے میں آگیا۔

"یہ منحوس صحافی بھی کیسی کیسی جگہیں کھود ڈالتے ہیں۔ گرانٹ! تم نے یہ بات کیوں چھپائی کہ تم پر ایک نن پر مجرمانہ حملے کا الزام تھا۔"

"وہ نن نہیں تھی۔ وہ تو بس ارادہ رکھتی تھی۔" احمد نے لجاجت سے کہا۔

"اور تمہارے ہاتھوں ایک پولیس آفیسر کا خون ہوا؟"

"میں نے اس پر گولی نہیں چلائی تھی۔ میں تو صرف اسے دھمکا رہا تھا۔ مجھے تو ٹھیک سے ریوالور پکڑنا بھی نہیں آتا تھا۔" اس کی آنکھ سے ایک آنسو بہہ کر گال پر پھسلنے لگا۔ "عدالت نے میرا ریکارڈ سیل کردیا تھا۔ میں تب نابالغ تھا۔ جج کو مجھ سے بہت ہمدردی تھی۔ اس نے مجھے صرف پانچ سال کی قید سنائی تھی اور ڈیڑھ سال پروبیشن۔ اگر میں ایسا ہی گھناؤنا مجرم ہوتا جیسا اس رپورٹر نے مجھے دکھانے کی کوشش کی ہے تو مجھے اتنی کم سزا کیوں ملتی۔ میں اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کروں گا۔"

"تو تمہیں convict (فیصلہ) کردیا گیا تھا؟ تم ان جرائم میں سزا بھی بھگت چکے ہو۔ او میرے خدا! تم کتنے بڑے دھوکے باز ہو۔"

"یہ سب میرے خلاف سازش ہے۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ میری بات سنو' میں بالکل قصوروار نہیں ہوں۔" وہ پاگلوں کی طرح ہاتھ ہلا ہلا کر کہہ رہا تھا۔

وہ ایک ایسے بحری جہاز میں سوار تھا جس کے پیندے میں سوراخ ہوچکا تھا اور اس شگاف سے اندر آتے ہوئے ہلاکت خیز پانی کو روکنے کے لیے اس کے پاس ہتھیلیوں کے سوا کچھ اور نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کے قدموں تلے سے محض سرخ قالین نہیں کھینچے گئے تھے' ان کے ساتھ زمین بھی کھینچ لی گئی تھی۔ پام کے درخت اس پر جھکے نہیں تھے اس پر گر گئے تھے۔

مارگریٹ منرو کا وہ گیت جو برسوں اس کے کانوں میں رس گھولتا رہا تھا' اس کی حقیقت اب اس پر واضح ہوئی تھی۔ وہ تو دیومالائی جن دیویوں کا زہریلا نغمہ تھا جسے وہ مسافروں کو بھٹکانے اور انہیں فنا کرنے کے لیے گاتی تھیں۔

اسٹوڈیو نے احمد کا معاہدہ منسوخ کیا تو اسے قطعاً" حیرت نہیں ہوئی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اس کے کانوں میں پرنیاں کے آخری الفاظ گونج رہے تھے۔

"خدا جب منہ کے بل گراتا ہے تو ٹھوکر کھانے کے لیے رکاوٹ کی ضرورت نہیں پڑتی۔"

اس کا رستہ روکنے والا کسی مقامی اخبار کا کوئی صحافی نہیں تھا۔ وہ سمون بھی نہیں تھی۔ وہ کوئی اسٹوڈیو بھی نہیں تھا۔ اس کے ساتھ جو ہوا تھا وہ خدا نے پہلے سے طے کر رکھا تھا۔ بے کار اس نے اتنے ہاتھ پاؤں مارے' بے جا خود کو تھکا کر ادھ موا کرلیا۔ وہ کچھ بھی کرلیتا۔ خدا کی مرضی ہی نہیں تھی تو نتیجہ مختلف کیسے نکلتا۔ اب اس کی سمجھ میں آرہا تھا کہ الباا سے روکتی یا نہ روکتی۔

سالومن موریل اس کے پورنوگرافک میگزین میں کام کرنے پر معترض ہوتا یا نہیں۔ اس کی موت سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ہونا وہی تھا جو اس کے ساتھ ہوچکا تھا۔

اسے درد ہو رہا تھا' آج سے پہلے کبھی اس نے ایسی تکلیف محسوس نہیں کی تھی۔ جب ابراہیم اسے چمڑے کی بیلٹ سے پیٹتا اور اس مار سے اس کی پیٹھ پر بدھیاں پڑ جاتیں تب بھی ایسا درد نہیں ہوتا تھا' جس رات موناا سٹوکر اس کے گھر سے ہمیشہ کے لیے چلی گئی تھی۔ تب بھی ایسی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ جب جج نے اسے پانچ سالوں کے لیے جیل میں بند کرنے کا حکم دیا تھا' اس وقت بھی نہیں۔ جب اسے van nuys کے اسٹوڈیو میں لورکا کے لیے کام کرنا پڑا تھا' تب بھی نہیں۔ کسی بھی موقع پر اس نے ایسی اذیت محسوس نہیں کی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ درد کی ایسی کوئی صورت بھی ہو سکتی ہے۔ وہ کس طرح اسے روکتا۔ ہر علاج اس درد کے سامنے بے بس تھا' بڑے دنوں بعد اسے ابراہیم یاد آرہا تھا۔

"یہ قرآن کا دل ہے۔ جب کوئی جان کنی کی تکلیف میں ہو تو اسے پڑھنے کی ہدایت ہے۔ اور میں دیکھ رہا ہوں' تم بہت تکلیف اٹھانے والے ہو۔ تمہیں اس کی بہت ضرورت پیش آئے گی۔"

ابراہیم نے اسے چھ ماہ میں وہ سورۃ یاد کروائی تھی۔ تقریباً" ہر روز وہ ابراہیم کے ہاتھوں مار کھایا کرتا تھا مگر ایک دن میں ایک پوری آیت بھی یاد نہیں کرپاتا تھا۔ ابراہیم نے کہا تھا کہ اسے مستقبل میں اس کی ضرورت پیش آنے والی ہے اور آج وہ دن آگیا تھا۔ ابراہیم کی پیش گوئی سچ ہوگئی تھی۔

اسے ابراہیم اتنا یاد کیوں آرہا تھا یا شاید اسے ابراہیم نہیں خدا یاد آرہا تھا۔ خدا کے ان الفاظ کو دہرا کر ہی وہ اس درد سے چھٹکارا پا سکتا تھا۔ وہ باتھ روم میں گیا اور وضو کرنے کے ارادے سے نل کھولا۔ ہاتھ دھوتے ہوئے اسے احساس ہوگیا کہ اسے وضو کا درست طریقہ یاد نہیں تھا۔ پہلے چہرہ دھویا جاتا ہے یا بازو۔ وہ متذبذب ہو کر بہتے ہوئے پانی کو دیکھنے لگا۔ خاصی دیر

سوچتے رہنے کے بعد اس نے ہاتھ کے ساتھ کہنیوں تک بازو دھو لیے اور منہ پر پانی کے چھپاکے مارنے لگا۔

"لیکن منہ دھونے سے پہلے ناک میں بھی تو پانی ڈالا جاتا ہے اور کلی بھی کی جاتی ہے اور پتا نہیں ترتیب میں ان کاموں کی جگہ کہاں ہوتی ہے؟"

"کیا ترتیب کو نظر انداز کرنے سے وضو ہو جاتا ہے۔" اسے اس سوال کا جواب معلوم نہیں تھا۔ زور سے اپنے ہاتھ واش بیسن سے ٹکراتے ہوئے وہ رونے لگا۔ باتھ روم کے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے اس کی نگاہ پیروں کی جانب گئی اور وہ الٹے قدموں واپس اندر چلا گیا۔

"ہاں پاؤں بھی دھوئے جاتے ہیں۔"

اپارٹمنٹ کے ایک کونے میں گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے اس نے سورۃ کا آغاز کرنا چاہا۔ اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا تھا۔ اسے کچھ بھی یاد نہیں آرہا تھا' ذہن پر زور دے کر اس نے سوچنے کی کوشش کی۔ اس کا حافظہ غیر معمولی حد تک مضبوط تھا۔ کرداروں کے مکالمے یاد کرنے کے لیے اسے کسی فلم کو دوسری دفعہ دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ قرآن کی جو سورہ ذہن نشین کرنے میں اس نے چھ ماہ لگائے تھے' اس کے چند الفاظ بھی اس کی یادداشت میں نہ رہے ہوں' وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگا' اسے ایک آیت تو کیا' ایک لفظ بھی یاد نہیں آرہا تھا۔ حتیٰ کہ اس سورۃ کا نام بھی اس کے ذہن سے محو ہو چکا تھا۔

اسے یقین تھا کہ خدا کا کلام ہی اس کی تکلیف کو کم کر سکتا تھا' پر وہ اسے بھول کیسے گیا تھا؟ اچانک اسے ایک خیال آیا اور وہ کار کی چابی اٹھا کر بھاگتا ہوا باہر نکل گیا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ ہالی ووڈ سٹی یا اس کے آس پاس کوئی مسجد تھی یا نہیں۔ اس نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔ پہلے اس نے کوئی مسجد تلاش کرنے ارادہ کیا مگر اس تکلیف کو سہنے کی اس میں ذرا بھی سکت باقی نہ تھی۔ جو ہر گزرتے لمحے کے ساتھ وہ شدید تر ہوتی جاتی تھی اور مسجد ڈھونڈنے میں جانے کتنا وقت لگ جاتا۔ اس نے قریبی مارکیٹ کا رخ کیا۔ ایک بڑی بک شاپ کے سامنے گاڑی روک کر وہ بھاگتا ہوا شاپ کے اندر داخل ہوا اور کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی لڑکی کو مخاطب کر کے اونچی آواز میں بولا۔

"تمہارے پاس قرآن ہے۔ خدا کی کتاب۔" اس کے گالوں پر جمے ہوئے خشک آنسوؤں کے دھبے تھے اور مسلسل رونے سے اس کی ہچکی بندھ چکی تھی۔

لڑکی نے حیرت سے اسے روتے ہوئے دیکھا تھا'

"میں معذرت چاہتی ہوں جناب! ہمارے اسٹاک میں موجود نہیں ہے۔"

وہ مڑ کر اسی رفتار سے باہر نکل گیا۔ اگلے دو گھنٹوں میں اس نے کئی کتابوں کی دکانیں دیکھ ڈالی تھیں۔ کہیں بھی اسے اپنی مطلوبہ کتاب نہیں ملی تھی۔ اس کی تکلیف میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ چھٹی یا شاید ساتویں دکان کے بوڑھے میکسیکن مالک نے اسے ہاں میں جواب دیا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ میکسیکن بوڑھے کے ہاتھ چوم لے۔

قرآن اس کے ہاتھوں سے تقریباً "چھینتے" ہوئے وہ گاڑی تک آیا تھا اور گاڑی کی اندرونی بتیاں روشن کر کے قرآن کو درمیان سے کھولتے ہوئے سامنے پھیلا لیا تھا۔ اسے لگا جیسے اس کی بینائی چلی گئی ہو۔ وہ اندھوں کی طرح قرآن کے صفحوں کو ٹٹولنے لگا۔

قرآن کا وہ نسخہ اسپینش میں تھا اور احمد اسپینش زبان پڑھنا نہیں جانتا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ بیبل کو ساتھ لیے بازار میں بے مقصد گھوم رہی تھی کہ جوتوں کی اس مخصوص دکان کے سامنے حسبِ عادت رک گئی۔ بے اختیار اسے دھچکا لگا تھا۔ شیشے کی دیوار کے پار ایک سیلز بوائے قرمزی رنگ کے جوتوں کے جوڑے کو اس کی مخصوص جگہ سے نکال رہا تھا۔ اس کے عقب میں ایک خوش رو بلونڈ (سرخ بالوں والی لڑکی) چمک دار نیلی آنکھوں میں اشتیاق لیے کھڑی تھی۔ سیلز بوائے نے نیچے جھکتے ہوئے لڑکی کو جوتے پہننے میں مدد دی۔ اب وہ آگے پیچھے چلتے ہوئے

ان کی پرکھ کر رہی تھی۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ وہ لڑکی ان جوتوں کو رد کردے۔ مگر اسے یہ خیال احمقانہ لگتا تھا۔

وہ جوتے اس قدر شان دار تھے کہ کوئی بھی انہیں ناپسند نہیں کرسکتا تھا۔ لڑکی کے انداز سے اطمینان اور خوشی ظاہر ہوتی تھی۔ اس نے ایک اسٹول پر بیٹھتے ہوئے جوتوں کو پیروں سے الگ کیا اور اپنے پرس میں سے کوئی چیز نکالی جسے اس نے سیلز بوائے کے حوالے کردیا تھا۔ شاید وہ کریڈٹ کارڈ تھا۔ صوفیہ کے لیے مزید اس منظر کو دیکھنا محال ہوگیا۔

اس کے ساتھ کھڑے میبل نے اس کی قمیص کی آستین پکڑ کر کھینچی تو وہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ اسے میبل کی یہ عادت بہت ناگوار لگتی تھی کہ جب وہ اس کے قریب موجود ہوتا تو اس کو مخاطب کرنے کے لیے زبان ہلانے کے بجائے ہاتھوں کو استعمال کرتا، کبھی وہ اس کا دامن پکڑ کر جھٹکا دیتا تو کبھی آستین کھینچنے لگتا۔

"کیا چیز تمہیں تکلیف پہنچا رہی ہے؟" اس نے کرختی سے کہتے ہوئے ایک کڑی نگاہ میبل پر ڈالی۔ وہ بھی اسی شاپ کی جانب دیکھ رہا تھا جہاں اب وہ لڑکی ایک خوب صورت شاپنگ بیگ ہاتھ میں لٹکائے دروازے سے باہر آرہی تھی۔

"وہ لے کر جارہی ہے۔" اس نے اپنی بھدی انگلی سے اشارہ کیا۔

"تو کیا کروں؟ اب وہ اس کی ملکیت ہیں۔ اسے لے جانے سے روک تو نہیں سکتی۔ کیا تم روک سکتے ہو؟ ہاں کیوں نہیں۔ تمہارے لیے ایسا کرنا کچھ مشکل نہیں ہوگا۔" اس نے تمسخر اڑایا۔

"وہ تمہیں اچھے لگتے ہیں۔ مجھے برا لگ رہا ہے۔"

"وہ نہیں رہے۔ بات ختم۔ مجھے وہ کیسے لگتے تھے۔ اس سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دنیا کی کوئی بھی اچھی چیز میرے لیے نہیں ہے۔ تم جب کچھ کر نہیں سکتے تو مجھے بے زار بھی نہ کرو۔ تم انتھونی کی دراز سے کچھ نقدی چرا لیتے تو آج مجھے یہ برداشت نہ کرنا پڑتا۔"

میبل کو شاید اس کی بات مضحکہ خیز لگی تھی۔

"میں بات کرتا ہوں، مجھے کوشش کرنے دو۔ میں اسے جانتا ہوں۔" اس نے پھر سے فٹ پاتھ پر چلتی ہوئی سرخ بالوں والی لڑکی کے رخ بازو لہرایا۔

لڑکی کی ڈھیلی ڈھالی چال بتا رہی تھی کہ اسے فرصت میسر تھی۔ ہر دو قدم پر رک کر وہ کسی نمائشی الماری میں کھو جاتی تھی۔

"اشارہ مت کرو۔ لوگ متوجہ ہوں گے اور تم اس سے کیا بات کرو گے۔ کیسے جانتے ہو تم اسے؟" میبل بیساکھی سنبھالتا ہوا چل دیا اور جاتے ہوئے گردن گھما کر بولا۔

"میں ٹیٹو پہچانتا ہوں۔ وہ انتھونی کے گیراج میں آئی [illegible]" صوفیہ نے غور کیا وہ واقعی لڑکی کی گردن پر [illegible] کی رنگت کی [illegible] مچھلی گدی ہوئی تھی۔ اس نے میبل کو رکنے کا کہا مگر ان سنی کرکے وہ لڑکی کے قریب جا کر کچھ کہنے لگا۔

زیر لب بڑبڑاتے ہوئے وہ ایک بڑے ستون کی اوٹ میں ہوگئی۔ کسی تماشے کا حصہ بننے سے بچنے کے لیے بہتر تھا کہ وہ میبل سے کوئی تعلق ظاہر نہ ہونے دے۔ اسی لیے اس نے خود کو پوشیدہ کرلیا تھا۔ ایک بار اس کے جی میں آئی کہ میبل کو وہیں چھوڑ کر چلی جائے۔ لیکن پھر تجسس کے ہاتھوں مجبور ہوکر وہیں ٹھہر کر اس لڑکی کے تاثرات سے اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگی کہ ان دونوں کے درمیان کیا بات ہو رہی تھی۔

لڑکی خوف زدہ نظر آئی تھی اور اس کے تیوروں سے لگتا تھا کہ وہ کسی بھی آن چلانا شروع کردے گی۔ میبل کی ہیئت بھی اس نوع کی تھی کہ اسے اپنے قریب پاکر کسی بھی نفیس طبع انسان کا کبیدۂ خاطر ہو جانا ایک فطری امر تھا۔ اس وقت تو یوں بھی دھمکی آمیز طریقے سے ہاتھ ہلاتا ہوا وہ بے حد خطرناک ظاہر ہو رہا تھا۔

وہ لڑکی بدحواسی کے عالم میں دائیں بائیں دیکھ رہی تھی۔ شاید اسے میبل سے چھٹکارا پانے کے لیے مدد درکار تھی۔ میبل ایک ناقابل عبور رکاوٹ بن کر اس کا راستہ روکے کھڑا تھا اور منہ سے کف اڑاتے ہوئے تیز تیز کچھ کہہ رہا تھا۔ پھر اس نے میبل کو لڑکی کے شاپنگ بیگ والے ہاتھ پر جھپٹتے دیکھا۔ وہ اس سے جوتوں والا لفافہ چھیننے کی کوشش کر رہا تھا۔ گھبرائی ہوئی لڑکی نے شور مچانا شروع کردیا تھا۔

صوفیہ اس صورت حال سے محظوظ ہونے لگی تھی۔ زیادہ فاصلے پر ہونے کی وجہ سے وہ ان کی آوازیں وضاحت سے نہیں سن سکتی تھی اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ قریب جا کر ان کی تکرار سنے جو یقیناً "دلچسپ" ہوگی، مگر وہ اتنی غیر محتاط نہیں تھی۔ اس لیے جو دستیاب تھا اسی پر اکتفا کرکے اپنے قیام کی جگہ سے سارا معاملہ دیکھتی رہی۔ لڑکی کے واویلے پر چند لوگ ان کے گرد جمع ہونے لگے۔

ان لوگوں میں اس دکان کا سیلز بوائے بھی شامل تھا، جہاں سے کچھ دیر قبل وہ خریداری کرکے نکلی تھی اور اپنی معزز گاہک کا دفاع کرنے میں پیش پیش دکھائی دیتا تھا۔ میبل نے اتنے لوگوں کو اپنے مقابل پاکر فوراً ہی پسپائی اختیار کرلی تھی۔ خیر گزری کہ اس لڑکی یا ان راہ گیروں میں سے کسی نے پولیس کو بلانے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ خاصی دیر میبل ادھر ادھر تلاش کرتا رہا اور اسے ڈھونڈ نہ سکا۔ جب اس نے لوگوں کے مختصر گروہ کو منتشر ہوتے دیکھا تو ستون کے عقب سے نکل کر میبل کے سامنے آگئی۔

"تمہیں کیا لگا تھا وہ بھیک میں اپنی تین سو ڈالر کی خریداری تمہارے حوالے کردے گی۔ جغد کہیں کے۔" اس نے کہا تو میبل کا چکنائی زدہ گھنگھریالے بالوں والا سر جھک گیا۔

"وہ نہیں مانی، وہ ایک بے وقوف لڑکی ہے۔"

"یہ بتاؤ، تم نے اس سے جوتے چھین کیوں نہیں لیے۔ کیا اس کی گرفت تم سے زیادہ مضبوط تھی۔ تم کسی لاچار بڑھیا کی طرح اس سے زور آزمائی کررہے تھے۔"

"نہیں۔ وہ میں لے سکتا تھا، ایسا نہیں ہے، میں بھاگتا کیسے۔" اس نے شرمندگی بھرے لہجے میں کہا۔

☼ ☼ ☼

سیاہ پشم والی بلی جیسی رات روشن دان میں گھات لگائے بیٹھی تھی۔ اگلے پنجوں کو چھاتی سے چمٹائے کمر اٹھا کر وہ حملہ کرنے کو تیار تھی۔ کمرے کے ایک گوشے میں چلتے ٹیبل لیمپ کی سہمی ہوئی روشنی ایک زرد چوہیا تھی جو اس دشمن کی نیت سے انجان تھی۔ وہ کالی بلی اس زرد چوہیا پر کسی بھی پل جھپٹنے والی تھی۔ بس وہ موزوں لمحے کی تاک میں تھی۔

وہ کھلی آنکھوں کے ساتھ بستر پر پہلو کے بل لیٹی تھی اور یورپی دیوار کی جڑ میں لگے lenolevn کے نمونے کو دیکھنے کی کوشش کررہی تھی۔ اس سمت پچھے ہوئے کونے جیسا جھر جھرا اندھیرا پھیلا تھا اور دیوار کا وہ حصہ صاف ظاہر نہ ہوتا تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ لگے ہوئے lenoleyn میں گہری بھوری اور اودی مثلثیں بنی تھیں، پھر بھی پچھلے کئی منٹ سے نیم تاریک فضا میں وہ ان رنگوں کو شناخت کرنے میں کوشاں تھی۔

کھڑکی کے شیشے کو کسی نے انگلی سے ٹھکورا۔ اس نے بستر سے اترتے ہوئے پردہ ہٹایا تو میبل پر نظر پڑی۔ اسٹریٹ لائٹوں کی روشنی میں وہ ایک سیاہ بت کی طرح ایستادہ تھا۔ اس کے حلیے میں کوئی ایسی بات تھی جو پہلی نظر میں صوفیہ کو سمجھ نہ آسکی۔ وہ الجھن زدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی اور پھر اس پر عیاں ہوا کہ میبل نے البا کا وہ کاسٹیوم پہن رکھا تھا جو کچھ دن پہلے وہ اس سے مانگ کر لے گیا تھا۔ درمیانی جسامت کی کسی عورت کو تو وہ لباس با آسانی پورا آسکتا تھا۔ مگر میبل جیسے دیوہیکل کے جسم پر وہ یوں نظر آتا تھا جیسے اس نے بدن

پر کسی گڑیا کی پوشاک چڑھا رکھی ہو۔ کئی جگہ سے سلائیاں ادھڑی ہوئی تھیں اور اس کا سیاہ گوشت ان مقامات سے جھانک رہا تھا۔

"کیا منحوسوں جیسا حلیہ بنا رکھا ہے۔ تمہارے دماغ میں ایسے واہیات خیال آتے کہاں سے ہیں؟"

"میں کیسا لگ رہا ہوں؟" اس نے جھینپ کر پوچھا۔

"یہ پوچھنے کی ضرورت تمہیں کیوں پیش آئی۔ کیا آئینہ دیکھ کر نہیں نکلے گھر سے۔ ویسے تم اتنی خصوصی تیاری کے ساتھ اس وقت میرے پاس کیوں آئے ہو۔ کیا مجھے ڈیٹ پر لے جانے والے ہو؟"

میبل کے موٹے ہونٹ جن پر خشکی سے جھریاں پڑی تھیں، ذرا سے کھل گئے۔ اس کو دیکھے بنا وہ دھیمی آواز میں بولا۔ "تم چلو گی۔"

"کہاں؟" اس نے ہاتھوں سے بالوں کو سمیٹتے ہوئے لاپروائی سے پوچھا۔

"میں تم سے کہوں، میرے ساتھ ڈیٹ پر چلو تو تم چلی جاؤ گی؟"

"ہاں میں راضی ہو سکتی ہوں، لیکن تم نے تو کہا ہی نہیں۔"

"میں کہہ رہا ہوں۔" میبل کی آواز اتنی اونچی ہو گئی کہ صوفیہ کو ہاتھ رکھ کر اس کا منہ بند کرنا پڑا۔

"تم مجھے کہاں لے کر جاؤ گے؟"

وہ چند لمحے آنکھوں کے ڈیلے گھماتا رہا، پھر کندھے اچکا دیے۔ "پتا نہیں۔"

"کیا تمہیں معلوم ہے ڈیٹ پر کیوں جاتے ہیں؟"

"پتا نہیں۔" اس کی سوئی پتا نہیں پر اٹک گئی تھی۔

"اب اگر کسی بات کے جواب میں تم نے پتا نہیں کہا تو میں تمہارا جبڑا توڑ دوں گی۔"

میبل جو کھلکھلاتے ہوئے شاید ایک بار پھر وہ ہی کہنے والا تھا، خاموش ہو کر سرہلانے لگا۔

"اچھا اتنا تو معلوم ہو گا کہ ڈیٹ پر جانے سے پہلے مجھے کیا کرنا ہو گا؟"

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر زور سے سرہلاتے ہوئے بولا۔ "تمہیں باہر آنا ہو گا۔"

صوفیہ نے ایک طویل سانس بھری۔ "صحیح کہا۔ میں باہر آتی ہوں۔ گرانٹ آج دوپہر سے اپنے کمرے سے نہیں نکلا۔ لگتا ہے اس نے کوکین کی ضرورت سے زیادہ مقدار استعمال کر لی ہے۔ تم دوسری طرف سے آؤ اور دروازے کے باہر ٹھہر کر میرا انتظار کرو۔ میں جوتے پہن کر آ رہی ہوں۔" وہ کھڑکی بند کر کے پلٹنے لگی تو میبل شیشے کو ہتھیلی سے بجانے لگا۔ وہ مڑ کر دوبارہ کھڑکی تک آئی تھی۔

"تم کھڑکی سے باہر آ جاؤ، مجھے انتظار کرنا اچھا نہیں لگتا۔ میں تھک جاتا ہوں۔"

"تم ایسا کرو کہ اس کھڑکی کے راستے میرے کمرے میں آ جاؤ۔"

وہ جھکتا ہوا آگے آیا اور ایک ہاتھ سے دیوار کا سہارا لیتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے بیساکھی اسے تھما دی۔

"میں نہیں کر سکتا۔ میں گر جاؤں گا۔"

"کوشش تو کرو۔"

گھبرائے ہوئے میبل نے جوں ہی کھڑکی میں پھیلی گھنی بیل کے پتوں پر ہاتھ رکھ کر بدن کا دباؤ ڈالا اس کے حلق سے بے اختیار سسکاری نکل گئی۔ اس نے چھپکلی کی طرح دیوار سے جھٹتے ہوئے فوراً ہاتھ ہٹا لیا تھا۔

"اب تو تمہیں معلوم ہو گیا ہو گا کہ میں کھڑکی کے راستے باہر کیوں نہیں آ سکتی۔" صوفیہ نے بیل کے پتوں کے کچھ گچھے ہٹا کر کھڑکی کا نچلا سرا نمایاں کیا تو کنکریٹ کی چوڑی دیوار میں پروئے ہوئے کانچ کے ٹکڑے، بڑی قینچیں خاردار تار کے لچھے اور آہنی گوکھرو نظروں کے سامنے آ گئے۔

"تم سے پہلے گرانٹ نے یہ بات سوچ لی کہ میں اس کھڑکی کے ذریعے گناہ کرنے باہر جا سکتی ہوں۔ یہ کیلیں اتنی مضبوط ہیں کہ سخت سے سخت جوتے کا سول آسانی سے پھاڑ سکتی ہیں۔ یوں بھی مجھے کھڑکیاں

پسند نہیں۔ آنے جانے کے لیے دروازے ہی اچھے ہوتے ہیں۔ ان کو دونوں طرف سے کھولا جا سکتا ہے۔ لیکن کھڑکیاں صرف اندر سے کھلتی ہیں۔ تم دروازے پر آؤ۔ میں تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرواؤں گی۔" بیساکھی اسے لوٹاتے ہوئے صوفیہ نے کہا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں سنسان سڑک پر سمت کا تعین کیے بغیر نہایت سست روی سے چلے جا رہے تھے۔ ہوا رکی ہوئی تھی اور صنوبر کے اونچے درخت سڑک کے جانب صفیں باندھے دم سادھے کھڑے تھے۔ زعفرانی چاند اون کے کھلتے ہوئے گولے کی مانند ایک سمت لڑھکتا چلا جاتا تھا۔ اکا دکا گزرتی ہوئی گاڑیوں کی لمحاتی مداخلت کے سوا مکمل سکوت طاری تھا۔

"تمہارا پسندیدہ بیوریج کون سا ہے؟"

"صرف Jim Beam۔" میبل نے بلاتوقف جواب دیا۔

"وہ کیوں؟"

"اس کا نام اچھا ہے۔"

"کسی مشروب کا نام اچھا ہونے سے وہ تمہارا پسندیدہ کیسے ہو گیا۔ کوئی اور وجہ بھی تو ہو گی۔ جیسے ذائقہ یا اس کو پینے سے پیدا ہونے والی کیفیت...؟"

"اور اس لیے بھی کہ وہ سستا ہے۔" میبل نے بے تاثر آواز میں بتایا۔

"تمہیں میں کیوں پسند ہوں؟"

"تم ہنستی ہو تو تمہارے منہ سے تھوک نہیں اڑتا، اس لیے۔" اس بار بھی اس نے تامل کیے بغیر کہا تھا۔

"تمہارے پاس چیزوں کو پسند یا ناپسند کرنے کے لیے کتنی سادہ وجوہات ہیں۔ کبھی کبھی مجھے تم پر رشک آتا...."

ان سے کچھ فاصلے پر جہاں سڑک بل کھا کر جنوب کو مڑ جاتی تھی، مخالف سمت سے آتی ہوئی ایک تیز رفتار گاڑی نے چند سیکنڈ کے لیے رفتار دھیمی کی، انہوں نے پسنجرز سائیڈ کا دروازہ کھلتے اور ایک انسان کو جو اپنی وضع سے عورت معلوم ہوتی تھی، باہر سڑک پر گرتے دیکھا۔ آنکھوں کو چندھیا دینے والی ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی ان پر پڑی اور گاڑی ریورس گیئر میں بھاگ پڑی۔ شاید اس عورت کو باہر دھکیلنے سے قبل ڈرائیور کی ان پر نظر نہیں پڑی تھی اور سڑک کو ویران جانتے ہوئے اس نے اس جگہ کو منتخب کیا تھا۔ درحقیقت رات کے ان اوقات میں رہائشی آبادی کا یہ حصہ آمدورفت سے عاری رہتا تھا۔ اگر اتفاقاً وہ دونوں اس جگہ موجود نہ ہوتے تو وہ جو کوئی بھی تھا اپنا کام کسی کی نظروں میں آئے بنا یوں کر سکتا تھا۔

جتنی دیر میں وہ اس صورت حال کو شعوری طور پر قبول کرپاتے تب تک وہ گاڑی ان کی بینائی کی حد سے باہر جا چکی تھی۔ سڑک پر آڑی ترچھی پڑی ہوئی عورت اگر مردہ نہیں تھی تو بھی بے ہوش ضرور تھی، کیونکہ اس کے جسم میں کسی حرکت کے آثار ظاہر نہ ہوئے تھے۔ ان دونوں نے آپس میں کوئی بات نہ کی اور میبل چند قدموں کا فاصلہ طے کر کے اس عورت کے پاس چلا گیا۔ صوفیہ وہیں جمی اس کی طرف سے کسی ردعمل کا انتظار کرنے لگی۔ میبل زمین پر گھٹنا ٹیکتے ہوئے نیچے بیٹھ کر اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

"یہ وہ ہی ہے، جلدی یہاں آؤ۔" اچانک وہ جوش سے چلایا۔ "تمہارے جوتے اس کے پاس ہیں، ادھر آ کر دیکھو، وہ ہی جوتے ہیں، تمہارے پسندیدہ بھاگ کر یہاں آؤ۔"

میبل کی لایعنی باتیں سن کر وہ الجھ گئی اور بلا ارادہ اس سمت چل دی۔ قریب جانے پر میبل کے بے ربط جملوں کا مفہوم واضح ہو گیا تھا۔ سڑک پر بے سدھ لیٹی ہوئی لڑکی وہ ہی تھی، جسے محض دو دن پہلے اس نے بازار میں اپنے پسندیدہ جوتے خریدتے دیکھا تھا۔ اس بات میں شک کی کوئی گنجائش نہ تھی۔

اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں اس کی گردن پر گدی ہوئی بڑی سی مچھلی اصلی پارے کی مانند چمک رہی تھی اور وہ قرمزی جوتے بھی اس وقت اس کے پیروں میں موجود تھے۔ اس کے سر یا شاید ماتھے پر کہیں چوٹ لگی تھی، کیونکہ سر کے بال چپچپے اور مڑے ہوئے تھے اور پیشانی خون آلود تھی۔ اس کے علاوہ کوئی زخم تھا تو وہ

جسم کے کھلے ہوئے حصوں پر نہیں تھا۔ بہر حال وہ زندہ تھی۔ وہ دقت سے نتھنے کھینچ کر سانس لے رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے پپوٹے پوری طرح بند نہیں تھے اور پتلیاں الٹ کر حلقوں میں گھسی تھیں۔

"میری مدد کرو۔ میں اکیلا نہیں کر سکتا۔"

میبل کی آواز سن کر وہ چونکی۔ وہ ایک ہاتھ سے بیساکھی سنبھالے ہوئے دوسرے ہاتھ سے لڑکی کے جوتے کا اسٹریپ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کیا کر رہے ہو؟ پاگل مت بنو۔"

"یہ جوتے تمہارے ہو جائیں گے، اس کو پتا نہیں چلے گا۔"

وہ اپنے شولڈر بیگ میں ہاتھ گھسا کر ٹٹولنے لگی۔ "ہمیں پولیس کو اطلاع دینا ہو گی۔ یہ کسی جرم کا معاملہ لگتا ہے۔ خاموشی ہمیں مہنگی پڑ سکتی ہے۔"

اس نے بیگ میں تلاش موقوف کر دی۔ اس کا سیل فون اس میں نہیں تھا اور اب اسے خیال آرہا تھا کہ گھر سے نکلتے ہوئے اسے سیل فون لے آنا یاد نہیں رہا تھا۔ اس نے بدستور میبل کو لڑکی کے جوتوں کے ساتھ زور آزمائی کرتے دیکھا تو چیخ پڑی۔

"میں نے تم سے کہا کہ اس سے دور رہو۔ بالکل نہ چھوؤ اسے۔"

میبل نے ایک نظر اس کی برہم صورت دیکھی اور پھر بیساکھی کو سڑک پر گراتے ہوئے آرام سے نیچے بیٹھ گیا۔ "تمہیں مجھ سے خفا نہیں ہونا چاہیے، میں یہ تمہارے لیے کر رہا ہوں، تمہیں یہ جوتے بہت پسند ہیں۔ ایک ہاتھ سے بکل نہیں کھل رہا تھا۔" وہ لڑکی کے پاؤں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے منمنایا۔

لڑکی کے تنفس میں غیر معمولی حد تک تیزی آگئی تھی اور اس کے بدن کو خفیف سے جھٹکے لگ رہے تھے۔

صوفیہ پہلے سے زیادہ اونچی آواز میں چیخی۔ "لعنت ہو ان جوتوں پر۔ تم فوراً اٹھو اور ہم یہاں سے چلتے ہیں۔ میں کہیں سے فون پر پولیس کو اس کے بارے میں بتا دوں گی۔"

میبل سر جھکائے اپنے کام میں مگن رہا۔ وہ ایک جوتا اتارنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ دوسرے پاؤں کو پکڑنے کے لیے وہ جھکا تو اچانک لڑکی کا اوپری دھڑ ایسے سمٹا جیسے وہ اٹھ کر بیٹھنے والی ہو۔ ایسا بس ایک ساعت کے لیے ہوا تھا۔ پھر وہ بے حس و حرکت ہو گئی تھی۔

اس نے میبل کو زوردار سسکی لیتے سنا۔ وہ دیکھنے کی خاطر آگے جھکی تو اسے معلوم ہوا کہ لڑکی نے اپنے ہاتھ کے لمبے ناخن میبل کی کلائی میں سختی سے گاڑ رکھے تھے۔ تب ہی اسے دور سے ایک پولیس پٹرول کار آتے ہوئے دکھائی دی۔

میبل کے جھٹکا دینے پر اس کی کلائی لڑکی کی گرفت سے نکل گئی تھی، اب صوفیہ کو لڑکی کے جسم میں تنفس کے عمل سے پیدا ہونے والا زیر و بم محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

"میبل! میں آخری بار تم سے کہہ رہی ہوں کہ اٹھو اور تمہارے اندر جتنی بھی سکت ہے اسے استعمال کر کے اس جگہ سے زیادہ سے زیادہ دور ہو جاؤ۔ cops اسی طرف آرہے ہیں اور یہ لڑکی اگر مر چکی ہے، جس کا مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہوا ہے تو ہمارے پاس ان کے سوالوں کے جو جواب ہیں، یقین کرو، وہ بالکل مناسب نہیں ہیں۔"

پولیس کار اب خاصی نزدیک آچکی تھی۔ صوفیہ استطاعت کی آخری حد تک تیز دوڑتے ہوئے فٹ پاتھ سے اتر کر درختوں کی اوٹ میں کچی سڑک پر آگئی۔ اسے اپنی پشت پر روشنی کا دھارا چمکتا دکھائی دیا، ایک لمحے کے لیے تو اسے یوں لگا جیسے سرچ لائٹس کی مدد سے اس کی نشان دہی کر لی گئی تھی۔ کچھ دیر وہ جھک کر کھڑی سن گن لیتی رہی اور پھر اطمینان ہونے پر گھر کی سمت سرپٹ دوڑ پڑی۔

اسے ایک فی صد بھی امید نہیں تھی کہ میبل ان لوگوں کے ہتھے نہیں چڑھا ہو گا۔ وہ اس کے لیے متفکر بھی نہیں تھی اسے بس کسی بھی طرح پولیس آفیسرز کے الٹے سیدھے سوالوں کا سامنا کرنے سے بچنا تھا۔

اس نے البا کے stiletto جوتے پہن رکھے تھے جو بھاگنے میں بے حد غیر معاون ثابت ہو رہے تھے۔ اس کی ایڑیوں اور پنڈلیوں میں درد ہونے لگا تھا لیکن وہ رک کر انہیں اتارنے میں وقت گنوانا نہیں چاہتی تھی۔ گھر کے سامنے پہنچنے میں اسے زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ لگے ہوں گے لیکن بے حد تیز رفتاری سے دوڑنے کے باعث وہ بری طرح ہانپ رہی تھی، اس کی عادت تھی کہ رات کو چوری چھپے گھر سے نکلتے ہوئے اگر اس کا ارادہ البا کے جوتوں میں سے کوئی استعمال کرنے کا ہوتا جو کہ سب کے سب نوک دار اونچی ایڑیوں سے مزین تھے، تو وہ جوتے دروازے سے باہر آکر پہنا کرتی تھی تاکہ باریک ایڑیوں سے ابھرنے والی آواز گرانٹ کو چوکنا نہ کر دے اور اسی طرح جب وہ کہیں سے واپس آتی تو دروازہ عبور کرنے سے قبل جوتے اتار دیا کرتی تھی۔

اس وقت بھی اس نے یہ عادت دہرائی تھی۔ گھر سے کچھ دور ہی اس نے گرد سے اٹے جوتے اتار کر ہاتھ میں پکڑ لیے۔ تلوؤں اور پیروں کی انگلیوں میں اسے پسینے کی نمی محسوس ہو رہی تھی۔ بستر میں گھسنے سے پہلے اس نے اپنے پاؤں دھوئے تھے۔ کمبل کو سر تک اوڑھ کر لیٹے ہوئے جب اسے خاصی دیر بیت گئی تو اس کے تنے ہوئے اعصاب رفتہ رفتہ ڈھیلے پڑنے لگے۔

وہ سوچنے لگی کہ شاید بے پناہ ہراس کے زیر اثر میبل cops کو اس کے متعلق بتا ہی نہیں پایا ہو گا، ضروری نہیں تھا کہ واقعات کا تسلسل وہی رہے جو اس نے ذہن میں طے کر رکھا تھا۔ اچانک اطلاعی گھنٹی کی آواز نے اس کے حواس کو جھنجھوڑ دیا۔ وہ خاموشی سے لیٹی انتظار کرتی رہی۔ گھنٹی دوبارہ بجی اور پھر تیسری دفعہ بجی تو مسلسل بجتی چلی گئی۔

اسے گرانٹ کے کمرے سے کھٹ پٹ سنائی دی۔ وہ جاگ گیا تھا اور اب کھانستا ہوا دروازے کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے دروازہ کھلنے کی آہٹ سنی اور کسی کے تیز تیز بولنے کی آوازیں اس کے کانوں تک آئیں۔ اس نے اندازہ لگایا کہ آنے والے ایک سے زیادہ تھے۔

"کون ہے وہ لڑکا؟ وہ کچھ بھی کہے گا اور تم مان لو گے؟" اس نے گرانٹ کو احتجاج کرتے سنا۔ دوسری طرف سے کیا کہا جا رہا تھا۔ باوجود پورا دھیان دینے کے، وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

"اچھا وہ! اسے میں جانتا ہوں وہ تو retard (ذہنی طور پر معذور) ہے، اس کی باتوں کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔"

"وہ کیوں اس کے ساتھ ہو گی رات کے اس وقت؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بارہ بجنے والے ہیں۔ یہ اس کے carfew hours ہیں۔"

جواب میں شاید کسی نے نابالغ ہونے کے متعلق کوئی بات کی تھی۔

"نہیں۔ وہ نابالغ نہیں ہے لیکن وہ میری بیٹی ہے۔ وہ عام نوجوان لڑکیوں کی طرح بے لگام اور ضرورت سے زیادہ خود مختار نہیں ہے۔ اسے میری جانب سے ممانعت ہے کہ وہ نو بجے رات کے بعد گھر سے باہر نہیں رہ سکتی۔" گرانٹ کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی۔

"میں جھوٹ کیوں بولوں گا؟ وہ اپنے کمرے میں سو رہی ہے۔ میں بہت بیمار ہوں، اس طرح رات گئے مجھے بے آرام کرنا تم لوگوں کو زیب نہیں دیتا۔"

"تو تم نہیں مانو گے۔ ٹھیک ہے تم سے بحث تو نہیں کی جا سکتی۔ میں اسے بلاتا ہوں، لیکن جو بھی سوالات ہوں گے وہ میری موجودگی میں پوچھے جائیں گے۔"

اس نے بکتے جھکتے گرانٹ کو اپنے کمرے کی سمت پاؤں گھسیٹ کر آتے سنا۔

"صوفیہ! اٹھ کر باہر آؤ۔"

وہ ذہنی طور پر تیار تھی، اس لیے کوئی رد عمل ظاہر نہ کیا۔ گرانٹ کے متعدد بار پکارنے اور دروازہ پیٹنے کے

بعد اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور اس کی زبان پولیس کی آمد کا سن کر بے ربط باتیں کرنے لگی۔ جیسے گہری نیند سے اٹھائے جانے کے بعد عام طور پر لوگ کیا کرتے ہیں۔ پولیس آفیسرز کے سامنے آنے تک اس نے سر کے بال بے ترتیب کر دیے اور چہرے پر غنودگی والی کیفیت طاری کرلی۔ وہ تعداد میں تین تھے۔ ان میں سے دو دروازے پر کھڑے تھے اور ایک آفیسر کچھ فاصلے پر رکی ہوئی پولیس کار کے اندر پچھلی نشست پر بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ میبل بھی موجود تھا اور دور سے دیکھنے پر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دونوں ہاتھ اس کی پشت پر ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔

اس پر نظر پڑتے ہی میبل کے اندر شدید ہلچل ہونے لگی۔ وہ کھڑکی کے شیشے سے سر ٹکرانے کی کوشش کر رہا تھا اگر cops نے اس لڑکی کے متعلق پوچھ گچھ کرنے کے لیے اسے روک رکھا تھا تو پھر اسے ہتھکڑی کیوں لگائی گئی تھی۔ غالب امکان یہی تھا کہ میبل ان کو کوئی تسلی بخش وضاحت نہیں دے سکا تھا اور وہ اسے ہی ذمہ دار گردان رہے تھے۔

دونوں آفیسرز اسے جانچتی ہوئی نظروں سے گھور رہے تھے۔ اس نے اپنی تمام حسیات ان پر مرکوز کرلیں۔

”تم ہی صوفیہ مارسیلو ہو؟“

”ہاں“

”تم میبل نامی لڑکے سے واقف ہو؟“

سوال اس کی توقع کے عین مطابق آیا تھا۔

”ہاں۔ وہ یہاں قریب ہی رہتا ہے۔ اس سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ بہت اچھا لڑکا ہے۔ کیا اس سے کوئی غلطی ہوگئی ہے؟“

اس کا استفسار نظر انداز کر دیا گیا۔

”کیا تم ابھی ابھی کہیں باہر سے لوٹی ہو۔؟“

اس سوال کا جواب بھی اس نے سوچ رکھا تھا۔

”مجھے نہیں معلوم تم کیا کہہ رہے ہو۔ میں تو اپنے کمرے میں تھی۔“

اگلا سوال بھی حسب امید تھا۔ ”سوچ کر جواب دو۔ کیا چند منٹ پہلے تم میبل کے ساتھ تھیں؟“

جواب دینے سے قبل اس نے میبل کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی لیکن فاصلہ زیادہ ہونے اور پولیس کار کے اندر ناکافی روشنی کی وجہ سے اس کا چہرہ ایک بڑا سا کالا دھبہ دکھائی دیتا تھا۔ پہلی مرتبہ میبل اس سے کوئی ایسی چیز مانگ رہا تھا جس کی اسے واقعی ضرورت تھی۔

”چند منٹ پہلے۔۔۔ کیوں؟“ پولیس آفیسرز کی طرف دیکھتے ہوئے وہ ارادتاً ہکلائی۔ ”میں تو دس بجے سونے کے لیے لیٹ گئی تھی۔ میبل سے آخری بار تو میں کل صبح ملی تھی۔ اس نے گزرتے ہوئے مجھے ہیلو کہا تھا۔ میں تب دودھ کی بوتل اٹھانے دروازے پر آئی تھی۔“

کچھ اور سوالات پوچھے گئے۔ اسے اگلے روز پولیس اسٹیشن آنے کی ہدایت دی گئی اور وہ لوگ لوٹنے والے تھے کہ ان میں سے ایک آفیسر جو دروازے کے سامنے بنے مختصر چبوترے پر کھڑا تھا ازراہ اخلاق بولا۔

”معذرت خواہ ہوں۔ میرے مٹی بھرے جوتوں سے تمہارے فرش پر دھبے بن گئے۔ یہ بہت ہی بدنما لگ رہے ہیں۔“

ایک پل کے لیے صوفیہ کے چہرے کی رنگت پھیکی پڑگئی۔ اگر اس نے عادتاً سڑک پر جوتے اتارے نہ ہوتے تو اس کے جوتوں پر لگی مٹی سے اس ہلکے رنگ کے فرش پر بننے والے نشان صاف نظر آجاتے۔

”تم نے ابھی ابھی پاؤں دھوئے ہیں؟“

وہ بے اختیار نفی کرنے لگی تھی کہ جملے کا باقی حصہ سن کر خود کو بروقت روک لیا۔ ”تمہارے پائنچے گیلے ہیں۔“

کس قدر خلاف توقع سوال تھا۔ اس کی ساری ذہنی تیاری دھری کی دھری رہ گئی۔

”میرا پیٹ درست نہیں ہے۔ مجھے بستر میں جانے کے بعد دو تین مرتبہ ٹوائلٹ جانا پڑا۔“ اس نے سرتوڑ جدوجہد کرکے آواز کو بے تاثر بنایا۔

کچھ مزید ہدایات دینے کے بعد وہ لوگ کار میں سوار ہوگئے تھے ان کے بیچ مچلتا ہوا میبل اتنا بے قرار لگتا تھا جیسے جال میں آئی ہوئی مچھلی۔

میبل کو دیکھنے پر اسے ہمیشہ نوٹرے ڈیم کا کبڑا یاد آیا کرتا تھا۔ آج اسے اور اک ہوا تھا کہ میبل اور وکٹر ہیوگو کے تخلیق کردہ اس کردار میں کیا پہلو مماثل تھا۔ کوز پشت quasimodo کلیسا کے جرس کی اونچی آواز سے بہرا ہوگیا تھا اور میبل ٹانگ سے محروم تھا۔

quasimodo اور خانہ بدوش رقاصہ esmeralda کے درمیان ایسا ہی عجیب رشتہ تھا جیسا خود اس کے اور میبل کے درمیان تھا۔ میبل اس سے محبت کرتا تھا لیکن شعوری سطح پر اس امر کو پہچانتا نہیں تھا۔ وہ quasimodo کی طرح بدصورت اور تنہا تھا لیکن وہ صوفیہ es meralda کی طرح نہیں تھی وہ بیسوی صدی کے اس quasimodo کی خاطر کچھ بھی کرنے پر آمادہ نہ تھی۔

گرانٹ نے اس سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ وہ اپنی جگہ مطمئن تھا۔

رات کا بقیہ حصہ اس نے جاگ کر گزارا۔ میبل کی اس کی زندگی میں اتنی اہمیت نہیں تھی کہ وہ اس کے لیے بے خواب رہتی۔ تنہائی اور خاموشی اسے یوں کاٹتی تھی کہ ایک ایک پل گزارنا محال تھا۔ وہ کبھی اوندھی لیٹتی، کبھی سیدھی کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتی اور کبھی فرش پر ٹہلنے لگتی۔ وہ کہیں دور جانا چاہتی تھی لیکن کہاں؟ اسے معلوم نہیں تھا۔ کسی سے بات کرنے کی شدید خواہش اس کے اندر شور مچا رہی تھی اور در و بام کے سوا کوئی سننے والا نہ تھا۔ اسے کارل میکار تھی کا خیال آیا۔ پروم پارٹی کے بعد اس نے اسکول جانا ترک کر دیا تھا اور تب سے آج تک اس کی ملاقات کارل سے نہ ہوئی تھی۔ اس نے خود بھی صوفیہ سے ملنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس نے خاصی دیر سوچنے کے بعد اپنا سیل فون اٹھایا اور کارل کا سیل نمبر ملانے لگی۔ دوسرے سرے پر ایک لڑکی کی غنودہ آواز سنائی دی تھی۔

”کارل! تم نے اپنا سیل یہاں میرے سرہانے کیوں رکھ چھوڑا ہے۔ یہ تیسری کال ریسیو کر رہی ہوں میں۔ بہت تھکی ہوئی ہوں۔ یہ لو پکڑو۔ ذرا پرے تو کھسکو، میں بستر سے گرنے والی ہوں۔“

اس نے کال کاٹ دی۔ وہ اور بھی زیادہ اضطراب محسوس کرنے لگی تھی۔ اس نے بتی جلادی اور کرسی پر بیٹھ کر سامنے والی دیوار۔۔۔ کو گھورنے لگی۔

صبح کی نیلگوں روشنی کھڑکی سے کمرے میں آرہی تھی جب اس پر ہلکی سی غنودگی چھانے لگی۔ وہ بستر پر جانے کے لیے اٹھی تو اسے باہر سڑک پر سے گزرتی ہوئی دیوانی بڑھیا کا گیت سنائی دیا۔

بہت عرصے سے روزانہ صبح کے اوقات میں وہ بڑھیا کھڑکی کے قریب سے یہی rhyme گاتی ہوئی گزرتی تھی۔ اسے بڑھیا کی آواز بے حد بھلی لگتی تھی وہ اکثر اسی آواز کو سن کر بیدار ہوا کرتی تھی۔ اس نے کبھی بڑھیا کو دیکھا نہیں تھا۔ آج جانے کیوں اس کا جی چاہا کہ وہ بڑھیا کا چہرہ دیکھے۔ اس نے کھڑکی کے قریب جاکر گردن باہر نکالی اور حیرت سے گنگ ہوگئی وہ ”بڑھیا“ جو بمشکل پینتیس سال کی ہوگی۔ اس وقت اس کے گھر سے ذرا ہی دور تھی اور دھیمے قدموں سے اسی رخ چلی آرہی تھی۔

وہ ایک نہایت خوش وضع، میانہ قامت عورت تھی اس کے بائیں ہاتھ میں بید کی ٹوکری تھی جس میں کاسنی اور نارنجی مائل زرد تازہ چنے ہوئے پھول، ہولی کے سبز پتوں کے ساتھ رکھے تھے اس کی ظاہری ہئیت سے دیوانگی کے آثار معدوم تھے۔ نفاست سے سنوارے ہوئے بالوں پر اس نے جالی دار اونی اسکارف پہن رکھا تھا اور ہاتھ سفید دستانوں سے ڈھکے تھے۔ گیت کے بول دہراتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر ایک الوہی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ جس نے اس

کے پورے وجود کو جگمگا رکھا تھا۔
صوفیہ نے محض اس کی آواز سے دماغ میں ایک نکا خاکہ بنا رکھا تھا۔ اونچے سروں میں گاتے ہوئے اس کی آواز میں واضح کپکپاہٹ در آتی تھی، جس سے اس نے اندازہ لگایا کہ وہ بوڑھی تھی اور چونکہ وہ روزانہ باقاعدگی سے ایک ہی گیت گایا کرتی تھی، اس بات سے اسے لگا کہ وہ دیوانی ہو گی۔ لیکن اس کے دونوں ہی قیاس غلط نکلے۔
اب وہ کھڑکی کے سامنے سے اس پر کوئی دھیان دیے بغیر گزر رہی تھی۔ اس نے تجسس دور کرنے کو اسے پکار لیا۔
"میں روز تمہاری آواز سنتی ہوں۔ دراصل یہ میرا بیڈ روم ہے۔ کیا تم کہیں پاس ہی رہتی ہو؟"
وہ رک گئی اور اسے دیکھ کر مسکرانے لگی۔
"نہیں، میں بہت دور سے آتی ہوں اور اگر میرے گانے سے تم بے آرام ہوئی ہو تو میں معذرت خواہ ہوں۔" اس نے نرمی سے جواب دیا۔
"تم روزانہ اس وقت کہاں جاتی ہو؟"
"میں قبرستان جاتی ہوں۔ میرے تین بچے وہاں دفن ہیں۔ تینوں لڑکے تھے۔ آٹھ، چھ اور تین سال عمریں تھیں۔ میں ان کی قبروں پر یہ پھول چڑھانے جاتی ہوں۔ بہت ہی پیارے اور کھلنڈرے لڑکے تھے۔ تم ان سے ملی ہوتیں تو پہلی نظر میں ہی ان کی محبت میں مبتلا ہو جاتیں۔ میرے پاس ان کی تصویر ہے۔ تم دیکھو گی؟"
اس نے ٹوکری میں پھولوں کے نیچے سے ایک فریم شدہ تصویر نکالی اور چند قدم آگے آتے ہوئے اس کی آنکھوں کے سامنے کر دی۔ تصویر میں تین خوبصورت لڑکے نظر آ رہے تھے جن کی شکلیں اس عورت سے ملتی تھیں۔
"تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ کیا میں تمہارا نام جان سکتی ہوں؟"
"صوفیہ۔"
"شکریہ اور میرا نام اینا ہے۔" اس نے تصویر کو واپس ٹوکری میں رکھتے ہوئے کہا۔ اس سارے وقت میں ایک لمحے کے لیے بھی اینا کے ہونٹوں سے مسکراہٹ جدا نہیں ہوئی تھی۔ صوفیہ کو یہ بات عجیب لگی۔ تین مردہ بیٹوں کی ماں ان کی قبروں کی طرف جاتے ہوئے اتنی خوش کیسے ہو سکتی تھی۔
"میں اب جاؤں گی۔ خدا تم پر اپنی رحمتیں نازل کرے جیسے اس نے مجھ پر انہیں اتارا۔"
خدا نے اس پر کون سی رحمت نازل کی تھی جس پر وہ شکر گزار تھی۔ کیا وہ طنز کر رہی تھی؟ چہرے کے مسکراتے ہوئے خطوط اس بات کی تائید نہ کرتے تھے۔
"تم یہ رائم کیوں گاتی ہو؟ روزانہ ایک ہی رائم؟" اسے جانے کے لیے مڑتے دیکھ کر صوفیہ کو اچانک خیال آیا۔
"میرے بیٹے گھر کے باہر سڑک پر باری باری رسہ پھلانگنے کا کھیل کھیل رہے تھے اور میں بالکونی میں بیٹھی انہیں کھیلتے دیکھ رہی تھی۔ تب وہ تینوں مل کر یہی رائم گا رہے تھے۔ والٹر، میرا بیٹا اس کی باری پھلانگنے کی تھی۔ جبکہ دونوں چھوٹے رسے کو بل دیتے ہوئے گھما رہے تھے۔ والٹر اونچی اونچی چھلانگیں لگا رہا تھا۔ اس کا قد اپنی عمر کے دوسرے لڑکوں کی نسبت قدرے لمبا تھا۔ جوں جوں اس کے چکر تیز ہوتے جاتے تھے ان تینوں کے گانے میں بھی تیزی آتی جاتی تھی اور پھر ایک مدہوش ڈرائیور نے اپنی بے قابو گاڑی تلے تینوں کو کچل دیا جب بھی میرے قدم قبرستان کی سمت اٹھتے ہیں تو یہ rhyme خود بخود میری زبان پر آ جاتی ہے۔ کیا تمہیں اپنی کھڑکی میں سجانے کے لیے کچھ پھول چاہئیں؟ یہ سرمائی داؤدی اور گیسو میں نے اپنے گھر کے باغیچے سے چنے ہیں۔"
اس نے پیشکش کی تو صوفیہ نے ہاتھ ہلا کر انکار کیا۔
"نہیں۔ مجھے نہیں چاہئیں، مجھے صرف ایک بات کا جواب دو۔ خدا نے تمہارے ساتھ کیا اچھا کیا جس پر



تم اتنی خوش ہو۔" وہ خود کو یہ سوال پوچھنے سے باز نہیں رکھ پائی تھی۔

اپنا پھولوں والی ٹوکری کو دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے کھل کر مسکرائی۔

"اس نے مجھے صبر دیا۔"

اس کی کانپتی ہوئی آواز میں غم کی پرچھائیں تک نہ تھی۔

☼ ☼ ☼

"کچی دیوار پر اُپلے ایک ترتیب سے لگے تھے اور شیشم کا کبڑا پیڑ کوتاہ قد دیوار کا سہارا لیے کھڑا تھا۔

اس نے دیوار پر سے اندر جھانکا تو ڈھلتی عمر کی دو عورتیں نظر آئیں جو ایک کھاٹ کے ان بُنے ڈھانچے کے اطراف میں آمنے سامنے بیٹھی تھیں۔ ان میں سے ایک، جس کی رنگت تانبے ایسی تھی اور بدن بانس کی چھڑی سا سیدھا اور دبلا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں رنگین بان کا گولا تھا۔ جبکہ دوسری عورت جو نسبتاً صاف رنگت اور توانا جثے کی حامل تھی، آلتی پالتی مارے بیٹھ کر حقہ پی رہی تھی۔ ایک نیم چھتی تلے کچھ گدھے اور بکریاں بندھی تھیں۔ نرکلوں اور پھونس سے بنے چھپر کے نیچے مٹی کے برتن بنانے کا چاک فرش میں گڑا تھا۔ مغربی گوشے میں دیواروں کے اتصال والے مقام سے ذرا فاصلے پر انار کا بوٹا اور بکائن کا چھتری نما پیڑ تھا۔ سارے میں گوبر کی باس اور جانوروں کی پوستینوں سے اٹھتی بو پھیلی تھی۔

وہ آنگن میں آئی تو اس کے قدموں کی آہٹ پر دونوں عورتوں نے مڑ کر اسے دیکھا۔ حقے والی نے حقہ چھوڑ دیا اور بان والی نے گولا نیچے رکھ دیا جو لڑھک کر کچھ دور تک چلا گیا۔ اس پسماندہ گاؤں میں اس جیسے حلیے کی کسی لڑکی کا دیکھا جانا شاید ایک انوکھا واقعہ تھا۔ یہ بات ان دونوں دیہاتنوں کے چہروں پر صاف لکھی تھی۔ وہ ان کے قریب آئی تو وہ دونوں اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

"میں حکیم بیگم سے ملنے آئی ہوں آپ میں سے کون ہیں حکیم بیگم؟"

تانبے کی رنگت والی آگے آئی اور اس کے کندھے سے بیگ اتروا لیا۔ "صحیح تھاں (جگہ) پہنچ گئی ہے تو میرا ناں (نام) حکیم بیگم ہے۔ آبہ (بیٹھ) جا دھیے۔ میں تجھے وہڑے میں موڑھا ڈاھ (بچھا) کے دیتی ہوں۔ اندر کوٹھیاں پے بڑا سیت ہے (کمروں میں بہت سردی ہے۔)"

حکیم بیگم موڑھا لانے چلی گئی جبکہ وہ دوسری عورت چپ چاپ کھڑی نظروں میں اسے تولتی رہی۔ چند لمحوں بعد اس نے حکیم بیگم کو موڑھا اٹھائے عجلت میں آتے ہوئے دیکھا۔ وہ چلتے ہوئے موڑھے کی گرد آلود پوشش کو اپنے سر کی چادر سے صاف کر رہی تھی۔

"گٹھ گٹھ (بالشت) مٹی چڑھی ہے موڑھے تے۔ پروہنی (مہمان) دے بیٹھنے لائق کوئی شے ای نہیں میرے کول (پاس)۔ میں ذری ستھرا کر دوں اس کو تیرے کپڑے نہ گندے ہوں کہیں۔"

اس نے حکیم بیگم کے ہاتھوں سے موڑھا لے لیا۔ "میرے کپڑوں کی فکر نہ کریں۔ اتنے صاف نہیں ہیں کہ انہیں ذرا سی مٹی سے بچانے کی ضرورت پڑے۔"

اسے بٹھا کر وہ پھر چلی گئی۔ لوٹی تو دودھ والا مونہامنہ کٹورا لے کر آئی۔ "کوسا (نیم گرم) دودھ پی کے تیرا تھلیواں (تھکاوٹ) اتر جائے گا۔ لے میری دھی! بسم اللہ کر۔"

اس نے انکار میں سر ہلایا۔ "آپ کوئی زحمت نہ کریں۔ میں جس کام سے آپ کے پاس آئی ہوں بس وہ سن لیں۔"

"گل بات وی ہو جائے گی۔ تو کوئی فکر نہ کر۔ جے میرے رب دا حکم ہوا تے تیرا کوئی کم (کام) نئیں رکے گا۔ تو اے دودھ پی۔ مہمان گھر دا رزق چکھے تے برکت ہوتی ہے۔" حکیم بیگم نے اصرار کیا۔

"آپ شاید پسند نہ کریں کہ میں آپ کے برتنوں میں کچھ کھاؤں پیوں۔ میں عیسائی ہوں۔ آپ مسلمان لوگ اس بات کو مناسب نہیں جانتے۔"

حکیم بیگم مسکرانے لگی اور دوسری عورت نے جو اب چارپائی کے ڈھانچے کے ساتھ زمین پر بیٹھ کر حقہ پینے لگی تھی، ایسے جھرجھری لی جیسے اس پر چھپکلی گر گئی ہو۔ اس کے دنداسہ رنگے ہونٹ نیم وا ہوئے اور آنکھوں میں واضح کراہت اتر آئی۔

حکیم بیگم نے کٹورا اسے تھماتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا "ایسی گل نئیں کریئے! اللہ جانے کیہڑے (کون سے) مسلماناں نال تیرا ٹاکرا ہوا ہے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم دا طریقہ تھا کہ کتاب والیاں توں (اہل کتاب سے) عزت نال ملتے تھے۔ کھان پین لئی بانڈے ورتن دی تے گل ای معمولی ہے (کھانے پینے کے برتن استعمال کرنا ایک معمولی بات ہے) تو کوئی وہم نہ کر۔"

دوسری عورت نے حقے کی چلم کو انگلی سے ٹھوکتے ہوئے زوردار ہنکارا بھرا۔

"واہ حکیم بیگم! تیری عقل۔ ملوانی (ملانی) بن کے فتوے دیتی ہے۔ جو پلید ہے تیرے کہہ دینے سے پاک نئیں بنے گا۔"

حکیم بیگم نے ہاتھ اٹھا کر اسے ٹوکا تھا "نی چھوماں! کوڑا بول کے تجھے کی سواد آتا ہے، جے تیرا مندا بول کسی دا کلیجہ ساڑے تے تیرا اس وچ کی فیدا (کڑوا بول کر تجھے کیا مزہ ملتا ہے۔ اگر تیرا برا بول کسی کا کلیجہ جلائے تو تجھے اس سے کیا ملے گا)"

وہ دودھ کا پیالا ہاتھوں میں پکڑے سامنے والی دیوار پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ حکیم بیگم نے دوبارہ اسے دودھ پینے کو کہا اور پھر اس نے چھوماں کو کہتے سنا۔

"خدمتیں کرتی رہنا پروہنی کی۔ پہلے اس سے پوچھ تو سہی آئی کدھر سے ہے؟ نام نشان، تھاں ٹھکانہ تو بتائے۔ کس کام سے آئی ہے تیرے پاس۔"

"ہالی نئیں۔ اسے جھٹ گھڑی ساہ کڈن دے۔ جدو سنتر والا ویلا ہو گا وہ آپ گل کرے گی۔ کوئی کاہلی نئیں ہے۔" (ابھی نہیں۔ اسے ذرا دم لینے دے۔ جب بتانے کا وقت ہو گا، وہ خود بولے گی، کوئی جلدی نہیں ہے۔)

کچھ دیر خاموشی رہی۔ اس نے پیالے سے ایک چھوٹا گھونٹ لیا۔ چھوماں سے پھر نہ رہا گیا، وہ بولی۔

"جوان کڑی ہے۔ کسی شہر سے آئی ہے۔ منہ متھے کی سوہنی ہے اور عیسائی ہے، کوئی سنگی ساتھ نئیں۔ کوئی اک بھی نیک نشانی ہے ان میں۔ گل قند کی شیشی نہ بن کہ کوئی تیرا گھونٹ بھر لے۔ منہ باندھ کے بیٹھی ہے۔ کچھ تو پوچھ اس سے۔"

حکیم بیگم کے ماتھے پر شکن نہ آئی۔ "تیرے فکر کرنے دی لوڑ (ضرورت) نئیں۔ میرے مالک دے حکم نال سب خیر ہو گی۔ تو جا کے تندور چے بالن کو بچ لگا دے (لکڑیاں جلا دے) پروہنی دے روٹی ٹکر لئی بل جل کر کوئی۔ سیال دے دناں چے سورج نیدراں ہوتے سدھ نئیں لگتی (مہمان کی روٹی کے لیے کچھ کر۔ جاڑوں میں سورج ڈھلنے کی خبر ہی نہیں ہوتی)"

یقیناً وہ سمجھ گئی تھی کہ آنے والی اس سے اکیلے میں بات کرنا چاہتی ہے۔ تب ہی وہ چھوماں کو وہاں سے ٹالنے کا حیلہ کر رہی تھی۔ چھوماں بھی اس کی نیت تاڑ گئی۔

"اوہلے والی بات (چھپ کر کی جانے والی بات) میں بڑا رولا ہوتا ہے کسی گیڑے (چکر) میں نہ آ جانا۔ میں تیری گوانڈن (پڑوسن) ہی نئیں تیری دردی (ہمدرد) بھی ہوں۔ مجھ سے چھپا کر تو کیا نفع کمائے گی۔ میں بیٹھی ہوں یہاں۔ روٹیاں پکنے سے نئیں رہتیں۔ بے فکر ہو جا۔"

حکیم بیگم جواب میں کچھ نہ بولی۔ اس نے پرنیاں کو اٹھنے کا اشارہ کیا اور اسے ساتھ لے کر اناج والی کوٹھڑی میں آ گئی۔ کوٹھڑی کے اندر نیم تاریکی اور سیلن زدہ ٹھنڈک تھی۔ یہاں آ کر بھی حکیم بیگم نے اس سے کوئی سوال نہ کیا اور خاموشی سے اس کے بولنے کا

انتظار کرنے لگی۔ پرنیاں نے بات شروع کی تو اس نے پرنیاں کی طرف دیکھنا بھی ترک کردیا۔

"میں آپ کو اپنا نام اور گھر والوں کے متعلق کچھ نہیں بتاسکتی۔ آپ پوچھیے گا بھی نہیں۔ آپ کے کسی جاننے والے نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے میں اس کا نام بھی نہیں لوں گی۔ آپ کے لیے میرے بارے میں کچھ جاننا ضروری نہیں ہے کیونکہ شاید آئندہ زندگی میں ہماری کبھی ملاقات نہ ہو۔"

اس نے کچھ سچ اور کچھ جھوٹ کی آمیزش کرکے اپنی کہانی بیان کردی۔

"میں نے آپ کو پوری بات سچ نہیں بتائی لیکن ایک چیز کی سچائی میں کوئی شبہ نہیں۔ میں نے اس بچے کے باپ سے نکاح کیا تھا۔ وہ قانونی طور پر میرا شوہر ہے۔ یہ بچہ ناجائز نہیں ہے مگر میں اسے پیدا نہیں کروں گی۔ اس کام کے عوض آپ کو دینے کے لیے میرے پاس پیسے نہیں ہیں' یہاں تک آنے میں جو کرایہ خرچ ہوا ہے' وہ بھی میں کسی سے مانگ کر لائی تھی میرے گلے میں ایک کنٹھی ہے اور کلائی میں دو کنگنیاں ہیں۔ آپ کسی سنار کو دکھا لیجیے گا۔ یہ اصلی سونے کے زیور ہیں۔ یہ میں آپ کو دے دوں گی۔ میں آپ کی منت کرتی ہوں کہ میری مدد کیجیے لیکن اگر آپ کا جواب نہ میں ہے تو میں آپ کو مجبور نہیں کرسکتی جو بھی آپ کی مرضی ہے'' وہ ٹوک کہہ دیں۔"

حکیم بیگم کچی دیوار سے کمر لگائے کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ بڑی دیر تک بوجھل خاموشی چھائی رہی۔ پھر حکیم بیگم نہایت دھیمی آواز میں بولی۔

"میں بہتی سیانی (زیادہ عقل مند) نئیں ہوں۔ سدھ سادہ پینڈن ہوں (سیدھی سادھی دیہاتی عورت ہوں) تو پڑھی لکھی ہے۔ عقل والی ہے۔ میرا تجھے مت دینا پھبدا نئیں (میرا تجھے دانائی کی بات بتانا سجتا نہیں) پر میں تیری ماواں (ماں کی جگہ) ہوں۔ عمر تے تجربہ بڑی شے ہوتے ہیں۔ جے تو میری گل سن

لے (بات مان جائے) سارا کم سدھا ہوجائے تو جتھے (جہاں) کرے گی' میں تیرے نال جاوں گی۔ تیرے ماپیاں اگے ہتھ جوڑ کے ہنک نال لکیراں کڈ کے جہدیں وی ہوسکا' ان کو راضی کرلوں گی۔ (تیرے ماں باپ کے آگے ہاتھ جوڑ کے 'ناک سے لکیریں نکال کے جیسے بھی ہوسکا ان کو منالوں گی جب تک وہ مَن نہ جائیں گے میں دہلیز نئیں چھوڑوں گی۔ میرا یقین کر کڑیے! میں تیری رسائی (صلح) کرادوں گی۔"

"میں وہیں جاؤں گی۔ والدین کے گھر کے سوا میرے پاس کوئی ٹھکانا نہیں ہے' وہاں واپس جانے کے علاوہ میرے پاس کوئی چارہ نہیں ہے لیکن اس سے پہلے مجھے اس بچے سے نجات دلائیں۔ اسے ساتھ لے کر میں اپنے گھر نہیں جاسکتی۔ اسی رکاوٹ کو دور کرنے میں آپ کے پاس آئی ہوں۔"

حکیم بیگم نے اسے سمجھانے کی بہتیری کوشش کی لیکن اسے فیصلہ بدلنے پر آمادہ نہ کرسکی۔

"میرے مسئلے کا اور کوئی حل نہیں۔ میں سارے پہلوؤں سے غور کرچکی ہوں" اس کے انداز میں قطعیت تھی۔

حکیم بیگم چند لمحے شہادت کی انگلی سے نچلے ہونٹ کو ٹٹولتی رہی پھر اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے بولی۔ "رب آپ سوہنا تے سوہنے کلبوت گھڑتا ہے۔ وہ تیرا مقدر وی سوہنا بنادے گا۔ تو اس نال کدی سلسلہ نہ توڑ۔ تند جوڑ کے رکھ۔ میرے دماغ پے اک گل آئی ہے۔ رب کرے تجھے پسند آجائے۔ تو اس بال نوں جانوں نہ مار۔ اے وڈا گناہ ہے۔ رب رُس جائے (روٹھ جائے) نے کوئی تدبیر کم نئیں آتی۔ تو بچ چھ مہینے میری مہمان ہوجا۔ خاص ویلا آن تک ایتھے رہ تیرا کھان پین' لیڈا کپڑا سارا خرچ میرے ذمے۔ مجھے تیری گھنتوں کی لوڑ نئیں۔ میرے تے اللہ دی بڑی رحمت ہے۔ تو بال پیدا کرتے میرے کول چھڑ (چھوڑ) جا' تو فارغ ہو کے اپنے گھر چلی جانا۔ نیانے نوں میں آپی سانبھ لوں گی (بچے کو میں خود سنبھال لوں گی)

میرے ویہڑے چے وی رونق ہوجائے گی۔ میری اک ای دھی ہے۔ آمنہ نام ہے اس کا۔ ویاہ دی میں نے پچھلی واڑھی کے دیہاڑوں میں (اس کی شادی کردی۔ پچھلی بار گندم کی کٹائی کے دنوں میں) تے وہ باہر دے ملک چلی گئی اپنے بندے نال میں کلی (اکیلی) جان ہوں۔ تیرے بچے نال میرا دل لگا رہے گا۔ ٹھیک ہے میری دھی؟ جے تجھے کوئی اعتراض ہے تے دس (بتا)۔" حکیم بیگم نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

"لیکن میں اس بچے کو پیدا نہیں کرنا چاہتی۔ میں کس لیے انتظار کروں اور کیوں تکلیف برداشت کروں۔ اگر آپ میرا مسئلہ حل نہیں کرسکتیں تو صاف جواب دے دیں۔ ایسے گھما پھرا کر انکار نہ کریں۔ بہرحال میں سمجھ گئی ہوں۔ میں چلی جاتی ہوں۔"

وہ مڑنے لگی تو حکیم بیگم نے اسے ٹوک دیا۔

"کدھر جائے گی؟ تو جو وی کہے میں تجھے جانے نئیں دوں گی۔ فیصلہ کرن تے جلدی نہ کر۔ اندر چل کے کمرے چے آرام نال بہ جا۔ بُرکی ٹکروی کھاتے چنگی طرح سوچ لے اج راتی یا کل سویرے یا جد تیرا دل منے میتوں بتا دینا۔" (کہاں جائے گی؟ تو جو بھی کہے میں تجھے جانے نہیں دوں گی فیصلہ کرنے میں جلدی نہ کر۔ اندر کمرے میں چل کر آرام سے بیٹھ جا۔ روٹی کھا اور اچھی طرح سوچ لے آج رات یا کل صبح جب تیرا دل مانے بتا دینا)

کوٹھڑی کے دروازے پر آہٹ سن کر ان دونوں نے ادھر نظر ڈالی تو چھوماں کو دروازے میں کھڑے دیکھا۔ اس کے تاثرات سے عیاں تھا کہ وہ چھپ کر ان کی باتیں سنتی رہی ہے۔

"تو بن ملاڑی (ملنسار) اور کرم جمائیاں (مدارات) جب پلس (پولیس) کے سپاہی تیرے گلے میں رسہ ڈال کے تجھے کھینچیں گے تو یہی تیری پروہنی تیرے خلاف بھگت جائے گی (بیان دے دے گی) یہ جو کرتوت گھول کے آئی ہے۔ اسے قبر کی مٹی نئیں چھپا سکتی تو کچی کوٹھڑی کا سیونک کھایا دروازہ بند کرکے اسے کیسے چھپالے گی۔ چن چڑھتا ہے تو سارا زمانہ دیکھتا ہے۔ جگ والے تیرا جینا مشکل کردیں گے۔ کیوں اپنے بڑھاپے کو لیک لگاتی ہے۔ ہوش کر اور اس کو دو دھکے مار کے گھر سے باہر نکال دے۔"

حکیم بیگم کے بشرے میں کوئی بدلاؤ نہ آیا "میں نے تیری صلاح (مشورہ) سن لی ہے۔ ہن (اب) میری صلاح سن۔ تیرے کناں تک جو گل اپڑ گئی اس کو آگے نہ پہنچانا۔ کسی دے کول منہ وچوں ہواڑ نہ نکالنا۔ جنا ڈر تجھے جگ والیاں دا ہے اس دا اک تولہ وی رب کولوں ڈر گئی تے نئے خیراں

(جو بات تیرے کانوں تک پہنچ گئی ہے اس کو آگے نہ پہنچانا۔ کسی کے سامنے منہ سے بھاپ نہ نکالنا۔ جتنا ڈر تجھے جگ والوں کا ہے اس کا ایک تولہ بھی رب سے ڈر گئی تو سب امن ہے)"

وہ تنفر سے پرنیاں کو گھورتی رہی اور تلخی سے بڑبڑاتی ہوئی وہاں سے ہٹ گئی۔

شام کے سانولے ہاتھ خزاں زدہ پیڑوں کی پیلاہٹ اور سبزی پر گہرے سرمئی رنگ کی استرکاری کررہے تھے جب پرنیاں نے حکیم بیگم کو اپنے فیصلے سے آگاہ کردیا۔

"میں آپ کی بات مان رہی ہوں۔ یہ بات تو ہے کہ مجھے گھر واپس جانے میں بہت دیر ہوجائے گی مگر دیر تو پہلے ہی ہوچکی ہے۔ جہاں مجھے گھر سے نکلے دو ماہ کے قریب ہونے کو ہیں تو وہاں کچھ اور مہینے گزر جانے سے کیا فرق پڑے گا۔ عورت کی گھر سے باہر گزاری ہوئی ایک رات یا ایک ہزار راتیں' دونوں برابر ہیں۔"

اس کے ہاتھ کی پشت پر کوئی بے وزن شے گری۔ پہلے تو اسے لگا کہ وہ دھریک کی شاخ سے ٹوٹا ہوا کوئی پتہ تھا مگر دھیان دینے پر معلوم ہوا کہ وہ ایک مری ہوئی تتلی تھی۔ اس نے کبھی اس نہج پر سوچا نہیں تھا لیکن اب اسے خیال آرہا تھا کہ جاڑوں میں کبھی بھی تتلیاں نظر نہیں آتی تھیں اور اگر کبھی ملتیں تو مردہ حالت میں۔ شاید تتلیوں کو یہ موسم راس نہیں آتا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ کھاٹ پر چت لیٹی تھی۔ اس کے بدن کے ہر مسام سے پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ کسی کھڑکی یا روزن سے عاری اس کمرے میں شدید گھٹن تھی۔ جو مٹھی بھر ہوا میسر تھی وہ گاڑھی اور کسیلی تھی۔ اس میں راکھ اور دھواں ملے ہوئے تھے۔ سانس لیتے ہوئے اس کے جسم میں پھریری سی اٹھتی تھی۔ چارپائی کی کھدری ادوائن میں چول کے قریب ایک موٹی گرہ پڑی تھی جو مجنوں (ایک طرح کا کھیس) تلے سے مسلسل اس کی پنڈلی کے گوشت میں چبھ رہی تھی۔ اس نے پاؤں سمیٹتے ہوئے وہاں سے ٹانگ ہٹانا چاہی مگر اس سے ٹانگ ہلائی ہی نہیں گئی۔

پوربی دیوار میں بنے طاقچے میں —— روشنی کا چومکھا ظرف جل رہا تھا۔ اس کے چاروں فتیلے روشن تھے اور پیلی آگ کے لرزاں شعلے چاروں اور پرچھائیاں بکھیر رہے تھے۔ روشنی کے پھیلے ہوئے زرد دھبوں میں گھری اندھیرے کی پتلیاں رہ رہ کر کانپتیں اور اک دوجے کے پیچھے سرک جاتیں۔ عجیب الخلقت ہیولے کہگل سے لپی چھت سے چمگادڑوں کی طرح الٹے لٹکے تھے۔

کہیں دور سے موروں کے جھنکارنے کی آوازیں اس کے کانوں میں آرہی تھیں۔ اس کا جی چاہا کہ مور چپ ہو جائیں۔ ان کی آوازیں کتنی پریشان کن تھیں۔ لگتا تھا جیسے بلیاں رو رہی ہوں یا شاید انسانی بچے۔ بعض لمحوں میں اسے پورا یقین ہو جاتا کہ وہ مور نہیں تھے بلکہ نومولود بچے تھے۔ جو دردناک آوازوں میں چلاتے تھے۔ وہ اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر ان آوازوں سے جان چھڑا لینا چاہتی تھی مگر اس کے بازو شل تھے۔ وہ کوشش کے باوجود انہیں ذرا سی حرکت بھی نہ دے پاتی تھی۔ ابروؤں کے بالوں سے نچڑتا ہوا نمک گھلا پسینہ اس کی آنکھوں میں گھس رہا تھا۔ اس نے دانتوں پر دانت جماتے ہوئے حلق سے ایک مہیب آواز نکالی اور اس کے اوپری دھڑ کو زوردار جھٹکا لگا۔ پھر گہری تاریکی چھانے لگی۔ اسے لگا کہ فیتل سوز (دیا) کی چاروں لوؤں کو کسی نے پھونک مار کر بجھا دیا تھا۔ کوئی اس کا سر پکڑے جھنجوڑ رہا تھا۔

"سونا نئیں کڑیئے۔ اکھاں کھول۔ بس تھوڑی ہمت ہور (اور) حوصلہ۔ میری دھی حوصلہ۔"

ایک بار پھر پیلاہٹ بھری جھلسی ہوئی روشنی آنکھوں کی پتلیوں میں گھسنے لگی اور پھر وہی جان لیوا درد لوٹ آیا جو لمحہ بھر تھم گیا تھا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی پر اتنا بوجھ تھا کہ اسے لگتا تھا کسی بھی آن کڑ کڑ کی اونچی آواز آنے گی اور وہ دو ٹکڑوں میں بٹ جائے گی۔

دیواروں پر لمبے پھیلے ہوئے اور کڈھب سایے آگے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ ان میں چند انسانی شبیہیں بھی تھیں۔ اس نے انہیں شناخت کرنے کی کوشش کی۔ جھک کر ہرا ہوتا ہوا گٹھڑی بنا سایہ حکیم بیگم کا تھا۔ ایک سایہ دیوار کی جڑ سے چھت تک چلا گیا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ کولہے پر دھرا تھا۔ جس سے خم کھائی ہوئی کہنی کے اندر ایک ایسی تکون بن گئی تھی جس کے خطوط مسطر کے بنا کھنچے گئے تھے۔ اس سایے کا دوسرا بازو جو بے حد لمبا تھا کسی شے کو تھامے ہوئے تھا۔ وہ چھوماں تھی۔ ان کے ساتھ ایک اور انسانی ہیولہ بھی دکھائی دیتا تھا۔ وہ بھدا سا سایہ عجب مضحکہ خیز حالت میں تھا۔ آدھا ہوا میں معلق اور آدھا چارپائی پر جھکا ہوا۔ اس کا سر اور گھٹنے آپس میں غیر فطری حد تک قریب تھے اور اس کے پاؤں نظر نہ آتے تھے۔ شاید اس کے پاؤں تھے ہی نہیں۔ کچھ دیر تو وہ اس تیسرے سایے کو پہچان ہی نہ پائی۔ پھر اچانک اسے یاد آگیا کہ وہ اس کا اپنا سایہ تھا اسے کچھ خیال آیا جس سے وہ بری طرح سہم گئی۔ اس فرسودہ کمرے میں، اس چاروں سروں سے جلتے ہوئے عجب وضع کے برتن، ان بے شمار پرچھائیوں اور بچوں کی طرح رونے والے موروں کی آواز کے ساتھ اس کی جگہ کہاں بنتی تھی۔ ان دو اجنبی گنوار عورتوں کے درمیان اس گھٹن زدہ جگہ پر وہ کیا کر رہی تھی؟ وہ کیسے اس مقام تک پہنچ گئی تھی۔ بھڑکتی آگ جیسا وہ درد اسے صحیح طرح سے کچھ بھی سوچنے نہ دیتا تھا۔ پسینے کی ایک بوند اس کی کنپٹی سے

رینگتی ہوئی کان میں چلی گئی۔ ان دونوں عورتوں میں سے کوئی اس کا پسینہ کیوں نہیں پونچھتی تھی؟ وہ سسکیاں بھر کر رونے لگی۔

"سب بھلا ہوگا۔ حوصلے نال۔ دل تگڑا کر کے۔ کوئی گم نہ کر۔ رب نوں یاد کر۔"

اسے صلیب کا خیال آیا۔ صلیب کو مٹھی میں لے کر دعا مانگنے سے یقیناً یہ درد اس کا پیچھا چھوڑ دے گا۔ لیکن صلیب والا لاکٹ اس وقت جانے اس کی گردن میں تھا یا اس نے اتار کر کہیں رکھ چھوڑا تھا۔ اور یہ بات بھی تو تھی کہ جب بھی وہ چھوماں کے سامنے صلیب کو چھوتی یا اپنے سامنے ہاتھ سے مقدس صلیب کا نشان بناتی تو وہ کانوں کو ہاتھ لگاتی۔ توبہ توبہ کرنے لگتی اور یوں آنکھیں سکیڑ کر اسے گھورتی جیسے وہ کوئی مکروہ چیز ہو۔

کسی کے ہاتھ اس کا [illegible] ٹٹولتے تھے۔ وہ انہیں خود سے دور ہٹانے کی کوشش کرنے لگی۔ ان کا لمس اسے اتنا ناگوار لگ رہا تھا کہ وہ طیش سے چیخ پڑی وہ لگاتار چلانے لگی۔ کوئی مور کمرے کے اندر آگھسا تھا۔ اس کی چارپائی کے نیچے گھسا بار بار ایک تیکھی آواز میں کوکتا تھا۔ وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔

"بسم اللہ ماں صدقے۔ منڈا ہے جیویں (جیسے) روں دی پونی (روئی سے بنا ہوا) کوٹھے چے چانن ہو گیا۔ اکھ بھر کے دیکھ تے سہی نی چھوماں! ایتھے دیوا (دیا) لے کے آ۔ اس دی ماں دکھ لے اس کو۔"

روشنی اس کے قریب آگئی۔ اس نے بھاری پپوٹے کھول کر دیکھنا چاہا مگر آنکھوں میں گھستے کھارے پسینے نے اس کی بینائی دھندلا رکھی تھی۔ گرم گوشت کا ایک لوتھڑا اس کے بازو پر رکھ دیا گیا۔ وہ کلبلاتا تھا اور روئے جاتا تھا۔ حکیم بیگم ایک کپڑے سے اس کا منہ اور گردن پونچھ رہی تھی۔

"بڑے جگرے والی ہے میری دھی۔ جان نکلنے دی پیڑ تے بال جمنے دی پیڑ اے چے کوئی فرق نئیں۔ بس اتنا کہ مرن والا کسی کو دس نئیں سکتا۔"

(جان نکلنے کے درد اور بچے کو جنم دینے کے درد میں کوئی فرق نہیں۔ بس اتنا کہ مرنے والا کسی کو بتا نہیں سکتا۔)"

وہ سچ کہہ رہی تھی۔ وہ ان پڑھ عورت کبھی کبھی بڑی گہری باتیں کہہ جاتی تھی۔

وہ تھکن سے نڈھال تھی اور اس کی آنکھیں بند ہوئی جاتی تھیں۔

"مجھے اب کوئی نہ جگائے۔ میں اب آنکھیں نہیں کھولوں گی چاہے کچھ ہو جائے۔ میں مر چکی ہوں۔ مرے ہوؤں کو جگانے کا رواج تو ابھی دنیا میں نہیں پڑا ناں۔"

اس نے بڑبڑاتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

☼ ☼ ☼

حکیم بیگم زمین پر اکڑوں بیٹھی اپلوں کی آگ پر کوئی دوا چھڑکتی تھی جب پرنیاں نے پشت پر آکر اسے مخاطب کیا۔

"میں جا رہی ہوں۔"

حکیم بیگم نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ اس نے چادر اوڑھ رکھی تھی اور اس کا بیگ کندھے پر لدا تھا۔ حکیم بیگم بجھ سی گئی۔

"تیرا چھلا (چلہ) رہتا ہے۔ ہالی تیرے ہڈ کچے ہیں کچھ دیہاڑے ہور آرام کر لے۔ تیرے جثے میں زری طاقت آجائے فیر چلی جانا۔"

پرنیاں نے اس کے چہرے پر نظر جما دی۔ کیا وہ دل سے اسے روکنے کی خواہاں تھی؟

پچھلے چند ماہ میں اس کی وجہ سے حکیم بیگم کے ساتھ جو کچھ پیش آچکا تھا۔ اس کے بعد کوئی صحیح الدماغ انسان ایسی خواہش کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر وہ اس گمان میں تھی کہ بچے کی پیدائش تک پرنیاں کا وہاں قیام کسی کی توجہ نہیں کھینچے گا تو یہ محض اس کی خام خیالی تھی۔

بکریوں کے ریوڑ میں ہرن ملا دینے سے اس کی شناخت نہیں چھپ سکتی۔ جس کسی نے حکیم بیگم کے گھر کی نالی دیواروں سے اس کو جھانکا، اس کا ماتھا

ٹھنکا اور اس چھوٹے سے گاؤں میں جہاں کنوئیں پر پانی بھرنے، نہر کنارے کپڑے دھونے، بھٹی پر دانے بھنانے، بیڑیوں پر بیٹھ کے دونوں کناروں تک آنے جانے اور نمبرداروں کے ڈیرے پر ہونے والی بیٹھک جیسے بلاناغہ منعقد ہونے والے اجتماعات ہوتے ہوں، وہاں کسی چٹخارے دار بات کو زبانوں سے کانوں تک کا سفر طے کرنے کے لیے پیر درکار نہیں ہوتے، وہ تو یوں اڑتی ہے جیسے کسی نے مٹھی بھر بھوسہ آندھی کے سپرد کر دیا ہو۔

اسے گھر میں ٹھہرا کر حکیم بیگم نے اپنے لیے بدنامی اور ملامت کا سامان کیا تھا۔ گاؤں کے عزت داروں کے بیچ اس کی حیثیت وہ ہو چکی تھی، جو برہمنوں میں کسی اچھوت کی ہوتی ہے۔ لوگ اسے گنہگار اور گمراہ گردان رہے تھے۔ مرد و زن یکساں طور پر اس سے متنفر تھے۔ کوئی اس سے بات تک کرنے کا روادار نہ تھا۔ کوئی عورت اس کے آنگن میں قدم نہ دھرتی اور اگر کوئی تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر آ بھی جاتی تو اس کے گھر کے برتنوں میں کچھ کھانے پینے سے گریز کرتی۔ ایک قسم کا غیر اعلانیہ قطع تعلق کا رویہ تھا جو گاؤں والوں نے اس کے خلاف اجتماعی رضا سے اپنا رکھا تھا۔

کچھ عرصہ پہلے امریکہ سے حکیم بیگم کے نام ایک خط آیا تھا اور چونکہ وہ ان پڑھ تھی اور چٹھی رساں، جو پہلے بھی اس کے لیے خطوط پڑھا اور لکھا کرتا تھا۔ اس روز عجلت میں تھا تو اس نے وہ خط پرنیاں سے پڑھنے کو کہا۔

حکیم بیگم کی بیٹی اور داماد کو کسی ذریعے سے سارے معاملے کی خبر ہو گئی تھی اور انہوں نے نہایت کرخت لفظوں میں اس کے اقدام پر غم و غصہ ظاہر کیا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے اس برے کردار والی لڑکی کو گھر سے نکال باہر کیا جائے۔ ابھی وہ نصف تک بھی پڑھنے نہ پائی تھی کہ حکیم بیگم نے اس سے خط چھین لیا۔ کئی روز تک وہ یوں شرمسار پھرتی رہی جیسے وہ خط خود اسی نے لکھا ہو۔ اور ابھی کچھ ہی دنوں قبل ایک اور واقعہ ہوا تھا جس نے حکیم بیگم پر جانے کوئی اثر چھوڑا تھا یا نہیں لیکن پرنیاں کے اعصاب جواب دے گئے تھے۔

فضل الٰہی نامی مسجد کا بوڑھا خادم تھا جو روز صبح کنوئیں سے پکھال (بڑی مشک) بھر کر مسجد کے صحن میں چھڑکاؤ کرتا اور جھاڑو دیتا۔ اس کا ایک وقت کا کھانا حکیم بیگم نے اپنے ذمہ لے رکھا تھا۔ وہ مغرب کی نماز کے بعد دیوار کے پاس آ کر اونچی آواز میں سلام کرتا اور حکیم بیگم گھر کے اندر سے ہی کھانے کے برتن اسے تھما دیتی۔ پرنیاں کی آمد کے بعد اس نے خود آنا ترک کر دیا تھا۔ حکیم بیگم مسجد کے عقب والے حجرے میں اسے کھانا پہنچانے لگی۔ چند دن پہلے فضل الٰہی اپنی سابقہ روش کے مطابق دیوار کے نزدیک آیا تو حکیم بیگم اسے کھانا دینے آگے بڑھی۔

"وعلیکم اللہ بیرا اور تو آج آپ آ گیا۔ میں بس تیرے کول (پاس) آنے ہی والی سی۔"

فضل الٰہی نے چنگیر نہ پکڑی۔

"ایمانی گل ہے۔ جس دن سے تو نے اس بے دین زانی عورت کو گھر میں رکھا ہے۔ مجھ پر تیرا رزق حرام ہو گیا۔ میں تیرے گھر کی روٹی پنڈ کے کتوں کو ڈال دیتا تھا۔ قسم ہے پاک پروردگار کی۔ اک برکی (لقمہ) بھی چکھی ہو تو کلمہ نصیب نہ ہو۔"

"بھراوا (بھائی) مفت دا گناہ نہ کما۔ پاک دامن تے عیب نہ جوڑ۔ وہ نکاحی ہوئی ہے۔"

"نکاحیاں اپنے بچے مارنے کا حیلہ نیئں کرتیں۔ ان کو منہ نئیں چھپانا پڑتا۔ تیری گوانڈن چھوماں نے اپنے کانوں سے سنی ساری گل بات۔ وہ گواہ ہے کہ نئیں۔"

"اس نے جو کہا سچ ہو گا پر جو میں کہتی ہوں وہ بھی کوڑ (جھوٹ) نئیں۔ ایتھے نہ گل کر کوئی وی۔ وہ نمانی سنتی ہو گی۔ اس کا دل برا ہو گا۔ جو وی گلہ ہے تجھے میں صفائی دوں گی پر ایتھے نہ بول" حکیم بیگم گھٹی گھٹی آواز میں اس کی منت کرنے لگی۔

فضل الٰہی کی آواز اور بھی اونچی ہو گئی۔ وہ طیش سے کانپ رہا تھا۔ "تو باز آ جا۔ تیرا دیا مار تا ہے مجھے۔ نہیں تو میرا وس (بس) چلے میں تیرے گھر کو آگ لگا دوں۔ میں تجھے آخری وار (بار) بتا رہا ہوں اگر تو نے اس حرام کاری کرنے والی کو گھر سے نہ نکالا تو میں آپ جا کر تھانے دار سے تیری شکایت کروں گا۔ مولوی جی سے کہوں گا۔ جمعہ کے خطبے میں تیری بابت فتویٰ دیں۔ حکیم بیگم! تیرے دماغ میں فتور کیوں آیا؟ جن ہاتھوں سے تو کسب کرتی تھی۔ ان سے اب حرام کے بچے جنانے لگ پڑی۔ تجھے قبر کا عذاب بھول گیا۔"

پرنیاں نے ایک ایک لفظ سنا تھا اور اسے پورا یقین ہو چلا تھا کہ حکیم بیگم آج رات ہی اسے گھر سے جانے کو کہے گی مگر توقع کے برعکس وہ آ کر اس سے معافی مانگنے لگی۔

"تو کسی لئی (کس کے لیے) بددعا نہ کرنا میری دھی۔ میں تیرے آگے جواب دار ہوں۔ مجھے سے تیری پہرے داری ٹھیک نہ ہوئی پر تو دل نہ میلا کر۔ بس صبر کر۔ میرا رب تجھے اجر دے گا۔"

پرنیاں چند لمحے خاموش کھڑی اسے دیکھتی رہی اور پھر آہستگی سے خدا حافظ کہہ کر دروازے کی سمت قدم اٹھانے لگی۔

"دکھلوتے سہی (ذرا ٹھہر تو) حکیم بیگم اٹھ کر اس کے پاس آئی (ٹھیک ہے۔ میں تجھے روکتی نئیں پر دو گھڑی ٹھہر جا۔ مجھے تجھ سے کوئی بات کرنی ہے۔ پھر اللہ جانے حیاتی ہے تیرے نال میل ہو نہ ہو۔"

وہ رک کر سننے لگی۔

"تیرے پتر کو میں پھلاں دی آب (پھولوں کی مانند) رکھوں گی۔ کسی شے دی تھوڑ (کمی) نئیں آنے دوں گی۔"

"اس یقین دہانی کی ضرورت نہیں۔ میری حیثیت ایسی نہیں ہے کہ میں آپ سے کوئی ضمانت طلب کر سکوں۔ میں آپ کو کسی وعدے کا پابند نہیں بنا سکتی۔ آپ چاہے اسے جیسے بھی رکھیں میں آپ سے کبھی کچھ نہیں پوچھوں گی۔"

"رب کرے تیرے ماپے (ماں باپ) تجھ سے راضی ہو جائیں۔ جے ہن وی تو کہے تے میں تیرے نال چلی جاتی ہوں تیرے گھر۔ میں ہتھ کے ترلا (منت) کروں گی۔"

اس نے گردن کو دائیں بائیں جنبش دی "میں اکیلی جاؤں گی۔"

"میں تیری مجبوری جانتی ہوں۔ پر جے کدی وی اپنے پتر کو ملنے دا دل کرے تے منگ نہ کھانا (شرم نہ کرنا) تو ماں ہے اس دی۔ تیرا حق کدی ختم نئیں ہو گا۔" (اگر کبھی بھی اپنے بیٹے سے ملنے کو دل چاہے تو شرم نہ کرنا۔ ماں ہے اس کی تیرا حق کبھی ختم نہیں ہو گا)

"مجھے ماں نہ کہیں۔ مجھے لگتا ہے جیسے آپ مجھ پر طنز کر رہی ہوں۔ جس کے نقوش بھی ابھی صحیح طرح سے مجھے ذہن نشین نہیں ہوئے، اس کو آئندہ کبھی مل کر بھی میں کیا کروں گی۔ اب مجھے جانے دیجیے۔"

حکیم بیگم نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے دبایا۔ "کاکا میرے کول ہے گا۔ تے پکی گل ہے۔ مسلمان ہو گا پر تجھ سے پچھنا (پوچھنا) وی ضروری ہے ناں۔ ہالی میں نے اس دے کن وچ اذان نئیں دی۔ میں نے سوچا تیری اجازت مل جائے تے فیر۔" (کاکا میرے ساتھ رہے گا تو پکی بات ہے کہ مسلمان ہو گا۔ پر تجھ سے پوچھنا بھی ضروری ہے نا۔ ابھی تک میں نے اس کے کانوں میں اذان نہیں دی۔ میں نے سوچا تیری اجازت مل جائے تو پھر...)

اس کے دل کو کچھ ہوا۔ شدت سے جی چاہا کہ حکیم بیگم کو ایسا کرنے سے روک دے لیکن اختلاف کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی وجہ نہیں تھی۔ اندر سے بچے کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔

باقی آئندہ شمارے میں

نمرہ احمد

مصحف



محمل ابراہیم، آغا ابراہیم اور مسرت بیگم کی خوب صورت اور طرح دار بیٹی ہے۔ بچپن میں ہی آغا ابراہیم کے انتقال کے بعد تایا آغا کریم اور چچاؤں کے رحم و کرم پر ہے۔ مسرت سیدھی سادھی خاتون تھیں۔ اس لیے اپنی سسرال کو گھر اور کاروبار پر قبضہ کرنے سے روک نہیں پائیں۔ جس کا قلق محمل کو ہے۔ گھر والوں خصوصاً" تائی مہتاب کا رویہ ماں بیٹی کے ساتھ بے حد ناروا ہے۔ اپنے تعلیمی اخراجات و ضروریات کے لیے محمل ٹیوشن سینٹر میں پڑھاتی ہے۔

آغا ابراہیم کے اس محفل نما گھر میں آغا کریم اور مہتاب تائی' فواد' حسان' وسیم' سدرہ اور مہرین کے ساتھ مقیم ہیں۔ آغا ابراہیم کے جڑواں بھائی آغا غفران اور فضہ چچی کے تین بچے حسن' ندا اور سامیہ ہیں۔ سب سے چھوٹے آغا اسد اور ناعمہ بالائی منزل پر رہائش پذیر ہیں۔ جن کے تین بچے آرزو' معیز اور معاذ ہیں جبکہ رضیہ پھپھو کی ایک صاحبزادی فائقہ بھی ہیں۔ خاندان بھر میں تائی مہتاب اور آغا کریم کے فرزند فواد کو خاص مقام حاصل ہے۔ آرزو' فائقہ اور ندا اس کے لیے خاص جذبات رکھتی ہیں۔ محمل کو تائی مہتاب کے خاندان کی اس دکھتی رگ کا بخوبی اندازہ ہے۔ وہ فواد کی توجہ حاصل کرنے کے لیے اسے نظر انداز کرتی ہے تو وہ اس پر چونک جاتا ہے۔ آرزو' سدرہ اور فائقہ کو اس کی خوب صورتی اور ذہانت سے حسد ہے۔

کالج جاتے ہوئے ہر روز اسے ایک پراسرار سیاہ فام لڑکی ملتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ جلد کی کتاب محمل کی توجہ کھینچتی ہے۔ وہ لڑکی محمل کو بتاتی ہے کہ اس کتاب میں ماضی' حال' مستقبل کا احوال ہے۔ اور اس میں حالات اپنے گرفت میں کرنے کا نسخہ ہے۔ محمل اسے سمجھ نہیں پاتی ہے۔ وہ لڑکی محمل سے کہتی ہے کہ ایک دن اسے اس کتاب کی ضرورت ضرور پڑے گی۔

محمل' آغا کریم کو بتاتی ہے کہ بہترین تعلیمی ریکارڈ پر اسے جلد ہی برٹش کونسل کی جانب سے لندن کی اسکالرشپ مل



جائے گی۔ وہ راستہ صاف ہو جانے کی اس نوید پر سکون کا سانس لیتے ہیں۔ ایروناٹیکل انجینئر فرقان کا رشتہ سدرہ کے بجائے محمل کے لیے دے دیا جاتا ہے تو سب کو سانپ سونگھ جاتا ہے۔ تائی مہتاب فوراً" انکار کردیتی ہیں۔ جس پر محمل اور مسرت کو بہت رنج ہوتا ہے۔ فواد اس سے ہمدردی جتاتا ہے اور اسے فیکٹری میں آنر شپ دینے اور جاب کرنے کے لیے آغا جان سے بات کرتا ہے۔ جس پر وہ انکار کردیتے ہیں۔ حالات سے تنگ آکر محمل اس پر اسرار لڑکی سے سیاہ جلد والی کتاب لے آتی ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے سے قبل ہی تائی مہتاب سب کے ساتھ اسے رنگے ہاتھوں پکڑتی ہیں۔ لیکن پتہ چلتا ہے کہ یہ تو قرآن مجید ہے۔ محمل سمیت سب رنگ رہ جاتے ہیں۔ تائی مہتاب اپنی بے عزتی پر بے حد تلملائی ہیں۔ محمل غصہ میں آکر سیاہ فام لڑکی کو قرآن شریف واپس کر آتی ہے اور اسے سخت سست بھی سناتی ہے۔ اس ردِ عمل پر وہ لڑکی بجھ سی جاتی ہے۔

آغا فواد سب سے چھپ کر محمل کو فیکٹری لے جانے لگتا ہے اور اسے منع کرتا ہے کہ اس کا ذکر کسی سے نہ کرے۔ وہ اسے بیش قیمت ملبوسات بھی دلواتا ہے تاکہ سدرہ کی منگنی پر وہ اپنی حیثیت کے مطابق نظر آئے۔ محمل اپنی سادگی میں اسے فواد کی محبت سمجھتی ہے۔ حسن، محمل کو فواد کے سائے سے بھی دور رہنے کی تنبیہہ کرتا ہے تو محمل کو برا محسوس ہوتا ہے۔ میریٹ میں ڈنر کا جھانسہ دے کر فواد، محمل کو اپنے ساتھ جانے پر آمادہ کرتا ہے۔ راستے میں کسی ڈیل کے نہ ہونے پر نقصان کا ڈراما رچا کر محمل کو کلائنٹ کے پاس بھیجتا ہے۔ وہاں جا کر محمل کو آغا فواد کے اصل چہرے کا ادراک ہوتا ہے۔ فواد نے اے ایس پی کے سامنے محمل کو بطور چارہ استعمال کیا تھا اس صورتِ حال پر محمل چکرا کر رہ جاتی ہے۔ وہ اسے بتاتی ہے کہ آغا فواد اس کا بھائی ہے۔

انسپکٹر ہمایوں، محمل کی آغا فواد سے بات کرواتا ہے تو وہ اسے رات اس کے ساتھ رہنے کو کہتا ہے۔ محمل اس دعوے کہ دی پر ششدر رہ جاتی ہے۔ اس صدمے سے وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔ اسے ایک کمرے میں قید کر دیا جاتا ہے۔ لیکن وہ وہاں بذریعہ چھت بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اس کوٹھی کے برابر میں مدرسہ ہے۔ جہاں اس کی ملاقات فرشتے نامی لڑکی سے ہوتی ہے جو وہاں دین کی تعلیم دیتی ہے۔ فرشتے جان لیتی ہے کہ محمل اس وقت مشکل میں ہے۔ انسپکٹر ہمایوں اس کا کزن ہے۔ ہمایوں کے وہاں پہنچنے پر محمل کو مشورہ دیتی ہے کہ وہ اپنے گھر انسپکٹر ہمایوں کے ساتھ جائے۔ کچھ سوچ کر محمل فرشتے کی بات مان لیتی ہے۔ گھر پہنچنے پر اس کے ساتھ روایتی سلوک ہوتا اور آغا کریم اور تمام چچا اسے گھر سے نکال دینے کے درپے ہوتے ہیں کہ انسپکٹر ہمایوں کی آمد سب کو چونکا دیتی ہے۔ محمل سب کو بتاتی ہے کہ کس طرح آغا فواد نے دھوکے سے اسے ڈیل کا حصہ بنایا۔ سوائے حسن اور مسرت (ماں) کے سب اسے جھٹلاتے ہیں۔ وہ آغا فواد کی سرگرمیوں کے خلاف پولیس میں رپورٹ کروا دیتی ہے۔ تائی جان اسے مارنے کو لپکتی ہیں تو سب انہیں روک دیتے ہیں۔ آغا فواد گرفتار ہو جاتا ہے۔ مصلحتاً" محمل کو گھر میں رہنے کی اجازت مل جاتی ہے۔ مسرت سے محمل کی بات چیت بند ہے۔ وہ اس معاملے میں محمل کو بھی قصوروار سمجھتی ہیں۔ محمل فرشتے سے ملنے دوبارہ مدرسے جاتی ہے تو وہ اسے قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرنے کا مشورہ دیتی ہے۔ وہ اس بات کو خاص اہمیت نہیں دیتی، لیکن مصروفیت کے لیے اس کا مشورہ مان لیتی ہے۔ دینی تعلیم اسے ذہنی و روحانی سکون بخشتی ہے۔ اس دوران انسپکٹر ہمایوں سے اس کی ملاقات ہوتی ہے تو وہ اسے رابطے کے لیے اپنا سیل نمبر دیتا ہے۔ وہ آغا فواد کے خلاف محمل کو وعدہ معاف گواہ بنانا چاہتا ہے۔ یہ بات جب گھر والوں کے علم میں آتی ہے تو وہ محمل کو بری طرح زدوکوب کرتے ہیں۔ وہ رو، رو کر ان سب کو بددعا دیتی ہے۔ حسن گھر والوں کے اس سلوک پر ششدر رہے۔ مسرت، محمل کو آغا فواد کے خلاف وعدہ معاف گواہ بننے کا کہتی ہیں۔ محمل، انسپکٹر ہمایوں کو تمام صورتِ حال بتاتی ہے تو وہ اسے مصلحتاً" جھوٹ بولنے کا مشورہ دیتا ہے۔ تایا کریم اسے جائیداد میں حصہ دینے کا جھانسہ دیتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ شرط رکھتے ہیں کہ وہ انسپکٹر ہمایوں داؤد کے خلاف کورٹ میں بیان دے تو اسے اس کا حصہ مل جائے گا، وہ ان کا ساتھ دینے کی حامی بھر لیتی ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

چوتھی قسط

"ہاں۔ ابا مجھ سے ملتے تھے۔ میری امی ان کی فرسٹ وائف تھیں، ڈائیوورس کے بعد امی اور ابا الگ ہو گئے تھے، پھر انہوں نے تمہاری امی سے شادی کی۔ دونوں ان کی پسند کی شادیاں تھیں، ہے نا عجیب بات؟ خیر، مجھ سے وہ ہر ویک اینڈ پہ ملنے آتے تھے، میں اپنے چچاؤں سے متعارف تو نہ تھی، مگر وہ سب جانتے تھے کہ میں کون ہوں، کدھر رہتی ہوں۔ مگر ابا کی ڈیتھ کے بعد انہوں نے مجھے تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیا۔ میں بہت دفعہ اپنا حق مانگنے گئی، مگر وہ نہیں دیتے۔ ابا کی پہلی شادی خفیہ تھی، سوائے ہمارے بڑوں کے، خاندان میں کسی کو علم نہ تھا۔ تم سے بھی چھپا کر رکھا گیا کہ کہیں تم میرے ساتھ مل کر حصہ نہ مانگنے کھڑی ہو جاؤ۔"

"آپ نے کیس کیوں نہیں کیا ان پہ؟" بہت دیر بعد وہ بول پائی تھی۔

"مجھے جائیداد سے حق میں... تم... سے حق چاہیے محمل! میں بہت دفعہ تمہارے گھر پہ گئی ہوں، مگر اندر داخلہ۔ خیر یہ بھی کہانی ہے میں کئی برسوں سے اپنے حق کی جنگ لڑ رہی ہوں۔ وارث اللہ نے بنائے ہیں، میں ابا کی وارث ہوں۔ یہ ہی سوچ کر اب میں جائیداد میں سے حصہ مانگتی ہوں، مگر....." وہ بات ادھوری چھوڑ گئی۔

"آپ کو پتا تھا میں آپ کے بارے میں نہیں جانتی؟"

"ہاں، مجھے پتا تھا۔ میں نے جب بھی تم سے ملنے کی کوشش کی، کریم تایا نے یہ ہی کہہ کر روک دیا کہ محمل ذہنی طور پہ ڈسٹرب ہو جائے گی، اور ابا سے نفرت کرے گی، پھر میں نے صبر کر لیا۔ میں جانتی تھی جو ربِ بن یامین کو یوسف علیہ السلام کے پاس لا سکتا ہے، وہ محمل کو بھی میرے پاس لے آئے گا۔" وہ ہلکا سا مسکرائی تھی۔ محمل کو لگا اس کی سنہری آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔

"فواد بھائی، ان کا کیس۔"

"ہمایوں نے مجھے بتایا تھا کہ میرے کزن فواد نے اس کے ساتھ کسی لڑکی محمل کا معاملہ طے کیا ہے۔ کم عمر ہے اور خوب صورت بھی۔ میرا دل تب ہی سے کھٹک گیا تھا۔ مگر ہمایوں ماننے کو تیار ہی نہ تھا کہ فواد تمہارے ساتھ یہ کر سکتا ہے۔ اسے گمان تھا، وہ کوئی اور لڑکی ہو گی۔ مگر جس لمحے میں نے مسجد کی چھت پہ تمہیں دیکھا تھا، میں تمہیں پہچان گئی تھی۔"

"آپ نے تو مجھے کبھی نہیں دیکھا تھا، پھر۔"

"دیکھا تھا، ایک دفعہ تمہارے اسکول آئی تھی تم سے ملنے۔ بینچ پہ بیٹھی تمہیں دیکھتی ہی رہی، تم ابھی الجھی الجھی، چڑچڑی سی لگ رہی تھیں، پھر مجھ سے تمہیں مزید ذہنی اذیت نہیں دی گئی، سو واپس پلٹ گئی۔"

فرشتے تھک کر چپ ہو گئی، شاید اب اس کے پاس کہنے کو کچھ نہ بچا تھا۔ وہ یاسیت سے اسے دیکھے گئی جو بہت تھکی تھکی نظر آ رہی تھی۔ بہت دیر بعد اس نے پھر لب کھولے۔

"تم خوش قسمت ہو محمل! کہ تم رشتوں کے درمیان رہی ہو۔ تم یتیم نہیں رہی ہو۔ یتیموں والی زندگی تو میں نے گزاری ہے۔ اس کے باوجود میں نے کبھی یتیمی کا لیبل خود پہ نہیں لگایا۔ میری خالہ اور ہمایوں۔ یہ ہی تھے میرے رشتے اور اب میرے پاس کھونے کو مزید رشتے نہیں بچے، ایک چیز مانگوں تم سے؟ کبھی مجھے اس آزمائش میں مت ڈالنا، میں مزید رشتے کھونا۔"

"اے ایس پی صاحب کے ساتھ آپ ہیں؟" آواز پہ ان دونوں نے چونک کر سر اٹھایا۔ سامنے یونیفارم میں ملبوس نرس کھڑی تھی۔

"جی۔" محمل اس کے گھٹنوں سے ہاتھ ہٹاتی بے چینی سے اٹھی۔

"ان کو ہوش آ گیا ہے، اب خطرے سے باہر ہیں، آپ ان کی؟"

"میں.... میں ان کی فرینڈ ہوں۔" اس نے جلدی سے فرشتے کی طرف اشارہ کر کے بتایا۔ "یہ ہمایوں صاحب کی بہن ہیں۔"

"بہن؟" اس نے چونک کر محمل کو دیکھا، مگر وہ

نرس کی طرف متوجہ تھی۔ "بہن؟" وہ ہولے سے زیرِ لب بڑبڑائی۔ پھر ہلکا سا نفی میں سر ہلایا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی، مگر محمل نرس کے پیچھے جا رہی تھی۔ اس نے کچھ بھی نہ سنا۔

وہ خالی ہاتھ بیٹھی رہ گئی۔ اس کی سنہری آنکھوں میں شام اتر آئی تھی، محمل وہ شام نہ دیکھ سکی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر ہمایوں کے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔

وہ بیڈ پہ آنکھیں موندے لیٹا تھا، اوپر چادر پڑی تھی۔ آہٹ پہ قدرے نقاہت سے آنکھیں کھولیں۔ اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"محمل!"

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کے سامنے جا رکی۔

بھورے سلکی بالوں کی اونچی پونی ٹیل بنائے فیروزی شلوار قمیص ہم رنگ دوپٹہ شانوں پہ پھیلائے وہ بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"آئی ایم سوری، ہمایوں!" آنسو آنکھوں سے پھسل پڑے تھے۔ وہ بدقت مسکرایا۔

"ادھر آؤ۔"

وہ چند قدم آگے بڑھی۔

"اتنی غصے میں کیوں تھیں؟"

"مجھے معاف کردیں پلیز۔" اس نے بے اختیار دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ ہمایوں نے بایاں ہاتھ اٹھایا اور اس کے بندھے ہوئے ہاتھوں کو تھام لیا۔

"تم نے کیوں کہا، تمہیں مجھ سے کوئی امید نہیں؟"

"تو کیا رکھتی؟" اس کے دونوں ہاتھ اور ہمایوں کا ہاتھ اوپر تلے ایک دوسرے میں بند ہوگئے تھے۔

"تمہیں لگتا ہے، میں بیچ راہ میں چھوڑ دینے والوں میں سے ہوں؟"

"کیا نہیں ہیں؟" آنسو اسی طرح اس کی آنکھوں سے ابل رہے تھے۔

"کیوں اتنی بدگمان رہتی ہو مجھ سے؟"

"بدگمان تو نہیں، بس۔"

"پھر چھری کیوں لائی تھیں؟ تمہیں لگتا تھا تم میرے گھر غیر محفوظ ہوگی؟" وہ نرمی سے کہہ رہا تھا۔

"آپ مجھے معاف کردیں پلیز، آپ نے معاف کردیا تو اللہ بھی مجھے معاف کردے گا۔"

کہہ کر وہ لمحے بھر کو خود بھی چونک گئی۔ آخری فقرہ ادا کرتے ہوئے دل میں عجیب سا احساس ہوا تھا۔ ایک دم اس نے اپنے ہاتھ چھڑائے تھے، یہ سب ٹھیک نہیں تھا۔

"آپ آرام کریں، مجھے مدرسہ بھی جانا ہے۔" وہ دروازے کی طرف لپکی تھی۔

"مت جاؤ۔" وہ بے اختیار پکار اٹھا تھا۔

"میں گھر سے مدرسہ کا کہہ کر نکلی تھی، اگر نہ گئی تو یہ خیانت ہوگی اور پل صراط پہ خیانت کے کانٹے ہوں گے، مجھے وہ پل پار کرنا ہے۔"

"تھوڑی دیر رک جاؤ گی تو کیا ہو جائے گا؟" وہ جھنجلایا تھا۔

"یہ حقوق العباد کا معاملہ ہے اور....."

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے مادام! آپ جا سکتی ہیں۔" وہ مسکراہٹ دبا کر بولا تو اسے لگا، وہ کچھ زیادہ ہی بول گئی ہے۔

"سوری۔" ایک لفظ کہہ کر وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

فرشتے اسی طرح بینچ پہ بیٹھی تھی۔ آہٹ پر سر اٹھایا۔

"میں چلتی ہوں فرشتے! مجھے مدرسہ جانا ہے۔" نامحسوس انداز میں اس نے اپنا ہاتھ دوپٹے کے اندر کیا کہ کہیں وہ اس پہ کسی کا لمس نہ دیکھ لے۔

"مل لیں ہمایوں سے؟" اس کی آواز بہت پست تھی۔

"ہاں۔" اس نے بے اختیار نگاہیں چرائیں، فرشتے اسی طرح گردن اٹھا کر اسے دیکھتی جانے اس کے چہرے پہ کیا کھوج رہی تھی۔ وہ جیسے گھبرا کر جانے کو پلٹی۔

"محمل سنو!" وہ جیسے بے چینی سے پکار اٹھی اور اس سے پہلے کہ وہ پلٹتی اس نے نفی میں سر ہلاتے دھیرے سے کہا۔ "نہیں کچھ نہیں، جاؤ۔"

"خیریت؟"

"جاؤ، تمہیں دیر ہو رہی ہے۔"

"او کے، السلام علیکم۔" وہ راہداری میں تیز تیز قدم اٹھاتی دور ہوتی گئی۔ فرشتے نے پھر سے سر ہاتھوں میں گرا لیا۔

☆ ☆ ☆

اس کا دل بہت بوجھل سا ہو رہا تھا۔ مدرسہ آ کر بھی اسے سکون نہ مل رہا تھا۔ اسے تھوڑی دیر ہوگئی تھی اور تفسیر کی کلاس وہ مس کر چکی تھی۔ سارا دن وہ یوں ہی مضمحل سی پھرتی رہی۔ بریک میں سارہ نے اسے جا لیا۔ وہ برآمدے کے اسٹیپس پہ بیٹھی تھی۔ گود میں کتابیں رکھے، چہرے پہ بے زاری سجائے۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟" سارہ دھپ سے ساتھ آ بیٹھی۔

"پتا نہیں۔" وہ جھنجلاتے ہوئے گود میں رکھی کتاب کھولنے لگی۔

"پھر بھی، کوئی مسئلہ ہے؟"

"ہاں، ہے۔"

"کیا ہوا ہے؟"

"اللہ تعالیٰ..... بس....." وہ سر جھٹک کر صفحے پلٹنے لگی۔

"بتاؤ نا۔"

"اللہ تعالیٰ ناراض ہیں۔ دیٹس اٹ!" زور سے اس نے کتاب بند کی۔

"اوہو، تم خواہ مخواہ قنوطی ہو رہی ہو۔ اللہ تعالیٰ کیوں ناراض ہوں گے بھلا؟"

"بس ہیں نا!"

"اتنی مایوسی اچھی نہیں ہوتی۔ تمہیں کیسے پتا کہ وہ ناراض ہیں؟"

"ایک بات بتاؤ!" وہ جیسے کوفت زدہ سی اس کی طرف گھومی۔ "اگر تم کسی کے ساتھ چوبیس گھنٹے ایک ہی گھر میں رہو، تو گھر میں داخل ہوتے ہی تمہیں اس شخص کا موڈ دیکھ کر پتہ نہیں چل جاتا کہ وہ ناراض ہے؟ بھلے وہ منہ سے کچھ نہ کہے، بھلے تمہیں اپنی غلطی بھی سمجھ میں نہ آرہی ہو، مگر تم جان لیتی ہو ناکہ ماحول میں تناؤ ہے، اور پھر تم دوسروں سے پوچھتی پھرتی ہو کہ "اسے کیا ہوا ہے؟" اور پھر تم اپنی غلطی سوچتی ہو۔ میں بھی اس وقت یہی کر رہی ہوں سو مجھے کرنے دو!"

"مگر محمل"

"تمہیں پتہ ہے، اتنے عرصے سے میں روز ادھر آکر قرآن سنتی تھی۔ آج میری تفسیر کی کلاس مس ہوگئی ہے۔ آج میں قرآن نہیں سن سکی۔ تمہیں پتہ ہے کیوں؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ مجھ سے ناراض ہیں، وہ مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتے۔ سو ابھی پلیز مجھے اکیلا چھوڑ دو!"

سارہ کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ کتابیں سنبھالتی اٹھی اور تیز تیز قدموں سے چلتی اندر آگئی۔

پریئر ہال خالی پڑا تھا۔ بتیاں بجھی تھیں۔ وہ کھڑکی کے ساتھ آ بیٹھی۔ کھڑکی کے شیشے سے روشنی چھن کر اندر آ رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ دعا کے لیے اٹھائے۔

"اللہ تعالیٰ..... پلیز....." الفاظ لبوں پہ ٹوٹ گئے۔ آنسو ٹپ ٹپ گالوں پہ گرنے لگے۔ اس نے دعا کے لیے اٹھے ہاتھوں کو دیکھا۔ یہ ہاتھ چند گھنٹے قبل ہمایوں کے ہاتھ میں تھے۔ لڑکے لڑکی کا ہاتھ پکڑنا تو اب عام سی بات بن گئی تھی مگر قرآن کی طالبہ کے لیے وہ عام سی بات نہ تھی۔ وہ کیسے جذبات کے ریلے میں بہہ گئی کہ خیال ہی نہ آیا کہ اسے یوں تنہا کسی کے ساتھ نہیں ہونا چاہیے۔ ہمایوں نے خود کو کیوں نہ روکا؟ مگر نہیں، وہ ہمایوں کو کیوں الزام دے؟ وہ تو قرآن کا طالب علم نہ تھا، طالبہ تو وہ تھی۔ سمعنا واطعنا (ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی) کا وعدہ تو اس نے کر رکھا تھا۔ پھر؟

آنسو اسی طرح اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ وہ سر جھکائے آج کا سبق کھولنے لگی۔

"اللہ تعالیٰ، پلیز مجھے معاف کردے، مجھے ہدایت پہ قائم رکھ۔"

اس نے دل میں دعا مانگتے ہوئے مطلوبہ صفحہ کھولا۔

"کس طرح اللہ اس قوم کو ہدایت دے سکتا ہے جو اپنے ایمان لانے کے بعد کفر کریں؟"

اس کے آنسو پھر سے گرنے لگے۔ اس کا رب اس سے بہت ناراض تھا۔ اس کی معافی کافی نہ تھی۔ وہ سسکیوں کے درمیان پھر سے استغفار کرنے لگی۔

"اور انہوں نے رسول کے برحق ہونے کی گواہی دی تھی، اور ان کے پاس روشن نشانیاں آئی تھیں، اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔"

وہ جیسے جیسے پڑھتی جارہی تھی، اس کا رواں رواں کانپنے لگا تھا۔ قرآن وہ آئینہ تھا جو بہت شفاف تھا۔ اس میں سب کچھ صاف نظر آتا تھا۔ اتنا صاف کہ کبھی کبھی دیکھنے والے کو خود سے نفرت ہونے لگتی تھی۔

"ان لوگوں کی جزا یہ ہے کہ بے شک ان پہ اللہ کی لعنت ہے۔ اور فرشتوں کی اور سب کے سب لوگوں کی (لعنت ہے) "ہمیشہ رہنے والے ہیں اس میں۔ نہ ان سے عذاب ہلکا کیا جائے گا، اور نہ ہی وہ مہلت دیے جائیں گے۔"

اس نے قرآن بند کردیا۔ یہ خالی زبانی استغفار کافی نہ تھا۔

اس نے نوافل کی نیت باندھی، اور پھر کتنی ہی دیر وہ سجدے میں گر کر روتی رہی۔ جس کے ساتھ ہر پل رہو، جو رگ جاں سے بھی زیادہ قریب ہو، اس کی ناراضی محسوس ہو ہی جاتی ہے اور انسان اس کی ناراضی دور کرنے کے لیے اتنا ہی کوشش کرتا ہے جتنی وہ اس سے محبت کرتا ہے۔

جب دل کو کچھ سکون آیا تو اس نے اٹھ کر آنسو پونچھے، اور قرآن اٹھا کر ٹھیک اسی آیت سے کھولا جہاں سے چھوڑا تھا۔ آیت روز اوّل کی طرح روشن تھی۔

"مگر اس کے بعد جن لوگوں نے توبہ کرلی...." (اس کا دل زور سے دھڑکا) اور انہوں نے اصلاح کرلی تو بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔"

بہت دیر سے روتے دل کو ذرا امید بندھی۔ ذرا قرار آیا۔

یہ توبہ کی قبولیت کی نوید تو نہ تھی، مگر امید ضرور تھی۔

اس نے آہستہ سے قرآن بند کیا۔ میڈم مصباح کہتی تھیں، اگر قرآن کی آیات میں آپ کے لیے ناراضی کا اظہار ہو تو بھی بخشش کی امید رکھا کریں۔ کم از کم اللہ آپ سے بات تو کر رہا ہے۔

"وہ ٹھیک ہی کہتی تھیں۔" محمل نے اٹھتے ہوئے سوچا تھا۔

☼ ☼ ☼

مہتاب تائی نے کمرے کے کھلے دروازے سے اندر جھانکا۔

"محمل سے کہو شاپنگ کے لیے چلے۔ اس کے جوتے کا ناپ لینا ہے۔ ورنہ بعد میں خود کہے گی کہ پورا نہیں آتا۔"

وہ بیڈ پہ کتابیں کھولے بیٹھی تھی، جبکہ مسرت الماری سے کچھ نکال رہی تھیں۔ تائی کی آواز پہ دونوں نے بری طرح چونک کر انہیں دیکھا تھا جو اسے نظر انداز کیے مسرت سے مخاطب تھیں۔

(تو وہ وسیم والا قصہ ابھی تک باقی ہے؟) اس نے کوفت سے سوچا تھا۔ پچھلے کچھ دنوں میں پے در پے ہونے والے واقعات نے وقتی طور پہ اسے وہ معاملہ بھلا دیا تھا۔ یہ بھی کہ حسن کی مخالفت ابھی برقرار تھی۔

"مگر تائی اماں میں انکار کرچکی ہوں۔"

"لڑکی! میں تمہاری ماں سے بات کر رہی ہوں۔"

"مگر میں آپ سے بات کر رہی ہوں۔" اس کا لہجہ نرم مگر مضبوط تھا۔

"مسرت؟ اس سے کہو تیار ہو جائے، میں گاڑی میں اس کا ویٹ کر رہی ہوں۔" وہ کھٹ کھٹ کرتی وہاں سے چلی گئیں۔ اس نے بے بسی سے ماں کو دیکھا۔ وہ اس سے بھی زیادہ بے بس نظر آ رہی



تھیں۔

"اماں آپ......"

"ابھی چلی جاؤ، محمل! ورنہ وہ ہنگامہ کردیں گی۔"

"یہ سمجھتی کیوں نہیں ہیں؟" وہ زچ سی ہو کر کتابیں رکھنے لگی۔

"شاید حسن کچھ کرسکے۔ مجھے حسن سے بہت امید ہے۔"

"اور مجھے اللہ سے ہے!" وہ کچھ سوچ کر عبایا پہننے لگی۔ پھر سیاہ حجاب چہرے کے گرد لپیٹا اور پن لگائی۔ خوامخواہ ہنگامہ کرنے کا فائدہ نہ تھا۔ چلی ہی جائے تو بہتر ہے۔ باقی بعد میں دیکھا جائے گا۔

لاؤنج میں سیڑھیوں کے پاس لگے آئینے کے سامنے وہ رکی۔ ایک نظر اپنے عکس کو دیکھا۔ سیاہ حجاب میں سنہری چہرہ دمک رہا تھا۔ اونچی پونی ٹیل سے حجاب پیچھے سے اٹھ سا گیا تھا اور بہت اچھا لگ رہا تھا۔

وہ یونہی خود کو دیکھتی پلٹی ہی تھی کہ آخری سیڑھی اترتے حسن پہ نظر پڑی۔

"کدھر جارہی ہو؟"

"تائی اماں کے ساتھ شادی کی شاپنگ پہ۔"

"تم راضی ہو محمل؟" وہ بھونچکا سا اس کے قریب آیا۔ وہ بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹی۔

"اس گھر میں مجھے اپنی رضا سے اس فیصلے کا اختیار نہیں ملا حسن بھائی۔"

وہ کتنے ہی لمحے خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ پھر آہستہ سے لب وا کیے۔

"ہم کورٹ میرج کرلیتے ہیں۔"

اور محمل کو لگا اس نے تھپڑ دے مارا ہے۔

"آپ کو پتہ ہے آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" وہ بمشکل ضبط کرپائی تھی۔

"ہاں، میں تمہیں اس دلدل سے نکالنے کی بات کررہا ہوں۔"

"آپ کورٹ میرج کی بات۔؟ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ مجھ سے یہ بات کریں گے۔"

"تمہیں اعتراض کیوں ہے محمل! یہ تمہاری شادی زبردستی وسیم سے کردیں گے اور تم۔"

"حسن بھائی پلیز، آپ کو پتا ہے کورٹ میرج کیا ہوتی ہے؟ سرکاری شادی، کاغذوں کی شادی۔ میں ایسی شادی کو نہیں مانتی جس میں لڑکی کے دل کی مرضی شامل نہ ہو۔"

اور میں کیوں یوں چھپ کر شادی کروں گی؟ نہ آپ سے، نہ وسیم سے۔ میرا راستہ چھوڑیں۔" وہ بے بس سا سامنے سے ہٹا تو وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

گاڑی کی پچھلی سیٹ پہ بیٹھی مہتاب تائی اس کا انتظار کررہی تھیں۔ وہ اندر بیٹھی اور دروازہ ذرا زور سے بند کیا۔

اسی پل ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر کوئی اندر بیٹھا۔ اس نے ڈرائیور سمجھ کر یونہی بیک ویو میں دیکھا تو جھٹکا سا لگا۔

وہ وسیم تھا۔ اپنے ازلی معنی خیز انداز میں مسکراتے وہ گاڑی اسٹارٹ کرچکا تھا۔ اسے لگا اس سے غلطی ہوچکی ہے مگر اب کیا کیا جاسکتا تھا؟

لب کچلتی وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

تائی مہتاب منگنی کی شاپنگ کررہی تھیں یا شادی کی، وہ کچھ نہ سمجھ سکی۔ بس چپ چاپ ان کے ساتھ میٹرو میں چلی آئی۔ وہ جہاں بیٹھیں، ان کے ساتھ بیٹھ گئی۔

"سنا ہے، تم نے بڑا شور ڈالا تھا۔" تائی اٹھ کر ایک شوکیس کے قریب گئیں تو وہ اس کے ساتھ صوفے میں دھنس کر بیٹھا۔ محمل بدک کر اٹھی۔

"ارے بیٹھو بیٹھو۔ مجھے تم سے بات کرنی ہے۔"

شاپ کی تیز پیلی روشنیاں وسیم کے چہرے پہ پڑ رہی تھیں، گریبان کے کھلے بٹن، گردن سے لپٹی چین، اور شوخ رنگ کی شرٹ اف، اسے اس سے کراہت آئی تھی۔

"کیا بات کرنی ہے؟"

"تم مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتیں تو کس سے کرنا چاہتی ہو؟" وہ استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ پوچھ رہا تھا۔ اس کے ذہن کے پردے پہ ایک چہرہ سا ابھرا۔ ایک اندرونی خواہش۔ ایک دبتی، دبائی محبت کی ادھوری داستان، اس نے بے اختیار سر جھٹکا۔

"نہ آپ سے، نہ کسی اور سے۔ آپ میرا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟"

"ایسے نہیں محمل ڈیر، ابھی تو ہم نے بہت وقت ساتھ گزارنا ہے۔" وہ کھڑے ہو کر اس کے قریب آیا۔ وہ پھر دو قدم پیچھے ہٹی، دکان لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔ پھر بھی محمل کو اس کے بے باک انداز سے خوف آتا تھا۔ نہ معلوم وہ کیا کر ڈالے۔

"اچھا ادھر آؤ، مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔" وہ قدم اٹھاتا اس کے نزدیک آرہا تھا "ادھر آئس کریم پارلر میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔"

"تائی...... تائی اماں۔" بے بس سی وہ بھیڑ میں تائی مہتاب کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"تمہاری تائی کو ان کی کوئی فرینڈ مل گئی ہے، وہ ابھی نہیں آئیں گی۔ تم ادھر قریب تو آؤ نا محمل ڈیر۔" وسیم نے ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی تھامنا چاہی، اس کی انگلیاں اس کی کلائی سے ذرا سی مس ہوئیں۔ محمل کو جیسے کرنٹ سا لگا۔ ہاتھ میں پکڑا ہینڈ بیگ اس نے پوری قوت سے وسیم کے منہ پہ دے مارا۔

"گھٹیا آدمی، پیچھے ہو!" وہ چلائی تھی۔

بیگ اس کی ناک پہ زور سے لگا تھا، وہ بلبلا کر پیچھے ہٹا۔ شور کی آواز پہ بہت سے لوگ ادھر متوجہ ہوئے۔ سیلز بوائز کام چھوڑ کر ان کی طرف لپکے۔

"یو...... یو بچ...! وسیم تو غصے سے پاگل ہی ہوگیا۔ ناک پہ ہاتھ رکھے، وہ جارحانہ انداز میں اس کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ایک لڑکے نے اسے پیچھے سے پکڑ لیا۔

"کیا تماشا ہے؟ کیوں بچی کو تنگ کررہے ہو؟"

"میڈم کیا ہوا ہے؟ یہ بندہ تنگ کررہا تھا آپ کو؟"

بہت سی آوازیں آس پاس ابھریں۔ کچھ لڑکوں نے وسیم کو بازوؤں سے پکڑ رکھا تھا۔

"یہ مجھے تنگ کررہا تھا۔ اکیلی لڑکی جان کر۔" محمل نے بمشکل خود کو سنبھالا اور کہہ کر پیچھے ہٹ گئی۔ اسے معلوم تھا، اب کیا ہوگا۔ اور واقعی، وہی ہوا، اگلے ہی لمحے وہ لڑکے وسیم پہ پل پڑے۔ وہ گالیاں بکتا خود کو چھڑانے کی کوشش کررہا تھا، مگر وہ سب بہت زیادہ تھے۔ "مارو...... اسے اور مارو...... شریف لڑکیوں کو چھیڑتا ہے۔"

ایک عمر رسیدہ صاحب ہجوم کے پاس کھڑے غصے سے کہہ رہے تھے۔

"زور سے مارو۔ اسے عبرت کی مثال بنادو۔"

"اپنے گھر ماں، بہن نہیں ہے کیا۔؟"

اور وہ ماں جب تک دوکان میں لگے ہجوم تک پہنچی، وہ وسیم کو مار مار کر ادھ موا کرچکے تھے۔ تائی اس کی طرف لپکیں۔ تھوڑی ہی دور صوفے پہ محمل بیٹھی تھی۔ ٹانگ پہ ٹانگ رکھے، مطمئن سی وسیم کو پٹتے دیکھ رہی تھی۔

"محمل۔ یہ اسے کیوں مار رہے ہیں۔؟"

"کیونکہ اس کے باپ کے کہنے پہ مجھے بھی ایسے ہی مارا گیا تھا۔"

"بکواس مت کرو۔"

"بڑی دلچسپ بکواس ہے یہ، آپ بھی انجوائے کریں نا۔" وہ محظوظ سی وسیم کو پٹتے دیکھ رہی تھی۔ شاپ کا بوکھلایا ہوا مینجر اور سیلز بوائز، مشتعل نوجوانوں کو چھڑانے کی کوشش کررہے تھے۔

"سر پلیز۔ سر دیکھیں۔" سیلز بوائز کی منت کے باوجود وہ لڑکے ان کو دیکھنے کی زحمت ہی نہیں کررہے تھے۔ حواس باختہ سی تائی مہتاب ان کی طرف دوڑیں۔

"میرے بیٹے کو چھوڑو، پرے ہٹو مردودو!" وہ چلا چلا کر ان لڑکوں کو ہٹانے کی سعی کررہی تھیں۔

صوفے پہ بیٹھی محمل مسکراتے ہوئے چپس کا پیکٹ کھول رہی تھی۔

"اب یہ مرتے دم تک مجھے ساتھ نہیں لائیں گی۔" ساری صورتحال سے لطف اندوز ہوتی وہ چپس نکال کر کترنے لگی۔

☼ ☼ ☼

اس نے دروازہ ہولے سے بجایا۔ مدھم دستک نے خاموشی میں ارتعاش سا پیدا کیا۔

"آجاؤ محمل!" اندر سے فرشتے کی تھکن زدہ مسکراتی آواز آئی اس نے حیرت سے دروازہ کھولا۔

"السلام علیکم۔ اور آپ کو کیسے پتا کہ یہ میں ہوں؟"

"میں تمہاری چاپ پہچانتی ہوں۔" وہ بیڈ پہ بیٹھی تھی گھٹنوں پہ لحاف پڑا تھا۔ ہاتھ میں کوئی کتاب تھی۔ بھورے سیدھے بال شانوں پہ تھے۔ اور چہرے پہ ذرا سی تکان تھی۔ محمل اندر داخل ہوئی تو فرشتے نے کتاب سائیڈ ٹیبل پہ ڈال دی اور ذرا سا کھسک کر جگہ بنائی۔ "آؤ بیٹھو۔"

"نائس روم۔ فرسٹ ٹائم آئی ہوں آپ کے ہاسٹل!" محمل ستائشی نگاہیں اطراف میں ڈالتی بیڈ کی پائنتی کے قریب بیٹھی۔ وہ اسکول یونیفارم میں ملبوس تھی، جبکہ فرشتے بالکل مختلف گھر۔ والے حلیے میں تھی۔

"پھر کیسا لگا ہاسٹل؟"

"بہت اچھا اور آپ آج اسکول کیوں نہیں آئیں؟"

"یونہی۔ طبیعت ذرا مضمحل سی تھی۔" وہ تکان سے مسکرائی۔ اس کا چہرہ محمل کو بہت زرد سا لگا تھا۔ شاید وہ بیمار تھی۔

"اپنا خیال رکھا کریں۔" پھر قدرے توقف سے گویا ہوئی، "آپ ہمارے ساتھ ہمارے گھر چل کر کیوں نہیں رہتیں؟ وہ آپ کا بھی گھر ہے، آپ کا حق ہے اس پہ، آپ کو اس گھر میں سے اپنا حصہ مانگنا چاہیے۔"

"مجھے مٹی کے مکان کا کیا کرنا ہے؟ وہ تو میں ایک دن خود بھی بن جاؤں گی مجھے تو رشتوں میں سے حق چاہیے۔"

"تو ان پہ زور دیں نا۔"

"کوئی اور بات کرو محمل!"

"اف!" وہ ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی۔ "مجھے علم ہی نہ تھا کہ میری ایک بہن بھی ہے اور ساری عمر میں بہن کے لیے ترستی رہی۔"

"ہم لوگوں کے ساتھ کے لیے نہیں ترستے محمل، ہم لوگوں کے ساتھ کی "چاہ" کے لیے ترستے ہیں، اور اسی چاہ سے محبت کرتے ہیں۔ سو وہ لوگ مل جاتے ہیں تو پھر یوں لگتا ہے کہ وہ تو کچھ نہ تھے۔ سب کچھ تو وہ چاہ تھی جس کی ہم نے صدیوں پرستش کی تھی۔"

"آپ بیمار ہو کر کافی فلسفی ہو گئی ہیں، سو پلیز، اچھا سنیں، ایک بات بتاؤں۔" وہ پرجوش سی بتانے لگی۔ "کل تائی اماں مجھے وسیم کے ساتھ شاپنگ پہ لے گئیں، اور میں نے اسے شاپ میں لوگوں سے پٹوا لیا۔"

"آپ بیمار ہو کر کافی فلسفی ہو گئی ہیں، سو پلیز، اچھا سنیں، ایک بات بتاؤں۔" وہ پرجوش سی بتانے لگی۔ "کل تائی اماں مجھے وسیم کے ساتھ شاپنگ پہ لے گئیں، اور میں نے اسے شاپ میں لوگوں سے پٹوا لیا۔"

"بری بات۔ قرآن کی طالبہ ایسی ہوتی ہے کیا؟"

"ارے اس نے میرے ساتھ بدتمیزی کی تھی اور اسے سبق سکھانے کے لیے یہ ضروری تھا، یو نو، سیلف ڈیفنس! ہمایوں کیسا ہے؟" ایک دم اس نے پوچھا اور خود بھی حیران رہ گئی۔

"اب بہتر ہے۔"

"اوہ شکر الحمد اللہ۔" وہ واقعتاً" خوش ہوئی تھی۔ چہرہ جیسے کھل اٹھا تھا۔ فرشتے بغور اس کے تاثرات جانچ رہی تھی۔

"تم اسے پسند کرتی ہو، رائٹ؟"

اس کی نگاہیں بے اختیار جھک گئیں۔ رخسار گلابی پڑ گئے۔ اسے توقع نہ تھی کہ فرشتے اتنے آرام سے پوچھ لے گی۔

"بتاؤ نا۔" فرشتے ٹیک چھوڑ کر سیدھی ہوئی اور غور سے اس کا جھکا چہرہ دیکھا۔

"پتا نہیں!"

"مجھے سچ بولنے والی محمل پسند ہے۔"

"ہاں، شاید۔" اس نے اعتراف کرتے ہوئے پل بھر کو نگاہیں اٹھائیں۔ فرشتے ہنوز سنجیدہ تھی۔

"اور ہمایوں؟"

"ہمایوں؟" اس کے لب مسکرا دیے۔ "وہ کہتا ہے، وہ بیچ راہ میں چھوڑ دینے والوں میں سے نہیں ہے۔" وہ سر جھکائے مسکراتی ہوئی بیڈ شیٹ پہ انگلی پھیر رہی تھی۔ دوسری طرف دیر تک خاموشی چھائی رہی تو اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

فرشتے بالکل خاموش تھی۔ اس کے دل کو یونہی شک سا ہوا "کہیں فرشتے تو ہمایوں سے۔۔۔؟ آخر وہ دونوں ساتھ پلے بڑھے تھے۔" اس کا دل زور سے دھڑکا۔

"کیا سوچ رہی ہیں؟"

"یہی کہ جب میں ہمایوں کے لیے تمہارا رشتہ لینے جاؤں گی تو کریم چچا مجھے شوٹ تو نہیں کر دیں گے؟ آخر میں ہمایوں کی بہن ہوئی نا!"

اور محمل کھلکھلا کر ہنس دی۔ سارے وہم شک وشبے ہوا ہو گئے۔ فرشتے بھلا ایسی فیلنگز کیسے رکھ سکتی تھی؟ وہ عام لڑکیوں سے بہت مختلف تھی۔

"اچھا یہ دیکھو۔" اس نے کتاب میں سے ایک لفافہ نکالا۔ "ایک لنچ انوی ٹیشن ہے۔ مجھے انوائیٹ کیا ہے نسیم آنٹی نے۔ وہ اماں کی ایک پرانی فرینڈ ہیں، ان ہی کے کلب میں ہے اس سنڈے کو۔ تم چلو گی؟"

"مگر ادھر کیا ہو گا؟"

"یہ تو مجھے نہیں پتہ۔ صرف لنچ ہے۔ آنٹی نے کہا اگر میں آجاؤں تو اچھا ہے، اماں کی کچھ پرانی فرینڈز سے بھی مل لوں گی۔ تم چلو گی؟"

"شیور!" وہ پورے دل سے مسکرائی، اور پھر کچھ دیر بیٹھ کر واپس چلی آئی۔

☆ ☆ ☆

اتوار کی دوپہر وہ مقررہ وقت پہ مدرسے کے برآمدے میں کھڑی تھی۔ سیاہ عبایا میں ملبوس سیاہ حجاب چہرے کے گرد لپیٹے، وہ کھڑی بار بار کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھتی تھی۔ عبایا وہ اب بھی کبھی باہر پہنتی تھی، ہاں نقاب نہیں کرتی تھی، صرف حجاب لے لیتی۔

دفعتاً" اوپر سیڑھیوں پہ آہٹ ہوئی۔ محمل نے سر اٹھایا۔

فرشتے تیزی سے زینے اتر رہی تھی۔ ایک ہاتھ میں چابی پکڑے، دوسرے سے وہ پرس میں کچھ کھنگال رہی تھی۔

"السلام علیکم، تم پہنچ گئیں، چلو!" عجلت میں کہتے ہوئے اس نے پرس بند کیا، اور برآمدے کی سیڑھیاں اتر گئی۔ محمل اس کے پیچھے ہولی۔

"ہمایوں گھر میں ہی ہو گا مل نہ لیں؟" وہ گیٹ کے باہر رک کر بولی تو محمل مسکرا دی۔

"شیور!"

وہ لاؤنج میں ہی تھا، صوفے پہ بیٹھے، پاؤں میز پہ رکھے، چند فائلز کا سرسری سا مطالعہ کر رہا تھا۔ انہیں آتے دیکھا تو فائلز رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"خوش آمدید!" فرشتے کے پیچھے آتی محمل کو دیکھ کر وہ مسکرا دیا تھا۔ اس کا چہرہ پہلے سے قدرے کمزور لگ رہا تھا مگر ہسپتال میں پڑے ہمایوں سے وہ خاصا بہتر تھا۔

"میں ہمایوں کو اتنے سالوں میں بھی السلام علیکم کہنا نہیں سکھا سکی، محمل! اور کبھی تو مجھے لگتا ہے میں اسے کچھ بھی نہ سکھا سکوں گی۔"

"اچھا بھئی۔ السلام علیکم۔" وہ ہنس دیا تھا۔ "بیٹھو۔"

وہ اس کے سامنے والے صوفے پہ بیٹھ گئی مگر فرشتے کھڑی رہی۔

"نہیں ہمایوں ہمارے پاس بیٹھنے کا وقت نہیں ہے۔"

"مگر تمہاری بہن تو بیٹھ گئی ہے۔"

فرشتے نے مڑ کر محمل کو دیکھا جو آرام سے صوفے پہ بیٹھی تھی۔

"بہن! اٹھو ہم بیٹھنے نہیں آئے۔"
محمل ایک دم گڑبڑا کر کھڑی ہو گئی۔
فرشتے ہمایوں کی طرف پلٹی۔
"ہم بس تمہارا حال پوچھنے آئے تھے۔ تم اب ٹھیک ہو؟"
"میں ٹھیک ہوں مگر بیٹھو تو سہی۔"
"نہیں۔ ہمیں لنچ پہ جانا ہے، نسیم آنٹی کی طرف۔ اماں کی کچھ فرینڈز سے بھی مل لیں گے۔"
"اور محمل؟" اس نے سوالیہ ابرو اٹھائی۔
"محمل ظاہر ہے میری بہن ہے تو میرے ساتھ ہی رہے گی نا۔"

وہ بے اختیار مسکرا دیا۔ عبایا میں ملبوس وہ دونوں دراز قد لڑکیاں اس کے سامنے کھڑی تھیں۔ سیاہ حجاب چہرے کے گرد لپیٹے، دونوں کی ایک جیسی سنہری آنکھیں تھیں، یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ ان میں سے کون زیادہ خوبصورت تھی۔ ہاں فرشتے دو انچ زیادہ لمبی ضرور تھی۔ اس کے چہرے پہ ذرا سنجیدگی تھی، جبکہ محمل کے چہرے پہ کم عمری کی معصومیت برقرار تھی۔
..... اور یہ وہ محمل تو نہ تھی جس سے وہ پہلی بار اسی لاؤنج میں ملا تھا۔ سیاہ مقیش کی ساڑھی، چھوٹی آستینوں سے جھلکتے گداز بازو، اور اونچے جوڑے سے نکلتی گھنگھریالی لٹوں والی۔ اسے اس کا ایک ایک نقش یاد تھا۔ وہ کوئی اور محمل تھی، اور یہ عبایا اور حجاب والی کوئی اور تھی۔
"ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟"
"یہی کہ تم نے محمل کو اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے۔"
"یہ میرا رنگ نہیں ہے، یہ صبغت اللہ ہے، اور اللہ کے رنگ سے بہتر کون سا رنگ ہو سکتا ہے، چلو محمل۔ اوکے ہمایوں! اپنا خیال رکھنا۔ السلام علیکم۔" وہ محمل کا بازو تھامے مڑی ہی تھی کہ وہ پکار اٹھا۔
"سنو فرشتے!"
"ہاں!" وہ دونوں ساتھ ہی پلٹیں۔

"تم بہت بولتی ہو، اور تم نے محمل کو ایک لفظ بھی نہیں بولنے دیا۔ تمہیں معلوم ہے؟"
"مجھے معلوم ہے اور تم نے ساری عمر تو اسی کو سننا ہے، یہ کم ہے کہ میں نے تمہیں اس سے ملوا دیا ہے؟ مگر نہیں بے شک انسان بہت ناشکرا ہے، چلو محمل!" وہ محمل کو بازو سے تھامے اسی طرح عجلت میں واپس لے گئی۔ اور وہ حیرتوں میں گھرا کھڑا رہ گیا۔
پھر سر جھٹک کر مسکرا دیا تھا۔ "یہ فرشتے کو کس نے بتایا؟"

☆ ☆ ☆

اس گول میز کے گرد وہ دونوں اپنی نشستوں پہ بور سی بیٹھی تھیں۔
باقی کرسیوں پہ آنٹی ٹائپ چند خواتین جلوہ افروز تھیں۔ محمل بار بار کلائی پہ بندھی گھڑی کو دیکھتی۔ وہ واقعی بہت بور ہو رہی تھی۔
فرشتے ہی تھی جو اپنے ساتھ بیٹھی نسیم آنٹی سے کوئی نہ کوئی بات کر لیتی، ورنہ وہ تو مسلسل جمائی روکتی بے زاری سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔
"اس ملک میں عورتوں کو وہ حقوق حاصل نہیں جو مردوں کو ہیں۔" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مسز رضی کی طرف متوجہ ہو گئی جو ناک چڑھائے اپنا انگوٹھیوں سے مزین ہاتھ ہلا کر کہہ رہی تھیں۔
"اور یہ اس صدی کی سب سے بے وقوفانہ بات ہے اگر کوئی کہے کہ مرد عورت سے برتر ہے۔ میں تو نہیں مانتی ایسی کسی بات کو!"
"بالکل!" وہ سب غرور و تفاخر میں ڈوبی عورتیں ایک دوسرے کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھیں۔ محمل کا پرس میز پہ رکھا تھا۔ اس نے اس کو اٹھا کر گود میں رکھا، پھر اندر سے اپنا سفید کور والا قرآن نکالا جو وہ ہمیشہ ساتھ رکھتی تھی۔
"یہ سب جہالت کی باتیں ہیں مسز رضی، جب تک اس ملک میں تعلیم عام نہیں ہوگی لوگ عورت اور مرد کے برابر حقوق تسلیم نہ کر سکیں گے۔"

"اور نہیں تو کیا، اسی قدامت پرستی کی وجہ سے ہم ابھی یہاں ہیں اور دنیا چاند پہ پہنچ گئی ہے۔"
اس نے سر اٹھایا۔ اور ذرا سا کھنکاری۔
"مجھے آپ لوگوں سے اتفاق نہیں ہے۔"
تمام خواتین چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔
"اور میرے پاس اس کے لیے دلیل بھی ہے۔ یہ دیکھیں۔" اس نے گود میں رکھا قرآن اوپر کیا "ادھر سورہ نساء میں۔"
"نہیں، پلیز!"
"اف نہیں! ناٹ اگین۔"
"oh please' don't open it"
ملی جلی ناگوار، مضطرب سی آوازوں پہ وہ رک کر ناسمجھی کے عالم میں انہیں دیکھنے لگی۔
"جی؟"
"خدا کے لیے اس کو مت کھولیں۔"
وہ کہہ رہی تھیں اور وہ حق دق بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔
یہ مسلمان عورتیں تھیں؟ یہ واقعی مسلمان عورتیں تھیں؟ ان کو آسمانی کتابوں پہ ایمان نہ تھا؟ یہ قرآن کو نہیں سننا چاہتی تھیں۔ اس اللہ کی بات نہیں سننا چاہتی تھیں جس نے ان کو ان کا مال اور حسن دیا تھا۔؟ جو چاہتا تو ان کی سانسیں روک دیتا، ان کے دل بند کر دیتا۔ مگر اس نے ان کو ہر نعمت دے رکھی تھی، پھر بھی وہ اس کی بات نہیں سننا چاہتی تھیں؟
"یہ تو قرآن کی آیت ہے، اللہ کا کلام ہے، آپ سنیں تو سہی، یہ تو۔" اس نے کہنا چاہا۔
"پلیز، آپ ہماری ڈسکشن میں مخل نہ ہوں۔"
اور وہ خاموش ہو گئی۔ اتنی ہٹ دھرمی، شاید وہ بدنصیب عورتیں تھیں، جن کو اللہ اپنی بات سنوانا پسند نہیں کرتا تھا اور ہر وہ شخص جو روز قرآن نہیں پڑھتا، وہ بدنصیب ہوتا ہے اللہ اس سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتا۔
پھر وہ ادھر نہیں بیٹھی، تیزی سے اٹھی، قرآن بیگ میں رکھا اور فرشتے سے "میں گھر جا رہی ہوں" کہہ کر بغیر کچھ سنے وہاں سے چلی آئی۔ اس کا دل جیسے درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ آنسو ابلنے کو بے تاب تھے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کیسے اس غم کو قابو کرے، کیسے۔ کیسے مسلمان ہو کر وہ یہ سب کہہ سکتی تھیں؟ اسے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا۔
دل بہت بھر آیا تو آنسو بہہ پڑے، وہ چہرہ پھیرے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ سڑک کے ایک طرف درخت پیچھے کو بھاگ رہے تھے۔ گاڑی ڈرائیور چلا رہا تھا جسے وہ ساتھ لے کر آئی تھی۔ تائی مہتاب کی بہو بننے پہ یہ اعزاز تو اسے ملنا ہی تھا اور روک ٹوک بھی قدرے کم ہو گئی تھی مگر ابھی وہ ان باتوں کو نہیں سوچ رہی تھی، اس کا دل تو ان عورتوں کے رویے پہ اٹک سا گیا تھا۔ اسے لگا۔
ایک دم گاڑی جھٹکے سے رکی۔ وہ چونک کر آگے دیکھنے لگی۔
"کیا ہوا؟"
"بی بی! گاڑی گرم ہو گئی ہے، شاید ریڈی ایٹر میں پانی کم ہے، میں دیکھنا بھول گیا تھا۔ ڈرائیور پریشانی سے کہتا باہر نکلا۔ وہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔
سڑک قدرے سنسان تھی گو کہ وقفے وقفے سے گاڑیاں گزرتی دکھائی دیتی تھیں مگر ارد گرد آبادی کم تھی۔ وہ کوئی انڈسٹریل ایریا تھا۔ بہت دور اونچی عمارتیں دکھائی دیتی تھیں۔ ڈرائیور بونٹ کھول کر چیک کرنے لگ گیا تو وہ سر سیٹ سے ٹکائے، آنکھیں موندے انتظار کرنے لگی۔
"بی بی!" تھوڑی دیر بعد اس کی کھڑکی کا شیشہ بجا۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ باہر ڈرائیور کھڑا تھا۔
"کیا ہوا؟" اس نے شیشہ نیچے کیا۔
"انجن گرم ہو گیا ہے، میں کہیں سے پانی لے کر آتا ہوں، آپ اندر سے سارے دروازے لاک کر لیں، مجھے شاید تھوڑی دیر لگ جائے۔"
"ہوں۔ ٹھیک ہے جاؤ۔" اس نے شیشہ چڑھایا،

سارے لاک بند کیے اور چہرے پہ حجاب کا ایک پلو گرا کر آنکھیں پھر سے موند لیں۔ ادھیڑ عمر ڈرائیور چھ سات برس سے ان کے ہاں ملازمت کر رہا تھا اور خاصا شریف النفس انسان تھا سو وہ مطمئن تھی۔

وہ گرمیوں کی دوپہر تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں گاڑی حبس زدہ ہو گئی۔ گھٹن اور حبس اتنا شدید تھا کہ اس نے شیشہ کھول دیا۔ ذرا سی ہوا اندر آئی مگر گاڑی کے ساکن ہونے کے باعث ماحول پہلے سے زیادہ گرم ہو گیا۔ وہ تھوڑی ہی دیر میں پسینہ پسینہ ہو گئی۔ بے اختیار سیٹ پہ تہہ کر کے رکھا دوپٹہ اٹھایا اور اس سے ہوا جھلنے لگی۔ گرمی اتنی شدید تھی کہ اسے لگا وہ بھٹی میں جل رہی ہے۔

کافی دیر گزر گئی مگر ڈرائیور کا کوئی نام و نشان نہ تھا۔ بے اختیار وہ سورہ طلاق کی تیسری آیت آخر سے پڑھنے لگی۔ "جو اللہ سے ڈرتا ہے، اللہ اس کے لیے راستہ بنا ہی دیتا ہے۔"

ڈیڑھ گھنٹے سے اوپر ہونے کو آیا تھا، وہ گرمی سے نڈھال، پسینے میں شرابور کتنی ہی دیر سے دعا کر رہی تھی مگر جانے کیوں آج کوئی راستہ نہیں کھل رہا تھا۔ پھر جب سورج سر پہ پہنچ گیا اور باہر سے آتی دھوپ و گرمی میں اضافہ ہوتا چلا گیا تو اس نے گھبرا کر شیشے بند کر دیے۔

اور پھر سے وہی ہوا، گھٹن زدہ اور حبس زدہ بند گاڑی جیسے بند ڈبہ ہو یا بند قبر... یا سمندر کی تہہ میں تیرتی کسی مچھلی کا پیٹ!

"مچھلی کا پیٹ؟" اس نے حیرت سے دہرایا۔ "یہ میرے دل میں کیسے خیال آیا کہ یہ مچھلی کا پیٹ ہے؟" وہ الجھی، اور پھر سے اسے وہ کلب کی عورتیں یاد آئیں اور ان کا وہ گھمنڈی رویہ! اس کے خیال کی رو بھٹکنے لگی۔ پتہ نہیں وہ کیوں اس رب کی بات نہیں سننا چاہتی تھیں، جس کے ہاتھ میں ان کی سانسیں ہیں، اگر وہ چاہے تو ان منکرین کی سانسیں روک دے مگر وہ ایسا نہیں کرتا۔

"کیوں؟" اس نے خود سے سوال کیا۔ اس کی آواز بند شیشوں سے ٹکرا کر پلٹ آئی۔

باہر فضا صاف دکھائی دے رہی تھی۔ دور سے جھلکتی اونچی عمارتیں، ان کے اوپر آسمان جہاں سے پرندے اڑتے ہوئے گزرتے تھے، یہ عمارتیں، یہ آسمان زمین، یہ اڑتے پرندے، یہ زمین کو روندتے ہوئے چلتے متکبر لوگ، وہ سب زندہ تھے۔ ان کی سانسیں اپنے "انکار" کے باوجود نہیں رکتی تھیں۔ کیوں؟

"کیونکہ ان کی سانس ان کو ملی مہلت کی علامت ہے محمل بی بی! کسی کے گناہ کتنے ہی شدید ہوں، اگر سانس باقی ہے تو امید ہے، شاید کہ وہ لوٹ آئیں۔ وہ رب تو ان نافرمانوں سے مایوس نہیں ہوا، پھر تم کیوں ہوئیں؟" کوئی اس کے اندر بولا تھا۔

وہ جیسے سناٹے میں آ گئی۔

کتنی جلدی وہ نہ ماننے والوں سے مایوس ہو گئی؟ "ان" پہ کڑھنے لگی؟ پھر کیوں وہ کسی کی ہٹ دھرمی دیکھ کر یہ فرض کر بیٹھی کہ وہ کبھی بدل نہیں سکتیں کیوں اس نے مایوس ہو کر بستی چھوڑ دی۔

اس کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے۔ بے اختیار اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔

"نہیں کوئی الہ تیرے سوا، پاک ہے تو، بے شک میں ہی ظالموں میں سے ہوں۔"

ندامت کے آنسو اس کے گالوں پہ لڑھک رہے تھے۔ اسے بستی نہیں چھوڑنی چاہیے تھی۔ اگر کچھ لوگ قرآن نہیں سننا چاہتے تو کوئی تو ہو گا جو اسے سننا چاہے گا۔ خود وہ کیا تھی؟ قرآن کو اس روز چھت پہ کھولتے ہی بدک اٹھنے والی، آج کدھر تھی! صرف اس سیاہ فام لڑکی کی ذرا سی کوشش، ذرا سے تجسس کو بھڑکانے والے عمل سے وہ کسی نہ کسی طرح آج ادھر پہنچ گئی تھی کہ اللہ اس سے بات کرتا تھا، پھر اپنی پارسائی پہ غرور اور دوسرے کی تحقیر کیسی؟

اس کے آنسو ابھی بہہ ہی رہے تھے کہ ڈرائیور



سامنے سے آیا دکھائی دیا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں پانی کی بوتلیں تھیں۔

"اور جو اللہ سے ڈرتا ہے' اللہ اس کے لیے راستہ نکال ہی دیتا ہے۔"

بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا تھا۔ اسے لگا اس کی توبہ شاید قبول ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی اسے لگتا تھا' ایمان اور تقویٰ بھی سانپ سیڑھی کے کھیل کی طرح ہوتا ہے' ایک صحیح قدم کسی معراج پر پہنچا دیتا ہے' تو دوسرا غلط قدم گہری کھائی میں' اس نے بے ساختہ سوچا تھا۔

گاڑی گھر کے سامنے رکی' اور ڈرائیور نے ہارن بجایا۔ چوکیدار گیٹ کھول ہی رہا تھا جب اس کی نگاہ ساتھ والے بنگلے پہ پڑی۔

"تم جاؤ' میں آتی ہوں۔" وہ سبک رفتاری سے باہر نکلی۔

بریگیڈیئر صاحب کا چوکیدار وہیں گیٹ پہ کھڑا تھا۔ اس نے فوراً" بیگ کنگھالا۔

"سنو' یہ اپنے صاحب کو دے دینا۔" اور چند پمفلٹس نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔ "ان سے کہنا یہ امانت ہے' چاہے تو پڑھ لیں' کوئی دباؤ نہیں' مگر میں واپس ضرور لینے آؤں گی۔ پکڑ لونا۔" متذبذب کھڑے چوکیدار کو پمفلٹس زبردستی تھمائے اور واپس گھر کی جانب ہولی۔

کوئی تو ہوگا جو اسے سننا چاہے گا۔ آج نہیں۔ کل نہیں مگر کبھی تو وہ ان پمفلٹس کو کھولیں گے۔

☼ ☼ ☼

کاریڈور میں لگا سافٹ بورڈ آج کچھ زیادہ ہی چمک رہا تھا یا شاید وہ اس کیلی گرافی کے کناروں پہ لگی افشاں کی چمک تھی جو سافٹ بورڈ کے وسط میں آویزاں تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دیوار کے قریب آئی۔ کیلی گرافی بہت خوبصورت تھی۔ اس پہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے بیٹے ابراہیم کی وفات کے موقع پر کہے گئے الفاظ رقم تھے۔ وہ گردن اٹھائے ان الفاظ کو پڑھنے لگی۔

"عبدالرحمٰن بن عوف نے کہا" "یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' آپ بھی روتے ہیں؟" آپ نے فرمایا "اے ابن عوف! یہ رحمت اور شفقت ہے۔" اور آپ پھر سے رو پڑے اور فرمایا۔

"بے شک آنکھ آنسو بہاتی ہے' اور دل غمگین ہے' لیکن ہم زبان سے وہی بات نکالیں گے جس پہ ہمارا رب راضی ہو۔ اے ابراہیم! بے شک ہم تیری جدائی پہ بہت غم زدہ ہیں۔"

وہ مسحور سی اسی طرح گردن اونچی اٹھائے کھڑی وہ الفاظ بار بار پڑھتی گئی۔ کچھ تھا ان میں جو اسے بار بار کھینچتا تھا۔ وہ وہاں سے جا ہی نہ پا رہی تھی' جانے کے لیے قدم اٹھاتی مگر وہ الفاظ اسے روک دیتے اور وہ واقعی پھر سے رک جاتی۔

جب تفسیر کی کلاس کا وقت ہونے لگا تو وہ بمشکل خود کو وہاں سے کھینچ لائی۔ قرآن کھولتے ہوئے نظر درمیان کے کسی صفحے پہ پڑ گئی۔

"ہر نفس موت کا ذائقہ چکھنے والا ہے۔"

وہ صفحے پیچھے پلٹنے لگی۔ انگلی سے ورق پلٹتے ہوئے ایک اور جگہ یونہی نگاہ پھسلی۔

"آج تم ایک موت نہ مانگو' بلکہ آج تم کئی موتیں مانگو۔"

وہ سر جھٹک کر اپنے سبق پہ آئی۔

آج کی پہلی آیت ہی یہ تھی۔

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب تم میں سے کسی ایک پہ موت حاضر ہو جائے۔"

"اوہو' مجھے کیا ہو گیا ہے؟" وہ بے بسی سے مسکرا کر رہ گئی۔ "آج تو ساری موت کی آیتیں پڑھ رہی ہوں' کہیں میں مرنے تو نہیں والی؟ اف' محمل' فضول مت سوچو اور سبق پہ توجہ دو۔"

وہ سر جھٹک کر نوٹس لینے لگی۔ موت کی وصیت کے متعلق آیات پڑھی جا رہی تھیں۔

اسے یاد آیا' ابھی اس نے ایک حدیث بھی کچھ ایسی ہی پڑھی تھی۔

اچانک لکھتے لکھتے اس کا قلم پھسل گیا۔ وہ رک گئی اور پھر آہستہ سے سر اٹھایا۔

"کیا کوئی مرنے والا ہے؟" اس کا دل زور سے دھڑکا تھا۔ وہ جو قرآن میں پڑھتی تھی' وہ اس کے ساتھ پیش آجاتا تھا' یا آنے والا ہوتا تھا۔ کبھی ماضی' کبھی حال اور کبھی مستقبل۔ کوئی لفظ بے مقصد' بے وجہ اس کی آنکھوں سے نہیں گزرتا تھا۔ پھر آج وہ کیوں بار بار ایک ہی طرح کی آیات پڑھ رہی تھی۔ کیا کوئی مرنے والا ہے؟ کیا کوئی اسے چھوڑ کر جانے والا ہے؟ کیا اسے قرآن ذہنی طور پہ تیار کر رہا ہے' اسے صبر کرنے کو کہہ رہا ہے' مگر کیوں؟ کیا ہونے والا ہے؟

وہ بے چینی سے قرآن کے صفحے آگے پلٹنے لگی۔

"اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

ایک سطر پڑھ کر اس نے ڈھیر سے سارے ورق الٹے۔

"صبر کرنے والے اپنا صلہ......"

پورا پڑھے بغیر اس نے آخر سے قرآن کھولا۔

"اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے رہو۔"

اور پھر وہ صفحے تیز تیز پلٹتی ایک نظر سے سب گزارتی جا رہی تھی۔

"اور کوئی نہیں جانتا وہ کون سی زمین پہ مرے گا۔"

محمل کا دم گھٹنے لگا تھا۔ بے اختیار گھبرا کر اس نے قرآن بند کیا۔ اسے پسینہ آرہا تھا۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ کچھ ہونے والا تھا۔ کیا وہ برداشت کر پائے گی؟ شاید نہیں' اس میں اتنا صبر نہیں ہے۔ وہ کچھ نہ برداشت کر پائے گی۔ کبھی بھی نہیں۔ اس نے وحشت سے ادھر ادھر دیکھا۔

میڈم مصباح کا لیکچر جاری تھا۔ لڑکیاں سر جھکائے نوٹس لے رہی تھیں۔ کوئی اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔ اس نے ذرا سی گردن اوپر کو اٹھائی۔ اوپر چھت تھی۔ چھت کے پار آسمان تھا۔ وہاں کوئی اس کی طرف ضرور متوجہ تھا مگر وحشت اتنی تھی کہ وہ دعا بھی نہ مانگ سکی۔

تب ہی آپا اماں اسے دروازے میں نظر آئیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک چٹ تھی۔ وہ میڈم مصباح کے پاس گئیں اور چٹ ان کی طرف بڑھائی۔ میڈم نے لیکچر روک دیا' اور چٹ تھامی۔

محمل بنا پلک جھپکے ان کو دیکھ رہی تھی۔

میڈم مصباح نے چٹ پڑھ کر سر اٹھایا' ایک نگاہ پوری کلاس پہ ڈالی' پھر چہرہ مائیک کے قریب کیا۔

"محمل ابراہیم پلیز' ادھر آجائیں۔"

اور اسے لگا' وہ اگلا سانس نہیں لے سکے گی۔ وہ جان گئی تھی۔ کوئی مرنے والا نہیں تھا۔ اب کسی کو نہیں مرنا تھا۔ اس کا نام پکارا جا رہا تھا اور اس کی ایک ہی وجہ تھی۔

جسے مرنا تھا' وہ مر چکا تھا۔ کہیں کوئی' اس کا پیارا' مر چکا تھا۔

وہ نیم جاں قدموں سے اٹھی اور میڈم کی طرف بڑھی۔

"آنکھ آنسو بہاتی ہے۔

دل غمگین ہے۔

مگر ہم زبان سے وہی کہیں گے جس پہ ہمارا رب راضی ہو۔

اے ابراہیم...... بے شک ہم تیری جدائی پہ بہت غم زدہ ہیں۔"

صدیوں پہلے کسی کے کہے گئے الفاظ کی بازگشت اسے سارے ہال میں سنائی دے رہی تھی۔ باقی ساری آوازیں بند ہو گئی تھیں۔ اس کے کان بند ہو گئے تھے۔ زبان بند ہو گئی تھی۔

بس وہ ایک آواز اس کے ذہن میں گونج رہی تھی۔

آنکھ آنسو بہاتی ہے۔

دل غمگین ہے۔

دل غمگین ہے۔

دل غمگین ہے۔

وہ بمشکل میڈم مصباح کے سامنے کھڑی ہوئی۔

"جی میڈم؟"

"آپ کا ڈرائیور آپ کو لینے آیا ہے' ایمرجنسی ہے' آپ کو گھر جانا...."

مگر وہ پوری بات سنے بغیر ہی سیڑھیوں کی طرف بھاگی' ننگے پاؤں زینے پھلانگتی وہ تیزی سے اوپر آئی تھی۔ جوتوں کا ریک ایک طرف رکھا تھا' مگر محمل کو اس وقت جوتوں کا ہوش نہ تھا۔ وہ سنگ مرمر کے فرش پہ ننگے پاؤں دوڑتی جا رہی تھی۔

غفران چچا کی اکارڈ سامنے کھڑی تھی۔ ڈرائیور دروازہ کھولے منتظر کھڑا تھا' اس کا دل ڈوب کر ابھرا۔

"بی بی آپ...."

"پلیز خاموش رہو۔" وہ بمشکل ضبط کرتی اندر بیٹھی۔ "اور جلدی چلو۔"

اس کا دل یوں دھڑک رہا تھا گویا ابھی سینہ توڑ کر باہر آگرے گا۔

آغا ہاؤس کا مین گیٹ پورا کھلا تھا' باہر گاڑیوں کی قطار لگی تھی۔ ڈرائیو وے پہ لوگوں کا جم غفیر اکٹھا تھا۔ گاڑی ابھی گیٹ کے باہر سڑک پہ ہی تھی کہ وہ دروازہ کھول کر باہر بھاگی۔ ننگے پاؤں تارکول کی سڑک پہ جلنے لگے' مگر اس وقت جلن کی پروا کسے تھی۔

اس نے رش میں کھڑے آغا جان کو دیکھا' غفران چچا کو دیکھا' حسن کو دیکھا' وہ سب اس کی طرف بڑھے تھے' مگر وہ اندر کی طرف لپک رہی تھی۔ لوگوں کو اِدھر اُدھر ہٹاتی وہ ان آوازوں تک پہنچنا چاہتی تھی جو لان سے آرہی تھیں۔ عورتوں کے بین' رونے' آہ و بکا کی آوازیں۔

لوگ ہٹ کر اس سفید یونیفارم اور گلابی اسکارف والی لڑکی کو راستہ دینے لگے تھے۔ وہ بھاگتی ہوئی لان تک آئی اور پھر گھاس کے دہانے پہ بے اختیار رُک گئی۔

لان میں عورتوں کا ایک ہجوم اکٹھا تھا۔ درمیان میں چارپائی رکھی تھی' اس پہ کوئی سفید چادر اوڑھے لیٹا تھا۔ چارپائی کے چاروں طرف عورتیں رو رہی تھیں۔ ان کے چہرے گنڈ سے ہو رہے تھے۔ ایک فضہ چچی تھیں۔ اور ہاں نائمہ چچی بھی تھیں اور وہ سینے پہ دو ہتھڑ مار کر روتی رضیہ پھوپھو تھیں' اور وہ اونچی آواز میں بین کرتی مہتاب تائی تھیں۔ سب تو ادھر موجود تھے۔

پھر کون تھا اس چارپائی پہ؟ کون.... کون تھا وہ؟

اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی' وہاں سارا خاندان اکٹھا تھا' بس ایک چہرہ نہ تھا۔

"اماں!" اس کے لب پھڑپھڑائے۔

اس نے انہیں پکارنے کے لیے لب کھولے' مگر آواز نے گویا ساتھ چھوڑ دیا۔ وہ وحشت سے ادھر ادھر دیکھنے لگی' شاید اس کی ماں کسی کونے میں بیٹھی ہو' مگر وہ کہیں نہ تھی۔ اس کی ماں کہیں نہ تھی۔

"محمل.... محمل۔" وہ عورتیں اسے پکار رہی تھیں۔ اٹھ اٹھ کر اسے گلے سے لگا رہی تھیں' کسی نے راستہ بنا دیا' تو کوئی میت کے پاس سے ہٹ گیا' کوئی اسے ہاتھ سے پکڑ کر چارپائی کے قریب لے آیا' کسی نے شانوں پہ زور دے کر اسے بٹھا دیا' کسی نے میت کے چہرے سے سفید چادر ہٹا دی۔ کون کیا کر رہا تھا' اسے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ساری آوازیں آنا بند ہو گئی تھیں۔ ارد گرد کی عورتوں کے لب ہل رہے تھے' مگر وہ سن نہ پا رہی تھی کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں' رو رہی ہیں یا ہنس رہی ہیں' وہ تو بس یک ٹک' بنا پلک جھپکے اس زرد چہرے کو دیکھ رہی تھی جو چارپائی پہ آنکھیں موندے لیٹا تھا۔ نتھنوں میں روئی ڈالی گئی تھی اور چہرے کے گرد سفید پٹی تھی۔ وہ چہرہ واقعی اماں سے بہت ملتا تھا۔ بالکل جیسے اماں کا چہرہ ہو' اور شاید.... شاید وہ اماں کا چہرہ ہی تھا۔

اسے بس ایک پل لگا تھا یقین آنے میں' اور پھر اس نے چاہا کہ وہ بھی دھاڑیں مار کر رونے لگے' نوحہ کرے' بین کرے' زور' زور سے چلائے' مگر وہ رحمتہ العالمین کے کہے گئے الفاظ....

"مگر ہم زبان سے وہ ہی کہیں گے جس پہ ہمارا رب راضی ہو۔"

اور اس کے لب کھلے رہ گئے' آواز حلق میں ہی دم توڑ گئی۔ زبان ہلنے سے انکاری ہو گئی۔

اس کا شدت سے دل چاہا کہ اپنا سر پیٹے' سینے پر دو ہتھڑ مار کر بین کرے۔ دوپٹہ پھاڑ ڈالے اور اتنا چیخ چیخ کر روئے کہ آسمان ہل جائے' اور پھر اس نے ہاتھ اٹھائے بھی مگر۔

"نوحہ کرنے والی اگر توبہ کیے بغیر مر گئی تو اس کے لیے تارکول کے کپڑے اور آگ کے شعلے کی قمیص ہوگی۔"

"جو گریبان چاک کرے اور رخساروں پر طمانچے مارے اور بین کرے ہم میں سے نہیں۔"

یہ ہدایت تو ابد تک کے لیے تھی۔

اس کے ہاتھ اٹھنے سے انکاری ہو گئے۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے' لیکن لب خاموش تھے۔

"اسے رلاؤ' اس سے کہو اونچا رو لے' ورنہ پاگل ہو جائے گی۔"

"اسے کہو دل ہلکا کر لے۔"

بہت سی عورتیں اس کے قریب زور' زور سے کہہ رہی تھیں۔

"میری بچی!" تائی مہتاب نے روتے ہوئے اسے گلے سے لگا لیا۔ وہ اسی طرح ساکت سی بیٹھی ماں کی میت کو دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں سے آنسو گر گر کر گردن پہ لڑھک رہے تھے۔ اس کا پورا چہرہ بھیگ گیا تھا' مگر زبان.... زبان نہیں ہلتی تھی۔

"مسرت تو ٹھیک ٹھاک تھی' پھر کیسے...."

"بس صبح کہنے لگی سینے میں درد ہے۔ ہم فوراً اسپتال لے کر گئے' مگر۔"

ادھوری ادھوری سی آوازیں اس کے ارد گرد سے آرہی تھیں' مگر اسے سنائی نہ دے رہی تھیں' اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ اسے لگا اسے چکر آرہے ہیں' عجیب سی گھٹن تھی' اس کا سانس بند ہونے لگا تھا۔

وہ ایک دم اٹھی اور عورتوں کو ہٹاتی اندر بھاگ گئی۔

☼ ☼ ☼

کسی نے دروازے پہ ہلکی سی دستک دی۔ ایک دفعہ' دو دفعہ' پھر تیسری دفعہ' اس نے گھٹنوں پہ رکھا سر ہولے سے اٹھایا۔ دروازہ بج رہا تھا۔ وہ آہستہ سے اٹھی' بیڈ سے اتری' سلیپر پاؤں میں ڈالے اور کنڈی کھولی' باہر فضہ چچی کھڑی تھیں۔

"محمل بیٹا! تمہارے آغا جان تمہیں بلا رہے ہیں۔"

"آتی ہوں۔" اس نے ہولے سے کہا تو فضہ چچی پلٹ گئیں۔ وہ کچھ دیر یوں ہی ادھر کھڑی رہی' پھر باہر آگئی۔

سیڑھیوں کے قریب لگے آئینے کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ پل بھر کو رکی' اس کا عکس بھی رک کر اسے دیکھ رہا تھا۔

ہلکے نیلے رنگ کی شلوار قمیص پہ سفید ململ کا دوپٹہ سر پہ لیے وہ کمزور پژمردہ سی محمل ہی تھی؟ ہاں شاید وہ ہی تھی' سفید دوپٹے کے ہالے میں اس کا چہرہ کمہلایا ہوا لگ رہا تھا۔ آنکھوں کے گرد گہرے حلقے تھے' وہ سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔

آغا جان کے کمرے میں سب چچا اور چچیاں موجود تھیں' وسیم بھی ایک طرف کھڑا تھا۔

"آؤ محمل!" اسے آتے دیکھ کر آغا جان نے سامنے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ آج اماں کو گزرے چوتھا دن تھا اور گھر والوں کا رویہ پہلے کی نسبت اب خاصا نرم تھا۔

وہ چپ چاپ صوفے پہ بیٹھ گئی۔

"اس صبح' جب مسرت کی ڈیتھ ہوئی' اس نے درد شروع ہوتے ہی یہ کچھ چیزیں وصیت کی تھیں تمہارے لیے۔" (اسے لگ رہا تھا وہ اب مزید نہیں جی پائے گی) ــــ "ہم نے سوچا کہ تمہیں دے دی جائیں۔" انہوں نے ایک طرف رکھا ڈبہ اٹھایا۔ محمل نے سر اٹھا کر ڈبے کو دیکھا۔ یہ ڈبہ اماں کے زیورات کا تھا۔ وہ اسے ہمیشہ تالا لگا کر الماری کے نچلے خانے میں رکھتی تھیں۔

"یہ ایک ڈبہ تھا' اس کی یہ چابی ہے' تم خود دیکھ لو اور ساتھ یہ کچھ رقم تھی' اس کی جمع پونجی' اس نے مجھ سے

کہا تھا کہ میں تمہارے اکاؤنٹ میں جمع کرادوں مگر میں نے سوچا کہ میں یہ تمہارے حوالے ہی کردوں، تم بہتر فیصلہ کرسکتی ہو۔"

انہوں نے ایک پھولا ہوا لفافہ ڈبے کے اوپر رکھا۔ محمل نے آہستہ سے لفافہ اٹھایا اور کھول کر دیکھا۔ اندر ہزار ہزار کے کئی نوٹ تھے۔ شاید اماں نے اس کے جہیز کے لیے رکھے تھے۔ اس کا دل بھر آیا۔ اس نے لفافہ ایک طرف رکھا اور چابی سے کاسنی ڈبے کا تالا کھولا۔

اندر کچھ زیورات تھے۔ خالص سونے کے جڑاؤ زیورات، اس نے ڈبہ بند کردیا۔ معلوم نہیں اماں نے کب سے سنبھال رکھے تھے۔

"وسیم سمیت تمام لوگ اس وصیت کے وقت موجود تھے، تم سب سے پوچھ سکتی ہو، میں نے تمہارا حق پورا ادا کردیا ہے یا نہیں۔"

اس نے بھیگی آنکھیں اٹھائیں، سامنے صوفوں اور کرسیوں پہ بیٹھے تمام نفوس کے چہرے مطمئن تھے، مطمئن اور بے نیاز۔

"چیزیں تو آپ نے ادا کردی ہیں آغا بھائی! اگر مسرت کی وصیت؟" دفعتاً فضہ چچی نے اضطراب سے پہلو بدلا۔

"اوہو فضہ! ابھی اس کی ماں کو گزرے دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔" تائی مہتاب نے نگاہوں سے تنبیہہ کی۔

"مگر بھائی! مسرت نے کہا تھا کہ جلد از جلد۔"

"رہنے دو فضہ! ہم اس کا فیصلہ محمل پہ چھوڑ چکے ہیں۔ اس کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوگا۔"

"مگر ایٹ لیسٹ اسے بتا تو دیں۔"

"ابھی اس کا غم تو ہلکا ہونے دو، پھر۔۔۔"

ان کی دبی دبی سرگوشیاں اسے بے چین کر گئیں۔

"تائی اماں! کیا بات ہے؟ اماں نے کچھ اور بھی کہا تھا؟"

سب ایک دم خاموش سے ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"محمل! میں تمہیں کچھ دن تک بتادوں گی، ابھی اس قصے کو چھوڑو۔"

"پلیز تائی اماں! مجھے بتائیں۔"

"مگر تمہارا غم ابھی۔۔۔"

"میں ٹھیک ہوں، مجھے بتائیں۔" اس نے بے چینی سے بات کاٹی۔

تائی مہتاب نے ایک نظر سب کو دیکھا، پھر قدرے ہچکچا کر گویا ہوئیں۔

"بات یہ ہے کہ مسرت نے مرنے سے پہلے وسیم کو بلوا کر ان سب کے سامنے تمہارے آغا جان سے کہا تھا کہ اگر وہ بچ نہ سکے تو جتنی جلدی ہو ہم محمل کو وسیم کی دلہن بنا کر سہارا دے دیں، اس کو بے آسرا نہ چھوڑیں اور تمہارے آغا جان نے اس سے وعدہ کرلیا کہ وہ ایسا ہی کریں گے۔"

وہ اپنی جگہ سن سی ہوگئی۔ زمین جیسے قدموں تلے سے سرکنے لگی تھی اور آسمان سر سے ہٹنے لگا تھا۔

"اماں نے یہ سب کہا؟"

"ہاں، یہ سب لوگ جو یہاں ہیں، اس بات کے گواہ ہیں، تم کسی سے بھی پوچھ لو۔"

وہ ایک دم بالکل چپ ہی ہوگئی۔ عجیب سی بات تھی، اسے یقین نہ آرہا تھا۔

"لیکن محمل! ہم نے یہ فیصلہ تم پر چھوڑ دیا ہے، تم چاہو تو یہ شادی کرو، چاہو تو نہ کرو، ہم نے تمہیں اس لیے آگاہ کردیا کہ یہ تمہاری ماں کی آخری خواہش تھی۔ یہ تم پر منحصر ہے کہ تم اس کی بات رکھتی ہو یا نہیں۔ ہم میں سے کوئی تم پہ زور نہیں ڈالے گا۔"

وہ سر جھکائے کاسنی ڈبے کو دیکھ رہی تھی۔ ذہن میں جیسے جھکڑ چل رہے تھے۔

مگر یہ ڈبہ اور لفافہ ثبوت تھا کہ یہ وصیت واقعی اس کی ماں نے کی تھی۔

"اگر تمہیں منظور ہے تو ہم اگلے جمعے کو نکاح رکھ لیتے ہیں کہ مسرت کی خواہش تھی یہ کام جلد از جلد کیا جائے، اگر نہیں تو کوئی بات نہیں، تم جو چاہو گی وہی ہوگا۔" تائی مہتاب اتنا کہہ کر خاموش ہوگئیں۔

اس نے ہولے سے سر اٹھایا۔ سنہری آنکھیں پھر

سے بھیگ چکی تھیں۔ کمرے میں موجود تمام نفوس دم سادھے اسے دیکھ رہے تھے۔

"میں اپنی ماں کی بات کا مان رکھوں گی۔ آپ جب کہیں گی، میں شادی کے لیے تیار ہوں۔"

پھر وہ رکی نہیں، ڈبہ اور لفافہ اٹھا کر تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

٭ ٭ ٭

وہ کچن میں کرسی پہ بیٹھی تھی، ہاتھ میں صبح و شام کی دعاؤں اور اذکار کی کتاب تھی اور وہ منہمک سی پڑھ کر دعا مانگ رہی تھی۔

"ہم نے صبح کی فطرت اسلام پہ
اور کلمہ اخلاص پہ
اور اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین پہ
اور اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی ملت پہ
جو یکسو مسلمان تھے اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے۔"

"محمل۔۔۔!" کسی نے زور سے کچن کا دروازہ کھولا۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ سامیہ عجلت میں اندر داخل ہوئی تھی۔

"تم سے کوئی ملنے آیا ہے، ڈرائنگ روم میں ہے جاؤ مل لو۔"

"کون ہے؟"

"وہی پولیس والا!" وہ کہہ کر پلٹ گئی۔

"ہمایوں آیا ہے؟" وہ کتنی ہی دیر کتاب ہاتھ میں لیے بیٹھی رہی، پھر آہستہ سے اسے بند کیا، سلیب پہ رکھا، لباس کی شکنیں درست کیں اور سیاہ دوپٹہ ٹھیک سے سر پہ لے کر باہر آگئی۔

ڈرائنگ روم سے باتوں کی آواز آرہی تھی جیسے دو لوگ گفتگو میں مشغول ہوں۔ یہ ہمایوں سے کون باتیں کررہا ہے؟ وہ الجھتی ہوئی اندر آئی، ڈرائنگ روم اور ڈائننگ ہال کے درمیان سفید جالی دار پردہ تھا۔ وہ پردے کے پیچھے ذرا دیر کو رکی۔

سامنے بڑے صوفے پہ ہمایوں بیٹھا تھا۔ اس کے بالکل مقابل سنگل صوفے پہ آرزو بیٹھی تھی۔ ٹانگ پہ ٹانگ رکھے، آدھی پنڈلی تک ٹراوزر پہنے وہ اپنے مخصوص بے نیاز حلیے میں تھی، کٹے ہوئے بالوں میں ہاتھ پھیرتی وہ ہنس ہنس کر ہمایوں سے کچھ کہہ رہی تھی۔

جانے کیوں اسے یہ اچھا نہ لگا۔ اس نے ہاتھ سے پردہ سمیٹا اور اندر قدم رکھا۔

وہ جیسے اسے دیکھ کر کہتے کہتے رکا اور پھر بے اختیار کھڑا ہوگیا۔ بلیو شرٹ اور گرے پینٹ میں ملبوس وہ ہمیشہ کی طرح بہت شان دار لگ رہا تھا۔ آغا جان اسے پسند نہیں کرتے تھے، مگر پھر بھی اسے اندر آنے دیا گیا۔ شاید اس لیے کہ اب وہ ان کی بہو بننے والی تھی اور اس کو وہ ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔

"السلام علیکم۔" وہ آہستہ سے کہہ کر سامنے صوفے پہ بیٹھ گئی۔ آرزو کے چہرے پہ ذرا سی ناگواری ابھری، جسے ہمایوں نے نہیں دیکھا تھا، وہ پوری طرح محمل کی طرف متوجہ تھا۔

"مجھے مسز ابراہیم کی ڈیتھ کا پتا بہت دیر سے چلا، میں کراچی گیا ہوا تھا، آج ہی آیا ہوں، فرشتے نے جیسے ہی بتایا، میں آگیا، آئی ایم ویری سوری محمل!" واپس صوفے پہ بیٹھتے ہوئے وہ بہت تاسف سے کہہ رہا تھا۔

محمل نے جواب دینے سے پہلے ایک نظر آرزو کو دیکھا۔

"آرزو باجی! آپ جاسکتی ہیں، اب میں آگئی ہوں۔"

"ہاں شیور۔" آرزو اٹھ کھڑی ہوئی۔ "مگر جاتے ہوئے ان کو شادی کا کارڈ دے دینا۔" استہزائیہ مسکرا کر وہ گویا جتا گئی تھی۔ محمل کے سینے میں ہوک سی اٹھی۔

"کس کی شادی؟" وہ چونکا تھا۔

"محمل کی شادی، وسیم کے ساتھ، آپ کو نہیں پتا اے ایس پی صاحب؟ اسی فرائیڈے ان کا نکاح ہے، آپ ضرور آئیے گا، میں آپ کا کارڈ نکلوا دیتی ہوں، ٹھہریے!" وہ خوش دلی سے کہتی باہر نکل گئی۔

کتنے ہی لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔

"یہ کیا کہہ رہی تھی؟" وہ بولا تو اس کی آواز میں حیرت تھی' بے پناہ حیرت۔

"ٹھیک کہہ رہی تھی۔" وہ سر جھکائے ناخن کھرچتی رہی۔

"مگر کیوں محمل؟"

"آپ غالباً "تعزیت کے لیے آئے تھے۔"

"پہلے میری بات کا جواب دو' تم ایسا کیسے کر سکتی ہو؟"

"میں آپ کے سامنے جواب دہ نہیں ہوں۔" اس نے تلملا کر سر اٹھایا۔ "یہ میری ماں کی آخری خواہش تھی' مرتے وقت انہوں نے یہ ہی وصیت کی تھی۔"

"تمہیں کیسے پتا؟ تم تو ان کی ڈیتھ کے وقت مدرسے میں تھیں۔"

"ہاں' مگر انہوں نے آغا جان سے کہا تھا' سب لوگ وہاں موجود تھے' سب گواہ ہیں۔"

"تم!" وہ مٹھیاں بھینچ کر رہ گیا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا' وہ کیا کر ڈالے۔ "تم انتہائی بے وقوف اور احمق ہو۔"

"میں اپنی ماں کی بات کا مان رکھنا چاہتی ہوں' اس میں کیا حماقت ہے؟" وہ چڑ گئی۔

"نادان لڑکی! تمہیں یہ لوگ بے وقوف بنا رہے ہیں' استحصال کر رہے ہیں۔"

"کرنے دیں' آپ کو کیا ہے؟" وہ پیر پٹخ کر کھڑی ہو گئی۔ "آپ میرے کون ہیں جو مجھ سے پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔"

"میں جو بھی ہوں مگر تمہارا دشمن نہیں ہوں۔" وہ بھی ساتھ ہی کھڑا ہوا' اس کی آواز میں بے بسی تھی۔ کبھی یہ ہی بات اس نے بہت اکھڑ لہجے میں بھی کہی تھی۔ جب وہ مدرسے کے باہر اسے لینے آیا تھا' اس رات کی صبح جو اس کی زندگی اجاڑ گئی تھی۔

"اگر آپ کے دل میں میری ماں کا ذرا سا بھی احترام ہے تو مجھے وہ کرنے دیں جو میری ماں چاہتی تھی۔ ماں' باپ کبھی اولاد کا برا نہیں چاہتے۔ اسی میں کوئی بہتری ہو گی' آپ جا سکتے ہیں۔" وہ ایک طرف ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔

اسی پل پردے ہٹا کر آرزو نمودار ہوئی۔

"آپ کا کارڈ' آیئے گا ضرور۔" اس نے مسکرا کر کارڈ ہمایوں کی طرف بڑھایا۔ ہمایوں نے ایک قہر آلود نظر کارڈ پہ ڈالی' اور دوسری محمل پہ' پھر لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔

"نو پرابلم۔" آرزو شانے اچکا کر کارڈ لیے واپس مڑ گئی۔

"اماں!" وہ کراہ کر صوفے پہ گر سی گئی۔ یہ اماں اسے کس منجدھار میں چھوڑ کر چلی گئی تھیں؟ کیوں کیا انہوں نے یہ فیصلہ؟ کیوں اماں؟" وہ دونوں ہاتھوں میں سر گرائے سوچتی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

سارے گھر میں دبا دبا سا شادی کا شور اٹھ چکا تھا' گو کہ ابھی صرف نکاح تھا' مگر مہتاب تائی بھرپور تیاریاں کر رہی تھیں۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ فواد جلد ہی واپس گھر آ رہا تھا۔ اس خبر سے محمل پہ تو کوئی اثر نہ ہوا' البتہ تائی اماں اپنی اندرونی خوشی چھپائے سب کچھ محمل پہ ڈال گئی تھیں۔

"سوچ رہے ہیں تھوڑا سا گہما گہمی والا فنکشن رکھ لیں' تاکہ محمل کا دل بہل جائے' ورنہ سچ پوچھو تو مسرت کے جانے کے بعد سے وہ بہت بجھ سی گئی ہے۔ اب ہمارا دل تو نہیں چاہتا کہ شور ہنگامہ ہو' مگر بس محمل اچھا محسوس کرے' اس لیے۔"

وہ کسی نہ کسی کو ہر وقت فون پہ وضاحتیں دے رہی ہوتی تھیں۔

محمل چپ چاپ کچن میں کام نمٹاتی رہتی' جیسے وہ خاموش ماتم کر رہی تھی' نمازیں' تسبیحات' دعائیں' وہ سب کر رہی تھی' ہاں مدرسے وہ ابھی نہیں جا رہی تھی۔ مسجد جا کر سکون ملتا تھا اور فی الحال وہ سکون نہیں چاہتی تھی۔ وہ صرف اور صرف ماتم چاہتی تھی۔ مسرت کا' یا شاید اپنا' وہ نہیں جانتی تھی۔

فون کی گھنٹی بجی' تو وہ جو رومال سے میز صاف کر رہی تھی' آہستہ سے رومال چھوڑ کر اٹھی۔

اسٹینڈ پہ رکھا فون مسلسل بجے جا رہا تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی قریب آئی اور ریسیور اٹھایا۔

"السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام' محمل؟" نسوانی آواز ریسیور میں گونجی' وہ لمحے بھر میں ہی پہچان گئی۔

"فرشتے؟ کیسی ہیں آپ؟"

"میں ٹھیک ہوں۔ ہمایوں نے مجھے بتایا ہے کہ تم۔۔۔" فرشتے قدرے پریشانی سے کہہ ہی رہی تھی کہ اس نے تیزی سے بات کاٹی۔

"ہمایوں ہر بات آپ کو کیوں جا کر بتاتے ہیں؟ ان سے کہیں' ایسا مت کیا کریں۔"

"مگر محمل۔۔۔ تم اس طرح کیسے؟"

"آپ لوگ مجھے احمق کیوں سمجھتے ہیں؟ کیوں میرے لیے پریشان ہو رہے ہیں؟ میری ماں میرے لیے کچھ غلط نہیں سوچ سکتی' پلیز مجھے میری زندگی کے فیصلے خود کرنے دیں۔"

"محمل! اب میں تمہیں کیا کہوں! اچھا ٹھیک ہے جو کرنا' سوچ سمجھ کے کرنا' اوکے' چلو اب ہمایوں سے بات کرو۔"

"ارے نہیں۔" وہ روکتی رہ گئی' مگر فرشتے نے فون اسے پکڑا دیا تھا۔

"اگر تم نے فیصلہ کر ہی لیا ہے اور تمہارے وہ فیری ٹیل سسرال والے اجازت دیں تو کیا میں اور فرشتے تمہاری شادی کے فنکشن میں آ سکتے ہیں؟"

"اونہوں ہمایوں!" پیچھے سے فرشتے کی تنبیہی آواز ابھری۔

"کیوں محمل! میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں۔" وہ طنزیہ بولا تھا۔

"ہاں شیور کیوں نہیں۔ جمعہ کو رات آٹھ بجے فنکشن ہے۔ ضرور آیئے گا' اللہ حافظ۔"

اس نے کھٹ سے فون بند کر دیا۔ غصہ اتنا ابل رہا تھا کہ فرشتے سے بھی بات کرنے کو جی نہیں چاہا تھا۔

فون کی گھنٹی پھر سے بجنے لگی' مگر وہ سر جھٹک کر میز کی طرف بڑھ گئی جہاں جھاڑ پونچھ کا رومال اس کا انتظار کر رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

بیوٹیشن نے کام دار دوپٹہ اس کے سر پہ رکھا' اور پھر اسے ایک ہاتھ سے پکڑے' وہ جھک کر ڈریسنگ ٹیبل سے پنیں اٹھانے لگی۔ محمل بت بنی اسٹول پہ بیٹھی سامنے آئینے میں خود کو دیکھ رہی تھی' بیوٹیشن اس کے پیچھے کھڑی اس کا دوپٹہ سیٹ کر رہی تھی۔

وہ کام دار شلوار قمیص گہرے سرخ رنگ کی تھی' جس پہ سلور سلمیٰ ستارے کا کام تھا۔ دوپٹے کے بارڈر پہ بھی چوڑی پٹی کی صورت میں سلور کام کیا گیا تھا۔ ساتھ میں نازک سا وائٹ گولڈ اور روبی کا نیکلس تھا اور ایک خوب صورت قیمتی سا ٹیکہ' جس میں بڑا سا سرخ روبی جڑا تھا' اس کے ماتھے پہ سجا تھا۔ جانے تائی نے کب یہ سب بنوایا تھا' وہ بھی چپ چاپ ہر چیز پہنتی گئی۔

گھر میں ہونے والے ہنگاموں سے کہیں نہیں لگتا تھا کہ مسرت کو مرے ابھی بیس دن بھی نہیں ہوئے' مگر وہ شکوہ کس سے کرتی؟ مسرت کی زندگی میں بھی ان کی اتنی اہمیت کہاں تھی کہ مرنے کے بعد کوئی انہیں یاد رکھتا؟ اور سنا تھا' آج تو فواد بھی آ گیا تھا' پھر کاہے کا ماتم؟

وہ اپنے کمرے کے بجائے تائی کے کمرے میں تھی' تاکہ وہ ٹھیک سے تیار ہو جائے۔ اسے تیار کرنے کے لیے تائی نے وہ ماہر بیوٹیشن لڑکی بلوائی تھی جو کافی دیر سے اس پہ لگی ہوئی تھی۔

دفعتاً" باہر لاؤنج سے چند آوازیں گونجیں۔ وہ ذرا سی چونکی' کیا فواد آ گیا تھا؟ مگر نہیں' یہ آواز تو۔۔۔

"سنو' یہ دروازہ تھوڑا سا کھول دو۔" بے چینی سے اس نے بیوٹیشن سے کہا' تو وہ سر ہلاتی آگے بڑھی اور لاؤنج میں کھلنے والا دروازہ آدھا کھول دیا۔

سامنے لاؤنج کا منظر آدھا نظر آ رہا تھا اور اس کا شک

درست تھا۔

"تم۔۔۔ تم اِدھر کیوں آئی ہو؟" تائی مہتاب کی تلملاتی بلند آواز اندر تک سنائی دے رہی تھی۔

"فکر مت کریں، میں رنگ میں بھنگ ڈالنے نہیں آئی، محمل کی شادی ہے، میرا آنا فرض بنتا تھا۔" وہ اطمینان سے کہتی سامنے صوفے پہ بیٹھ گئی تھی۔ ادھ کھلے دروازے سے وہ محمل کو صاف نظر آرہی تھی۔

سیاہ عبایا کے اوپر سیاہ حجاب کے تنگ ہالے کو چہرے کے گرد لپیٹے وہ اب بے نیازی سے ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھی اطراف کا جائزہ لے رہی تھی۔

محمل نے لمحے بھر کو محسوس کرنا چاہا کہ اسے فرشتے کے آنے سے خوشی ہوئی ہے، مگر اسے اپنے محسوسات بہت جامد لگے تھے، برف کی طرح ٹھنڈے۔

اندر باہر خاموشی ہی خاموشی تھی۔ فرشتے آئے، یا فواد اب اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

"مگر ہم تمہارا اس گھر سے کوئی رشتہ تسلیم نہیں کرتے۔"

"نہ کریں، مجھے پروا نہیں ہے۔" وہ اب ہاتھ میں پکڑے موبائل کے بٹن دباتی اس کی طرف یوں متوجہ تھی جیسے سامنے غصے سے بل کھاتی تائی مہتاب کی کوئی اہمیت نہ ہو۔ فرشتے کے پاس موبائل نہیں تھا وہ شاید ہمایوں کا موبائل لے کر آئی تھی۔

"دیکھو لڑکی! تمہارا محمل سے کوئی تعلق نہیں ہے، بہتر ہے کہ تم چلی جاؤ اس سے پہلے کہ میں گارڈ کو بلواؤں۔"

"پھر آپ گارڈ کو بلوالیں، کیونکہ میں تو ایسے جانے والی نہیں ہوں، سوری۔"

"تم کیسے نہیں جاؤ گی، تمہارا تعلق۔۔۔"

"مسز کریم! میں موبائل پہ بزی ہوں، آپ دیکھ رہی ہیں، مجھے ڈسٹرب مت کریں، اور پلیز محمل کو بلا دیں۔"

وہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھی موبائل پہ چہرہ جھکائے ہوئے مصروف تھی، محمل کے لبوں کو ہلکی سی مسکراہٹ چھو گئی۔ فرشتے بدتمیز یا بدلحاظ نہ تھی بلکہ وہ اپنے ازلی ٹھنڈے اور باوقار انداز میں تائی کو بہت آرام سے جواب دے رہی تھی۔ البتہ محمل بدتمیزی کر جاتی تھی، اسے لگتا تھا وہ کبھی بھی فرشتے کی طرح پر اعتماد اور باوقار نہیں بن سکے گی۔

"محمل تم سے نہیں ملے گی، تم جاسکتی ہو۔"

آغا جان کی آواز پہ موبائل پر مصروف فرشتے نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ سامنے سے چلے آرہے تھے۔ کلف لگے شلوار قمیص میں ملبوس کمر پہ ہاتھ باندھے وہ غیظ و غضب کی تصویر بنے ہوئے تھے۔

"السلام علیکم کریم چچا!" وہ موبائل رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ چہرے پہ ازلی اعتماد اور سکون تھا۔

"فرشتے! تم یہاں سے جاسکتی ہو۔"

"آپ مجھے نکال سکتے ہیں؟" وہ ذرا سا مسکرائی۔

"آپ کو لگتا ہے کریم چچا کہ آپ مجھے نکال سکتے ہیں؟"

"میں نے کہا، یہاں سے جاؤ۔" وہ ایک دم غصے سے دھاڑے تھے۔

"میں بھی اتنا ہی اونچا چیخ سکتی ہوں، مگر میں ایسا نہیں کروں گی، میں یہاں یہ کرنے نہیں آئی، میں صرف محمل سے ملنے آئی ہوں۔" وہ سینے پہ ہاتھ باندھے پر اعتماد سی ان کے سامنے کھڑی تھی۔

لاؤنج میں سب اکٹھے ہونے لگے تھے۔ لڑکیاں ایک طرف کھڑی لاعلم سی اشاروں میں ایک دوسرے سے پوچھ رہی تھیں، اسد چچا، غفران چچا، فضہ چچی اور ناعمہ چچی بھی وہیں آگئی تھیں، حسن بھی شور سن کر سیڑھیوں سے اتر آیا تھا۔ لاؤنج کے بیچوں بیچ آغا جان کے سامنے کھڑی وہ دراز قد سیاہ عبایا والی لڑکی کون تھی؟ بہت سی آنکھوں میں سوال تھا۔

"تمہارا محمل سے کوئی تعلق نہیں ہے، وہ تم سے نہیں ملے گی، سنا تم نے؟"

"آپ یہ ہی بات محمل کو بلوا کر پوچھ لیں نا کریم چچا! کہ وہ مجھ سے ملے گی یا نہیں۔"

"ہم تمہیں نہیں جانتے کہ تم کون ہو، کہاں سے اٹھ کر آگئی ہو۔ تم فوراً نکل جاؤ، ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔"

"آغا جان! یہ کون ہیں؟" حسن الجھا ہوا آگے بڑھا۔

"تم بیچ میں مت بولو۔" انہوں نے پلٹ کر اتنی بری طرح سے جھڑکا کہ حسن خائف سا ہو گیا۔

"ہٹو۔" بیوٹیشن کا ہاتھ ہٹا کر وہ اٹھی اور کامدار دوپٹہ سنبھالتی ننگے پاؤں باہر کو لپکی۔

"آپ مجھ سے ملنے آئی ہیں؟" لاؤنج کے سرے پہ وہ رک کر بولی تو سب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ فرشتے ذرا سا مسکرائی۔

"کریم چچا کہہ رہے تھے کہ تم مجھ سے نہیں ملو گی؟"

"محمل! تم اندر جاؤ۔" تائی مہتاب پریشانی سے آگے بڑھیں۔

"آغا جان! تائی اماں! فرشتے کو میں نے خود شادی میں انوائیٹ کیا ہے، آپ گھر آئے مہمان کو کیسے نکال سکتے ہیں؟"

"تم نے؟" تائی مہتاب بھونچکی رہ گئیں۔ "تم جانتی ہو اسے؟"

"ہاں۔ میں انہیں جانتی ہوں۔"

"اور یہ کیسے نہیں جانتی ہوں گی، ان کے اس عاشق کی عزیزہ ہیں نا یہ۔"

کوئی تمسخرانہ انداز میں کہتا سیڑھیوں سے اتر رہا تھا۔ محمل نے چونک کر گردن اٹھائی۔ وہ فواد تھا۔ ہشاش بشاش، چہرے پہ طنزیہ مسکراہٹ لیے، وہ ان کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔

"یہ کون ہیں؟" فرشتے نے قدرے ناگواری سے اسے دیکھ کر محمل کو مخاطب کیا۔

"یہ اس ملک میں قانون کی بے بسی کا منہ بولتا ثبوت ہیں، جن کو قانون زیادہ دیر تک حراست میں نہیں رکھ سکتا۔"

ایک جتاتی نظر فواد پہ ڈال کر اس نے چہرہ موڑ لیا تھا۔ "آپ اندر آجائیں فرشتے! بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔"

"ہرگز نہیں۔" تائی تیزی سے آگے بڑھیں۔

"محمل! یہ لڑکی فراڈ ہے، یہ صرف ابراہیم کی جائیداد کے پیچھے ہے۔"

"وہ تو آپ بھی ہیں مہتاب آنٹی! اور شاید اسی لیے آپ محمل کو بہو بنا رہی ہیں؟"

اس نے فرشتے کو کسی سے اتنی درشتی سے بات کرتے آج پہلی بار دیکھا تھا، مگر اسے حیرت نہیں ہوئی تھی۔

"یہ ہمارے گھر کا معاملہ ہے، تم بیچ میں مت بولو۔"

"میں بیچ میں بولوں گی، محمل کے لیے میں ضرور بولوں گی۔" وہ پلٹی اور محمل کو دونوں کندھوں سے تھام کر اپنے سامنے کیا۔

"محمل! مجھے بتاؤ، ان لوگوں نے تمہارے ساتھ زبردستی کی ہے؟ یہ تمہیں کیوں مجبور کر رہے ہیں اس شادی پہ۔"

"مجھے کسی نے مجبور نہیں کیا، یہ میرا اپنا فیصلہ ہے، میں اس پہ خوش ہوں۔"

فرشتے ایک دم چپ سی رہ گئی۔ اس کے شانوں پہ اس کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔

"سن لیا تم نے؟ اب جاؤ۔" آغا جان نے استہزائیہ سر جھٹکا اور دروازے کی طرف اشارہ کیا، مگر وہ ان کی طرف متوجہ نہ تھی۔

"محمل، تم نے اتنا بڑا فیصلہ اکیلے کر لیا؟" وہ دکھ سے اسے دیکھ رہی تھی۔ "جب کسی کو اپنا مخلص دوست کہا جاتا ہے اور اپنے دوست کی محبت اور خلوص کے دعوے کیے جاتے ہیں تو اتنے بڑے فیصلوں سے قبل اسے مطلع بھی کیا جاتا ہے۔"

"میں آپ کو بتانے ہی۔۔۔"

"میں اپنی بات نہیں کر رہی۔"

"پھر؟ کون؟" وہ چونکی۔ "کیا ہمایوں؟" اس کا نام اس نے بہت آہستہ سے لیا تھا۔

"نہیں۔۔۔" وہ مزید اس کے قریب آئی اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے دھیرے سے بولی۔ "میں اس مصحف کی بات کر رہی ہوں جس کے اتارنے والے سے تم نے سمعنا واطعنا (ہم نے سنا اور ہم نے

اطاعت کی) کا وعدہ کیا تھا۔ کیا تم نے اسے بتایا؟"
"فرشتے!" وہ بنا پلک جھپکے اسے دیکھ رہی تھی۔
"اللہ کو سب پتا ہے' میں کیا بتاؤں؟"
"کیا تمہیں دن میں پانچ بار اسے اپنی اطاعت کا بتانا نہیں پڑتا؟ پھر اپنے فیصلوں میں تم اسے کیسے بھول سکتی ہو؟"
محمل ٹکر ٹکر اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ فرشتے کیا کہہ رہی ہے' کیا سمجھنا چاہ رہی ہے۔
"مگر میں نے نماز' تسبیح' کچھ نہیں چھوڑا' میں ساری نمازیں پڑھتی ہوں۔" وہ دونوں بہت مدھم سرگوشیوں میں بات کررہی تھیں۔
"لیکن کیا تم نے اس کی سنی؟ اس نے کچھ تو کہا ہوگا تمہارے فیصلے پر۔" فرشتے نے ابھی تک اسے کندھوں سے تھام رکھا تھا اور وہ یک ٹک اسے تکے جارہی تھی۔
"محمل! تم اس کی بات سنتیں تو سہی' اس سے پوچھتیں تو سہی! تم قرآن کھولو اور سورہ مائدہ کا ترجمہ دیکھو۔" اس کی آواز میں تاسف گھل گیا۔ محمل نے ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھ اپنے شانوں سے ہٹائے' اسے لگا اس سے غلطی ہوگئی ہے۔
"میں ابھی آتی ہوں' آپ جائیے گا نہیں۔"
وہ کام دار دوپٹے کا پلو انگلیوں سے تھامے ننگے پاؤں بھاگتی ہوئی کمرے کی طرف گئی۔
"محترمہ! آپ جاسکتی ہیں۔" فواد نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔
"یہ میرے باپ کا گھر ہے' اس میں ٹھہرنے کے لیے مجھے آپ کی اجازت نہیں چاہیے۔" وہ رکھائی سے کہتی صوفے پہ بیٹھی اور پھر سے موبائل اٹھالیا۔
فواد اور آغا جان نے ایک دوسرے کو دیکھا' نگاہوں میں۔۔۔ اشاروں کا تبادلہ کیا اور پھر آغا جان بھی گہری سانس لیتے ہوئے صوفے پہ بیٹھ گئے۔ تقریب کے شروع ہونے میں دو ڈھائی گھنٹے رہتے تھے۔ مہمانوں کی آمد کا سلسلہ ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔

محمل دوڑتے قدموں سے اپنے کمرے میں آئی تھی۔ دروازے کی چٹخنی چڑھا کر وہ شیلف کی طرف لپکی۔
سب سے اوپر والے خانے میں اس کا سفید جلد والا مصحف رکھا تھا۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے اوپر رکھا' مصحف اٹھایا اور آہستہ سے اسے دونوں ہاتھوں میں تھامے اپنے چہرے کے سامنے لائی' اسے سب یاد رہا تھا' صرف یہ بھول گیا تھا کیوں؟
وہ اسے مضبوطی سے پکڑے بیڈ پہ آبیٹھی اور کور کھولا۔
وہ سورہ مائدہ کی 106 آیت تھی۔
"اے ایمان والو' جب تم میں کسی کی موت کا وقت آجائے اور وہ وصیت کررہا ہو تو۔۔۔"
چند الفاظ پڑھ کر ہی اس کا دل بری طرح سے دھڑکا۔ اس نے زور سے پلکیں جھپکیں۔ [illegible] یاد وہ سب کچھ واقعی اور [illegible] وصیت۔۔۔ موت کا وقت' وصیت۔۔۔
"مسرت نے مرتے وقت وصیت کی تھی۔۔۔"
"تمہارا رشتہ وسیم سے۔۔۔" بہت سی آوازیں ذہن میں گڈمڈ ہونے لگیں۔ وہ سر جھٹک کر پھر سے پڑھنے لگی۔
"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آجائے اور وہ وصیت کررہا ہو تو اس کے لیے شہادت کا نصاب یہ ہے کہ تمہاری جماعت میں دو صاحب عدل آدمی گواہ بنائے جائیں یا اگر تم سفر کی حالت میں ہو اور وہاں موت کی مصیبت پیش آجائے تو غیر لوگوں ہی میں سے دو گواہ لے لیے جائیں پھر اگر (ان کی بتائی ہوئی وصیت میں) کوئی شک پڑجائے تو نماز کے بعد دونوں گواہوں کو (مسجد میں) روک لیا جائے اور وہ قسم کھا کر کہیں کہ ہم کسی فائدے کے عوض شہادت بیچنے والے نہیں ہیں اور خواہ کوئی ہمارا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو (ہم اس کی رعایت کرنے والے نہیں) اور نہ خدا واسطے کی گواہی کو ہم چھپانے والے ہیں' اگر ہم نے ایسا کیا تو گناہ گاروں میں شمار ہوں گے۔"

وہ ساکت سی ان الفاظ کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ قرآن کو تھامے دونوں ہاتھ بے جان سے ہوگئے تھے۔ کیا وہ سب واقعی یہاں لکھا تھا؟ مگر۔۔۔ مگر کیسے؟ وصیت۔۔۔ دو افراد کی قسم کھا کر گواہی۔۔۔ رشتہ دار یہ سب تو۔۔۔ یہ سب تو اس کے ساتھ ہورہا تھا۔
وہ پلک تک نہ جھپک پارہی تھی۔ اس کا دل جیسے رعب سے بھر گیا تھا۔ رعب سے اور خوف سے۔ یکایک اسے لگا اس کے ہاتھ کپکپا رہے ہیں' اسے ٹھنڈے پسینے آرہے ہیں' وہ بہت بھاری کتاب تھی' بہت بھاری' بہت وزنی' وہ جس کا بوجھ پہاڑ بھی نہ اٹھا سکتے ہوں' وہ کیسے اٹھاسکتی تھی؟ اسے لگا اس کی ہمت جواب دے جائے گی۔ وہ اب مزید یہ بوجھ نہیں اٹھا پائے گی۔ وہ عام کتاب نہیں تھی' اللہ کی کتاب تھی۔ اسے اللہ نے اس کے لیے خاص اس کے لیے اتارا تھا۔ ہر لفظ ایک پیغام تھا۔ ہر سطر ایک اشارہ تھی۔ اس نے اتنی زندگی ضائع کردی۔ اس نے یہ پیغام کبھی دیکھا ہی نہیں۔
"محمل! تم نے اتنی عمر بے کار گزار دی۔ یہ کتاب غلاف میں لپیٹ کر بہت اوپر سجانے کے لیے تو نہ تھی۔ یہ تو پڑھنے کے لیے تھی۔"
ہر دفعہ کی طرح آج پھر اس کتاب نے اسے بہت حیران کیا تھا۔ سوچنا سمجھنا تو دور کی بات' وہ تو متحیر سی ان الفاظ کو تکے جارہی تھی' یہ سب کیا تھا؟ کیسے اس کتاب کو سب پتا ہوتا تھا؟
"کیونکہ یہ اللہ کی کتاب ہے' نادان لڑکی! یہ اللہ کی بات ہے' اس کا پیغام ہے' خاص تمہارے لیے' تم لوگ نہ سننا چاہو تو یہ الگ بات ہے۔" کسی نے اس کے دل سے کہا تھا۔
"وہ کون تھا؟ وہ نہ جانتی تھی۔"
دروازے کھلنے کی آواز پہ سب نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ وہ آہستہ سے چلی آرہی تھی۔ کام دار دوپٹے کا کنارہ ٹھوڑی کے قریب سے اس نے دو انگلیوں میں لے رکھا تھا۔ اس کے چہرے کی رنگت قدرے سفید پڑی ہوئی تھی یا شاید یہ کچھ اور تھا جو انہیں چونکا گیا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی ان کے سامنے آکھڑی ہوئی۔
"آغا جان!" اس نے ان کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ اس کے اجنبی لہجے پہ چونک سے گئے۔
"ہاں' بولو۔"
"میری ماں کی وصیت کے وقت موجود لوگوں میں سے کون سے دو لوگ عصر کی نماز کے بعد اللہ کے نام کی قسم اٹھا کر گواہی دیں گے کہ انہوں نے یہ وصیت کی تھی یا نہیں؟"
پل بھر کو لاؤنج میں سکوت سا چھا گیا' فرشتے نے مسکراہٹ دبا کر سر نیچے کرلیا۔
آغا جان حیران سے کھڑے ہوگئے۔
"کیا مطلب؟"

"آپ کو پتا ہے سورۂ مائدہ میں لکھا ہے نماز کے بعد آپ میں سے دو لوگوں کو اللہ کے نام کی قسم اٹھا کر گواہی دینی پڑے گی۔"

"کیا بکواس ہے؟" وہ حسب توقع بھڑک اٹھے۔ "تمہیں ہماری بات کا اعتبار نہیں ہے؟"

"نہیں ہے!"

"تم!" وہ غصہ ضبط کرتے مٹھیاں بھینچ کر رہ گئے۔ تب ہی نگاہ فرشتے پہ پڑی تو اس نے فوراً" شانے اچکا دیے۔

"میں نے تو کچھ نہیں کیا کریم چچا!"

"تم سے تو میں بعد میں..."

"آپ لوگ گواہی دیں گے یا نہیں؟" وہ ان کی بات کاٹ کر زور سے بولی تھی، پھر چہرے کا رخ صوفوں پہ بیٹھے نفوس کی طرف موڑا۔ "کون کون تھا اس وقت آپ میں سے ادھر؟ کون دے گا گواہی؟ کون اٹھائے گا قسم بولیے، جواب دیجیے۔"

سب خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

اسے اس کے سارے جواب مل گئے تھے۔ کاش وہ پہلے اس آیت کو پڑھ لیتی تو اتنا غلط فیصلہ نہ کرتی۔ صحیح کہتا ہے اللہ تعالیٰ ہماری بہت سی مصیبتیں ہمارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہوئی ہیں۔

"تو آپ لوگوں نے مجھ سے جھوٹ بولا، بہت بہتر۔ مجھے اب کوئی شادی نہیں کرنی۔" اس نے ماتھے پہ جھولتا ٹیکا نوچ کر سامنے پھینکا۔ نازک سا ٹیکا ایک آواز کے ساتھ میز کے شیشے پہ گرا۔

"اب میرا فیصلہ بھی سن لو۔" آغا جان نے ایک گہری سانس لی۔ "مگر پہلے تم لڑکی!" انہوں نے حقارت سے فرشتے کو اشارہ کیا۔ "تم مجھے یہاں سے چلتی نظر آؤ۔"

"میرے باپ کا گھر ہے، میں تو کہیں نہیں جاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے فواد۔" انہوں نے فواد کو اشارہ کیا۔ وہ سر ہلا کر آگے بڑھا اور صوفے پہ بیٹھی فرشتے کو ایک دم بازو سے کھینچا۔

"چھوڑو مجھے۔" وہ اس اچانک افتاد کے لیے تیار نہ تھی، بے اختیار چلا کر خود کو چھڑانے لگی، مگر وہ اسے بازو سے کھینچ کر گھسیٹتا ہوا باہر لے جانے لگا۔ اسی پل آغا جان محمل کی طرف بڑھے۔

"تو تم یہ شادی نہیں کرو گی؟"

"ہاں ہرگز نہیں کروں گی۔ میری بہن کو چھوڑو۔" وہ غصے سے فواد پہ جھپٹنا ہی چاہتی تھی، جو فرشتے کو زبردستی باہر لے کر جا رہا تھا، مگر اس سے پہلے ہی آغا جان نے اس کو بالوں سے پکڑ کر واپس کھینچا۔

"تو تم شادی نہیں کرو گی؟" انہوں نے اس کے چہرے پر تھپڑ مارا۔ وہ چکرا کر گری۔

"تمہیں لگتا ہے ہم پاگلوں کی طرح تمہاری منتیں کریں گے؟ تمہارے آگے ہاتھ جوڑیں گے؟ نہیں بی بی! شادی تو تمہیں کرنی پڑے گی، ابھی اور اسی وقت۔ اسد! نکاح خواں کو ابھی بلاؤ۔ میں بھی دیکھتا ہوں یہ کیسے شادی نہیں کرتی۔"

"میں نہیں کروں گی، سنا آپ نے۔" وہ روتے ہوئے بولی۔ وہ مسلسل اسے تھپڑوں اور مکوں سے مار رہے تھے۔

"میری بہن کو چھوڑ۔" خود کو چھڑاتی فرشتے محمل کو پٹتے دیکھ کر لمحے بھر کو تو سکتہ میں رہ گئی تھی، اور پھر دوسرے ہی پل اس نے زور سے فواد کو دھکا دینا چاہا، مگر وہ مرد تھا، وہ اس کو دھکیل نہ سکتی تھی۔ وہ اس کا بازو پکڑتے ہوئے اسے دروازے سے باہر نکال رہا تھا۔

"فواد! اسے چھوڑو۔" یکدم حسن نے پوری قوت سے فواد کو پیچھے دھکیلا تھا۔ فواد اس حملے کے لیے تیار نہ تھا، ایک دم بوکھلا کر وہ پیچھے کو ہٹا۔ اس کی گرفت ڈھیلی پڑی، اور فرشتے بازو چھڑاتی محمل کی طرف بھاگی، جسے آغا جان ابھی تک مار رہے تھے۔ فواد نے غصے سے حسن کو دیکھا مگر اس سے پہلے کہ اسے کچھ سخت کہتا، فضہ نے حسن کو بازو سے کھینچ کر ایک طرف کر دیا۔

"میری بہن کو چھوڑیں، ہٹیں۔" وہ چیختی ہوئی آغا جان کا ہاتھ روکنے لگی، مگر انہوں نے ساتھ ہی ایک زوردار طمانچہ اس کے چہرے پہ مارا۔ فرشتے تیورا کر ایک طرف کو گری۔ منہ میز کے کونے سے لگا۔ ہونٹ کا کنارہ پھٹ گیا۔ لمحے بھر کو اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھایا تھا، اگلے ہی منٹ وہ خود کو سنبھال کر تیزی سے اٹھی۔

محمل اپنے بازو چہرے پہ رکھے، روتی ہوئی اپنا کمزور سا دفاع کر رہی تھی۔ اب کی بار فرشتے نے آغا جان کا ہاتھ نہیں روکا، بلکہ محمل کو پیچھے سے پکڑ کر کھینچا۔ محمل گھڑی ہی چند قدم پیچھے گھسٹتی گئی۔ اس کا دوپٹہ سر سے اتر کر پیچھے ڈھلک گیا تھا، بالوں کی لٹیں جوڑے سے نکل کر چہرے پہ بکھر گئیں۔

اس سے پہلے کہ آغا جان اپنے اور محمل کے درمیان چند قدم کا فاصلہ عبور کر پاتے، فرشتے ان کے بیچ آ کھڑی ہوئی۔

"ہاتھ مت لگائیے میری بہن کو۔" اپنے پیچھے گری ہی محمل کے سامنے اپنے دونوں بازو پھیلائے وہ چیخ پڑی تھی۔ "آپ لوگ اس حد تک گر جائیں گے، میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ کیا بگاڑا ہے اس نے آپ کا؟"

"سامنے سے ہٹ جاؤ ورنہ تم آج میرے ہاتھوں ختم ہو جاؤ گی!" وہ غصے سے ایک قدم آگے بڑھے ہی تھے کہ فواد نے ان کا بازو تھام لیا۔

"آرام سے آغا جان! آپ کا بی پی شوٹ کر جائے گا۔" ان کو سہارا دے کر وہ نرمی سے بولا تھا۔ محمل ابھی تک گھٹنوں پہ سر رکھے رو رہی تھی، جبکہ فرشتے اس کے آگے اپنے بازو پھیلائے راستہ روکے کھڑی تھی۔ فواد چاہتا تو اس کو پھر پکڑ لیتا، مگر جانے کیوں وہ آغا جان کو سہارا دیے وہیں کھڑا رہا۔ اس کی طرف نہیں بڑھا۔

"میں اب محمل کو ادھر نہیں رہنے دوں گی۔ اٹھو محمل! اپنا سامان پیک کرو، اب تم میرے ساتھ رہو گی۔ چلو۔" اس نے محمل کو اٹھانا چاہا مگر وہ ایسے ہی گری روتی جا رہی تھی۔

"آپ کو کیا لگتا ہے، آپ اسے اپنے ساتھ لے گئیں تو ہم خاندان والوں کو کہیں گے کہ محمل کی نام نہاد بہن اسے لے گئی اور بس؟" محمل کو بازو سے پکڑ کر اٹھاتے اسی لمحے تھا ایک ثانیے کو تھم گئے۔ اس نے قدرے الجھ کر سر اٹھایا اور فواد کو دیکھا۔ چہرے پہ چھایا غصہ آہستہ سے الجھن میں ڈھلا تھا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ محمل تو وہ لڑکی ہے نا جو ایک رات پہلے بھی گھر سے باہر رہ چکی ہے؟ تو اس کے لیے اگر خاندان والوں کو یہ بتایا جائے کہ یہ نکاح سے پہلے کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے تو وہ فوراً" یقین کر لیں گے نا؟"

اس کے چہرے پہ شاطرانہ مسکراہٹ تھی۔

"نہیں۔" محمل نے تڑپ کر آنسوؤں سے بھیگا چہرہ اوپر اٹھایا۔

"تمہارے نہیں کہنے سے یہ بدنامی ٹل تو نہیں جائے گی ڈیئر کزن! تم اپنی بہن کے ساتھ گئیں تو ہم تمہیں پورے خاندان میں بدنام کر دیں گے۔ اور پھر یہ تمہیں کتنا عرصہ سنبھالے گی؟ اس کے بعد تم کہاں جاؤ گی؟"

محمل پھٹی پھٹی نگاہوں سے فواد کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ خود فرشتے بھی سن رہ گئی۔

"اگر تم نے اس گھر سے قدم بھی نکالا تو تم بدنام ہو جاؤ گی۔ پورا خاندان تھوکے گا تم پر کہ ماں کے مرتے ہی کھلی چھوٹ..."

"نہیں، نہیں... میں نہیں جاؤں گی۔" وہ خوف زدہ سی گھٹی گھٹی آواز میں بمشکل بول پائی۔

"یعنی تم وسیم سے شادی کرنے پہ تیار ہو۔ ویری گڈ کزن!"

وہ اسی عیاری سے مسکرایا۔ "اسد چچا یقیناً" نکاح خواں کو لاتے ہی ہوں گے۔ وسیم کدھر ہے؟ کوئی اسے بھی بلائے۔"

باقی آئندہ شمارے میں

رابعہ فیاض قادری

فاطمہ نے دروازہ کھولا تو سامنے ارم کو پایا۔

"السلام علیکم امی!" وہ ان کے گلے لگ گئی۔ فاطمہ بی بیٹی کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد آخر ارم کو حنا کا خیال آیا۔

"یہ حنا نظر نہیں آرہی اور آپ نے دروازہ کھولا' وہ کہاں ہے؟"

"ارے وہ۔ اس کی طبیعت صحیح نہیں ہے۔ کل سے بخار آرہا ہے۔ میں نے ہی کہا' آرام کرلو۔"

فاطمہ سادگی سے بولیں تو ارم تپ گئی۔

"حد ہو گئی امی! آپ نے تو بہو کو بہت ہی سر چڑھا رکھا ہے' ذرا سا بخار کیا ہوا' محترمہ بستر سنبھال کے پڑ گئیں۔"

"ارے ارے ارم بیٹا! ایسی بات نہیں ہے وہ بے چاری تو خود سارا دن گھر کے کاموں میں لگی رہتی ہے اور پھر اس بھری دوپہر میں آرام نہیں کرے گی تو اور کیا کرے؟"

امی نے گھبرا کر حنا کی صفائی پیش کی مگر ارم اور حنا سے دل صاف کرلے' یہ ممکن نہ تھا۔ مزید کچھ کہنے لگی ہی تھی کہ حنا دروازہ کھول کر باہر آگئی۔

"ارے ارم باجی! کب آئیں آپ!"

"جب تم گدھے گھوڑے بیچ کر سو رہی تھیں۔ امی کو دروازہ کھولنا پڑا' تمہیں تو ہوش ہی نہیں تھا۔" ارم کے اتنے سخت لہجے پر حنا کا چہرہ اتر گیا۔

"دوائی کھائی تھی نا' اس لیے آنکھ لگ گئی تھی۔" وہ دھیمے لہجے میں بولی تو فاطمہ فوراً" بولیں۔

"اگر میں نے دروازہ کھول دیا تو کیا ہو گیا اور حنا بیٹا! تم آرام کرو۔ تم باہر کیوں آگئیں۔ کچھ چاہیے تھا کیا؟"

"نہیں امی! اب میری طبیعت بہتر ہے۔ آپ آپی کو اپنے کمرے میں لے جائیں۔ میں وہیں چائے لاتی ہوں۔ کیوں آپی چائے چلے گی نا! یا کولڈ ڈرنک لے آؤں؟"

"جو لے آؤ گی' تمہاری مہربانی ہو گی۔ آئیں امی' آپ کے کمرے میں چلتے ہیں۔" وہ اپنا شولڈر بیگ اٹھاتے ہوئے بولی تو حنا کچن میں چلی گئی۔

"ارم بیٹا! حنا سے ایسے بات نہ کیا کرو' وہ تمہاری بھابھی ہے پھر یہ دیکھو کہ وہ میرا کتنا خیال رکھتی ہے۔"

فاطمہ نے پھر سے ارم کو سمجھانے کی کوشش کی تو وہ بھڑک گئی۔

"بس کریں امی! آپ تو اس کی حمایت کا کوئی موقع جانے نہیں دیتیں' چھوڑیں۔ میں آپ سے ملنے آئی ہوں' اپنی بات کریں۔"

فاطمہ گہری سانس لے کر رہ گئیں۔

حنا سے ارم کا بیر اس وقت سے تھا جب حنا بیاہ کر اس گھر میں آئی بھی نہیں تھی۔ فاطمہ کے دو ہی بچے تھے ارم اور اس سے پانچ سال چھوٹا یاسر ــــ ابھی ارم بی اے کے پیپر دے کر فارغ ہی ہوئی تھی کہ ایک حادثے میں باپ چل بسے صدمہ بہت بڑا اور اچانک تھا مگر آخر کار صبر آہی گیا۔ زندگی کی گاڑی پھر سے چل پڑی۔ یونیورسٹی میں ارم کی ملاقات سہیل سے ہوئی تو ان کی دوستی دوسرا رنگ اختیار کر گئی۔ ادھر فاطمہ ارم کے لیے اچھے رشتے کی تلاش میں تھیں مگر ان پر بجلی گری جب ارم نے کہا کہ وہ شادی کرے گی تو صرف سہیل احمد سے ورنہ نہیں کرے گی۔

فاطمہ ارم کی ضدی طبیعت سے واقف تھیں' اس لیے راضی ہوتا ہی پڑا حالانکہ انہیں سہیل احمد اور اپنے گھر کے ماحول میں زمین آسمان کا فرق لگا تھا۔ ان کی فیملی جتنی مختصر تھی' سہیل کی اتنی ہی بڑی تھی۔ وہ چار بھائی پانچ بہنیں تھیں' گلشن میں بڑا سا گھر تھا۔ اپنا کاروبار تھا۔ سب بھائی اپنا اپنا کام خود چلاتے تھے مگر رہتے ایک جگہ تھے۔

سہیل بھی کافی سنجیدہ اور لیے دیے مزاج کا نظر آتا تھا۔ نجانے ارم اور ان کے درمیان یہ تعلق کیسے استوار ہوا تھا۔ سہیل کے گھر پر ان کی امی کی حکومت تھی۔ ہر کام ان کی منشا اور مرضی سے ہوتا تھا اور سہیل ان کا لاڈلا بیٹا تھا۔ اس لیے انہوں نے ارم کو بہو کے روپ میں قبول کرلیا تھا۔

ارم شادی کے بعد بہت کم میکے آتی اور سہیل تو عید بقر عید اور خوشی غمی تک محدود تھا۔ یاسر پڑھائی مکمل کرکے جاب پر لگا تو ارم اپنی نند کا رشتہ لیے چلی آئی۔

فاطمہ حیران ہو گئیں۔ وہ وٹے سٹے کے لیے راضی نہیں تھیں مگر ارم مسلسل زور دے رہی تھی۔ پھر اس کے سسرال والے اور سہیل بھی یہی چاہتے تھے۔ تب ہی ایک شادی کے سلسلے میں ارم کچھ دنوں کے لیے اسلام آباد چلی گئی مگر جب واپس آئی تو ایک شاکنگ نیوز اس کی منتظر تھی کہ فاطمہ نے یاسر کا رشتہ طے کردیا تھا۔

"امی! میں اتنی غیر اہم تھی کہ آپ نے مجھے بتانا بھی ضروری نہ سمجھا۔" وہ تو صدمے سے شکستہ ہو گئی۔

"یہ بات نہیں ہے۔ سب کچھ اچانک ہو گیا اور ابھی ہوا ہی کیا ہے اب تم خیر سے آگئی ہو' اب بھائی کی خوشی منانا۔ منگنی' شادی ــــ میں دھوم دھام سے شرکت کرنا۔"

فاطمہ نے اسے بہلانا چاہا مگر وہ بگڑ گئی۔

"کہاں کی منگنی' شادی! مجھے لڑکی دکھائی نہیں' خود ہی ہاں کہہ آئیں جب کہ میں نے کہا بھی تھا کہ سہیل اپنی بہن کے لیے کہہ رہے ہیں پھر عفت میں کیا برائی تھی۔ اچھا ہے میرا بھی سسرال میں سر اونچا ہو جاتا مگر آپ کو میری پروا کب ہے۔"

"بات تمہاری یا سہیل کی نہیں ہے۔ شادی یاسر نے کرنی ہے اور اس نے خود حنا کا نام لیا۔ میں نے جاکر دیکھا۔ اچھی لڑکی ہے۔ تم بھی دیکھو گی تو پسند کرو گی بلکہ اسے کوئی ناپسند کر ہی نہیں سکتا' چاند سورج کی جوڑی ہے ماشاء اللہ۔"

"امی! مجھے تو لگتا ہے آپ نے ہی یاسر کو عفت کے لیے منانے کی کوشش نہیں کی ورنہ یاسر آپ کی بات کبھی نہیں ٹالتا۔ آپ خود عفت کو بہو نہیں بنانا چاہتی تھیں۔" ارم کی بدگمانی عروج پر تھی' فاطمہ کو دکھ ہوا۔

"جب تم سہیل کے لیے ضد کر رہی تھیں تو تم نے کسی کی سنی تھی؟ اب یاسر اپنی پسند سے کرنا چاہ رہا ہے تو میں کیوں روڑے اٹکاؤں ــــ یہ زندگی بھر کا معاملہ ہے۔ میں اپنے بیٹے پر اپنی پسند مسلط نہیں کر سکتی تھی پھر حنا بالکل ایسی ہی ہے جیسی بہو میں چاہتی تھی۔ تم بھی اب یہ نکتہ چینی بند کرو اور شادی کی تیاریاں شروع کرو۔" فاطمہ نے سختی سے کہا تو ارم کو چپ ہونا پڑا اور تب سے وہ حنا کا دل جلانے اور جلی کٹی سنانے کا کوئی موقع جانے نہیں دیتی تھی۔ بوٹے سے قد والی من



موہنی حنا اپنی ساس اور شوہر کی من چاہی تھی مگر اکلوتی نند سے ہار جاتی تھی۔ حنا نے نہ کبھی ارم کی کسی بات کا جواب دیا نہ بدتمیزی کی اور ارم کو اس کی اس نرمی سے اور شہہ ملتی تھی۔ فاطمہ ہی تھیں جو ارم کو سمجھاتی رہتی تھیں مگر لگتا تھا ارم سمجھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔

ابھی بھی ارم اور فاطمہ باتوں میں مشغول تھیں کہ حنا لوازمات سے بھری ٹرالی لیے کمرے میں چلی آئی اور ارم کی خاطر مدارات شروع کردی۔

تب ہی ڈور بیل بجی' حنا دروازہ کھولنے چلی گئی۔ واپس آئی تو حنا کی دونوں چھوٹی بہنیں ساتھ تھیں۔ حنا کا چہرہ بہنوں کو دیکھ کر خوشی سے تمتما اٹھا تھا۔ ارم کو اس کی خوشی ایک آنکھ نہیں بھائی۔ بولی۔

"تم لوگ بھری دوپہر میں گھومتی پھرتی ہو' یہ کوئی وقت ہے نکلنے کا؟"

ارم کی بات پر حنا کا چہرہ بجھ گیا۔ اس کی چھوٹی بہن بولی۔

"آپی ہم کو بھائی چھوڑ کر گئے ہیں۔ شام میں لینے بھی وہی آئیں گے۔ ہم اکیلے نہیں آتے جاتے ہیں۔"

"حنا! بہنوں کو اپنے کمرے میں لے جاؤ اور آرام سے باتیں کرو' اتنے دن بعد مل رہی ہو۔" فاطمہ نے کہا۔

حنا پریگننٹ تھی اس لیے آج کل گھر سے کم کم نکلتی تھی۔ وہ سرہلا کر اپنی بہنوں کو لیے چلی گئی تو فاطمہ ارم پر بگڑ گئیں۔

"کیا ضرورت تھی تمہیں اس طرح کہنے کی۔ کتنا برا لگا ہوگا حنا کو۔"

"لگتا ہے تو لگے۔ میں نے تو سچ بات کی تھی اور آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں۔"

ارم اطمینان سے بولی تو فاطمہ اس کو تاسف سے دیکھنے لگیں۔

"ارم! تمہارا میکہ میرے بعد یاسر کے دم سے ہی ہوگا بیٹا! بھائی بھابھی سے بنا کر رکھو گی تو کل یہ تمہارے کام آئیں گے اور اگر ان کا دل برا ہو گیا تو کہاں جاؤ گی۔ اس گھر کے دروازے اللہ نہ کرے تم پر بند نہ ہو جائیں۔"

"یہ کون ہوتے ہیں اس گھر کے دروازے بند کرنے والے' یہ یاسر کا نہیں میرے ابو کا گھر ہے اور میرا جب دل چاہے گا۔ میں یہاں آؤں گی۔"

وہ تاسف سے اسے دیکھ کر رہ گئیں۔ اس لڑکی کو سمجھانا تو دیوار سے سر پھوڑنا ہے۔ یہ نہیں سمجھے گی۔ فاطمہ کی خاموشی کو ارم نے بھی محسوس کرلیا۔ اسی لیے بولی۔

"امی! میں یہ برتن کچن میں رکھ آتی ہوں آپ کی بہو تو اپنی بہنوں میں مگن ہو گئی ہیں۔"

کچن سے واپس آتے ہوئے اس کے قدم حنا کے دروازے کے آگے رک گئے۔ "امی کہتی ہیں یہ گھر یاسر اور حنا کا ہے۔ میں ذرا اس کو بتادوں کہ اس گھر سے میرا اختیار کبھی ختم نہیں ہوگا اگر حنا ایسا سوچتی ہے تو ابھی سے اپنی عقل درست کرلے۔"

ارم دل ہی دل میں حنا کو مخاطب کیے ہوئے تھی۔ اندر سے باتوں کی آواز آرہی تھی اپنا نام سن کر ارم رک گئی۔ حنا کی بہن کہہ رہی تھی۔

"حنا باجی! تم کیسے ارم باجی کی کڑوی کسیلی برداشت کرلیتی ہو۔ قسم سے میں ہوں تو طبیعت صاف کردوں محترمہ کی۔"

"کوئی بات نہیں۔ کہنے دو' بڑی ہیں۔ ان کی عادت ہی کچھ ایسی ہے' اب میں کیا ان کو کچھ کہوں' کچھ دیر کو تو آتی ہیں بے چاری۔" حنا نے ارم کی طرف سے گویا صفائی پیش کی۔ حنا کی بہن نے غصے سے تکیہ گود سے اٹھا کر بیڈ پر پٹخا اور گویا ہوئی۔

"تمہاری اسی کمزوری نے ان کو اتنی شہہ دی ہے۔ شروع میں ٹوک دیتیں تو آج ان کی اتنی ہمت نہ ہوتی۔"

اس کی بات سن کر ارم کا اشتعال دوچند ہو گیا۔ دل چاہا اندر جاکر ان ٹانگ برابر لڑکیوں کو خوب کھری کھری سنائے مگر حنا کی بات نے اس کو ٹھٹکنے پر مجبور کردیا۔

"فوراً! اگر میں ان کے اس رویے کی وجہ نہ جان جاتی تو ان سے میرا جھگڑا اب تک ہو چکا ہوتا مگر اب یہ ممکن نہیں ہے اور پھر یاسر نے بھی تاکید کی ہے کہ آپی کی کسی بات کا جواب نہ دوں۔"

"مگر کیوں حنا؟ کیا یاسر بھائی اپنی بہن کا رویہ نہیں دیکھتے۔" وہ دکھ سے بولی۔

"ہاں دیکھتے ہیں۔ چلو میں بتادیتی ہوں کہ میں آپی کی بری بھلی ہنس کر کیوں ٹال دیتی ہوں۔" حنا سکون سے گویا تھی۔

"یہ میری شادی کے چند ہفتوں۔ بعد کی بات ہے کہ یاسر نے کہا۔ آپی کے گھر چلتے ہیں حالانکہ میں جانا نہیں چاہتی تھی مگر یاسر کے اصرار پر راضی ہو گئی۔ وجہ یہی تھی کہ آپی کا رویہ میرے ساتھ پہلے دن سے ہی خراب تھا' دوسرے اصولی طور پر ان کو ہماری دعوت کرنا چاہیے تھی مگر خیر ہم نے نکلنے سے پہلے ان کو فون کردیا۔ جب ہم تیار ہو کر ان کے گھر پہنچے تو دروازہ کھلا تھا۔ ہم سے ایک غیر اخلاقی حرکت سرزد ہوئی کہ بیل دیے بنا ہم سیدھے گھر میں چلے گئے۔ آپی کی ساس اور سہیل بھائی لاؤنج میں ہی بیٹھے تھے اور آپی کو سخت برا بھلا کہہ رہے تھے اور یہاں طنز کے تیر برسانے والی آپی وہاں ایک لفظ نہ کہہ پارہی تھیں اور ان کے آنسو بہہ رہے تھے' جھگڑا اس بات پر تھا کہ آپی اپنی ساس سے کچھ اچھا پکانے کی اجازت چاہتی تھیں کہ ان کے بھائی بھابھی پہلی بار شادی کے بعد ان کے گھر آرہے تھے۔

یہ دیکھ کر یاسر کو سخت غصہ آیا مگر میں ان کا ہاتھ پکڑ کر دبے پاؤں واپس لے آئی اور اللہ کا شکر ہے ہمیں کسی نے دیکھا بھی نہیں۔ باہر نکل کر ہم نے ان سے فون کرکے معذرت کرلی کہ ہم آج نہیں آسکیں گے۔

ہمارا فون سن کر آپی نے کچھ نہیں کہا یاسر سخت افسردہ تھے۔ انہوں نے کہا اب سمجھ میں آیا آپی اپنی نند کی شادی مجھ سے کیوں کرانا چاہتی تھیں۔ ہمیں اندازہ ہی نہیں تھا کہ وہ سسرال میں اس طرح کی زندگی گزار رہی ہیں۔ اگر مجھے پتا ہوتا تو شاید میں ان کی نند سے فوراً شادی کرلیتا کہ میری بہن کو تو اس کے گھر میں سکون ملے۔ میری بہن نے آج تک اپنا بھرم اس طرح رکھا ہے کہ ہم اندازہ ہی نہیں کرسکے کہ ان کے سسرال والے کیسے لوگ ہیں اور تب ہی یاسر نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں کبھی آپی کو پلٹ کر جواب نہیں دوں گی۔ ان کی کڑوی کسیلی ہنس کر برداشت کروں گی اور میں یہی کررہی ہوں۔"

"آپی ایسے لوگوں میں ایسے گھر میں کیسے رہ رہی ہیں وہ بھی بغیر کوئی شکوہ و شکایت کیے یہ بڑی بات ہے۔" چھوٹی والی دہل کر بولی تو دوسری نے فوراً کہا۔

"اچھا تو یہ وجہ ہے وہ گویا وہ اپنی فرسٹریشن یہاں تم پر چیخ چلا کر نکالتی ہیں۔"

"یہ بھی ہو سکتا ہے خود کو دبنگ ظاہر کرکے وہ یہ بتانا چاہتی ہوں کہ ان کا سسرال میں بھی یہی رعب ہے۔" دوسری والی پھر بولی۔

"بات جو بھی ہو مگر میں ان کا جھنجلانا برداشت کر لیتی ہوں کیونکہ وہ مجھ پر نہیں اصل میں اپنے حالات پر جھنجلاتی ہیں۔ پھر ان کی باتیں ہنس کر ٹالنے پر یاسر میرے ممنون ہوتے ہیں۔ ساس اور زیادہ پیار کرتی ہیں اور آپی کا اندر کا غصہ نکل جاتا ہے سو اگر ایک میرے برداشت کرنے سے اتنے فائدے ہیں تو کیا حرج ہے۔"

حنا مسکرائی تھی مگر باہر کھڑی ارم کا تو وہ حال تھا کہ کاٹو تو لہو نہیں۔ آج حنا اسے بلندی پر نظر آئی۔ وہ اسی لیے تو یاسر کی شادی اپنی نند سے کروانا چاہتی تھی کہ سسرال والوں کو دبا سکے۔ اپنے ایک غلط فیصلے کو وہ خود سے بھی پوشیدہ رکھتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ سہیل احمد سے شادی کا غلط فیصلہ دنیا میں موضوع گفتگو بنے اور اسی لیے وہ اس گھر میں ہنس کر سب کچھ برداشت کیے جارہی تھی مگر اپنے میکے میں بھنک بھی نہیں پڑنے دی تھی مگر آج اس کے بھرم میں دراڑ آگئی تھی۔

حنا سے کچھ کہے بغیر ہی وہ واپس جانے کے لیے مڑ گئی کہ شاید اب کہنے کے لیے اس کے پاس کچھ بچا ہی نہ تھا۔



ناولٹ

دل کی راہ گزر پر

رمشا خالد خان

رات اندھیرے کے دامن دودھیا چاندنی کی آمیزش لیے بڑی تمکنت سے جلوہ گر تھی۔ ستاروں کی تابانی آسمان کی خوب صورتی میں اضافہ کر رہی تھی۔ رات کی رانی کی مہک ماحول کی فسوں خیزی کو دوبالا کیے ہوئے تھی۔ ایسے میں مین روڈ پر تیزی سے حرکت کرتا سایہ بڑی گلی میں داخل ہوا اور دوسرے گھر کی دیوار کو ڈھانپے رات کی رانی کی فضا میں رچی مدہوش کن خوشبو کو لمبی سانس لے کر فرحت سے اپنے اندر اتارتے ہوئے اس نے بڑی مشکل سے خود کو مست ہونے سے روکا اور لاپروائی کا لبادہ پیچھے چھوڑ کر پھونک پھونک کر قدم آگے بڑھانے لگا۔ اس کی نظریں سرچ لائٹ کی طرح گردش کرتے ہوئے کسی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ ذرا آگے بڑھا تو اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ چوکیدار خدا بخش بڑی اور چھوٹی گلی کے سنگم پر کرسی بچھائے محو خواب تھا' آدھا راستہ اس کی کرسی اور باقی اس کے ڈنڈے نے بند کر رکھا تھا۔

وہ چند لمحے اس کے قریب ٹھہر کر جائزہ لیتا رہا' اگر بدقسمتی سے اس کی آنکھ کھل جاتی تو شناخت یقینی تھی کیونکہ وہ دیکھتا بعد میں تھا اور چور چور کا شور مچا کر سارے محلے کو اکٹھا پہلے کر لیتا تھا۔ گزرنے کا راستہ دائیں سے تھا' نہ بائیں سے تھا کچھ سوچ کر اس نے ایک نظر بے چارگی سے اپنے سب سے بہترین کپڑوں پر ڈالی اور پیٹ کے بل لیٹ کر ڈنڈے کے نیچے سے گھٹنوں کے بل گزرتے ہوئے چھوٹی گلی میں جا پہنچا' جہاں ایک ہی ساخت کے تین گھر سناٹا اوڑھے کھڑے تھے۔ وہ درمیان والے گھر کی دیوار کے سامنے کھڑا ہو کر کپڑے جھاڑتے ہوئے خود کو اگلے پل صراط کے لیے تیار کرنے لگا۔ سالہا سال کی پریکٹس کی بدولت وہ بڑی آسانی سے دیوار پھلانگ کر ہلکے سے دھماکے سے اندر جا گرا۔

"کون؟" ارم کی خمار آلود آواز سناٹے میں گونجی تھی۔

"میاؤں' میاؤں۔" وہ بلی کی آواز نکالتا ابا کے اٹھ جانے کے ڈر سے ادھر ہی دبک گیا۔ "ہش ہش ہش" بلی بھگانے کی زبانی کلامی کوشش کے ساتھ ہی ارم نے سمت کا اندازہ کرتے جوتا بھی دے مارا۔ اس نے غوطہ لگا کر بچنے کی لاکھ کوشش کی مگر موٹے سول والی جوتی اس کا مزاج پوچھ گئی۔ ارم کروٹ بدل کر پھر سے سو چکی تھی۔

وہ آہستہ سے اٹھا اس کی پشت کو مکا دکھاتے ہوئے طویل سانس خارج کرتے چارپائی پر ڈھے گیا اور اپنا بازو سہلانے لگا' دن بھر کی تھکن اس کے روم روم میں سمائی تھی۔ آج اس کا رزلٹ تھا اور جیسا پیپر اس نے

دیا تھا اس کا نتیجہ وہ پہلے سے جانتا تھا' اس لیے ابا کی ممکنہ عزت افزائی کے ڈر سے وہ صبح کا بھاگا اب آدھی رات کو سب کے سونے کا اطمینان کرتے ہی لوٹا تھا۔

اس کا ذہن غنودگی کی زد میں آنے ہی لگا تھا کہ باتھ روم کا دروازہ کھلنے کی چرچراہٹ نے سناٹے کو چیرا۔ قدموں کی چاپ اس کے آس پاس آکر تھم گئی' وہ ابھی صورت حال سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ اچانک لائٹ آجانے سے سارا صحن روشنی میں نہا گیا' اس کے سر پر کھڑے ابا کے جمائی لیتے اور اس کے انگڑائی لیتے ہاتھ ایک دوسرے کو دیکھ کر وہیں کے وہیں تھم گئے۔ اب فرار کی ہر کوشش بے کار تھی۔ وہ جل تو جلال تو کا ورد کرتا اٹھ بیٹھا۔

"آگئے برخوردار! آدھی رات کے اندھیرے میں گھر کا راستہ تلاش کرنے میں مشکل تو پیش نہیں آئی؟" اسے دیکھتے ہی ابا نے طنز کا تیر پھینکا۔

"وہ ابا! وہ..... میں تو عشاء کے بعد ہی گھر آگیا تھا' نیند آرہی تھی اس لیے آپ کے آنے سے پہلے ہی سو گیا تھا۔" اس نے جلدی سے بہانہ گھڑا۔

"اچھا' اچھا' تو تم اتنی دیر سے میرے پہلو میں سوئے تھے اور مجھے خبر تک نہ ہوئی' برخوردار! تم نے سلیمانی ٹوپی پہن رکھی تھی یا میری بینائی کے ساتھ ساتھ حواس خمسہ بھی جواب دے چکے تھے؟"

اس نے چور نظروں سے اردگرد نظر دوڑائی تو ڈوب مرنے کو جی چاہا' وہ جلدی میں ابا کی چارپائی پر آکر لیٹ گیا تھا۔ اب کوئی بھی بہانا گھڑنا بے کار تھا۔ وہ طویل سانس لے کر خود کو ابا کی کھری کھوٹی سننے کے لیے تیار کرنے لگا۔ انہوں نے آج تک اس سمیت اپنی کسی اولاد پر کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا تھا مگر لفظی چھترول کرنے میں ماہر تھے اور اپنی اس مہارت کا خوب فائدہ بھی اٹھاتے تھے' اس پر تو آج یوں بھی دوہری فرد جرم عائد ہوتی تھی' سو ابا اسے نیل و نیل کرنے میں حق بجانب تھے۔

"اگر گھر آنے سے پہلے اطلاع کر دیتے تو میں بینڈ باجے سمیت گلی کے نکڑ پر آکر تمہارا استقبال کرتا' گلے میں پھولوں کے ہار ڈالتا' آخر کو میرے بیٹے نے اتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ بھلا بی اے کی انگلش میں دوسری بار سپلی لانا کوئی آسان تھوڑی ہے۔ کیوں برخوردار! ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں؛ کتنا کڑی محنت کرنا پڑی ہوگی تمہیں' نہ دن کی گرمی دیکھنا نہ رات کی سردی کو خاطر میں لانا' بس چوبیس گھنٹے اپنے آوارہ دوستوں کے ساتھ آوارہ گردی کرنا' سڑکیں ناپنا بھی بڑا دل گردے کا کام ہے۔ یہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی مگر شاباش ہے تم پر' بڑی ذمہ داری سے تم نے یہ کام انجام دیا' بھئی اپنے باپ دادا کا نام روشن کرنا تو کوئی تم سے سیکھے برخوردار! تم جیسا "گوہر نایاب" تو نہ ہمارے خاندان کی پچھلی سات پشتوں میں پیدا ہوا تھا اور نہ اگلی سات نسلوں میں پیدا ہوگا۔" ابا کی زبان کسی طور رکنے میں نہیں آرہی تھی اور اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

"خدا کے لیے اب چپ بھی کیجئے' رات کا وقت ہے۔ آپ کی آواز سات گھروں میں صاف سنائی دے رہی ہوگی۔ کیوں جگ ہنسائی کروانا چاہتے ہیں آپ۔" شور سن کر اماں بھی جمائیاں لیتی اٹھ بیٹھی تھیں۔

"مزید کسی جگ ہنسائی کی کسر چھوڑی ہے تمہارے لاڈلے نے' انگلش میں دوسری بار سپلی لاکر میری تو ناک ہی کٹوادی ہے۔ ہانیہ بیٹی بھی تو ہے' اس کا رزلٹ بھی آج آیا ہے۔ ایم اے انگلش میں پورے ڈپارٹمنٹ میں ٹاپ کیا ہے۔ کسی زمانے میں اسی نالائق کی کلاس فیلو ہوتی تھی۔ اب اس نے اپنی پڑھائی مکمل بھی کرلی ہے اور یہ..... ابھی تک وہیں کا وہیں لٹکا ہے۔"

وہ تاسف سے دیکھ کر سر جھٹکتے ہوئے اب ہانیہ کی تعریف میں رطب اللسان تھے جبکہ دانش کا بس نہیں چل رہا تھا کہ جاکر ہانیہ کے رزلٹ کارڈ کو آگ لگادے' یہ ہانیہ ہی تھی جس کی وجہ سے ابا اسے پڑھائی چھوڑنے نہیں دے رہے تھے اور چاہتے تھے وہ ہر حال میں اپنا بی اے مکمل کرے۔

"دانش اگر نہیں پڑھنا چاہتا تو آپ کیوں پیچھے پڑے ہیں؟ اپنے ساتھ کاروبار میں لگا لیجیے۔ ارے یہ کوئی "تنویر فاطمہ" ہے جس کا بی اے کرنا ضروری ہے۔" ڈراموں کی شوقین اماں نے مثال دی بھی تو کس کی۔

"ہاں۔ ضروری ہے' اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔" ان کے ہاتھ سے پانی کا گلاس پکڑتے ہوئے ابا کی آواز پھر سے بلند ہوگئی تھی۔ وہ اپنی توپوں کا رخ پھر سے دانش کی طرف کرتے ہوئے بولے۔

"کان کھول کر سن لو برخوردار! اب کی بار تمہارے پاس آخری موقع ہے اگر اس بار بھی پاس نہ ہوئے تو ساری زندگی مجھے شکل نہ دکھانا' جہاں جی چاہے دفع ہوجانا۔"

وہ جو اس امید پر ابا کی بے بھاؤ کی سن رہا تھا کہ آج کے بعد پڑھائی کا سلسلہ ہی ختم ہوجائے گا پھر سے پیپر دینے کی بات سن کر سر پکڑ کر رہ گیا۔

"اور ہاں' میں نے ہانیہ سے بات کرلی ہے' کل سے وہ تمہیں پڑھائے گی۔" ابا کی اگلی بات سن کر تو اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہوگئے۔

"مگر ابا؟" اس نے احتجاج کرنے کی کوشش کی۔

"اگر مگر کچھ نہیں' خبردار جو ناغہ کیا یا سستی دکھائی' میں خود تمہیں چھوڑ کر آیا کروں گا۔"

"ہاں۔ میں جیسے بچہ ہوں نا۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے اپنی چارپائی پر دراز ہوگیا مارے جھنجلاہٹ کے نیند بھی تو نہیں آرہی تھی۔

"آپ کیوں ضد کرتے ہیں جی' اگر دانش نہیں پڑھنا چاہتا تو مت زبردستی کیجیے۔"

کچھ دیر بعد اسے اماں کی دھیمی آواز سنائی دی جو ابا کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے بعد انہیں سمجھا رہی تھیں۔

"نیک بخت! تم خود ہی انصاف کرو۔ اپنے بھائی سے اس بی اے فیل بیٹے کے لیے ہانیہ جیسی اعلا تعلیم یافتہ لڑکی کا رشتہ کس منہ سے مانگوں گا' اور کچھ نہیں تو کم از کم دانش بی اے پاس تو ہو' دوسرا سال ہے۔ بی اے کی انگلش میں لٹکا ہوا ہے۔" جواباً ابا بڑی فراست سے اپنا موقف انہیں سمجھاتے ہوئے قائل کرنے لگے۔

"بی اے دی انگلش تے چاچے دی دھی' سر پئے ویندن" (بی اے کی انگلش اور چاچا کی بیٹی مصیبت کی طرح سر پڑجاتی ہیں) دانش کو اس وقت اپنے کالج میں مقبول عام یہ کہاوت حرف بہ حرف سچ محسوس ہو رہی تھی۔

"بی اے کی انگلش سے تو چلو جیسے تیسے نمٹا جاسکتا ہے مگر ہانیہ جیسی خود پسند لڑکی! انہیں کبھی نہیں۔" دل ہی دل میں عزم باندھتے ہوئے اس نے جوش میں مکا لہرایا جو سیدھا پاس لیٹے دانیال کی کمر میں جا لگا' اس سے پہلے کہ اس کی چیخ بلند ہوتی۔ وہ جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے تھپکتے ہوئے اپنی قسمت کو کوسنے لگا۔

☆ ☆ ☆

"اوہ آ۔ یار دانش کدھر رہ گیا تھا' بڑی راہ دکھائی آج تو....." وہ بارہ بجے محمود کے نیٹ کیفے پہنچا تو سارا ٹولہ پہلے سے وہاں پر اجمان تھا' خاور نے اسے دیکھتے ہی ہانک لگائی۔

"بس یار! رات کو ذرا نیند اچھے سے نہیں آئی تھی۔ اس لیے صبح دیر تک سوتا رہا۔" وہ بھرپور انگڑائی لیتے ہوئے سستی سے کرسی پر جم گیا۔

"یہ مچھروں کی کارستانی تھی یا تمہارے ابا کی۔" مہروز نے جملہ پھینکا تو سب نے زوردار قہقہہ لگا کر اس کا ساتھ دیا۔

"یار! بڑا افسوس ہوا تیرے فیل ہونے کا سن کر۔ خیر مٹی ڈالو' اب گریجویشن کرنا ہر کسی کے بس کی بات تھوڑی نا ہوتی ہے۔" بظاہر ہمدردی سے اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے مہروز نے اس کا تمسخر اڑایا۔

"اسی لیے تو ایف اے سے آگے بڑھ نہیں پائے۔" دانش بھی ادھار رکھنے والوں میں سے نہیں تھا۔ مہوز پہلو بدل کر رہ گیا۔ "اور جہاں تک بات ہے پاس ہونے کی' میں نے آج تک اسے سیریس لیا ہی نہیں ورنہ انگلش کلیئر کرنا کون سا مشکل ہے' بس ذرا سی محنت ہی تو کرنا پڑے گی۔"

مہوز' دانش کی اس کمال درجہ بے نیازی پر سُلگ کر رہ گیا۔ دانش کے خلوص کی وجہ سے سارے دوست اس پر جان چھڑکتے تھے جبکہ مہوز کو اپنی امیری کا بڑا زعم تھا مگر وہ کتنا اعلا ہی کیوں نہ پہن لیتا' صاف گندمی رنگت' متناسب نقوش اور لمبے قد کے حامل دانش کے سامنے اس کی پرسنالٹی ڈاؤن ہو جاتی تھی' یہی وجہ تھی کہ وہ اس سے خار کھاتا تھا اور جہاں بھی موقع ملتا اسے نیچا دکھانے سے نہیں چوکتا تھا۔

"اچھا اگر ایسی ہی بات ہے تو پھر تم کیوں نہیں ذرا سی محنت کر لیتے' پھر کیا خیال ہے لگی شرط" مہوز نے فوراً" ہاتھ آگے بڑھایا۔

"ارے ارے۔ ڈرو مت۔ کچھ زیادہ کی بیٹ نہیں بس جو ہار گیا وہ جیتنے والے کو ہمیشہ "باس" کہہ کر بلائے گا۔" اسے ہچکچاتے دیکھ کر مہوز بولا۔

محمود اور خاور کے ساتھ ساتھ ارد گرد بیٹھے لوگ بھی انہیں دیکھ رہے تھے تو ایسے میں مہوز کا بڑھا ہاتھ نہ تھامنا بزدلی کی علامت تھی۔ سو اس نے بھی بغیر سوچے مہوز کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا۔

اوکے دوستو! تم سب گواہ رہنا اس بار اگر اے گریڈ کے ساتھ دانش پاس ہو گیا تو وہ شرط جیت جائے گا ورنہ......"

اس کے ہاتھ کو زور سے بھینچتے ہوئے مہوز نے بآواز بلند اعلان کیا اور ساتھ ہی اے گریڈ کی بیخ بھی لگا دی حالانکہ شرط کی بات کرتے وقت ایسا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ دانش خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا کیونکہ اب پیچھے ہٹنا مردانگی کے خلاف تھا۔ مہوز کے ہاتھ کو اس سے بھی دگنی مضبوطی سے مروڑ کر چیلنج قبول کرتا ہوا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

یار! کچھ دیر تو بیٹھتے' ابھی آئے تھے اور ابھی سے چل دیے۔" اسے جانے کو تیار دیکھ کر محمود بولا۔

"جانے دو یار! بے چارے کو ایسے تیاری کے لیے بھی تو کچھ وقت چاہیے ہو گا۔" اپنا ہاتھ میز کے نیچے چھپا کر سہلاتے ہوئے بھی مہوز باز نہیں آیا۔

"کیوں نہیں۔ وقت تو واقعی چاہیے۔" لاپروائی سے کندھے اچکا کر دل جلانے والی مسکراہٹ اس کی طرف اچھالتا وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر چلا گیا۔ مہوز کی کینہ توز نظروں نے آخر تک اس کا پیچھا کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

دانش جوش میں آکر شرط تو لگا بیٹھا تھا مگر اب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کرے تو کیا کرے۔ مہوز سے شرط ہارنے کا مطلب ساری زندگی اس کے ہاتھوں ذلیل ہونا تھا جو اسے کسی صورت منظور نہیں تھا۔ پاس تو خیر آسانی سے ہوا جا سکتا تھا مگر اے گریڈ لانا...... یہیں آکر اس کی سوئی اٹک جاتی تھی۔

"لگتا ہے' ہانیہ بی بی سے ٹیوشن لینا ہی پڑے گی۔" راستہ میں پڑی بوتل کو ٹھوکر سے اڑاتے ہوئے اس نے خود کو قائل کرنا چاہا تھا' گلی میں داخل ہو کر اپنے گھر کے دروازے پر وہ لمحہ بھر کو رکا پھر کچھ سوچ کر ساتھ والے دروازے پر دستک دے دی۔

ان کا خاندان بہت مختصر سا تھا۔ سارے قریبی رشتہ دار اسی ایک گلی میں مقیم تھے۔ سب سے پہلا گھر دانش کے چچا عبدالرحمٰن کا تھا جن کی صرف ایک بیٹی ہانیہ تھی' درمیان والے گھر میں عبداللہ صاحب اپنے تین بچوں دانش' دانیال اور ارم کے ساتھ رہائش پذیر تھے' جبکہ ان کے برابر والا تیسرا ان کے چچا زاد بھائی عبدالرزاق کا تھا جن کے دو بچے نمل اور ٹیپو تھے۔

"واہ بھئی' آج تو بڑے بڑے لوگ راستہ بھول پڑے۔" دروازہ کھولنے والی نمل تھی۔

سلام دعا کے بعد وہ اس کے ہمراہ اندر چلا آیا۔ صفیہ چچی برآمدے میں لیٹی تھیں' اسے دیکھ کر اٹھ بیٹھیں۔

صدقے جاؤں۔ میرا بیٹا آیا ہے' نمل! تم ابھی تک یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو۔ جاؤ' جا کر بادام کا شربت بنا لاؤ۔ دیکھ نہیں رہیں بچہ اتنی گرمی سے آیا ہے۔"

انتہائی گرم جوشی سے اس کا استقبال کرتے ہوئے انہوں نے نمل کو ہدایت جاری کی اور اپنے قریب تخت سے چائے کے برتن اور کپڑوں کے شاپر ہٹا کر اس کے لیے جگہ بنانے لگیں۔ یہ صفیہ چچی کا پیار ہی تھا جو وہ یہاں کھنچا چلا آتا تھا ورنہ گھر میں اماں کو اتنی فرصت کہاں تھی جو وہ یوں پیار جتاتیں ______

اسی وجہ سے اسے صفیہ چچی کے پاس آنا اچھا لگتا تھا' وہ اسے کسی وی آئی پی کی طرح اہمیت دیتی تھیں ورنہ بچپن میں یہی صفیہ چچی تھیں جو گلی میں ذرا سا شور کرنے پر وہ ہنگامہ کھڑا کرتیں کہ اللہ اماں' سب بچے ان کے سائے سے دور بھاگتے تھے۔

"ویسے کل خیر تو تھی؟ رات گئے تایا ابا کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔" چچی کسی کام سے اندر گئیں تو نمل نے کرسی لے کر اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اچانک پوچھا' اسے شربت پیتے پیتے اچھو لگ گیا۔

"ہاں' وہ دراصل ان کے پیٹ میں درد تھا۔" وہ فوراً" یہی بہانہ گھڑ سکا تھا۔

"مگر وہ تو آپ پر چلا رہے تھے۔" نمل نے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے معصومیت کی انتہا کر دی۔

"دراصل ان کی دوائی مجھ سے گر کر ٹوٹ گئی تھی۔" وہ بے چارگی سے مسکرایا۔

"اچھا...... میں شام کو آؤں گی ان کی طبیعت پوچھنے۔" اچھا کو ضرورت سے زیادہ لمبا کھینچا گیا (ضرور دیوار سے کان لگا کر سب کچھ سن چکی ہے چالاک ماسی)

"نہیں نہیں۔ اب وہ بالکل ٹھیک ہیں' تمہیں تکلیف کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" وہ کٹیلی نظر اس پر ڈال کر جلدی سے بولا' مبادا شام کو آ ہی نہ جائے۔ جبکہ وہ اس کے یوں دیکھنے کو کچھ اور سمجھتے ہوئے آنکھیں جھکا کر ایک ادا سے مسکرانے لگی۔

وہ اندر تک کوفت سے بھر گیا' نجانے بیٹھے بٹھائے نمل کو یہ کیا ہونے لگتا تھا۔ اس کی اوور ایکٹنگ اسے بے زار کر دیتی تھی۔ وہ ساری توجہ ہاتھ میں پکڑے گلاس پر مرکوز کر کے شرط کے بارے میں سوچنے لگا۔

"سنا ہے' بھائی صاحب نے تمہیں پڑھانے کے لیے ہانیہ سے کہا ہے؟" وہ اٹھنے کا ارادہ کرنے ہی لگا تھا جب چچی اندر سے چلی آئیں۔ اس نے شربت کا خالی گلاس جس کی تہہ میں ڈھیروں چینی بغیر گھلے پڑی تھی' نمل کو پکڑاتے ہوئے کڑے تیوروں سے اسے گھورا (ضرور اس بندریا نے ہی چچی کو رپورٹ دی ہو گی)

"مجھے نمل نے نہیں بتایا' وہ تو سبزی خریدتے وقت بھابھی نے ذکر کیا تھا۔" اس کی نظروں کا مفہوم سمجھتے ہوئے انہوں نے جلدی سے وضاحت کی۔

"ویسے بیٹا! مجھے حق تو نہیں مگر چونکہ تمہیں بیٹا سمجھتی ہوں' اس لیے اس ناتے سے سمجھا رہی ہوں۔ تم ذرا بچ کے رہنا۔ ہانیہ بڑی تیز لڑکی ہے' اوپر سے یونیورسٹی کی ہوا بھی کھا چکی ہے۔ تم بڑے بھولے ہو' ہوشیار رہنا۔"

اسے بدستور خاموش دیکھ کر وہ اسے سمجھانے لگیں جب کہ خود کو بھولا کہے جانے پر دانش دل ہی دل میں ہنس دیا۔

"ہانیہ کے مزاج تو پہلے ہی نہیں ملتے تھے۔ ٹاپ کرنے کے بعد تو خود کو بڑی اونچی شے سمجھنے لگی ہے' نجانے آپ سے کیا سلوک کرتی ہے' سیدھے منہ بات بھی کرے گی یا نہیں۔" نمل بولی۔

"ہانیہ" صفیہ چچی اور نمل دونوں کا پسندیدہ موضوع تھا' اکثر اس کے سامنے ہانیہ کا ذکر چھیڑے رہتیں' ان ہی کی بدولت وہ جان پایا تھا کہ ہانی بہت مغرور' اکڑو' بدتمیز اور بدسلیقہ لڑکی ہے جسے چھوٹے بڑے کی کوئی تمیز نہیں اور اپنی ڈگریوں پر اترانے کے سوا کوئی

کام نہیں' اسی لیے وہ اس کے نام سے چڑتا تھا۔ وہ بہت کم اس کے ہاں جاتا تھا۔ چاچو اور چاچی خود ہی اکثر شام کو چکر لگا لیتے تھے۔ ہانیہ سے سرسری ملاقات کی نوبت بھی مہینوں بعد آتی تھی اس لیے وہ ذاتی طور پر اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا۔

"اوہو! میں تو بھول ہی گیا' اماں نے بازار سے سودا لانے کو کہا تھا۔ اچھا چچی! میں چلتا ہوں' ان کے "ہانیہ نامے" سے بے زار ہو کر وہ جلد ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ صفیہ چچی کھانے پر رکنے کا کہتی ہی رہ گئیں مگر وہ بھاگ کھڑا ہوا۔

☼ ☼ ☼

"ماشاء اللہ..... اللہ نظر بد سے بچائے' سال میں پہلی بار کتابیں اٹھائے میرا ویر بالکل شہزادہ لگ رہا ہے۔"

دانش کتابیں اٹھائے باہر نکلا تو ارم نے اس کی بلائیں لے ڈالیں۔

"مگر میری تو اتنے سالوں سے حسرت ہی رہی' اپنی بہن کو کبھی کتابیں اٹھائے دیکھوں۔"

وہ بھلا کہاں چوکنے والا تھا' اس کے سر پر چپت لگا کر بولا تو وہ پاؤں پٹخ کر اندر چلی گئی۔ وہ مسکراتا ہوا ہانیہ کے گھر کی طرف بڑھ گیا مگر دروازے کے سامنے پہنچ کر اس کے قدموں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔

"نجانے کتنا مذاق اڑائے گی ہانیہ؟ رویہ کیسا ہو گا اس کا؟" یہ وہ سوال تھے جو پچھلے ایک ہفتے سے اس کے قدم روک لیتے تھے۔ کل تو ابا بھی اس کے نہ جانے پر ناراض ہو رہے تھے مگر اسے ابا کی ناراضی کی اتنی پروا نہیں تھی' سارا مسئلہ شرط کا تھا اگر شرط کا معاملہ نہ ہوتا تو وہ مر کر بھی ہانیہ کے پاس پڑھنے نہ جاتا۔ بہرحال جو بھی تھا مگر مہوز سے شرط ہارنے سے زیادہ برا نہیں تھا یہی سوچ کر آج وہ ہمت کر کے اندر چلا گیا۔

پورے گھر میں پرسکون خاموشی بکھری تھی۔ سرخ اینٹوں والے صحن میں ترتیب سے تین چارپائیاں بچھی تھیں۔ اس نے لمبا سانس لے کر فضا میں رچی موتیا اور گیلی اینٹوں کی خوشبو کو اپنے اندر اتارا۔ قدرتی خوشبو ہمیشہ سے اس کی کمزوری تھی۔ چچی اماں ہار سنگھار کے پیڑ کے قریب تخت پر بیٹھی تسبیح کرنے میں مصروف تھیں۔ وہ انہیں سلام کر کے چارپائی پر آ بیٹھا اور ناقدانہ نظروں سے اردگرد کا جائزہ لینے لگا۔ گھر میں داخل ہونے والے کو جو چیز سب سے پہلے متاثر کرتی تھی' وہ بلاشبہ ہر چیز سے جھلکتا سلیقہ ہی تھا۔ برآمدے کے کونے میں بنے کچن سے کھٹ پٹ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں' ہانیہ شاید ادھر ہی تھی۔

"ثمل سچ کہتی ہے لگتا ہے بڑی اکڑو ہے ہانیہ بی بی۔ کھڑکی سے مجھے آتا دیکھ تو چکی ہو گی مگر ابھی تک آنا گوارا نہیں کیا اگر ایسی ہی اکڑ ہے تو میں ابا کو صاف جواب دے دوں گا۔ شہر میں کوچنگ سینٹر بہت ہیں۔"

کاپی پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچتے ہوئے وہ بے زاری سے سوچے جا رہا تھا جب سلام کی مترنم آواز۔ اس کے کانوں میں پڑی۔ وہ چونک کر سیدھا ہوا۔ سامنے ہی ہانیہ سلیقے سے دوپٹہ اوڑھے چائے کی ٹرے تھامے کھڑی تھی۔

"معذرت خواہ ہوں' مجھے آنے میں ذرا دیر ہو گئی۔" متانت سے کہتے ہوئے اس نے ٹرے دانش کے سامنے رکھ دی۔ چائے کے ساتھ پکوڑے' نمکو' بسکٹ اور کافی کچھ تھا' شاید یہ انتظام کرنے میں دیر ہو گئی ہو گی وہ اپنی پچھلی سوچ پر نادم ہو گیا۔

"اتنا تکلف کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"تم اتنے عرصہ بعد آئے ہو' اتنا تکلف تو بنتا ہے نا! مگر تم بغیر کسی تکلف کے ہر چیز سے انصاف کرو۔ میں اماں کو چائے دے کر آتی ہوں۔"

دانش نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اس کے سادہ لہجے میں بناوٹ کا شائبہ تک نہیں تھا۔ اماں کو چائے دے کر وہ دوسری چارپائی پر آ بیٹھی اور چائے کے دوران دانش سے ادھر ادھر کی چھوٹی چھوٹی باتیں کرتی رہی۔

"تو پھر کیا خیال ہے۔ پہلے اینتھالوجی پڑھیں' سلیکشن یا پھر پوئٹری سے آغاز کریں۔" چائے کے برتن سمیٹنے کے بعد وہ تکیہ گود میں رکھے اس سے پوچھنے لگی۔

"میرا خیال ہے' پوئٹری بہتر رہے گی۔" کتابیں کھولتے ہوئے اسے ڈر ہوا کہ ہانیہ یہ نہ پوچھ لے کہ پہلے کیا کچھ پڑھ رکھا ہے۔ اس نے تو کتابیں ہی آج پہلی بار کھولی تھیں مگر ہانیہ نے ایسا کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

"ٹھیک ہے' مگر شاعری پڑھنے سے پہلے ذرا ان شاعروں کو ڈسکس کر لیتے ہیں' اس طرح ان کی شاعری سمجھنے میں آسانی رہے گی۔"

وہ کتاب ہاتھ میں لیتے ہوئے بولی تو دانش بھی ہمہ تن گوش ہو گیا۔

"اگر ہم شیلے کی بات کریں تو وہ ایک غنائیہ شاعر ہے کسی حد تک ملحد بھی "سب سے محبت کیجیے' نفرت کسی سے نہیں" وہ یہ پیغام اپنی شاعری کے ذریعے پھیلانا چاہتا ہے۔ پھر اس کے بعد کیٹس ہے جو رومانوی شاعر ہے اور خوب صورتی کا اس حد تک دل دادہ ہے کہ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کا کوئی مذہب نہیں سوائے حسن کے۔"

وہ اب کولرج کا تعارف کرا رہی تھی جبکہ دانش سفید دوپٹے کے ہالے میں اس کے سادہ مگر بااعتماد روپ کو حیرت سے دیکھے جا رہا تھا۔ یہ ہانیہ اس شبیہہ کے بالکل برعکس تھی جو صفیہ چچی اور ثمل کی باتوں کی روشنی میں اس نے اپنے ذہن میں تراش رکھی تھی۔ وہ ابھی تک اسی مخمصے میں تھا کہ ہانیہ کی آنکھوں دیکھی حقیقت سچ ہے یا کانوں سنی؟

☼ ☼ ☼

ہانیہ کے پڑھانے کا انداز بہت دلچسپ تھا' بہت جلد دانش کو بھی مزہ آنے لگا تھا۔ وہ نہ اپنی قابلیت کا رعب جھاڑتی اور نہ ہی استاد اور شاگرد والا تکلف روا رکھتی تھی۔ کچھ بھی پڑھانے کے بعد پہلے مصنف کی ذات اور پھر اس کے پیش کردہ خیالات کو اس کے ساتھ تفصیل سے ڈسکس کرتی۔ انداز یوں ہوتا تھا جیسے پروفیسر کے جانے کے بعد دو کلاس فیلوز آپس میں اوپن ڈسکشن کر رہے ہوں۔ اکثر دونوں میں کسی نہ کسی نقطہ پر اختلاف ہو جاتا تھا مگر وہ اپنا نقطہ نظر تھوپنے کے بجائے دلائل دے کر قائل کرتی تھی۔ اسے بھی اس کے دلائل دینے کا پورا پورا موقع دیتی تھی۔ اکثر شام میں چاچو بھی ان کے ساتھ مل جاتے تھے پھر بات رسل سے شروع ہوتی اور بین الاقوامی تعلقات سے ہوتی ہوئی آئندہ انتخابات پر جا کر ختم ہوتی۔

چاچو دانش کی معلومات' باریک بینی اور تجزیانہ صلاحیتوں سے متاثر تھے۔ وہ اس کا کریڈٹ اماں کو دیتا تھا جو اخبارات و رسائل کی از حد شوقین تھیں اور پڑھنا نہ جاننے کے سبب ہمیشہ اس سے پڑھوا کر سنتی تھیں۔ ارم اور دانیال تو ہاتھ ہی نہیں آتے تھے۔ اوپر سے ابا آتے ہی ٹی وی صحن میں سیٹ کر لیتے۔ مجال تھا جو کوئی ٹاک شو دیکھنے سے رہ جاتا' ایسے میں اس کی معلومات اپ ٹو ڈیٹ ہونا تعجب کی بات نہیں تھی۔ ہانیہ تو کئی بار اسے لکھنے کا مشورہ دے چکی تھی جسے وہ "کیوں مذاق کرتی ہو" کہہ کر ٹال جاتا تھا۔

☼ ☼ ☼

ہانیہ عصر کے بعد سے دانش کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ گھنٹہ ہونے کو آیا تھا مگر اس کے آنے کے آثار نہیں لگ رہے تھے۔ اسے پڑھتے ہوئے دو ماہ ہونے کو آئے تھے مگر اس نے ایک دن بھی ناغہ نہیں کیا تھا۔ شاید آج اس کا چھٹی کا ارادہ ہو' یہ سوچ کر وہ رات کے لیے چھوڑے چھوٹے چھوٹے کام نپٹانے لگی۔ ابا کے کپڑوں کے ساتھ ساتھ اپنا گاؤن اور اسکارف بھی دھو کر الگنی پر ڈال دیا اور پائپ لگا کر صحن میں چھڑکاؤ کرنے لگی۔ صحن کچھ اس رخ پر تھا کہ عصر کے فوراً بعد دھوپ غائب ہو جاتی تھی۔ سردیوں میں تو بڑی تکلیف ہوتی تھی مگر گرمیوں میں مزے ہو جاتے تھے۔ پانی کی موٹی دھار جیسے ہی جلتی بلتی زمین پر پڑی' تپش باہر نکلنے لگی۔ اچھی طرح چھڑکاؤ کرنے اور کیاریوں کو پانی دینے کے بعد وہ بھی اچھی خاصی بھیگ گئی تھی۔ اس لیے چارپائیاں بچھانے کا کام کچھ دیر بعد پر چھوڑ کر نہانے چلی گئی۔



"چچی اماں! ہانی کہاں ہے؟" دانش آم کی پیٹی کچن میں رکھنے کے بعد چچی کے کمرے میں چلا آیا' ہانیہ کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔

"وہ ابھی ابھی نہانے گئی ہے۔ تم بیٹھو' آتی ہی ہو گی۔"

الماری کی صفائی کرتے ہوئے انہوں نے بڑے مصروف سے انداز میں جواب دیا۔ وہ باہر آکر تخت پر دراز ہو گیا۔ پنکھے کی ٹھنڈی ہوا اسے تھپکنے لگی دن بھر کی تھکن پلکوں پر آٹھہری۔ ہانیہ اس کی آمد سے بے خبر لاپروائی سے گیلے بالوں کو سلجھاتی باہر آئی تو کنگھے کے جھٹکے سے گیلے بالوں سے کتنے ہی پانی کے قطرے نکل کر دانش کے چہرے پر جا پڑے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

ہانیہ بھی گڑبڑا کر اسے دیکھنے لگی۔ اس کی قدرے سہمی بڑی بڑی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دانش کو اپنا آپ کھوتا محسوس ہوا۔ اس نے جلدی سے نظریں جھکا لیں۔ سرعت سے سر پر دوپٹہ ڈال کر ہانیہ بھی خود کو کمپوز کرنے لگی۔

"خیریت تو تھی۔ آج بہت دیر کر دی؟" خاموشی کے غیر معمولی وقفہ سے گھبرا کر ہانیہ نے پہل کی۔

"دانیال بہت ضد کر رہا تھا۔ محمود اور خاور بھی کئی دنوں سے کہہ رہے تھے اس لیے آج ان کے ہمراہ باغ چلا گیا تھا' سارا دن ادھر ہی گزارا۔ ابھی کچھ دیر پہلے واپسی ہوئی ہے۔ اماں نے آم کی پیٹی بھجوائی تھی میں نے کچن میں رکھ دی ہے۔ تم کھول لینا۔" خود پر قابو پاتے ہوئے وہ اسے تفصیل بتانے لگا۔

"یاد ہے بچپن میں جب تایا ابا ہمیں لے کر جاتے تھے تو کتنا مزہ آتا تھا۔ واپسی کے وقت ہم سب چھپ جاتے تھے تاکہ گھر واپس نہ جانا پڑے تایا ابا ہمیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تنگ آجاتے تھے اور آئندہ لے جانے سے توبہ کر لیتے تھے مگر اگلی چھٹی پر ہم پھر ان کے سر ہو جاتے تھے۔ وہ بھی کیا دن تھے۔"

خوب صورت بچپن کی یاد روشنی بن کر اس کے چہرے پر چمکنے لگی' دانش بھی ان دنوں کو یاد کر کے مسکرانے لگا۔

"پتا ہے آج عابد ولت کی ملاقات ایک سانپ سے ہوئی تھی۔" اچانک کچھ یاد آنے پر وہ مزے لے لے کر اسے بتانے لگا۔

"پھر کیا ہوا؟" وہ دہل کر بولی۔ وحشت اس کے چہرے سے مترشح تھی کہ اسے سانپوں سے بہت ڈر لگتا تھا۔ اس لیے تو اس نے باغ جانا بھی چھوڑ دیا تھا کہ اس علاقے میں بہت سانپ ہوتے تھے۔

"ارے ہونا کیا تھا۔" وہ ڈرامائی انداز میں گویا ہوا۔ "سانپ نے مجھے گھورا' میں نے سانپ کو گھورا' ذرا غور کیا تو دیکھا سانپ بے چارے کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ مجھے ترس آگیا' اس لیے راستہ چھوڑ کر ایک طرف ہو گیا۔"

دانش پوری سنجیدگی سے بتا رہا تھا جبکہ ہانیہ ہنس ہنس کر دوہری ہوئی جا رہی تھی۔ گلابی دوپٹے کے ہالے میں بے تحاشا ہنستے ہوئے وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ دانش بس اسے دیکھے گیا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟" ہانی کے پوچھنے پر اس نے یوں کندھے اچکائے جیسے کہہ رہا ہو "میں بے بس ہوں۔"

"چائے ملے گی؟" اپنی نظروں کو بمشکل کنٹرول کرتے ہوئے اس نے سامنے رکھی کتاب پر نظریں جما دیں۔

"اوہ ضرور' میں ابھی لاتی ہوں۔" وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ساتھ میں کچھ کھانے کو بھی لانا۔" اس نے پیچھے سے آواز لگائی۔ ان دو ماہ میں وہ ہانی سے بہت بے تکلف ہو گیا تھا باوجود کوشش کے بھی وہ صفیہ چچی کے بتائے گئے اوصاف کا شائبہ تک اس میں پانے میں ناکام رہا تھا تب سے نجانے کیوں اس نے ان کے ہاں جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔

"تم حجاب کب سے لینے لگیں؟" الگنی پر لٹکے گاؤن سے گرتے پانی کے قطرے گنتے ہوئے وہ اس سے پوچھنے لگا جہاں تک اسے یاد پڑتا تھا' ہانیہ سمیت گھر کی سب خواتین چادر لیتی تھیں۔

"جب سے یونیورسٹی جانا شروع کیا۔" اس نے فریج سے کباب نکال کر دوسرے چولہے پر تلنے کے لیے رکھ دیے۔

"کیوں کیا تم لڑکیوں کی مقبول عام دلیل "حیا تو آنکھ میں ہوتی ہے" سے متفق نہیں۔"

"بالکل متفق ہوں مگر حیا ہماری آنکھ میں ہوتی ہے، لازمی نہیں کہ ہمیں دیکھنے والی آنکھ بھی حیا سے لبریز ہو ورنہ خود ہی سوچو اگر آنکھ کی حیا کافی ہوتی تو اسلام میں حیا کے ساتھ ساتھ پردے کا حکم کیوں ملتا؟"

چائے کی ٹرے دانش کے قریب رکھ کر وہ اپنی چائے لے کر کچن کے دروازے کے پاس پڑی کرسی پر جا بیٹھی ـ وہ اس کی بات سن کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

"اگر تم برا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں؟" اس کی اسائنمنٹ چیک کرتے ہوئے وہ بہت عرصے سے ذہن میں مچلتے سوال کو زبان میں لے آئی۔

"ضرور۔" سمری لکھتے اس کے ہاتھ لمحہ بھر کو ٹھٹکے اور پھر سے روانی سے چلنے لگے۔

"تمہاری قوت حافظہ اتنی اچھی ہے۔ تمہارے اسائنمنٹ بہت زبردست ہوتے ہیں۔ ٹیسٹ بھی اے ون دے رہے ہو، اس کے باوجود تم کیسے دوبارہ..... میرا مطلب ہے۔"

وہ اس کی پچھلی دو سپلیوں کے بارے میں پوچھنا چاہ رہی تھی مگر سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا کہے۔

"بات دراصل یہ ہے بانی بی بی! ابا ہمیشہ میرا مقابلہ تم سے کرتے تھے۔ انٹر میں میرے بڑ70 نمبر تھے مجھے امید تھی، ابا بہت خوش ہوں گے مگر ان کی نظر تمہارے بڑ88 پر تھی ایسے میں بھلا میرے نمبر انہیں کیسے بھاتے' بجائے تعریف کے انہوں نے خوب ڈانٹ پھٹکار کی۔ میں نے بھی ضد میں پڑھائی پر توجہ نہیں دی۔ پیپرز کے قریب جب توجہ دینی چاہی تو کالج سے ٹیچر غائب ظاہر ہے نتیجہ سپلی کی صورت آتا تھا۔ دوسری بار پیپر دینے کا میرا ارادہ نہیں تھا ابا نے زبردستی کی تو کورا کا کورا چلا گیا۔ یقین کرو، دوبار انگلش کا پیپر دینے کے باوجود مجھے تو یہ تک نہیں پتا تھا کہ سلیبس میں کتنے چیپٹر ہیں اور کتنے یونٹس کو پڑھنا ہے۔"

جب تک اس نے بات ختم کی سمری بھی ختم ہو چکی تھی۔ اس نے نوٹ بک ہانیہ کی طرف بڑھائی جو اس کی بات سن کر اپنی وجہ سے شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔

"ارے پاگل! تم کیوں گلٹی فیل کر رہی ہو، ہر والدین اپنی اولاد کو سب سے آگے دیکھنا چاہتے ہیں اگر ابا مجھے اکسانے کے لیے تمہاری مثالیں دیتے تھے تو اس میں تمہارا کیا قصور؟ میں تو اب بھی پڑھنا نہیں چاہ رہا تھا مگر برا ہو معوذ کا جس نے چالاکی سے شرط لگوا کر پھنسوا دیا۔"

"کیسی شرط؟" ہانیہ نے اچنبھے سے دریافت کیا تو اس نے ساری تفصیل بتادی۔

"تو کیا تم صرف شرط جیتنے کے لیے اتنی محنت کر رہے ہو؟" ناپسندیدگی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

"ہاں شروع شروع میں تو یہی مقصد تھا مگر اب مجھے پڑھنے میں مزہ آنے لگا ہے۔ ویسے تمہیں کیا لگتا ہے اے گریڈ آتو جائے گا ناں؟"

دانش نے اس کی طرف نہیں دیکھا تھا، اس لیے اس کے تاثرات نہیں جان پایا تھا۔

"اگر شرط جیتنے کے لیے اتنی محنت کرو گے تو اے گریڈ تو ضرور آجائے گا مگر....." وہ قدرے ہچکچائی۔

"مگر کیا؟"

"اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہوتا ہے۔ اگر شرط جیتنے کی نیت سے پڑھو گے تو گریڈ تو ضرور آجائے گا مگر شاید علم نہیں۔"

چچی کے بلانے پر وہ نوٹ بک اس کے ہاتھ میں دیتی اندر چلی گئی اور اس کے سوچنے کو بہت کچھ چھوڑ گئی۔

"آج میرا یار کیسے راستہ بھول پڑا؟" دانش آج بہت دنوں بعد محمود نے نیٹ کیفے چلا آیا۔ اسے دیکھتے ہی محمود گرم جوشی سے اس کے استقبال کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

"یار! تو تو سچ میں عید کا چاند ہو گیا ہے، پورے ایک ماہ بعد نظر آیا ہے۔ اس خوشی میں تو مٹھائی بنتی چاہیے۔" خاور نے پیچھے سے آکر اسے دھپ رسید کی تو وہ ہنستے ہوئے اس سے گلے ملنے لگا۔

"لگتا ہے۔ تم نے معوذ کی شرط کو بے حد سیریس لے لیا ہے۔ اس کی تو عادت ہے شرط بازی کرنے کی۔" محمود نے چائے کی پیالی اسے تھمائی۔

"مگر یہ بات تو ماننا پڑے گی' اس کی وجہ سے ہی مجھے احساس ہوا ہے کہ میں پڑھائی چھوڑ کر کتنی بڑی غلطی کرنے چلا تھا۔ پہلے پہل تو صرف شرط جیتنے کا محرک ہی مجھے پڑھنے پر اکساتا تھا مگر اب مجھے شرط جیتنے سے کوئی سروکار نہیں۔ مجھے صرف علم حاصل کرنا ہے۔ میں نے تو آگے بھی پڑھائی جاری رکھنے کا پورا ارادہ کر لیا ہے۔" دانش کی آنکھوں میں جاگتے عزم نے دونوں کو حیران کر دیا تھا۔

"ڈھائی ماہ میں اتنا بڑا انقلاب' دماغ تو درست ہے ناں۔" خاور نے انگلی سے اس کی کنپٹی ٹھونکی۔

"ابے ہی تو میں جا کر درست ہوا ہے۔" وہ بڑے مزے سے مسکرایا۔

"یہ اکیلے اکیلے مسکرانا۔ اچانک سے اتنا ذمہ دار بن جانا' بادشاہو! علامات تو بڑے خطرناک مرض کی ہیں۔" محمود نے آنکھیں نچائیں تو وہ قدرے گڑبڑا سا گیا۔ اپنے اندر کسی تبدیلی کا احساس تو اسے کئی دنوں سے ہو رہا تھا مگر وہ دانستہ خود سے بھی نظریں چرا جاتا تھا۔

"موبائل تو بڑا زبردست ہے' نیا لیا ہے؟" وہ بات بدلنے کو فوراً خاور کے ہاتھ سے موبائل لے کر دیکھنے لگا۔

"ہاں زیرو میٹر ہے۔ کل ہی لایا ہوں۔"

"آج ایک بڑا زبردست آئیٹم ڈاؤن لوڈ کیا ہے۔ لاؤ موبائل میں فیڈ کر دوں۔" محمود خاور کا موبائل اٹھا کر میموری کارڈ نکالنے لگا۔

دانش کو اس نے خود ہی آفر نہیں کی تھی جانتا تھا وہ ان خرافات سے کتنا چڑتا ہے۔ کیبن میں تیز میوزک کی آواز گونجی تو دانش کی غیر ارادی نظر مانیٹر کی طرف اٹھی مگر پلٹنا بھول گئی۔ اسکرین پر کوئی کالج گرل اسٹیج پر بال کھولے بری طرح تھرک رہی تھی مگر اس کی حیرانی کا باعث سائیڈ پر الگ سے اس لڑکی کی پاسپورٹ سائز تصویر تھی۔ اس تصویر میں وہ اسکارف اوڑھے کسی شریف گھرانے کی معصوم سی لڑکی لگ رہی تھی، ارم ہی کی ہم عمر ہوگی۔

یہ سوچ کر وہ لرز گیا۔

"کیا گرلز کالج کے فنکشنز کی ویڈیوز نیٹ پر دستیاب ہوتی ہیں۔" اس کے لہجہ میں انتہائی درجے کی حیرت تھی۔

"نیٹ کی جادو نگری میں کیا نہیں ہوتا میرے بھائی! ویسے گرلز کالجز، یونیورسٹیز وغیرہ کے فنکشنز کی وڈیوز آفیشلی طور پر تو نہیں ہوتیں مگر آج کل ٹیکنالوجی عام ہونے کی وجہ سے موبائل میں ریکارڈنگ کر لینا کون سا مشکل کام ہے۔ دیکھ نہیں رہے' یہ بھی موبائل ریکارڈنگ ہے' محمود نے اپنا کام کرتے ہوئے مصروف سے انداز میں جواب دیا۔

"لگتا ہے' کسی نے باقاعدہ پلاننگ سے یہ کام کیا ہے ورنہ ساتھ میں اس لڑکی کی سادہ تصویر اور نام نہ ہوتا۔" خاور دلچسپی سے ویڈیو دیکھتے ہوئے بولا۔

"نجانے اس لڑکی کا کیا بنے گا، پوری دنیا میں گردش کرتی یہ وڈیو اگر اس کے گھر والوں کے ہاتھ لگ گئی تو کیا اسے زندہ چھوڑیں گے۔" دانش کو یہ وڈیو دیکھ کر حقیقتاً بہت تاسف ہوا تھا۔

"والدین بچیوں کو کالج میں پڑھنے بھیجتے ہیں۔ یہ کام کرنے نہیں۔ یہ تو اس لڑکی کو خود سوچنا چاہیے تھا۔" محمود نے کندھے اچکائے۔

"چلو' اگر اس سے غلطی ہو بھی گئی تو اس کی اتنی بڑی سزا؟ اس لڑکی کا تو مستقبل تباہ ہو جائے گا۔ محمود یار! تو یہ وڈیو ڈیلیٹ (Delate) کر دے پلیز۔" دانش نے اس کی منت کی۔

"مگر میرے ڈیلیٹ کرنے سے کیا ہوگا' انٹرنیٹ پر تو یہ جوں کی توں موجود رہے گی اور اب تک نجانے کتنے لوگ یہ وڈیو دیکھ بھی چکے ہوں گے۔"

"مگر اسے پھیلانے میں تم تو حصہ دار نہیں بنو گے' تمہارا ضمیر تو مطمئن ہوگا۔" دانش نے اسے قائل کرنا

چاہا۔

"تم کیوں اتنا پریشان ہو رہے ہو' تمہاری کون سی سگی لگتی ہے۔ کتنی ہی فلموں کے آئٹم سونگ محمود نے تمہارے سامنے ڈاؤن لوڈ کیے ہیں' ان کے بارے میں تو تم نے کبھی ایسا رویہ اختیار نہیں کیا۔" خاور نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے تعجب سے پوچھا۔

"یار! وہ تو پیشہ ور ہوتی ہیں' پیسوں کے عوض جان بوجھ کر اپنی مرضی سے سب کرتی ہیں۔ جبکہ یہ تو صاف ظاہر ہے' کسی نے دشمنی نبھائی ہے۔ ورنہ کالج فنکشن میں یہ سب اکثر لڑکیاں کرتی رہتی ہیں مانا کہ یہ غلط ہے مگر جب کچے ذہن ٹی وی پر روشن خیالی کے نام پر دن رات ایسی گندگی دیکھیں گے تو موقع ملنے پر اسے فالو کیسے نہیں کریں گے اور دوسری بات یہ ہماری بہنوں کی ہم عمر ہے۔ سگی نہ سہی مسلمان تو ہے۔ میں تمہیں فورس نہیں کروں گا جیسے تمہاری مرضی۔"

انہیں تذبذب کا شکار دیکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا جبکہ وہ اس کی باتوں کے زیر اثر چپ بیٹھے رہ گئے۔ ان کے ذہنوں میں ایک ہی جملہ گونج رہا تھا۔

"سگی نہ سہی مسلمان تو ہے۔"

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اور ہاتھ بڑھا کر بیک وقت ڈیلیٹ کا بٹن دبا دیا۔ دروازہ کھولنے سے پہلے دانش نے مڑ کر دیکھا اسکرین صاف تھی۔ اسے اپنے اوپر سے بھاری بوجھ ہٹتا محسوس ہوا۔ محمود اور خاور کی نظریں اس سے ٹکرائیں۔ تینوں کھل کر مسکرا دیے۔

"ہمارے ضمیر ابھی زندہ ہیں۔" یہی سوچتا ہوا وہ خوشگوار موڈ میں گھر چل پڑا۔

دانش بستر پر کروٹیں بدل بدل کر تنگ آ چکا تھا مگر نیند کسی صورت نہیں آ رہی تھی جونہی آنکھیں بند کرتا اک بھیگی سی شبیہ آنکھوں سے نیند سمیٹ لیتی تھی۔

میں اپنے ہاتھوں میں آنکھوں کا کاسہ لے کے نکلا ہوں
کہیں سے کاش مجھ کو نیند کی خیرات مل جائے

چاند پر نظریں جمائے وہ ہولے ہولے گنگنانے لگا۔

اس کے ساتھ والی چارپائی پر لیٹا دانیال اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کیا ہوا؟" دانش نے ابرو اچکا کر پوچھا۔

"مچھروں کی بھیرویں کیا کم ہے جو آپ بھی شروع ہو گئے۔ خدا کے لیے سونے دیجیے۔" اس نے ہاتھ جوڑے تو دانش نے اسے دھپ لگا کر کروٹ بدل لی۔

سوچوں کا رخ ایک بار پھر ہانیہ کی طرف مڑ گیا۔ وہ تنگ آ کر اندر چلا آیا۔

ہانیہ ہمیشہ اسے لکھنے پر اکساتی تھی۔ اس نے سوچا کیوں نہ آزما کر دیکھا جائے۔ اس لیے وقت کاٹنے کو کاغذ قلم لے کر بیٹھ گیا اور موجودہ سیاسی صورت حال پر جو کچھ دل میں آیا لکھتا چلا گیا۔ شروع شروع میں ذرا مشکل ہوئی مگر پھر جو قلم نے چلنا شروع کیا تو بغیر رکے چلتا چلا گیا۔ جب اس نے قلم رکھا تو رات کے دو بج رہے تھے۔ "قسمت آزمانے میں کیا حرج ہے۔" یہی سوچ کر اس نے اگلے دن مضمون سنڈے میگزین کے پتہ پر بھجوا دیا۔

اگلے ہفتے تک اس کی ڈیٹ شیٹ متوقع تھی۔ اس لیے تن دہی سے پڑھائی میں جت کر وہ اس بارے میں بھول گیا اور نہ ہی کسی کو بتانا یاد رہا چونکہ اب وہ گریڈ کے بجائے علم حاصل کرنے کا خواہاں تھا' اس لیے محمود اور خاور کے سلیکٹو اسٹڈی کے مشورے کو نظر انداز کرتے' وقت کی قلت کے باوجود وہ پورا سلیبس کور کرنا چاہ رہا تھا۔ اس سلسلے میں ہانیہ بہت تعاون کر رہی تھی۔ دانش کے اکسانے پر محمود اور خاور نے بھی پیپر کی تیاری شروع کر دی تھی۔

آج اتوار تھا' اماں کے اصرار پر وہ کتابیں بند کر کے ان کے پاس آ بیٹھا اس کے علاوہ کسی سے اخبار و رسائل سننے کا انہیں مزہ ہی نہیں آتا تھا۔ اب بھی اسے اپنے قریب تخت پر بٹھا کر چائے کے ساتھ ساتھ سنڈے میگزین بھی اسے پکڑا دیا اور خود کریلے چھیلنے لگیں۔ ابھی وہ میگزین اٹھا ہی رہا تھا کہ ایک بچہ پڑوس کی سکینہ خالہ کا پیغام لیے چلا آیا۔ ان کے پاس ملتانی کڑھائی کے سوٹ آئے تھے وہ دیکھنے کے لیے بلا رہی

تھیں۔ اماں جلدی سے بچے کے ساتھ چل دیں تاکہ سب سے پہلے اچھے اچھے ڈیزائن چن سکیں۔ ان کے جانے کے بعد دانش چائے پیتے ہوئے میگزین کی ورق گردانی کرنے لگا۔

درمیانی صفحہ کھولتے ہی وہ ٹھٹک گیا۔ الفاظ جانے پہچانے لگ رہے تھے' رائٹر کی جگہ اپنا نام دیکھ کر وہ حیرت سے دنگ رہ گیا' اسے پتا بھی نہ چلا اور گرم گرم چائے اس کا ہاتھ جلا گئی مگر اس وقت جلن کی پرواہ کسے تھی۔ وہ بار بار اپنے نام پر ہاتھ پھیر کر خود کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا' اٹھ کر بھنگڑا ڈالنا شروع کر دے۔

"کیا ہوا بھائی! خیریت؟" اس کے ناقابل فہم تاثرات سے گھبرا کر دانیال نے اس کا کندھا ہلایا۔ اس نے جواب دینے کے بجائے میگزین اس کے سامنے کر دیا۔

"دانش عبداللہ" کا نام اور دانی بھائی کی خوشی دیکھ کر دانیال کو کچھ کچھ بات سمجھ میں آنے لگی۔

"منہ میٹھا کر میرے یار! تیرا بھائی رائٹر بن گیا ہے۔" دانش نے اردگرد کسی میٹھی چیز کی تلاش میں ناکام ہونے پر پاس پڑا کریلا اٹھا کر اس کے حیرت سے کھلے منہ میں ڈال دیا اور لمبی چھلانگ لگا کر باہر نکل گیا۔ وہ یہ جلد از جلد ہانیہ کو دکھانا چاہتا تھا۔

وہ اس وقت اپنے پچھلے پورشن کی صفائی کرنے میں مصروف تھی جب دانش اسے آوازیں دیتا ادھر چلا آیا۔ ایک بڑے کمرے اور برآمدے پر مشتمل اس پورشن کو اس نے اسکول بنا رکھا تھا جہاں وہ قریبی کچی بستی کے بچوں کو مفت تعلیم دیتی تھی۔ جب دانش نے اسے میگزین دکھایا تو وہ خوشی سے اچھل پڑی' اس کی خوشی کسی بھی طرح دانش سے کم نہیں تھی اس نے فوراً" ہی برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر پڑھنا شروع کر دیا وہ جب تک پڑھتی رہی دانش پہلو سے ٹیک لگائے یک ٹک اسے دیکھے گیا۔ حقائق کی کڑواہٹ اور مزاح کی چاشنی کے بہترین امتزاج نے مضمون کو واقعی لاجواب بنا دیا تھا۔

مضمون ختم کرتے ہی اس کے منہ سے بے ساختہ "زبردست" نکلا۔ خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو" ہانیہ نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا' جواباً" اس نے کندھے یوں اچکائے جیسے کہہ رہا ہو "میں بے بس ہوں" اور رخ موڑ کر چلا گیا۔ ہانی کچھ نہ سمجھتے ہوئے سر جھٹک کر ایک بار پھر مضمون پڑھنے لگی۔

پھر گھر میں جس جس کو یہ بات پتہ چلی۔ سب نے خوب سراہا۔ اماں تو دن میں کئی کئی بار ہر آتے جاتے کو پکڑ پکڑ کر اس کا مضمون پڑھوا کر سنتیں اور جب ابا نے بھی اسے سراہتے ہوئے پانچ سو روپے انعام دیا تو وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچا جبکہ دانیال دھڑام سے بے ہوش ہو کر اس کی گود میں آ گرا۔

ارم اور دانش نے اسے ہوش میں لانے کے لیے بڑے جتن کیے' گدگدی بھی کر کے دیکھ لی مگر وہ ڈھیٹ ٹس سے مس نہ ہوا۔ تنگ آ کر ارم نے اس کی جرابیں سنگھانے کا طریقہ علاج تجویز کیا تو وہ کرنٹ کھا کر اٹھ بیٹھا مبادا ارم جرابیں سنگھا کر اسے اصل میں بے ہوش ہی نہ کر دے۔ اس کے بعد دونوں مل کر ٹریٹ کے لیے دانش کے سر ہو گئے اور بالآخر اسے راضی کر کے دم لیا۔

"اماں! دیکھو ناں' نمل کی بچی میرے سارے پاپ کارن کھا گئی ہے۔"

ٹیپو صفیہ بیگم کے سر پر آ کر چیخا تو وہ کچی نیند سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ ٹیپو کو دس روپے دے کر چپ کرایا اور دوپٹہ سر پر باندھ کر باہر چلی آئیں۔ سارا گھر اوندھا پڑا تھا' وہ صبح الٹا سیدھا ناشتہ بنا کر جو سوتیں تو گیارہ بارہ بجے کی خبر لاتیں۔ ایسے میں کام والی ماسی آ کر اپنی مرضی سے الٹے سیدھے ہاتھ مار کر چلی جاتی تھی' آج تو وہ بھی نہیں آئی تھی' اس لیے گھر کی حالت خراب تھی۔

"تم سے اتنا نہیں ہوتا کہ گھر کی صفائی کر لو یا کم از کم برتن ہی دھو ڈالو۔" انہوں نے بے زاری سے گھر کی

حالت دیکھ کر نیل پالش لگاتی نمل کو گھورا۔

"اماں! آپ دیکھتی نہیں کتنے نازک ہاتھ ہیں میرے۔ یہ ماسیوں والے کام کر کے میں نے ان کا کباڑا نہیں کرنا۔" اس نے ناخنوں پر پھونکیں مارتے ہوئے صاف جواب دیا۔

"کسی کام کی نہیں تم، نجانے کون عقل کا اندھا تم سے شادی کرے گا۔" اس کی پیٹھ میں دھمو کا جڑ کر وہ تخت پر بیٹھ گئیں۔ کام کرنے کو ان کا دل بھی نہیں چاہ رہا تھا۔

"ابا جیسا کوئی نہ کوئی تو مل ہی جائے گا۔" وہ پیٹھ سہلاتے ہوئے تھٹے سے بولی۔ آخر کو ان ہی کی بیٹی تھی۔

دانش کو اماں نے قینچی دے کر صفیہ چچی کے ہاں بھیجا تھا۔ وہ دروازہ کھٹکھٹانے ہی لگا تھا کہ ٹیپو باہر نکلا اور اسے اندر آنے کا کہہ کر گلی میں کھیلنے لگا۔ وہ ابھی ڈیوڑھی میں تھا کہ اپنا نام سن کر ٹھٹک گیا۔

"دانش تھا تو سہی مگر تم سے اتنا نہ ہو سکا کہ اسے قابو کر لیتیں۔ میں نے کتنے جتن کیے تھے اسے ہانیہ سے دور رکھنے کے ورنہ اس کے اماں ابا تو اس کے بچپن سے ہانیہ کو اپنی بہو بنانے کا سوچے بیٹھے ہیں۔ میری بیٹی تو جیسے کسی کو نظر ہی نہیں آتی ورنہ کیا کمی ہے تم میں۔ اگر دانش کو اپنے بس میں کر لیتیں تو وہ بھی تمہارے ابا کی طرح سارے خاندان سے ٹکر لے کر تم سے شادی کر لیتا اور سب منہ دیکھتے رہ جاتے۔ مگر دانش کم بخت جب سے اس ہانیہ کے پاس جانے لگا ہے، یہاں کا تو راستہ ہی بھول گیا ہے ورنہ ہر دوسرے ہفتے چکر لگاتا تھا۔" وہ افسوس سے ہاتھ مل رہی تھیں۔

"پرسوں اسے ٹیپو بلا کر لایا تھا تو دیکھ نہیں رہی تھیں اماں! کیسے ہانیہ کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ پہلے تو گھنٹہ گھنٹہ بھر ہانیہ کے خلاف بولتے رہتے تھے مگر موصوف کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی تھی مگر دیکھا نہیں تھا، میں نے ہانی کے بارے میں ذرا بات کیا کر دی، کیسے غضب ناک ہو رہا تھا۔ اب تو اس کا پیپر بھی ہو گیا ہے، مگر ہانیہ کے گھر کے چکر ویسے ہی لگتے ہیں۔ میں تو کہتی ہوں مٹی ڈالو اماں! سوائے شکل کے اس کے پاس ہے ہی کیا۔ میں تو کسی ایسے آدمی سے شادی کروں گی جو مجھے پیسوں میں تول دے۔"

وہ بھرپور انگڑائی لیتی اماں کے پاس لیٹ کر جاگتی آنکھوں سے سپنے بننے لگی۔ صفیہ بیگم بھی اس سے متفق ہو کر پرسوچ انداز میں سر ہلانے لگیں۔

ڈیوڑھی میں کھڑے دانش کو اس کے سارے سوالوں کے جواب مل گئے تھے۔ صفیہ چچی کی محبت محض دکھاوا تھی اسے یہ جان کر جہاں بے حد افسوس ہوا تھا وہیں ان کی اصلیت جاننے کی خوشی بھی تھی وہ جس کام سے آیا تھا اسے چھوڑ کر الٹے قدموں واپس پلٹ گیا۔

☼ ☼ ☼

صحن میں رخصت ہوتی دھوپ کی تپش اور حبس نے عجیب گھٹن پھیلا رکھی تھی۔ رہی سہی کسر لوڈ شیڈنگ نے پوری کر دی تھی۔ اماں تخت پر لیٹی پنکھا جھلنے کے ساتھ ساتھ واپڈا والوں کو بھی کوس رہی تھیں۔ ذرا فاصلے پر دری بچھائے ارم اور دانیال بے ایمانی کے سارے ریکارڈ توڑتے ہوئے لڈو کھیلنے میں مصروف تھے۔ دانش کرسی پر نیم دراز آرٹیکل لکھ رہا تھا۔ جب سے اس کا پیپر ختم ہوا تھا اسے بس ایک ہی کام تھا لکھنا لکھنا اور اور صرف لکھنا۔ اس کی تحریریں بے حد پسند کی جا رہی تھیں جب سے مصروف چینل کے ٹاک شو میں اس کے کالم کو زیر بحث لایا گیا تھا تب سے اس کی شہرت میں مزید اضافہ ہوا تھا جو لوگ اسے نہیں پڑھتے تھے وہ بھی پڑھنے لگے تھے۔ وہ فری لانسر کے طور پر کام کر رہا تھا چونکہ اپنا خرچا خود اٹھا رہا تھا اس لیے ابا کو بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔

اچانک لائٹ آنے پر فضا میں پنکھوں کا شور جاگا تو سوائے اس کے سب نے اندر جانے کی مگر وہ اپنے کام میں اتنا مگن تھا، اسے لائٹ آنے کا پتہ بھی نہ چلا۔ یہاں تک کہ اماں خود اندر سے اٹھ کر آئیں اور اپنے دوپٹے سے اس کا پسینہ پونچھتے ہوئے کان سے پکڑ کر

اندر لے گئیں۔ جب وہ کام سے فارغ ہوا تو لائٹ ایک بار پھر جا چکی تھی باہر بھی گرمی کا زور ٹوٹ چکا تھا وہ انگڑائی لے کر تھکن اتارتا باہر چلا آیا جہاں ارم اور دانش لڑ لڑ کر تھک چکنے کے بعد اب آم کھانے کا مقابلہ کر رہے تھے، ان کی دعوت پر وہ بھی ان کے ساتھ شریک ہو گیا مگر ان جیسی تیز رفتاری نہ ہونے کے باعث عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا حصہ پلیٹ میں نکال کر الگ ہو بیٹھا۔ اس کی نظریں بار بار بھٹک بھٹک کر دیوار پر جا ٹکتیں جس کے پار ہانیہ کا گھر تھا پیپرز کے بعد سے اس نے دانستہ ادھر جانا کم کر دیا تھا مگر اس دل کا کیا کرتا جو بار بار ادھر جانے کو مچل اٹھتا تھا، اسے یوں بے خودی سے دیوار پر نظریں جما کر مسکراتا دیکھ کر ارم نے دانش کو ٹھوکا دیا۔ دونوں معنی خیز انداز میں مسکرا دیے پھر کچھ سوچ کر اپنے آم ختم کرنے کے بعد دانیال نے اس کی [illegible] آموں کی پلیٹ کھینچ لی مگر اسے خبر تک نہ ہوئی۔ وہ بدستور خیالوں میں کھویا تھا۔ اس کی پلیٹ میں موجود سارے آموں کا صفایا کرنے کے بعد دونوں زور زور سے ہنسے تب کہیں جا کر اسے ہوش آیا۔

"میرے آم کہاں گئے؟" وہ خالی پلیٹ دیکھ کر چلایا۔

"دانے دانے پر کھانے والے کا نام لکھا ہوتا ہے۔" ارم اٹھلائی۔

"اور ان آموں پر جن کا نام تھا، وہ ان کے پیٹ میں پہنچ چکے ہیں۔" دانیال حفاظتی تدبیر پر عمل کرتے ہوئے یہ کہہ کر جلدی سے محفوظ فاصلے پر ہو گیا مگر دونوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب کچھ بھی کہے بغیر دانش اپنے کاغذ سمیٹ کر پوسٹ کرنے چل پڑا۔

"لگتا ہے دال میں کچھ ہی نہیں، سب کچھ کالا ہے۔" معنی خیز انداز میں آنکھیں گھماتے ہوئے دونوں ہی سوچے جا رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

دانش ہاتھ میں گزٹ پکڑے انتہائی بے یقینی کے عالم میں اسے دیکھے جا رہا تھا۔ آج اس کا رزلٹ آیا تھا، لمبی لائن میں لگ کر گزٹ حاصل کرنے کے بعد وہ قریبی پارک میں آ بیٹھا، جتنی دعائیں اسے یاد تھیں، سب پڑھنے کے بعد دھڑکتے دل سے نیچے سے گزٹ دیکھنا شروع کیا۔ آخری دو نام محمود اور خاور کے تھے۔ دونوں بی گریڈ لے کر پاس ہوئے تھے۔ ان کو مبارک باد کا میسج بھیج کر وہ آگے بڑھا بی سے بی اور بی سے اے گریڈ والی کیٹگری چھان ماری اسے کہیں بھی اپنا نام رول نمبر نہ ملا حالانکہ اس کا پیپر انتہائی زبردست ہوا تھا۔ وہ بے یقینی اور پریشانی سے گزٹ کو تکے جا رہا تھا۔

"یعنی اتنی محنت کے باوجود بھی......" اس نے گزٹ کو ہوا میں اچھال دیا اور سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ گزٹ ہوا میں الٹتا پلٹتا پھر سے اس کی گود میں آ گرا۔ اس بار دوسری سائیڈ اس کے سامنے تھی جہاں اے کی کیٹگری میں سب سے اوپر اس کا نام جگمگا رہا تھا۔

"شکر الحمد للہ۔" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ آسمان کی طرف منہ کر کے آنکھیں بند کرتے ہوئے گویا اس نے اتنے مہینوں کی تھکن پلکوں سے سمیٹ لی۔ پارک سے نکلتے ہی اس نے بیکری کا رخ کیا۔ مٹھائی کا آرڈر دے کر خوشگوار موڈ میں کاؤنٹر بجانے لگا، جب پیچھے سے کسی نے اسے گھما کر بھینچ ڈالا۔

"بہت بہت مبارک ہو یار!"

"تجھے بھی۔" اس نے بھی زوردار انداز میں خاور کی پیٹھ ٹھپکی "لو منہ میٹھا کرو" دانش نے اکٹھے دو رس گلے اس کے منہ میں ٹھونس دیے۔

"اب مزا آئے گا، مہوز کو بتانے کی ضرورت نہیں پڑے گی، اس نے تو تم سے بھی زیادہ بے صبری سے تمہارے رزلٹ کا انتظار کیا تھا۔ اس کا منہ اس وقت دیکھنے والا ہو گا۔" خاور، مہوز کی حالت کا تصور کر کے مزے لینے لگا۔

"چھوڑو یار، میں نے اپنی نیت صاف کر لی تھی۔ مجھے اب شرط سے کوئی سروکار نہیں۔ تم بھی اسے شرمندہ مت کرنا۔" وہ متانت سے بولا۔

"یہ تو تم کہہ رہے ہو، اگر خدانخواستہ تم ہار جاتے تو

دیکھتے وہ کمینہ تمہیں کتنا ذلیل کرتا۔ ویسے یہ موذی بڑی ڈھیٹ چیز ہے اب تمہارے سائے سے بھی دور بھاگے گا۔ تمہیں دیکھ کر یوں انجان بن جائے گا گویا جانتا ہی نہیں۔"

خاور نے منہ بنایا تو وہ ہنستا ہوا گھر چل دیا۔ وہ یہ خبر سب سے پہلے ہانیہ کو سنا کر اس کی حیرت سے محظوظ ہونا چاہتا تھا مگر اس کی اپنی حیرت کی انتہا نہ رہی جب ہانی کو کوئی حیرت نہ ہوئی۔ "تمہیں حیرت نہیں ہوئی۔" اس نے اچنبھے سے دریافت کیا۔

"حیرت تب ہوتی ہے جب یقین کی کمی ہو جبکہ مجھے تم پر پورا بھروسا تھا۔" وہ مان سے بولی تو دانش اس کے خوشی سے چمکتے چہرے کو دیکھتا رہ گیا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو" ہانی نے حیرت سے اپنا ہر بار کا سوال دہرایا جواباً" اس نے حسب سابق یوں کندھے اچکائے جیسے کہہ رہا ہو میں بے بس ہوں۔

"بیٹا! اب آگے کے متعلق کیا سوچا ہے؟" چاچو بھی آفس سے آنے کے بعد اس کے پاس آبیٹھے۔

"بہت کچھ۔" وہ گڑبڑایا۔ "میرا مطلب ہے فی الحال تو ایم اے جرنلزم کرنے کا ارادہ ہے۔"

"بہت اچھی بات ہے انسان کو ہمیشہ وہی راہ اپنانی چاہیے جو اس کی صلاحیتوں سے مطابقت رکھتی ہو۔" انہوں نے سراہا۔

"پتہ ہے ہانی! مجھے رزلٹ کا بے حد انتظار تھا۔ میں نے ایک ایک دن گن کر گزارا تھا۔" چاچو فون سننے اندر گئے تو وہ ہانیہ کی طرف متوجہ ہوا۔

"کوئی خاص وجہ؟" اس نے چائے کی پیالی اسے پکڑائی۔

"بہت ہی خاص۔" وہ اسے نظر بھر کر دیکھتا ہوا بولا۔

"بتاؤ گے نہیں؟" وہ حیران ہوئی "ان چند ماہ میں ان کے درمیان اتنی دوستی ہو گئی تھی کہ دانش اپنی ہر بات سب سے پہلے اس سے شیئر کرتا تھا۔

"بتاؤں گا مگر وقت آنے پر۔"

"اور وہ وقت کب آئے گا؟" وہ بھی شاید بحث کے موڈ میں تھی۔

"دعا کرو کہ وہ وقت جلد آجائے۔" وہ مسکرایا۔

"ٹھیک ہے میں ڈھیر ساری دعا کروں گی۔"

وہ سادگی سے بولی تو دانش سرشار سا مسکراتا ہوا گھر کی طرف بڑھ گیا جہاں سب اس کا رزلٹ جاننے کو بے تاب تھے۔

✲ ✲ ✲

آج عبداللہ صاحب شام میں جلدی گھر چلے آئے تھے۔ میمونہ بیگم اتنے دنوں سے جو بات ان سے کرنا چاہ رہی تھیں آج موقع جان کر جلدی سے فارغ ہو کر ان کے پاس چلی آئیں۔

"سنیں جی!"

"آپ کچھ سنائیں گی تو میں سنوں گا۔ اب میرے کان تو بجنے سے رہے۔" وہ حسب عادت گویا ہوئے۔ میمونہ بیگم نے ان کا موڈ خراب ہونے کے ڈر سے کوئی جواب دینے سے گریز کیا اور ان کے قریب بیٹھ گئیں۔

"آپ کا ارادہ دانش کے بی اے کے بعد بھائی صاحب سے ہانیہ کے لیے بات کرنے کا تھا۔ اب تو دانش نے یونیورسٹی میں بھی داخلہ لے لیا ہے اب کس بات کی دیر ہے؟"

"یہ تو میری شروع سے خواہش تھی کہ ہانیہ جیسی لائق فائق اور پیاری بچی میری بہو بنے مگر تم نے ہی تو بتایا تھا کہ دانش اس رشتے پر راضی نہیں۔ زندگی اس نے گزارنی ہے۔ میں نہیں چاہتا اس پر زبردستی کروں۔" انہوں نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"ارے وہ تو پہلے کی بات ہے۔ جس دن دانش کا رزلٹ آیا تھا اس دن اس نے آتے ہی خود مجھ سے رشتے کی بات کی تھی وہ آپ کی خواہش پر دل و جان سے راضی ہے۔ بس اب آپ جلدی سے بھائی صاحب سے بات کریں تاکہ کوئی اچھا سا دن دیکھ کر باقاعدہ رسم کرلی جائے۔" وہ خوشی خوشی انہیں بتانے لگیں۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ میں آج ہی.... ارے آئیں آئیں صفیہ بھابھی! بڑے دنوں بعد چکر لگایا آپ نے مگر بڑے صحیح موقع پر آئی ہیں آپ" صفیہ بیگم کو آتا دیکھ کر وہ بات ادھوری چھوڑ کر اٹھ بیٹھے۔

"خیریت بھائی صاحب؟ بہت خوش نظر آرہے ہیں آپ۔" وہ میمونہ بیگم سے ملتے ہوئے ان کے قریب بیٹھ گئیں۔

"بات ہی ایسی ہے آپ سنیں گی تو آپ بھی خوش ہو جائیں گی۔" میمونہ بیگم بے حد خوش تھیں۔

"بھابھی! آپ کو تو پتہ ہے میری ہمیشہ سے خواہش تھی کہ ہانی میری بہو بنے مگر دانش نالائق کی غیر ذمہ داری کی وجہ سے بات ہمیشہ ٹلتی رہی۔ اب جبکہ میں نے امید بھی چھوڑ دی تھی تو برخوردار نے نہ صرف اپنی غیر ذمہ دارانہ روش چھوڑ دی بلکہ رشتے کے لیے رضا مندی بھی دے دی ہے۔ میں آج کل میں عبدالرحمن سے بات کرتا ہوں تاکہ کوئی مناسب دن دیکھ کر چھوٹی موٹی رسم کرلیں۔" خوشی عبداللہ صاحب کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔ صفیہ بیگم پہلو بدل کر رہ گئیں۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے مگر۔" انہوں نے زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"مگر کیا بھابھی؟" انہیں چپ دیکھ کر میمونہ بیگم نے پوچھا۔

"دراصل میں نے سنا ہے ہانیہ کے لیے کسی ڈاکٹر کا رشتہ آیا ہے۔"

"ہاں۔ میمونہ بتا رہی تھی مگر گھر کے بچے کے ہوتے وہ غیروں کو ترجیح تھوڑی دیں گے۔" عبداللہ صاحب کے لہجے میں بہت مان تھا۔

"آپ کی بات ٹھیک ہے بھائی صاحب! عبدالرحمن بھائی آپ کی بہت عزت کرتے ہیں۔ انہیں آپ سے بہت محبت ہے۔ کبھی آپ کو انکار نہیں کریں گے مگر چھوٹے بھائی کو اپنی محبت میں اس حد تک آزمانا آپ کو زیب نہیں دیتا۔"

"کیا مطلب؟" عبداللہ صاحب نے تیوری چڑھائی۔

"دیکھیں بھائی صاحب! آپ بھی بیٹی والے ہیں۔ سچ بتائیے اگر ارم کے لیے آپ کو موقع ملے تو آپ سب سے بہترین انتخاب کریں گے ناں؟ جبکہ ہانیہ تو ہے بھی والدین کی اکلوتی اولاد وہ بھلا ڈاکٹر کے مقابلے میں دانش کو کیسے ترجیح دے سکتے ہیں جبکہ دانش تو ابھی بے روزگار بھی ہے کس برتے پر آپ اس کے لیے رشتہ مانگیں گے۔" بغور ان کے رنگ بدلتے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے وہ مزید گویا ہوئیں۔

"آپ ہمارے بڑے ہیں۔ آپ کی حیثیت خاندان کے سربراہ کی سی ہے اگر آپ زور دیں گے تو عبدالرحمن بھائی کو آپ کو ہاں کرنی ہی پڑے گی مگر یہ آپ کی اصول پسندی کے خلاف ہوگا۔ آگے آپ کی مرضی۔"

وہ اپنی عادت سے مجبور تھیں انہوں نے نمل کے انکار پر دانش کا خیال چھوڑ تو دیا تھا مگر اتنی آسانی سے ان کی مراد پوری ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ اس لیے عبداللہ صاحب کی سوچوں کو نئے رخ پر ڈال کر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ میمونہ بیگم تفکر سے عبداللہ صاحب کی گمبھیر چپ کو دیکھتی رہ گئیں۔

✲ ✲ ✲

"اماں! آپ نے ابا سے بات کی؟" دوپہر کے کھانے کے لیے دستر خوان پر بیٹھتے ہوئے دانش نے حسب معمول اپنا سوال دہرایا۔

"ہاں کی تھی۔" مبہم سا جواب دے کر اس سے نظریں چراتے ہوئے وہ کچن میں چلی گئیں۔ جواب جاننے کے اشتیاق میں دانش کی نظریں گویا دروازے سے چپک سی گئیں۔

"آپ تو یوں دیدہ و دل فرش راہ کیے بلکہ پلکیں بچھائے بیٹھے ہیں جیسے اماں کا نہیں ہانیہ آپی کا انتظار کر رہے ہوں۔" ارم کھلکھلائی تو دانش نے اسے گھورا۔

"یوں خوں خوار انداز میں گھوریں تو مت۔ دل میں تو یقیناً" لڈو پھوٹ رہے ہوں گے۔"

دانیال نے اس کے آگے سے ڈونگا کھسکایا مگر

حسب توقع اس نے کوئی توجہ نہ دی آج کل وہ اتنا خوش تھا کہ ایسی چھوٹی موٹی شرارتوں کو خاطر میں نہیں لاتا تھا جس کا ارم اور دانیال خوب فائدہ اٹھا رہے تھے۔

"کتنا مزا آئے گا ناں بھائی کی شادی میں میں تو پورے دس جوڑے بنواؤں گی۔" ارم سوچ سوچ کر مزا لینے لگی۔

"ہیلو بھائی کی ایک ساتھ چار شادیاں نہیں ہوں گی جو تم دس جوڑے بنواؤ گی۔" دانیال کی زبان بھلا کیسے قابو رہ سکتی تھی۔

"اچھا بھائی! یہ بتائیں آپ مجھے کتنا نیگ دیں گے؟" وہ دانیال کی بات نظر انداز کر کے پھر سے دانش کا سر کھانے لگی۔

"میرے خیال میں دس روپے کافی ہوں گے۔" دانیال نے پھر مداخلت کی۔

"تم اپنا خیال اپنے پاس رکھو۔ میں تم سے نہیں بھائی سے بات کر رہی ہوں۔" ارم جھنجلا اٹھی جبکہ دانش دونوں کی نوک جھونک کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اماں کی راہ دیکھ رہا تھا جو آنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔

وہ آئیں تو چپ چاپ کھانا شروع کر دیا۔ وہ سب بھی خاموشی سے کھانا کھانے لگے۔

"اماں! اب بتا بھی دیں کیا جواب دیا ابا نے۔" وہ برتن سمیٹنے کے لیے اٹھنے لگیں تو دانش نے ان کا ہاتھ پکڑ کر بڑی آس سے پوچھا۔

"انہوں نے انکار کر دیا ہے۔" وہ منہ دوسری طرف کرتے ہوئے بولیں۔

اس کی آنکھوں کی بجھتی جوت دیکھنے کا حوصلہ کہاں سے لائیں۔

"مگر اماں ایسا کیسے ہو سکتا ہے' ابا تو خود ہی چاہتے تھے۔"

اس کی آواز صدمہ اور حیرت سے پھٹ پڑی۔ منہ تو ارم اور دانیال کے بھی کھلے کے کھلے رہ گئے تھے۔ اس کے اصرار پر اماں نے ساری بات صاف صاف اسے بتا دی تھی۔

"ہونہہ' تو یہ صفیہ چچی کی باتوں کا اثر ہے۔ اماں! آپ کو نہیں پتہ وہ تو شروع سے ہی مجھے......" وہ اماں کو ان کی اصلیت بتاتے بتاتے چپ ہو گیا وہ خواہ جیسی بھی تھیں' چچا عبدالرزاق کی وجہ سے سب ان کی عزت کرتے تھے ان کی اصلیت بتا کر انہیں سب کی نظروں میں گرانا اس کی غیرت نے گوارا نہ کیا۔

"اماں! آپ ابا سے ایک بار پھر بات کر کے دیکھیں۔ میں ہانیہ کو بہت خوش رکھوں گا۔ اس کی کوئی خواہش تشنہ نہیں رہنے دوں گا ڈھیروں دولت نہ سہی بے حساب محبت و عزت تو دوں گا وہ بھی کوئی مادیت پسند لڑکی نہیں ہے یقیناً" وہ بھی محبت کو دولت پر ترجیح دے گی۔" دانش اب اماں کی منتیں کر رہا تھا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے میں نے انہیں نہیں سمجھایا ہوگا؟ مگر ایک بات جو ان کے دماغ میں سما جائے' وہ آسانی سے نکلتی نہیں۔ بھلا... تم کہتے ہو تو میں ایک بار پھر ان سے بات کر کے دیکھتی ہوں۔"

اس کا ماتھا چوم کر وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ پھر حسب وعدہ انہوں نے رات کو عبداللہ صاحب سے بات کی تو وہ بھڑک اٹھے۔

"تم چاہتی ہو میں اپنے بڑے ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھاؤں' اپنے چھوٹے بھائی کو آزمائش میں ڈالوں؟ 'رکس برتے پر میں اس سے اس کی لائق فائق اکلوتی اولاد کا رشتہ مانگوں؟ آج ہی اس نے مجھ سے ڈاکٹر صارم کے رشتہ پر صلاح مانگی ہے اور ساری بات مجھ پر چھوڑ دی ہے۔"

میمونہ بیگم رونے لگیں تو وہ کچھ دھیمے پڑے۔

"تم ہی بتاؤ نیک بخت! میں کیا کروں' کیا اولاد کی خوشی مجھے عزیز نہیں؟" وہ بے چارگی سے بولے۔

"آپ ایک بار بات تو کر کے دیکھیں۔ زور زبردستی کرنے کو کون کہہ رہا ہے' صرف رشتہ تو دے کر دیکھیں۔ آگے ان کی مرضی۔ کم از کم ساری زندگی ہمارے دل پر بوجھ تو نہ رہے گا کہ ہم اپنی اولاد کی خوشی کے لیے کچھ کر نہ سکے۔"

میمونہ بیگم نے روتے ہوئے منت کی تو وہ قدرے

توقف کے بعد بولے۔

"ٹھیک ہے' عبدالرحمٰن نے مجھ سے ایک ہفتہ میں جواب مانگا ہے اگر اس دوران دانش کوئی ایسی نوکری تلاش کر سکے جس کے بل بوتے پر میں اس کے رشتے کی بات کر سکوں تو میں ضرور عبدالرحمٰن سے بات کروں گا مگر آخری فیصلہ اسی کا ہوگا ورنہ دوسری صورت میں ڈاکٹر صارم کے متعلق چھان بین کروا کر ہاں کر دوں گا۔"

"مگر دانش ابھی پڑھ رہا ہے' اسے کیسے اتنی جلدی نوکری مل سکتی ہے۔ اور اس کی پڑھائی کا کیا ہوگا۔" میمونہ بیگم اس نئی منطق پر سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

"اس کی کلاسز شام میں ہوتی ہیں' وہ پڑھائی کے ساتھ آسانی سے نوکری کر سکتا ہے اور جہاں تک نوکری تلاش کرنے کی بات ہے' یہ اس کا اپنا درد سر ہے۔ رات بہت ہو گئی ہے اب تم بھی سو جاؤ۔" بات ختم کرتے ہوئے وہ بھی سونے کو لیٹ گئے حالانکہ نیند تو ان کی آنکھوں سے بھی کئی دنوں سے روٹھی تھی۔

☼ ☼ ☼

گھر میں جیسے اداسی کی دھوپ سارا دن بسیرا کیے رکھتی تھی۔ رات ہوتے ہی پژمردگی اپنی چادر پھیلا دیتی تھی۔ دانش صبح نوکری کی تلاش میں نکلتا رات گئے تھکا ہارا نامراد واپس آتا۔ اس نے شام میں یونیورسٹی جانا بھی چھوڑ رکھا تھا۔ نہ ٹھیک سے کھانا کھاتا نہ ہی سوپاتا تھا۔

اماں اس کی حالت دیکھ کر کڑھتی رہتی تھیں۔ ابا بھی اپنی جگہ بہت پریشان تھے۔ اولاد کی خوشیاں آخر کسے پیاری نہیں ہوتیں مگر اصول بھی کوئی چیز ہوتے ہیں۔ ارم اور دانیال جو دن بھر چونچیں لڑانے سے باز نہیں آتے تھے اب تو گویا لڑنا ہی بھول گئے تھے ہر وقت اکٹھے بیٹھے اس وحشت سے چھٹکارا پانے کے لیے منصوبے بناتے رہتے تھے۔

"خدا کے لیے تم اپنے اوٹ پٹانگ آئیڈیے اپنے پاس رکھو۔" دانیال کے اوٹ پٹانگ آئیڈیوں سے تنگ آکر ارم نے ہاتھ جوڑے۔

"پھر تم ہی بتاؤ کیا کریں؟" دانیال نے ہتھیار ڈالتے ہوئے سب کچھ اس پر چھوڑ دیا۔

"کیوں نہ ساری بات ہانیہ آپی کو بتا دیں۔" ارم نے چٹکی بجائی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اس سے کیا ہوگا؟"

"واقعی یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں' وہ بھلا کیا کر سکتی ہیں۔ انہیں تو شاید پتہ بھی نہ ہو بھائی ان سے اتنا پیار کرتے ہیں۔" وہ پژمردہ سی دوبارہ بیٹھ گئی۔

"یوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے رہنے سے بھی تو کچھ نہیں ہوگا' ٹھیک ہے چلو ہانیہ آپی کے پاس چلتے ہیں۔"

"مگر تم جاتے ہی ان سے بات مت کرنا۔ میں بازار سے گلیسرین لے کر آتا ہوں۔ تم آنکھوں میں ڈال کر خوب رو رو کر انہیں بتانا۔ شاید ان کا دل پسیج جائے اور وہ خود ہی ڈاکٹر صارم کے رشتے سے انکار کر دیں۔"

دونوں اس آئیڈیے پر متفق ہو کر باہر نکلے۔ ارم چاچو کے گھر جبکہ دانیال گلیسرین لینے بازار چلا گیا۔ ارم دھڑکتے دل کے ساتھ اللہ کا نام لے کر اندر داخل ہوئی۔ پورے گھر میں سناٹا چھایا تھا۔ چاچو سامنے برآمدے میں کرسی پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے' وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ان کے پاس چلی آئی۔

"السلام علیکم چاچو!"

"ارے میرے بیٹی آئی ہے۔" وہ اسے دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھے وہ بہت نرم مزاج اور ہر ایک سے محبت کرنے والے شخص تھے۔

"ہانیہ آپی کہاں ہیں؟" اس نے متلاشی نظریں ارد گرد دوڑائیں۔

"وہ اور آپ کی چچی تو شاپنگ کرنے بازار گئی ہیں۔ آپ بہت پریشان لگ رہی ہیں۔ کوئی مسئلہ ہے کیا؟" اس کی گھبراہٹ دیکھ کر وہ پوچھے بنا نہ رہ سکے۔

"نہیں چاچو! ایسی کوئی بات نہیں" اس نے جھٹلانا چاہا مگر آنکھوں میں اُمڈتی نمی نے راز فاش کر دیا۔

"اپنے چاچو کو نہیں بتاؤ گی۔"

انہوں نے اٹھ کر شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو نجانے اسے کیا ہوا۔ وہ ان کے کندھے پر سر رکھ کر زار و قطار روتے ہوئے ساری بات انہیں بتاتی چلی گئی۔

ارم کی باتیں سن کر عبدالرحمٰن صاحب حیرت سے منجمد رہ گئے وہ تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ بھائی صاحب ان سے اتنی غیریت برت سکتے ہیں وہ تو خود بھی ہمیشہ سے دانش کو ہی اپنے داماد کے روپ میں دیکھتے آئے تھے۔ ڈاکٹر صارم کے رشتے کی بات بھی انہوں نے بھائی صاحب سے اسی لیے کی تھی کہ وہ صاف انکار کرتے ہوئے دانش کے بارے میں باقاعدہ بات کریں گے مگر جب انہوں نے اس طرح کا ردِعمل ظاہر نہ کیا تو وہ بھی چپ ہو گئے جو بھی تھا وہ بیٹی کے باپ تھے، ورنہ ان کی تو خواہش تھی کہ اکلوتی بیٹی ہمیشہ نظروں کے سامنے رہے۔

کافی دیر ان کے گلے سے لگ کر سسکنے کے بعد ارم کو ہوش آیا تو اس نے ڈرتے ڈرتے ان کے چہرے کی طرف دیکھا مگر وہاں ناراضی یا غصہ کا شائبہ تک نہ تھا۔ اسے دیکھ کر وہ نرمی سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے مسکرائے تو ارم کو اپنا آپ ہواؤں میں اڑتا محسوس ہوا۔

دانیال بازار سے واپس آیا تو ارم اسے دروازے میں ہی مل گئی، وہ حیرت سے کبھی اپنے ہاتھ میں پکڑی گلیسرین اور کبھی اس کے گالوں پر بہتے آنسوؤں کے نشان اور مسکراتے لب دیکھتا رہ گیا۔

۞ ۞ ۞

آسمان پر واپسی کے سفر پر دراز سورج آگ برسا رہا تھا۔ اس کی گرمی سے بے نیاز دانش فٹ پاتھ پر قدم گھسیٹتا سر جھکائے سمت کا تعین کیے بغیر چلا جا رہا تھا۔ ابا نے آج شام تک کی مہلت دی تھی مگر پورا ہفتہ جوتیاں گھسنے کے باوجود وہ کوئی اچھی تو کیا معمولی نوکری تک نہیں ڈھونڈ سکا تھا کسی سیٹ کے لیے اگر میٹرک پاس امیدوار درکار ہوتا تو ڈبل ایم اے انٹرویو دینے پہنچ جاتے ایسے میں اس کی بی اے کی ڈگری تو کسی کھاتے میں نہ تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کرے تو کیا کرے ہانیہ سے دوری کا تصور ہی سوہانِ روح تھا۔ بے معنی سوچوں کو سر پر سوار کیے جب وہ چلتے چلتے تھک گیا تو پسینہ پونچھتے ہوئے ایک تھکی ہوئی نگاہ آسمان پر ڈالی۔

”میں قاضی الحاجات ہوں مجھ سے مانگ میں دوں گا۔“

اسے آسمان سے یہی صدا آتی محسوس ہوئی، اس کے قدم میکانکی انداز میں سڑک کے دوسری طرف مسجد کی طرف اٹھتے چلے گئے اندر داخل ہونے سے پہلے وہ مایوسی کا چولا اتارنا نہیں بھولا تھا۔ دو رکعت نفل حاجات پڑھنے اور سچے دل سے دعا کرنے کے بعد وہ باہر نکلا تو اس کا دل سراپا سکون بن چکا تھا۔

سڑک کے دوسری طرف ایک موقر جریدے کے آفس پر نظر پڑی تو وہ ادھر چلا گیا۔ اس جریدے میں ہر ہفتہ باقاعدگی سے اس کا آرٹیکل شائع ہوتا تھا اور عوام میں بے حد مقبول ہو رہا تھا۔ نئے آرٹیکل کا مسودہ اس کے پاس تھا وہی دینے کے خیال سے وہ ایڈیٹر صاحب کے پاس چلا آیا۔

انصاری صاحب اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ دانش انہیں ذاتی طور پر بھی بہت پسند تھا کیونکہ اپنی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے باوجود نہ تو دانش نے بے جا نخرے دکھائے تھے اور نہ ہی طرح طرح کی ڈیمانڈز کے ذریعے انہیں تنگ کیا تھا۔

”اچھا ہوا دانش صاحب! آج آپ چلے آئے، میں خود کئی دنوں سے آپ سے ملنے کا سوچ رہا تھا۔“

ادھر ادھر کی کافی باتوں کے بعد کچھ یاد آنے پر بولے۔

”خیریت انصاری صاحب؟“ چائے کا خالی کپ میز پر رکھ کر وہ پیپر ویٹ سے کھیلنے لگا۔

”دانش صاحب، ہمارا ادارہ نوجوانوں کے لیے ”نئی سوچ“ کے نام سے ایک نئی طرز کے ماہنامے کا اجرا کر رہا ہے آج کل اس کے لیے اسٹاف کی تلاش جاری ہے۔ سب ایڈیٹر کی سیٹ کے لیے مجھے آپ سے موزوں کوئی نہیں لگا۔ آپ نوجوان ہیں۔ نئی سوچ کے حامل ہیں۔ ماشاء اللہ باصلاحیت بھی ہیں۔ جہاں تک ڈگری کی بات ہے۔ وہ بھی سال دو سال میں آپ کے پاس ہوگی۔ رہا تنخواہ کا سوال تو شروع میں تو ہم آپ کو بیس ہزار ہی آفر کر سکتے ہیں، آگے ماہنامے کی سرکولیشن پر منحصر ہے۔ پھر کیا خیال ہے؟“

انصاری صاحب لگی لپٹی رکھے بغیر ہمیشہ صاف اور دو ٹوک بات کیا کرتے تھے۔

دانش کو ہفت اقلیم کی دولت ملنے پر بھی اتنی خوشی نہ ہوتی جتنی اس وقت یہ نوکری ملنے پر ہو رہی تھی۔ انصاری صاحب سے معاملات طے کرنے کے بعد وہ دوبارہ سیدھا مسجد چلا آیا اور رب کے حضور کب سے رکے شکرانے کے آنسو بہا ڈالے۔ وہ تو کہتا ہے مانگ میں دوں گا یہ تو ہم انسان ہی ہیں جو رب سے مانگنے کے بجائے انسانوں سے خیرات لینے کو ترجیح دیتے ہیں۔

وہ یہ خوش خبری جلد سے جلد ابا کو سنانا چاہتا تھا مگر ان کا سیل آف جا رہا تھا۔ گھر کا فون بھی دو دن سے خراب تھا اس لیے رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ سورج ڈھل رہا تھا مغرب ہونے کو تھی اس کا بس چلتا تو اڑ کر گھر پہنچ جاتا اسے بس اسٹاپ پر کھڑے دس منٹ سے زیادہ ہونے کو آئے تھے مگر اس کے روٹ کی بس آنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ کوفت سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس کی نظر مہوز پر پڑی۔ اسی وقت مہوز نے بھی اسے دیکھ لیا اور ان دیکھا کر کے تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ تیز رفتاری کی وجہ سے اس کی جیب سے موبائل گر پڑا مگر وہ اتنا جلدی میں تھا کہ اسے پتہ بھی نہ چلا۔ دانش نے آگے بڑھ کر موبائل اٹھاتے ہوئے اسے آواز دی مگر اس نے اپنے قدموں کی رفتار مزید تیز کر دی اور مڑ کر دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ شرط ہارنے کے بعد سے وہ اس کے سائے تک سے بدکتا تھا۔

اپنی ہڑبڑی اور تیزی کی وجہ سے وہ سامنے سے آتی گاڑی کو نہ دیکھ پایا اور گاڑی کی ٹکر سے اچھل کر دور جا گرا حسب روایت گاڑی کے ڈرائیور نے فرار ہونے میں دیر نہ کی۔ دانش جو فٹ پاتھ پر کھڑا سارا واقعہ دیکھ رہا تھا۔ مہوز کا تیزی سے نکلتا خون دیکھ کر پریشان ہو گیا اور تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ ابھی کچھ ہی آگے گیا تھا کہ اس کے روٹ کی بس آگئی۔ اس کے قدم بیچ راستے میں رک گئے ایک طرف بس تھی اور دوسری طرف خون میں نہایا مہوز، دونوں طرف برابر کا فاصلہ تھا، گویا وہ محبت اور انسانیت کے بیچ معلق ہو گیا تھا چھ بجنے کو تھے اگر وہ بروقت گھر نہ پہنچ پاتا تو شاید ہمیشہ کے لیے ہانیہ کو کھو دیتا اور مہوز کی مدد نہ کرتا تو شاید وہ زندگی کھو دیتا۔

بہت کڑی آزمائش تھی یہ، دل و دماغ دونوں فیصلہ کرنے سے جواب دے چکے تھے۔ ”مدد میرے مالک“ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا اس کے قدم نفس کو قدموں تلے روندتے مہوز کی طرف بڑھتے چلے گئے۔

۞ ۞ ۞

مہوز کو اسپتال لے جانے، وہاں داخل کرانے اور اس کے گھر والوں کے آنے تک وہ جن کڑے مراحل سے گزرا۔ وہ بس وہی جانتا تھا۔ اس دوران اس نے بار بار ابا سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر رابطہ نہ ہونا تھا نہ ہوا۔

کئی گھنٹوں بعد جب مہوز کو ہوش آیا اور ساری صورتحال پتہ چلی تو، دانش کی اعلا ظرفی نے اسے گردن اٹھانے کے قابل نہ چھوڑا مگر وہ کسی بھی طرح کا احسان جتائے اور بنا کوئی پچھلی بات یاد دلائے اسے اس کے گھر والوں کے حوالے کر کے ہی لوٹا تھا۔

وہ کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح رات کے گیارہ بجے گلی میں داخل ہوا تو حیرت انگیز طور پر اس کا دل مطمئن تھا۔ اس کے گھر کے دروازے پر تالا تھا جبکہ ہانیہ کے گھر سے شور و غل کی آوازیں باہر تک سنائی دے رہی تھیں۔ گویا ابا نے اپنا کہا سچ کرتے ہوئے ڈاکٹر صارم کے رشتہ کے لیے ہاں کر دی تھی چند لمحے دروازے کے سامنے رک کر وہ اپنا ضبط آزمانے اندر چلا آیا۔ اس کی نظر سب سے پہلے سجی سنوری ہانیہ

پر پڑی تو اسے اپنا دل رکتا محسوس ہوا۔ مزید ضبط کا یارا نہ رہا تو اس نے واپسی کے لیے قدم بڑھا دیے۔

☼ ☼ ☼

ارم کی باتیں سن کر عبدالرحمٰن صاحب ششدر رہ گئے تھے۔ اپنی بیگم کے بازار سے لوٹتے ہی ان سے مشورہ کرنے کے بعد وہ کچھ سوچ کر سیدھے عبداللہ صاحب کی دکان پر چلے آئے۔ ان کا کپڑوں کا چلتا ہوا کاروبار تھا۔

"او عبدالرحمٰن اس وقت کیسے آنا ہوا؟"

عبداللہ صاحب انہیں اس وقت دیکھ کر حیران ہوئے۔ اس وقت دوکان میں کھانے کے وقفے کی وجہ سے کوئی نہیں تھا۔ کوئی گاہک بھی موجود نہیں تھا اس لیے عبدالرحمٰن صاحب نے دو ٹوک ساری بات ان سے کہہ دی۔

"میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا بھائی صاحب! آپ اتنی غیریت برتیں گے آپ نے ایک بار تو مجھ سے کہا ہوتا۔ ہمارے بے ریا رشتوں میں مادی پیمانے کب سے چلنے لگے؟" چھوٹے بھائی کے خلوص کے سامنے عبداللہ صاحب شرمندہ ہو کر رہ گئے۔

"بھائی صاحب! والدین کی سب سے بڑی خواہش یہی ہوتی ہے کہ ان کی اولاد ان کی نظروں کے سامنے رہے۔ میں تو آج تک یہی سوچ سوچ کر خوش ہوتا آیا تھا کہ میری اکلوتی بیٹی اپنوں میں جائے گی ہمیشہ میری نظروں کے سامنے رہے گی جبکہ وہ ڈاکٹر صارم امریکہ سیٹل ہونے کا ارادہ رکھتا ہے۔ میں تو مر کر بھی اپنی اکلوتی بیٹی کو سات سمندر پار نہیں بھیج سکتا" آگے آپ کی مرضی۔"

عبداللہ صاحب اگر خود کو اپنی جگہ ٹھیک سمجھتے تھے تو عبدالرحمٰن صاحب بھی اپنے شکوے میں حق بجانب تھے۔

"تو کیا خیال ہے ہم آج اپنی بیٹی کو انگوٹھی پہنانے آجائیں؟"

ان کے چپ ہوتے ہی عبداللہ صاحب ان کے حسب منشاء بولے تو انہوں نے مطمئن انداز میں مسکراتے ہوئے سب کچھ ان کی صوابدید پر چھوڑ دیا اور فون پر ڈاکٹر صارم کے گھر والوں سے معذرت کرنے لگے۔

منگنی کی چھوٹی سی تقریب کا انعقاد باہر صحن میں کیا گیا تھا۔ وقت کی قلت کے باوجود ارم اور دانیال نے پھولوں اور غباروں سے بہت خوبصورت سجاوٹ کی تھی۔

ہانیہ کو اس جھٹ پٹ منگنی پر حیران ہوتا دیکھ کر ارم ساری بات اس کے گوش گزار کر چکی تھی۔ میمونہ بیگم اس کے لاکھ نہ نہ کرنے پر بھی اسے اپنے ساتھ لے جا کر اس کی پسند کا لہنگا اور انگوٹھی لے آئی تھیں۔ چاہے جانے کا احساس کتنا خوشگوار ہوتا ہے۔ سجی سنوری ہانیہ کو بخوبی اندازہ ہو رہا تھا۔ میمونہ بیگم اس کی بلائیں لیتے نہیں تھک رہی تھیں۔ ارم اور دانیال کی شوخی بھی اپنے عروج پر تھی۔ خوشی ہر چہرے سے جھلک رہی تھی۔ صفیہ چچی بھی چہرے پر مسکراہٹ سجائے شریک ہوئی تھیں۔

"دانیال! بھائی کو فون تو لگا۔ اب تک تو اسے آجانا چاہیے تھا۔" دانش صبح سے گھر نہیں آیا تھا۔ بچوں کے اصرار پر اسے اطلاع بھی نہیں دی گئی تھی۔ اس لیے وہ اس ساری کارروائی سے لاعلم تھا مگر اتنی دیر گزر جانے کے باوجود جب اس کی واپسی نہ ہوئی تو میمونہ بیگم کو ہول اٹھنے لگے۔

دانیال کب سے اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر نیٹ ورک میں مسئلہ ہونے کی وجہ سے رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ اس وقت بھی وہ موبائل کان سے لگائے اس سے رابطہ کرنے کی کوشش میں لگا تھا۔

"وہ رہے بھائی" اسے کہتے ہیں "ڈیوڑھی میں بھائی ڈھنڈورا موبائل پہ۔" وہ جانے کو پلٹا تو پیچھے سے ارم کی چہکتی آواز سنائی دی۔

"یہ آتے ہی چوری چوری کہاں چل دیے برخوردار! صبح کے نکلے اب آ رہے ہو" اتنی آوارہ گردی سے دل نہیں بھرا جو پھر سے چل دیے۔"

ابا کی ڈانٹ میں غصہ مفقود تھا اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ہر چہرہ خوشی سے کھلا پڑ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا ارم اور دانیال نے اسے پکڑ کر ہانیہ کے پہلو میں لا بٹھایا اور اماں نے منگنی کی انگوٹھی آگے کر دی وہ حیرت سے بت بنا رہ گیا۔

"لگتا ہے اماں! بھائی شرما رہے ہیں۔" ارم اس کی حیرت سے محظوظ ہو کر چہکی تو دانیال نے لقمہ دیا۔

"اماں! آپ خود کیوں نہیں انگوٹھی پہنا دیتیں۔"

"صدقے جاؤں۔ کتنا شرمیلا ہے میرا بیٹا۔" دانیال کے کہنے پر وہ خود ہی ہانیہ کو انگوٹھی پہنانے لگیں۔ جبکہ دانش پہلو بدل کر رہ گیا۔ ظاہر ہے اس کے سوا وہ اب کر بھی کیا سکتا تھا۔

رسم ہوتے ہی کمل اور ارم ہانیہ کو لے کر اندر چلی گئیں اسے جی بھر کر اس روپ میں دیکھنے کی حسرت ہی رہی۔ [illegible] خوش خبری [illegible] سب کی خوشی [illegible] آنکھوں سے جھلکتے مان نے اسے اپنی نظروں میں معتبر کر دیا۔ ساری زندگی اس نے ان کی [illegible] مان کو تلاشا تھا۔

رات کافی ہو چکی تھی۔ اس لیے کھانا کھاتے ہی سب نے اٹھنے کی کی۔ دانش کو تو ابھی بھی یہ سب خواب لگ رہا تھا۔ وہ تو ارم اور دانیال سے گن گن کر بدلے لینے کے موڈ میں تھا مگر جب ان کی شان دار کارکردگی پتہ چلی تو حاتم طائی کی قبر پر لات مارتے ہوئے اس نے اپنا بھرا والٹ دونوں کے حوالے کر دیا اور انہیں حسب معمول لڑتا دیکھ کر ہنستا ہوا باہر چلا آیا۔

آسمان پر چودھویں کا چاند پوری تابانی سے جگمگا رہا تھا۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے اپنے کمرے میں جانے کے بجائے اوپر چلا آیا۔ حسب توقع ہانیہ چھت پر اپنی جگہ پر بیٹھی چاند دیکھنے میں محو تھی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ پورا چاند ہانی کی کمزوری ہے۔ چاندنی راتیں اسے بے خود کر دیتی تھیں اور وہ یہاں بیٹھ کر گھنٹوں چاند کو تکتی رہتی تھی۔

وہ چپکے سے آکر سیڑھیوں کے پاس دونوں چھتوں کی درمیانی چھوٹی دیوار پر بیٹھ گیا اور اس سے بھی زیادہ محویت سے اسے دیکھنے لگا۔ کاسنی اور سنہرے امتزاج کے خوبصورت لہنگے میں چاندنی میں نہائی وہ چاند کی شہزادی لگ رہی تھی۔

کسی کی نظروں کی تمازت محسوس کر کے وہ پلٹی تو اسے سامنے دیکھ کر گھبرا گئی۔ نیچے جانے کا راستہ اس کے قریب سے ہو کر جاتا تھا۔ وہ بری طرح پھنس چکی تھی نہ ٹھہر سکتی تھی نہ بھاگ سکتی تھی۔ دانش اس کی حالت کا خوب مزہ لے رہا تھا۔ اچانک اسے شرارت سوجھی۔

"ہانیہ!"

"ہوں۔" وہ اپنی چوڑیوں سے کھیلنے لگی۔

"ہمارے کالج میں ایک سرائیکی کہاوت بڑی مشہور تھی۔ بی اے دی انگلش تے چاچے دی دھی سر تے ویندن" (بی اے کی انگلش اور چاچا کی بیٹی مصیبت کی طرح سر پر پڑ جاتی ہیں) وہ نا سمجھی سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "خیر بی اے کی انگلش تو "چاچے دی دھی" کی بدولت سر سے اتر گئی مگر چاچے دی دھی "سر پڑ گئی۔"

اس کی بات سن کر اس کی شرارت کو سمجھتے ہوئے ہانیہ کو پتنگے لگ گئے۔

"کس نے تم پر زبردستی کی تھی۔ انکار کر دیتے۔"

"دل نے زبردستی کی تھی اور بھلا زندگی سے بھی کوئی انکار کر سکتا ہے۔" اس کے لہجے میں رچی محبتوں کی خوشبو اس کے دل کے تاروں کو چھیڑ گئی وہ بنا پلک جھپکے اس کی آنکھوں میں دیکھے گئی جہاں صرف محبت ہی محبت تھی۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟" اسے یوں اپنی طرف دیکھتا پا کر دانش کو حیرت ہوئی۔

جواباً ہانیہ نے بالکل اسی کے انداز میں کندھے اچکائے جیسے کہہ رہی ہو "میں بے بس ہوں" اس خوبصورت اظہار پر دانش سرشار ہو کر ہنس پڑا ہانیہ کی شرمیلی کھنک نے اس کے ساتھ دیا تھا۔

☼

مجنوں نے شہر چھوڑا تو صحرا بھی چھوڑ دے
نظارے کی ہوس ہو تو لیلیٰ بھی چھوڑ دے

واعظ! کمال ترک سے ملتی ہے یاں مراد
دُنیا جو چھوڑ دی ہے تو عقبیٰ بھی چھوڑ دے

سوداگری نہیں، یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر! جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

شوخی سی ہے سوالِ مکرر میں اے کلیم
شرطِ رضا یہ ہے کہ تقاضا بھی چھوڑ دے

واعظ! ثبوت لائے جو مے کے جواز میں
اقبال کو ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے

علامہ اقبال

لاکھ مسمار کیے جائیں زمانے والے
آ ہی جاتے ہیں نیا شہر بسانے والے

اس کی زد پر وہ کبھی خود بھی تو آ سکتے ہیں
یہ کہاں جانتے ہیں آگ لگانے والے

اب تو ساون میں بھی بارود برستا ہے
اب وہ موسم نہیں بارش میں نہانے والے

سر سے جاتا ہی نہیں وعدۂ فردا کا جنوں
مر گئے عدل کی زنجیر ہلانے والے

ہم نہ کہتے تھے تجھے وقت بہت ظالم ہے
کیا ہوئے اب وہ ترے ناز اُٹھانے والے

سائے میں بیٹھی ہوئی نسل کو معلوم نہیں
دُھوپ کی نذر ہوئے پیڑ لگانے والے

گھر میں دیواریں ہیں اور صحن میں آنکھیں ہیں سلیم
اتنے آزاد نہیں وعدہ نبھانے والے

سلیم کوثر



اتنے چُپ کیوں ہو!

اتنے چُپ کیوں ہو رفیقانِ سفر کچھ تو کہو
درد سے چُور ہوئے ہو کہ قرار آیا ہے
بھر گیا ہجر کا ہر زخم کہ جی ہار چلے
بجھ گیا شوق کہ پیغامِ نگار آیا ہے

نامرادی کی تھکن ہے کہ خمارِ شبِ وصل
جاں سلگتی ہے کہ چہروں پہ نکھار آیا ہے

کتنی اجڑی ہوئی رُت ہے کہ سکوں ہے نہ جنوں
اتنی بے فیض ہوئی بادِ بہاری کیسے
نہ کہیں نوحۂ جاں ہے نہ کہیں نغمۂ دل
کچھ تو بولو کہ شبِ درد گزاری کیسے؟
سر بزانو ہو تو کیوں چاک گریباں والو؟
بازیٔ راہِ طلب جیت کے ہاری کیسے؟

احمد فراز

اچھے عیسیٰ ہو، مریضوں کا خیال اچھا ہے
ہم مرے جاتے ہیں، تم کہتے ہو حال اچھا ہے

تجھ سے مانگوں میں تجھی کو کہ سبھی کچھ مل جائے
سو سوالوں سے یہی اک سوال اچھا ہے

دیکھ لے بلبل و پروانہ کی بے تابی کو
ہجر اچھا نہ حسینوں کا وصال اچھا ہے

آ گیا اس کا تصوّر، تو پکارا یہ شوق
دل میں جم جائے الٰہی! یہ خیال اچھا ہے

برق اگر گرمیٔ رفتار میں اچھی ہے امیر
گرمیٔ حسن میں وہ برقِ جمال اچھا ہے

امیر مینائی

شگفتہ جاہ

رنگ رنگ پھول

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ مسلمان یہود سے لڑیں گے۔ مسلمان ان کو قتل کریں گے یہاں تک کہ یہودی کسی پتھر یا درخت کی آڑ میں چھپے گا تو وہ پتھر یا درخت بولے گا کہ اے مسلمان! اے اللہ کے بندے! یہ میرے پیچھے ایک یہودی ہے۔ ادھر آ اور اس کو قتل کردے۔ مگر غرقد کا درخت نہ بولے گا۔ (یہ ایک کانٹے دار درخت ہے جو بیت المقدس کی طرف بہت زیادہ ہوتا ہے) وہ یہود کا درخت ہے۔"

(صحیح مسلم)

اجرِ نیت،

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب آگ میں جلایا جانے لگا اور آگ بھڑکائی جانے لگی تو یہ سارا منظر ایک چڑیا دیکھ رہی تھی۔ اس نے قریبی سمندر سے پانی لاکر اس آگ کو بجھانے کی کوشش کی۔

صبح سے شام ہوگئی مگر آگ نہ بجھی۔ چڑیا کے اس کام کو ایک کوا دیکھ رہا تھا۔ اس نے چڑیا سے کہا۔

"جب تمہیں پتا تھا کہ یہ آگ نہیں بجھے گی تو پھر اتنی محنت کیوں کررہی ہو؟"

چڑیا نے جواب دیا۔ "میں اپنے حصے کی محنت کر رہی تھی تاکہ — قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے ہاں جواب دے سکوں کہ میں نے سچائی کی راہ میں اپنا حصہ ڈالا ہے۔"

عروشہ صدف ریاض۔ سیالکوٹ

نصیب،

ایک حسین کنیز راجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں رقص کررہی تھی۔ رنجیت سنگھ بہت بدصورت تھا۔ رقص کے بعد کنیز نے راجہ سے ایک سوال کی اجازت طلب کی۔ راجہ نے کہا کہ "پوچھو۔" کنیز نے کہا۔

"جب خدا حسن تقسیم کررہا تھا اس وقت آپ کہاں تھے؟"

راجہ نے غصہ نہ کیا بلکہ مسکراتے ہوئے کہا۔

"جب تو حسن کی لائن میں کھڑی حسن مانگ رہی تھی تو میں قسمت کی لائن میں کھڑا قسمت لے رہا تھا۔ اور آج تجھ جیسی حسن والیاں میری کنیزیں ہیں۔"

ثمرہ واقف۔ کراچی

اسمگلر،

شیخ ابوالحسن نوری دریا کے گھاٹ پر وضو کرنے آئے تو دیکھا کہ دریا کے کنارے چند کشتیاں کھڑی تھیں اور ان میں شراب کے مٹکے رکھے جارہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ شراب خلیفہ "معتضم باللہ" کے لیے لے جائی جارہی ہے۔ آپ کا چہرہ سرخ ہوگیا اور اپنی لاٹھی سے سارے مٹکوں کو چکنا چور کردیا۔ گھاٹ کے نگران نے آپ کو پکڑ کر خلیفہ کے دربار میں پیش کردیا۔ خلیفہ نے نہایت غصے سے پوچھا۔

"تم کون ہو اور یہ سب کیوں کیا ہے؟"

آپ نے اطمینان سے فرمایا۔ "میں محتسب ہوں۔ میں نے یہ کام اللہ اور اس کے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق کیا ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ امر بالمعروف کرتے رہو، میں نے یہ کام بھلائی کے لیے کیا ہے۔ کیا تم پسند کرتے ہو کہ تم جہنم کا ایندھن بنو؟"

درباریوں نے دیکھا اور تاریخ میں یہ واقعہ محفوظ ہو گیا کہ بنو عباسیہ کا سخت گیر حکمران ایک اللہ والے کا دامن پکڑے اپنی مغفرت کے لیے دعا کروا رہا تھا۔

شاہدہ شبیر۔ رحمان گڑھ

خوش نصیب،

ایک بار امیر معاویہ نے دربار میں پوچھا۔

"خوش نصیب کون ہے؟"

ہر ایک نے اپنے خیال کے مطابق جواب دیا۔ ایک درباری نے کہا۔ "اے امیر! آپ ہی بتائیں۔"

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا۔

"وہ شخص جس کے گھر میں اچھی خوش مزاج اور نیک بیوی ہو، سواری کے لیے گھوڑا ہو اور ہم لوگوں (حکومت) سے دور رہتا ہو۔"

مدیحہ، ندا۔ کراچی

اقوالِ زریں

- کہاوتیں اور مثالیں عقلمندوں اور عبرت حاصل کرنے والوں کے لیے بیان کی جاتی ہیں۔ جاہلوں کو ان سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ (حضرت علی رضی اللہ عنہ)
- آپ سیکھنا چاہیں تو آپ کی ہر غلطی آپ کو سبق دے سکتی ہے۔ (ارسطو)
- دنیا میں کئی عجوبے ہیں لیکن انسان سے بڑا عجوبہ کوئی نہیں ہے۔ (سوفوکلس)
- نظر جب تک نہ اٹھے پاک ہے۔ (بوعلی سینا)
- اکثر مصائب جو امیروں کو درپیش ہوتے ہیں، غریب ان سے محفوظ رہتے ہیں۔ (گرونانک)
- سب سے بڑا علم نیکی ہے اور سب سے بڑی جہالت بدی ہے۔ (سقراط)
- اپنی نیکیوں کے لیے پوشیدہ جگہ بناؤ جیسے برائیوں کے لیے بناتے ہو۔ (یحیٰی برمکی)
- جو لوگ مطالعہ نہیں کرتے ان کے پاس سوچنے کے لیے بہت کم باتیں ہوتی ہیں۔

شبنم شمشاد۔ یزمان

نقطۂ دانش،

تکلیفوں سے مت گھبراؤ کیونکہ تکلیفیں انسان کو سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔ سوچنے سے آدمی دانا بنتا ہے اور دانائی آدمی کو جینے کے قابل بناتی ہے۔

(جان پیٹرک)

کرن، بینش۔ کراچی

عظمتِ انسانیت،

قیس ابن احنف نے کہا۔

"کوئی شخص مجھے تکلیف پہنچاتا ہے تو میں اس کے بارے میں غور کرتا ہوں۔ اگر اس کا مرتبہ مجھ سے بڑا ہے تو اس کی بڑائی میرے لیے جواب دینے میں مانع ہوتی ہے۔ اگر وہ میرا ہم مرتبہ ہے تو میں اس پر مہربانی کرتا ہوں۔ اسے جواب نہیں دیتا۔ اگر وہ مجھ سے کم مرتبہ ہے تو میں اس سے مقابلہ کرنا اپنی توہین سمجھتا ہوں۔"

لائبہ، ایمن۔ آزاد کشمیر

دانش،

میں یہ دعا نہیں کرتا کہ دشمن مرجائے، میں یہ دعا کرتا ہوں کہ دوست زندہ ہوجائیں۔

(واصف علی واصف)

عذرا، اقصٰی۔ کراچی

اصل دلچسپی

شہر سے جانے والے فٹ بال کے کھلاڑی اپنے گاؤں کے چند جوانوں کو جمع کرکے فٹ بال سکھا رہے تھے۔ کھیل کے قواعد بیان کرنے کے بعد بولے۔

"اب میں آپ کو لگے بندھے اصولوں سے ہٹ کر راز کی ایک بات بتاؤں۔ اگر آپ فٹ بال کو کک نہ لگا سکیں تو کم از کم مخالف ٹیم کے کسی کھلاڑی کو ایک کک ضرور لگادیں۔"

پھر انہوں نے کہا۔

"چلو اب کھیل شروع کرتے ہیں۔"

"فٹ بال کہاں ہے؟"

"فٹ بال کو گولی مارو جی! بس کھیل شروع کرتے ہیں۔" ایک نوجوان جوش سے بولا۔

عابدہ نشاد۔ کراچی

احمق

ایک غوطہ خور سمندر میں قیمتی موتی تلاش کر رہا تھا کہ اس نے ایک شخص کو پانی میں اترتے دیکھا جو فیشن ایبل جیکٹ اور پتلون میں ملبوس تھا۔ غوطہ خور نے حیران ہو کر اپنی روشن پلیٹ پر لکھا۔

"آپ کھلے سمندر کی گہرائی میں عام لباس میں کیا کر رہے ہیں؟"

"ڈوب رہا ہوں بے وقوف!" اس نے جواب دیا۔

عظمیٰ غلام نبی۔ فیصل آباد

رہنمائی

نشے میں دھت ایک صاحب فٹ پاتھ پر لڑکھڑاتے چلے جا رہے تھے۔ سامنے سے آتے ہوئے ایک پولیس مین نے انہیں روکا اور بارعب لہجے میں پوچھا۔

"تمہیں پتا ہے میں کون ہوں؟"

"نہیں۔" ان صاحب نے کپکپاتے لہجے میں جواب دیا۔ "لیکن اگر تم مجھے بتا دو کہ تم کہاں رہتے ہو تو میں تمہیں گھر پہنچانے کی کوشش کروں گا۔"

شبنم شمشاد۔ یزمان

نٹ کھٹ لکیریں

- عقل نام ہے یہ جاننے کا کہ آپ کتنے بے وقوف ہیں۔
- خاص آدمیوں میں اچھا صرف وہ ہوتا ہے جو عام آدمی ہو۔
- "صلاحیت" نام ہے اس کا کہ آپ کیا کر سکتے ہیں، "ہمت" یہ کہ آپ کس حد تک کر سکتے ہیں اور "نیت" یہ کہ کتنا اچھا کر سکتے ہیں۔
- اگر آخری منٹ نہ ہو تو کبھی کوئی کام نہ ہو سکے۔
- بے وقوفوں کی محفل میں عقل مند اچھا خاصا بے وقوف لگتا ہے۔
- آپ جتنا بھاگنا چاہیں بھاگ لیں، ماضی کبھی آپ کا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔
- آدمی بلندیوں کو اس وقت چھوتا ہے، جب جھک کر کسی گرے ہوئے کو اٹھا رہا ہو۔
- یادداشت کھو بیٹھنے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ آدمی روزانہ نئے آدمیوں سے ملتا ہے۔

شاہدہ شبیر رانا۔ رحمان گڑھ

باتیں اشفاق احمد کی

- منزل قریب آنے پر مسافر ایک دوسرے سے اور ساربان سے دور ہونے لگتے ہیں۔ منزل بھی کیا محبوب ہے کہ جب قریب آجاتی ہے تو محبت کرنے والے ایک دوسرے کے رقیب بن جاتے ہیں۔
- جب زندہ آدمی کا اندر مر جاتا ہے تو وہ بڑا خوش اخلاق شائستہ ہو جاتا ہے اور شمع زندگی کے پروانے اس سے نور حاصل کرنے کے لیے دور دور سے آکر گرنے لگتے ہیں۔
- پھولوں سے محبت کرنے والے کیا مرد کیا عورتیں؟ وہ پھولوں کی خوشبو سے، ان کی رنگت سے، ان کی گھڑت سے پیار نہیں کرتے بلکہ ان کے ہونے سے پیار کرتے ہیں۔

(اشفاق احمد۔ سفر در سفر)

رضوانہ شکیل راؤ۔ لودھراں

خوشیاں اور غم

اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدمؑ کا پتلا بنایا تو اس کو بنانے کے بعد اس پتلے پر انتالیس دن رنج، غم اور پریشانی کی ہوائیں چلائیں اور صرف ایک دن خوشی اور بے فکری کی ہوا چلائی۔ یہی وجہ ہے کہ انسان غمگین زیادہ اور خوش کم رہتا ہے۔ کبھی کبھی کوئی وجہ بھی نہیں ہوتی اور دل اداس ہو جاتا ہے۔ دولت، عزت، شہرت ہونے کے باوجود تفکرات اور پریشانیاں انسانوں کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔"

کرن بشیر۔ کراچی

قانون

ایک صاحب درمیانی درجے کے ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے کے بعد کاؤنٹر پر بل ادا کرتے ہوئے بولے۔

"واش بیسن پر جو تولیہ لٹکا ہوا ہے، وہ اس قدر غلیظ ہے کہ شاید اس سے کوئی پوچا لگانا بھی پسند نہ کرے۔ تمہیں پتا نہیں ہے شاید کہ محکمہ صحت نے ایک قانون منظور کیا ہے کہ ہوٹلوں میں لٹکائے جانے والے تولیوں کو ہفتے میں کم از کم ایک بار ضرور دھو لیا جائے اور اس قانون کو منظور ہوئے ایک مہینہ ہو چکا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے جناب!" کاؤنٹر کلرک نے لاپروائی سے جواب دیا۔ "لیکن یہ تولیہ اس قانون کے منظور ہونے سے پہلے کا لٹکا ہوا ہے، اس لیے یہ قانون اس پر لاگو نہیں ہوتا۔"

صائمہ جبیں۔ کراچی

پوری زندگی

"انسان کو بولنا سیکھنے میں ایک سال لگتا ہے پر کون سا لفظ کہاں بولنا ہے، یہ سیکھنے میں پوری زندگی لگ جاتی ہے۔"

دیویا سونی۔ ٹنڈو الہ یار

خدا کی یاد

کسی نے حضرت عثمان الخیریؒ سے پوچھا کہ "زبان سے خدا کو یاد تو کرتا ہوں مگر دل اس کے ساتھ موافقت نہیں کرتا۔" حضرت عثمان الخیریؒ نے فرمایا۔

"شکر کرو کہ ایک عضو تو مطیع ہوا دوسرا بھی ہو جائے گا۔"

سنہری اقوال

- نماز میں قلب کی، مجلس میں زبان کی، غضب میں ہاتھ کی اور دستر خوان پر شکم کی حفاظت کرو۔
(حکیم لقمان)
- جب کئی دن تمہاری رائے بدلتی رہتی ہے تو پھر اپنی رائے پر بھروسہ کیوں کرتے ہو۔
(بو علی سینا)
- مہمان کے آگے تھوڑا کھانا رکھنا بے مروتی ہے اور حد سے زیادہ رکھنا تکبر۔
(امام غزالیؒ)

صائمہ سلیم۔ گوجرہ

ہارمونیم کا کمال

ایک صاحب نے اپنے دوست کو کار سے اترتے دیکھ کر کہا۔

"آپ تو کہہ رہے تھے کہ آپ کے پاس کار خریدنے کے لیے رقم نہیں ہے مگر آپ نے تو اچھی خاصی سیکنڈ ہینڈ کار خرید لی ہے۔"

"دراصل یہ مجھے اپنے ہارمونیم کے بدلے میں ملی ہے جس پر میں روزانہ ریاض کیا کرتا تھا۔" دوست نے بتایا۔

ان صاحب نے حیرت زدہ ہوتے ہوئے پوچھا۔ "کمال ہے۔ ایسے پرانے اور پھٹیچر ہارمونیم کے بدلے کس احمق نے آپ کو یہ اچھی خاصی کار دے دی؟"

"بھئی یہ صاحب سیکنڈ ہینڈ کاروں کے ڈیلر ہیں اور میرے پڑوسی ہیں۔" دوست نے اطمینان سے بتایا۔

عائشہ، تحریم۔ فیصل آباد

باتیں

دو عورتوں کو چھ ماہ کی سزا ہوئی۔ انہیں ایک ہی کوٹھری میں رکھا گیا۔ وہ مسلسل چھ ماہ تک باتیں کرتی رہیں۔ جب جیل سے رہا ہوئیں تو وہ باہر نکلیں۔ ایک نے دوسری سے کہا۔

"آؤ بہن! ذرا درخت کی چھاؤں میں بیٹھ کر کچھ باتیں کر لیں۔ آج تو ہمیں بچھڑ ہی جانا ہے۔"

ام عمیرہ۔ نو تھیہ گلبہار

سرورق کی شخصیت

ماڈل	ایشا
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافر	موسیٰ رضا

خالدہ جیلانی

میری بیاض سے

حرمت ردا اکرم ———— ڈتوال

قدم قدم پہ صلیبوں کے جال پھیلا دو
کہ سرکشوں کو تو عادت ہے سر اٹھانے کی
شریکِ جرم نہ ہوتے تو مخبری کرتے
ہمیں خبر ہے لٹیروں کے ہر ٹھکانے کی

سورٹھ ساند ———— روحل وائی گاؤں

چلو عذاب سہیں دوستی کے، یونہی سہی
کہ وہ کسی کا ہوا ہم کسی کے، یونہی سہی

ایمان آصف ———— دیپال پور

اب رفتگاں کی بات نہیں کارواں کی ہے
جس سمت بھی ہو گرد سفر جانا چاہیے

پارس بلوچ ———— ڈہرکی

تمام عمر اسی کے رہے یہ کیا کم ہے
بلا کے عشق حقیقی نہ تھا مجازی تھا
نہ دوست یار، نہ ناصح نہ نامہ بر نہ رقیب
بلاکشانِ محبت سے کون راضی تھا

ایمن علی ———— کہوٹہ

یہ مسئلہ اب اہلِ محبت کا ہے اپنا
مرتے ہیں تو کچھ آپ پر احساں نہیں کرتے

آمنہ اجالا ———— ڈہرکی

جو کہا ہم نے وہ مضمون اور تھا
ترجماں کی ترجمانی اور ہے
نامہ بر کو کچھ بھی ہم پیغام دیں
داستاں اس نے سنائی اور ہے

نمرہ، اقرا ———— کراچی

یہی سنا ہے ستارہ شناس لوگوں سے
کہ ریت پہ کوئی منزل سجائے بیٹھے ہیں
گزشتہ سال کے زخموں کو بھولنے کے لیے
آئندہ سال پہ نظریں لگائے بیٹھے ہیں

صبا سلیم ———— ٹنڈو جان محمد

میں وہ دل ہوں دبستان الم کا
جسے روئے گی صدیوں شادمانی
نئی دنیا کے ہنگاموں میں ناصر
دبی جاتی ہیں آوازیں پرانی

شافیہ اسلم ———— ہری پور

نہ دید ہے نہ سخن، اب نہ حرف ہے نہ پیام
کوئی بھی حیلۂ تسکیں نہیں اور آس بہت ہے
امیدِ یار، نظر کا مزاج، درد کا رنگ
تم آج کچھ بھی نہ پوچھو کہ دل اداس بہت ہے

عائشہ بلوچ ———— ڈی، آئی خان

ہر جرم میری ذات سے منسوب ہے محسن
کیا میرے سوا اس شہر میں معصوم تھے سارے

شائستہ اکبر ———— ڈگری کالج گدو

جب بھی چاہیں اک نئی صورت بنا لیتے ہیں لوگ
ایک چہرے پر کئی چہرے سجا لیتے ہیں لوگ
مل بھی لیتے ہیں گلے وہ اپنے مطلب کے لیے
آ پڑے مشکل تو نظریں بھی چرا لیتے ہیں لوگ

سفینہ زاہد حسین ———— کوئٹہ

نامہ بروں کو کب تک ہم کوئے یار بھیجیں
وہ نامراد آئیں، ہم بار بار بھیجیں
ہم کب سے منتظر ہیں اس موسم جنوں کے
جب زخم تہنیت کے یاروں کو یار بھیجیں

عقیلہ حنا ———— رینالہ خورد

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

مسز بشریٰ افضل بٹ ———— رینالہ خورد

پختہ تر ہے گردش پیہم سے جام زندگی
ہے یہی اے بے خبر راز دوام زندگی

فرزانہ سہیل ———— میاں چنوں

وہ دشمن جاں، جان سے پیارا بھی کبھی تھا
اب کس سے کہیں، کوئی ہمارا بھی کبھی تھا
تتلی کے تعاقب میں کوئی پھول سا بچہ
ایسا ہی کوئی خواب ہمارا بھی کبھی تھا

شائستہ اکبر ———— ڈگری کالج گدو

وہ ٹھہرتا کیا کہ گزرا تک نہیں جس کے لیے
گھر تو گھر ہر راستہ آراستہ میں نے کیا

مریم رانا ———— ٹنڈو جان محمد

وہ حیلہ گر ہیں جو مجبوریاں شمار کریں
چراغ ہم نے جلائے، ہوا کے ہوتے ہوئے

سیدہ زہرا بخاری ———— جتی سیداں

دیکھو یہ میرے خواب تھے، دیکھو یہ میرے زخم ہیں
میں نے تو سب حسابِ جاں برسرِ عام رکھ دیا

سارہ شیخ ———— کراچی

شکوۂ ظلمتِ شب سے تو کہیں بہتر تھا
اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے
کتنا آساں تھا ترے ہجر میں مرنا جاناں
پھر بھی اک عمر لگی جان سے جاتے جاتے

رضوانہ شکیل راؤ ———— لودھراں

وہ آ گئے تو قلب کی تالیف ہو گئی
رخصت ہوئے تو پھر وہی تکلیف ہو گئی
محشر میں اک سوال کیا تھا کریم نے
ہم سے وہاں بھی آپ کی تعریف ہو گئی

شفق طاہر ———— گوجرہ

مسلسل ہوں ملاقاتیں تو دلچسپی نہیں رہتی
یہ بے ترتیب یارانے بڑے رنگین ہوتے ہیں

حرا شاہ ———— شجاع آباد

بھول جانا تو سب کو آتا ہے
کچھ تو دنیا سے منفرد کر لو

آسیہ جاوید ———— علی پور چٹھہ

اب تمہیں بھی شہر والوں کی ہنسی ڈسنے لگی
میں نہ کہتا تھا میرا دکھ تم نہ اپنایا کرو
کل تھکے ہارے پرندوں نے نصیحت کی مجھے
شام ڈھل جائے تو محسن تم بھی گھر جایا کرو

سدرہ تحسین ———— چوک اعظم لیہ

دلوں کی ماندگی پہ کیا تعجب
کہ سورج بھی تو ڈھلنا چاہتا ہے
نشستِ درد بدلی ہے تو اب دل
ذرا پہلو بدلنا چاہتا ہے

عینی ———— لاہور

مکمل دو ہی دانوں پر یہ تسبیح محبت ہے
جو آئے تیسرا دانہ یہ ڈوری ٹوٹ جاتی ہے
مقرر وقت ہوتا ہے محبت کی نمازوں کا
ادا جن کی نکل جائے قضا بھی چھوٹ جاتی ہے

سیدہ فرزانہ ———— حجرہ شاہ مقیم

تو جو بچھڑا ہے تو محسوس ہوا ہے اکثر
جیسے کوئی دیتا ہے دور سے آواز مجھے

امت الصبور

خاموش کی ڈائری

اک دن خوشبو بن جاتے ہیں
لوگ محبت کرنے والے

شہزادی وقار النساء کی ڈائری سے

یہ کائنات کچھ لوگوں کے لیے دریا خلوص اور بے غرض چاہت کے دم سے ہی قائم و دائم ہے جو اپنے دکھوں کو سینے میں چھپا کر دوسروں کے لیے خوشیوں اور مسرتوں کا سامان کرتے ہیں۔ اپنے دکھوں کی آنچ میں خود تو سلگتے رہتے ہیں مگر اس کی تپش دوسروں تک پہنچنے نہیں دیتے۔ امجد اسلام امجد کے یہ خوبصورت الفاظ شاید ایسے ہی لوگوں کے لیے ہیں۔

چپکے چپکے جل جاتے ہیں
لوگ محبت کرنے والے
بروا سنگ نکل جاتے ہیں
لوگ محبت کرنے والے

آنکھوں آنکھوں چل جاتے ہیں
تاروں کی قندیل لیے
چاند کے ساتھ ہی ڈھل جاتے ہیں
لوگ محبت کرنے والے
دل میں پھول کھلا دیتے ہیں
آگ میں راگ جگا دیتے ہیں
پانی بیچ بتاشے صورت
خود تو گھلتے رہتے ہیں
غم کو شہد بنا دیتے ہیں

لوگ محبت کرنے والے
تتلی تتلی لہراتے ہیں
پھولوں کی امید لیے

ڈاکٹر کومل ستار کی ڈائری سے

کائنات میں یہ سب شاید محبت کا ہیر پھیر ہی تو ہے جینے کی وجہ ہر شخص سے جڑی۔ ہر نئی راہ پر منتظر۔ ہر رشتے کا ... کتنے ہی تو روپ ہیں اس کے۔ تب ہی تو شاعروں نے اس پر دیوان کے دیوان بھر ڈالے مگر پھر بھی یہ بیاں نہ ہو پائی مگر منور جمیل نے ایک بہت ہی عمدہ کوشش اس چھوٹی سی نظم میں کی ہے جس کا نام بھی محبت ہے۔

کبھی سوچنا اسے
گیت گاتی فضاؤں میں
کبھی شام شہر ملال میں
اسے ڈھونڈنا...

شازیہ اقبال ملک کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر منیر نیازی کی یہ غزل آپ سب قارئین بہنوں کے لیے۔

اس شہر سنگ دل کو جلا دینا چاہیے
پھر اس کی خاک کو بھی اڑا دینا چاہیے

ملتی نہیں پناہ ہمیں جس زمیں پر
اک حشر اس زمیں پہ اٹھا دینا چاہیے

حد سے گزر گئی ہے یہاں رسم قاہری
اس دہر کو اب اس کی سزا دینا چاہیے

اک تیز رعد جیسی صدا ہر مکان میں
لوگوں کو ان کے گھر میں ڈرا دینا چاہیے

گم ہو چلے ہو تم تو بہت خود میں اے منیر
دنیا کو کچھ تو اپنا پتہ دینا چاہیے

ماریہ سید واجد علی کی ڈائری سے

حمیرا راحت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ نہ صرف اچھی افسانہ نگار ہیں بلکہ عمدہ شاعرہ کے طور پر بھی منظر عام پر آ رہی ہیں۔ "آنچل میں اداسی" حمیرا راحت کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ اس مجموعے سے ایک حقیقت سے قریب تر غزل آپ کی نذر کر رہی ہوں۔ امید ہے آپ کو پسند آئے گی۔

ذہن ہے خاموش دل ٹھہرا ہوا افکار چپ
مدتوں سے ہیں مرے گھر کے در و دیوار چپ

ہر طرف مقتل میں انسانی لہو پھیلا رہا
اور رہے انسانیت کے مارے بھیگے دار چپ

جیسے خاموشی کی تہہ میں کوئی ہنگامہ پلے
یوں اچانک ہو گئے ہیں چیختے بازار چپ

نیک و بد کے درمیاں جو فرق تھا، جاتا رہا
آدمی تو بولتا ہے، ہو گیا کردار چپ

خواہشوں کا رزق ہیں اب تو قلم کی حرمتیں
حرف بھی خاموش ہے اور لفظ کا معیار چپ

نام پر عزت کے پھر اک قتل، چھوٹی سی خبر
اس کا پس منظر ہے کیا؟ ہے آج کا اخبار چپ

نمرہ، اقرأ کی ڈائری سے

باذوق افراد کی ڈائری اور لائبریری ناصر کاظمی کے بغیر ادھوری ہوتی ہے۔ شکستگی، مایوسی، بے چارگی، تنہائی، شگفتگی، آس اور امید کے ست رنگ موتیوں کی لڑی، آپ سب کے لیے پسندیدہ ترین غزل۔

دل میں اک لہر سی اٹھی ہے ابھی
کوئی تازہ ہوا چلی ہے ابھی

شور برپا ہے خانۂ دل میں
کوئی دیوار سی گری ہے ابھی

بھری دنیا میں جی نہیں لگتا
جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی

تو شریک سخن نہیں ہے تو کیا
ہم سخن تیری خامشی ہے ابھی

یاد کے بے نشاں جزیروں سے
تیری آواز آ رہی ہے ابھی

شہر کی بے چراغ گلیوں میں
زندگی تجھ کو ڈھونڈتی ہے ابھی

سو گئے لوگ اس حویلی کے
ایک کھڑکی مگر کھلی ہے ابھی

تم تو یارو ابھی سے اٹھ بیٹھے
شہر میں رات جاگتی ہے ابھی

کچھ تو نازک مزاج ہیں ہم بھی
اور یہ چوٹ بھی نئی ہے ابھی

روشن حرف وہ سارے

ریحا چوہدری

وہ حلقہ یاراں ' وہ مری شوخ مزاجی ...!
کچھ بول بھی اے گردش حالات کہاں ہیں؟
حیرانی ہے کہ کسی ضدی بچے کی طرح دامن سے لپٹ گئی ہے کہ کیا واقعی میں اتنی بدل گئی ہوں؟ کبھی وہ دن تھے کہ ڈھیروں خطوط شعاع ' خواتین کے نام لکھے رہ جاتے تھے مگر کوئی نامہ بر بجھائی نہ دیتا تھا اور اب اتنے وسائل..... مگر پھر بھی اتنا عرصہ گزر گیا۔

کار جہاں کی بات ہو تو کیسے ممکن ہے کہ امجد اسلام امجد کی

"روشنی مزاجوں کا کیا عجب مقدر ہے حرز جاں نہ بنے"
بلکہ اگر اسی نظم کو میں اپنی زندگی کا سب سے بڑا سچ قرار دوں تو تعجب نہ ہو گا۔ خیر' چلتے ہیں سلسلے کی طرف۔

(1) دھوپ چھاؤں سی زندگی میں جب دھوپ ڈھلنے کا نام ہی نہ لے اور چھاؤں صرف خوابوں ' خیالوں تک محدود رہ جائے تو ان کڑے لمحات میں خالق کے ساتھ مخلوق کا تعلق خود بخود پختہ ہو جاتا ہے۔ ایسے میں بے اختیار یہ نظم لبوں پہ گردش کرتی ہے۔

"شکر ہے کہ سکھ کی ساری دعائیں قبول نہیں ہو جاتیں۔

ورنہ ہم اپنے آپ کو کبھی سن سکیں
چھو سکیں ' نہ دیکھ سکیں....."

بارہا دل میں کچھ خواہشات اتنی جڑ پکڑ لیتی ہیں کہ لگتا ہے۔

"بھلائیں اس کو تو ہم جاں سے جاتے ہیں۔"

لانگ ڈرائیو پہ جاؤں یا پھر شاپنگ کے لیے لاہور جا رہی ہوتی ہوں تو کوئی نہ کوئی ظالم جگا دیتا ہے۔ خوابوں کی نگری سے واپس آنا کتنا تکلیف دہ ہے' ایسے میں بے اختیار دل سے آہ نکلتی ہے۔

خواہشوں کا بھی کوئی معیار ہوا ہے
کیسی خواہش ہے کہ مٹھی میں سمندر ہوتا

محبت ایک لافانی جذبہ' ایک اٹل حقیقت..... آج کل ہم اس وائرس کے پوری طرح زیر اثر ہیں.....

جونم میری بہت بہت پیاری سی فرینڈ ہے اس کو سوچتے ہی فوراً "فیض صاحب یاد آتے ہیں۔

تجھ کو دیکھا تو سیر چشم ہوئے
تجھ کو چاہا تو اور چاہ نہ کی

میں حیران ہوتی ہوں کہ جونم کو فیض صاحب نے دیکھا تو ہرگز نہیں ہے پھر یہ غزل کیسے لکھی گئی.....

ایک تو محبت کی جان لیوا بیماری' پھر قیامت کی گرمی' مزید ستم گھر والوں کی بے حسی یعنی روٹیاں پکانا میری ذمہ داری' دن میں تین دفعہ روتے دھوتے ہوئے یہ کام سرانجام دیا جاتا ہے' ہاں' مگر شام کو جونم کے ساتھ جس دن چیٹنگ ہو جائے تو ہم خوشی خوشی اس شعر کا ورد کرتے ہوئے یہ آگ کا دریا بھی عبور کر لیتے ہیں کہ

دنیا ساری غم ہی غم ہے
تیرا نام تلافی ہے

جونم کا سوچتے ہی عدیم کو داد و تحسین سے نوازا جاتا ہے' جنھوں نے میری مشکل یوں آسان کی۔

تو بظاہر تو ملا تھا ایک لمحے کو عدیم
عمر ساری چاہیے تجھ کو بھلانے کے لیے

اور آج کل چونکہ ہمیں "ٹھکانے لگانے کی باتیں ہو رہی تو بارہا آئیڈیل پوچھا جاتا ہے' جس کا جھنجھٹ ہم نے پالا ہی نہیں تو بے اختیار لبوں سے نکلتا ہے۔

ہم عجب طرز کے لوگ تھے
ہمارے اور ہی روگ تھے

(2) شاعری سے ہماری آشنائی بہت بچپن سے ہے مگر باقاعدہ تعارف کا بھی سوچوں تو لگتا ہے کہ جب شعور کی وادی میں قدم رکھا تو شاعری میری ہم دم و ہم قدم تھی گویا۔

"تمہارا عکس تھا دل میں تمہارے نام سے پہلے"

شاعری کے کچھ جانے پہچانے نام جو میرے فیورٹ ہیں' وہ سب ہی کے ہوتے ہیں' لہٰذا میں ذکر کروں گی آج سے آٹھ سال پہلے کا جب شعاع اپریل کے شمارے میں عظمیٰ جون کی ایک نظم شائع ہوئی تو پھر میں نے بس انہی کا نام ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ نظم تھی۔

میرے دل سے لے کر تیرے سنگ دل تک
گماں کی چٹان اور حقیقت کی سل تک
جو آنکھوں سے میری تیرے کاکل تک
بُنا تھا محبت کی مکڑی نے جالا
زمانے کے ہاتھوں نے وہ تار الفت
یہاں سے وہاں تک کبھی نوچ ڈالا
تو دونوں ہی دل اب رہا ہو چکے ہیں
چٹاں اور وہ سل بھی جدا ہو چکے ہیں
وہ آنکھیں وہ کل بھی فنا ہو چکے ہیں
وہ چاہت نجانے کدھر کو گئی ہے
وہ مکڑی بھی شاید کہیں کھو گئی ہے

لیکن بات یہاں پر کیسے ختم ہو سکتی ہے' کیونکہ یہ ایسی نظم ہے جو مجھے اَز حد پسند ہے مگر اس کے شاعر سے تعارف کی خواہش تو گویا حسرت بن چکی ہے' اب آپ کے تعاون سے شاید پتہ چل جائے۔

کوئی دیوار رہنے دو
فقط اظہار رہنے دو
سفر میں ساتھ چل کر بھی
ہمیں اس پار رہنے دو
نہ آنکھوں میں سماؤ تم
نہ ہم کو خاک ہونے دو
نہ ترسیں تیری قربت کو
ہمیں بے باک رہنے دو
ہمیں اشعار میں لکھو
مگر نہ گنگناؤ تم
کتابوں میں کہیں رکھ کر
ہمیں پھر بھول جاؤ تم
سنو! تم سے یہ کہنا ہے
سفر میں دھول ہونے تک
کوئی بھی بھول ہونے تک
مجھے تم مانگ لینا بس
دعا قبول ہونے تک!!

(3) یہاں آکر تو مجھے باقاعدہ رک کر سوچنا پڑا اگر یہ جو بے ساختہ والی بات ہے ناں..... ایسا حسین لمحہ تو ابھی تک نہیں آیا۔ ہاں' اگر پڑھنے کی شرط نہ ہوتی بلکہ "آپ کے لیے" "شعر کہا ہوتا تو یقیناً" اب صفحے کالے ہوتے کیونکہ بہت ساری فرینڈز نے بہت سے اشعار لکھے جن کے بعد خصوصی بریفنگ دی جاتی تھی کہ کیوں کہے ہیں۔

شعر بے ساختہ پڑھا تو نہیں البتہ بے ساختہ لکھا ضرور گیا' وہ بھی کوئی چند ماہ پہلے جب ایگزام زوروں پر تھے اور اسٹوڈنٹ کو کوئی غیر نصابی بات کرنے کی اجازت کم از کم میری طرف سے نہیں تھی تو ایک روز جب میں بورڈ پہ کچھ لکھ رہی تھی' واپس پلٹی ہوں تو ایک عدد چٹ مجھے ٹیبل پہ نظر آئی جس کو بے دھیانی میں پرے کیا اور بک اٹھا کر وہ ٹاپک کلیئر کرنے لگی۔ بک کو ٹیبل پہ رکھا' بورڈ پہ پھر کچھ لکھا تو چٹ دوبارہ بک پر موجود پھر ایسے ہی بے جان کاغذ کا پرزہ سمجھ کر سائیڈ پہ کر دیا مگر جب بیگ اٹھا کر کلاس سے جانے لگی تو وہی چٹ اب کی بار بیگ پر پڑی تھی۔

اب میں متوجہ ہوئی' اس کو کھولا اور سمجھیں رنگ اڑ گیا۔ اتنی جرات' میں نے خود کو کمپوز رکھا۔

کلاس کو ایک نظر گھورا، مجرم سامنے ہی سر جھکائے بیٹھے تھے مگر میری آج تک سمجھ میں نہیں آیا کہ اصل میں وہ کارنامہ کس کا تھا، چونکہ تینوں شائننگ اسٹوڈنٹس تھیں سو میں عزت افزائی کیے بغیر کلاس چھوڑ آئی۔

فوراً اسٹاف روم پہنچی، آئینہ دیکھا، پھر دوبارہ وہ کاغذ دیکھا جس پر لکھا تھا۔

کالے لباس میں گوری تو یوں دکھے ایمان سے
جیسے کہ چاند چمکے کوئلے کی کان سے

گھر میں اس بات پہ بہت ریکارڈ لگا کیونکہ اس سے کچھ دن پہلے ہی کچھ معصوم بچوں کی طرف سے لیڈ پنسل سے لکھے گئے دو لو لیٹرز موصول ہوئے تھے، خیر یہ تو بچکانہ سی ایک حرکت تھی مگر حیرت اب بھی اتنی شدید ہے کہ اتنے چھوٹے بچے اور ایسی باتیں...... ویسے ایمانداری کی بات ہے کہ اتنا غیر معیاری شعر اس سے پہلے میری نظر سے نہیں گزرا تھا۔

اور ہاں یاد آیا، ایک دفعہ بے ساختہ ایک مصرعہ پڑھا گیا تھا میرے لیے مگر تعریفی نہیں تنقیدی انداز سے...... کسی گیدرنگ میں میری معصومیت پہ باتیں ہو رہی تھیں۔ (شکل ہی ایسی ہے) کہ اچانک میری قریبی دوست بولی شکل پہ نہیں، نام پہ غور فرمائیے۔ اتنی معصوم بھی نہیں ہے یہ اور ویسے بھی آپ نے سنا تو ہو گا۔

"ہمیں کو اب کچھ نظر آتے ہیں کچھ"

اس نے اتنا برجستہ کہا کہ میں آج بھی اس بات کو دل کھول کر انجوائے کرتی ہوں بلکہ بارہا جب تعریف مبالغہ آرائی کی حد تک پہنچ جائے تو میں خود یہ مصرعہ ڈی کوڈ کر دیتی ہوں۔

(4) اب یہاں پر آکر میں شدید خود ترسی کا شکار ہو رہی ہوں، میں نے جو گنی چنی چند غزلیں سنی ہیں، سب کی سب شائع ہو چکی ہیں لہٰذا میں کام چلاؤں گی اس گیت سے جس کو سنتے ہوئے مجھے اپنا آپ اس کا حصہ لگتا ہے۔

اک ستم اور میری جاں، ابھی جاں باقی ہے
دل میں اب تک تیری الفت کا نشاں باقی ہے
اک ستم اور میری جاں، ابھی جاں باقی ہے

جرم توہین محبت کی سزا دے مجھ کو
کچھ تو محرومی الفت کا صلہ دے مجھ کو
جسم سے روح کا رشتہ نہیں ٹوٹا ہے ابھی
ہاتھ سے صبر کا دامن نہیں چھوٹا ہے ابھی
ابھی جلتے ہوئے خوابوں کا دھواں باقی ہے
اک ستم اور میری جاں......

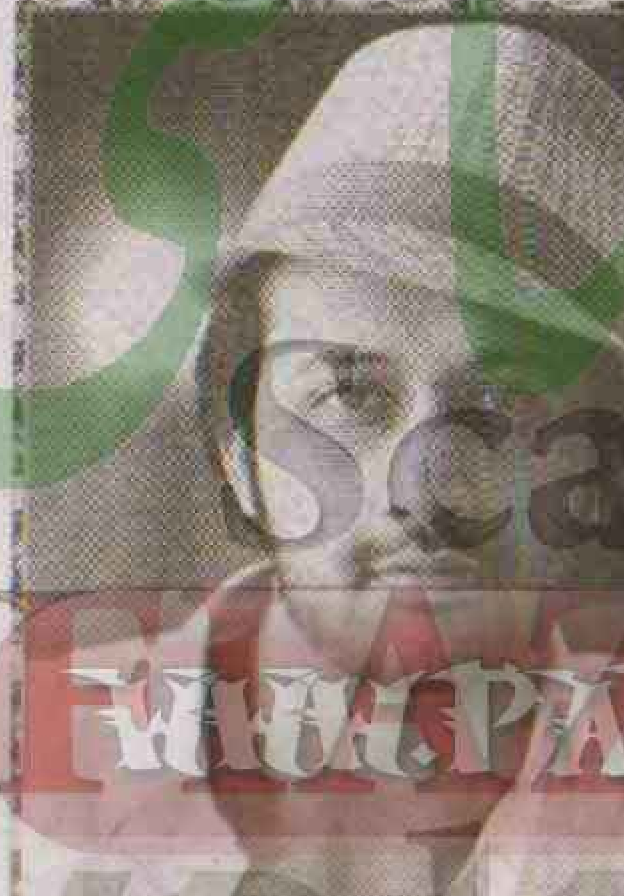
اپنی نفرت سے میرے پیار کا دامن بھر دے
دل گستاخ کو محروم محبت کر دے
دیکھ ٹوٹا نہیں چاہت کا حسین تاج محل
آکہ بکھرے نہیں مہکی ہوئی یادوں کے کنول
ابھی دید کے گلشن میں خزاں باقی ہے
اک ستم اور میری جاں......

(5) شکر ہے خدا کا داغ دہلوی نے یہ غزل لکھ ڈالی اور ہم...... جو کلاسیکی شاعری کو نامحرم سمجھ کر ایک سے دوسری نظر کے روادار نہ تھے، ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھنے لگے۔ ساغر صدیقی، غالب، ساحر، فراق غرض کتنے ناموں سے شناسائی ہوئی مگر اس غزل کو میری ڈائری میں تحریر پہلی کلاسیکی غزل کا اعزاز حاصل ہے۔

عجب اپنا حال ہوتا، جو وصال یار ہوتا...!
کبھی جان صدقے ہوتی، کبھی دل نثار ہوتا...!
جو تمہاری طرح تم سے کوئی جھوٹے وعدے کرتا
تم ہی منصفی سے کہہ دو...... تمہیں اعتبار ہوتا
یہ مزا تھا دل لگی کا کہ برابر آگ لگتی !
نہ تجھے قرار ہوتا، نہ مجھے قرار ہوتا
نہ مزا ہے دشمنی میں، نہ ہے لطف دوستی میں
کوئی غیر غیر ہوتا، کوئی یار یار ہوتا
تیرے وعدے پہ ستم گر ابھی اور صبر کرتے
گر اپنی زندگی کا ہمیں اعتبار ہوتا
تمہیں ناز ہو نہ کیونکر کہ لیا ہے داغ کا دل
یہ رقم ہاتھ لگتی، نہ یہ اختیار ہوتا!

خبریں وبریں

غزل ٹوانہ



عاطف اسلم اور علی ظفر کی مخالفت

جہاں عاطف اسلم نے اپنے بے شمار مسحور کن گیتوں سے دنیائے بولی وڈ کو اسیر کر رکھا ہے تو وہیں علی ظفر کو پہلی فلم "تیرے بن لادن" کو ملنے والی پذیرائی بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس فلم کے بعد علی ظفر کو ملنے والی فلموں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ تازہ ترین اطلاع کے مطابق بھارتی اداکار "رنبیر کپور" کو ملنے والی فلم "چشم بد دور" علی ظفر کی جھولی میں آگری ہے جس پر رنبیر کپور بے حد چراغ پا ہیں۔

دوسری اطلاع کے مطابق ابھرتے ہوئے بھارتی گلوکار "ابھیجیت ساونت" نے عاطف اسلم کے خلاف ایک دھواں دھار بیان داغ دیا ہے۔

یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں ہے۔ ماضی میں بھی بھارتی فنکاروں نے پاکستانی فنکاروں کو ملنے والی شاندار پذیرائی پر اپنی بے جا تنقید کے کوڑے برسائے ہیں۔ تاہم پاکستانی فنکار بولی وڈ میں اپنی شاندار کارکردگی کی بدولت چھائے ہوئے ہیں۔ بھارتی فنکار برادری کتنی بھی مخالفت کر لے، عاطف اسلم، علی ظفر، اسٹرنگز، شفقت امانت علی اور راحت فتح علی خان جیسے باصلاحیت فنکاروں کو عوامی مقبولیت کے دائرے سے کسی طور پر بھی باہر نہیں کر سکے گی، کیونکہ "جسے پیا چاہے وہی سہاگن۔"

بلال مقصود کی شاعری

بلال مقصود نغمہ نگاری کے میدان میں بھی کود پڑے ہیں۔ اسٹرنگز کے مشہور گیت "میں دیکھوں گا" کے ذریعے انہوں نے باقاعدہ شاعر ہونے کی سند حاصل کر لی ہے۔ بلال کے والد انور مقصود بھی فنون



لطیفہ کے کئی شعبوں میں بیک وقت کامیاب تسلیم کیے جاتے ہیں' جن میں ڈراما نگاری' شاعری' مصوری اور فن اداکاری وغیرہ شامل ہیں۔ ان کی پھوپھی زہرہ نگاہ بھی مشہور شاعرہ ہیں اب بلال نے بھی ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے موسیقی کے علاوہ دیگر شعبوں کی طرف قدم بڑھادیے ہیں۔ اسے کہتے ہیں "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات"۔

جگن کاظم فلموں میں

ٹی وی فنکار فلم میں کام کرنے کو کامیابی کی معراج سمجھتے تھے۔ مگر یہ بات ہے ان دنوں کی جب فلمی صنعت اپنے پورے جوبن پر تھی۔ اب تو یہ حال ہے کہ فلمی اداکار ٹی وی پر اداکاری اور کمپیئرنگ کررہے ہیں لیکن ایک فنکارہ ایسی بھی ہیں جو ٹی وی سے "لولی وڈ" کی طرف اڑان بھر رہی ہیں' وہ ہیں "جگن کاظم" جگن نے معروف ڈائریکٹر الطاف حسین کی فلم "خاموش رہو" میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے ہیں۔ ناروے کے پروڈیوسر کی یہ فلم رواں مہینے میں پاکستان میں بھی ریلیز ہوجائے گی۔ فلم کے ڈائریکٹر نے جگن کی اداکاری کو بے حد سراہا ہے۔



بینک سے میڈیا تک

معروف سندھی چینل "دھرتی" کے مارننگ شو کی ابھرتی ہوئی میزبان "صبا خان" کا کہنا ہے کہ انہوں نے حادثاتی طور پر شوبز کی دنیا میں قدم رکھا۔ ہوا کچھ یوں کہ صبا خان مقامی بینک سے وابستہ تھیں۔ صبا کی ایک دوست شوبز کی نگری کی مسافر تھی۔ صبا اپنی دوست کے ساتھ کبھی کبھار اس کی شوٹ پر جانے لگیں۔ تاہم' صبا کا مقصد اس نگری کی سیر و سیاحت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ایک اشتہار کے لیے صبا کی ماڈل دوست کے انکار کے بعد وہ اشتہار صبا کو مل گیا۔ یوں صبا اس دنیا کی باقاعدہ مکین ٹھہریں۔ آج ہم انہیں "دھرتی" پر صبح سویرے ہنستا مسکراتا دیکھ رہے ہیں۔



لوٹ کے بدھو گھر کو آئے

یہ مثل خواہ کتنی پرانی سہی' مگر بھلا ہو ہمارے بعض فنکاروں کا کہ وہ اسے وقتاً فوقتاً تروتازہ کرتے رہتے ہیں۔ سننے میں آیا ہے کہ معروف پاکستانی فنکارہ "وینا وینا ملک" طویل بھارت یاترا کے بعد وطن واپس آگئیں۔ بھارتی پروگرام "بگ باس" میں شرکت کے دوران

وینا' پاٹیل کے گیت گاتی رہیں۔ مقصد یہ تھا کہ انڈین فلموں میں موقع مل سکے لیکن اشمیت کہاں ان کے چکر میں آنے والے تھے۔ انہوں نے توجہ بھی نہیں دی۔ یوں وینا ان کی بے توجہی سے دل برداشتہ ہو کر وطن واپس آگئیں۔

کچھ ادھر ادھر سے

اسامہ امریکیوں کی طرح طاقت کے نشے میں بدحواس نہیں کہ ایبٹ آباد میں پناہ لیتا۔ شمالی وزیرستان میں امریکی اور نیٹو فورسز داخل نہیں ہو سکتیں افغانستان کے کئی علاقوں میں ان کا کوئی کنٹرول نہیں۔ پہاڑوں میں اپنا مسکن بنانے والا ایک گھر میں کیوں چھپتا۔ (ڈاکٹر محمد اجمل نیازی)

پاکستان میں امریکی آپریشن کا معاہدہ مشرف نے کیا۔ اسامہ کی موجودگی کی صورت میں امریکہ کو پاکستان میں فوجی کارروائی کا حق ہوگا اور پاکستان کسی قسم کی مزاحمت نہیں کرے گا لیکن دکھاوے کے لیے احتجاج کیا جائے گا۔ معاہدے کی تجدید 2008ء میں کی گئی۔ (برطانوی اخبار گارجین کی رپورٹ)

کیم اور دو مئی کی درمیانی شب امریکا کے فوجی آپریشن کے نام پر جو جہاز پاکستان آئے ہیں' ان میں اسامہ بن لادن کے خاندان کے افراد کو یہاں لایا گیا۔ امریکی انہیں یہاں چھوڑ کر چلے گئے تاکہ پاکستان میں ان کی موجودگی کے واقعہ کی صداقت پر لوگوں کو یقین دلا سکے۔ (جنرل اسلم بیگ)

پاکستان نے جن افراد کو پکڑ پکڑ کر امریکہ کے حوالے کیا ان میں سے 90 فیصد بے گناہ تھے یعنی جعلی مجرم تھے۔ (امریکی وکیل کلائیو اسمتھ)

زندگی کے دو سب سے اہم شعبے سیاست اور مذہب کو مگر ہم نے عاقبت نا اندیش یا حریص شعبدہ بازوں کے لیے چھوڑ دیا۔ اس کے بعد بھی ہم نجات کی امید پالتے ہیں۔ امید اچھی اور دعا بھی اچھی مگر جو غور و فکر کا حکم تھا اور وہ جو ریاضت اور جدوجہد کا فرمان تھا؟ (ہارون الرشید۔ ناتمام)

قوم تو متحد ہے کہیں بھی نہیں لڑ رہی سوائے کراچی کے۔ اور کراچی کے میدان جنگ میں مصروف جنگ تینوں ارباب جنگ حکمران پارٹیوں کے لوگ ہیں۔ (عبداللہ طارق سہیل۔ وغیرہ وغیرہ)

یہ بیان کالمانہ

☆ نو سال قبل گودھرا اور گجرات میں 59 یاتری ٹرین میں آگ لگنے سے زندہ جل مرے اور اگلے دن مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوگیا۔ ریاست کی خصوصی عدالت نے 31 افراد کو موت کی سزا سنائی' جبکہ دیگر 63 بے گناہوں کو 9 سال تک قید رکھنے کے بعد رہا کر دیا گیا ہے۔ مودی نے خود گودھرا کا واقعہ کرایا' کیونکہ وہ گجرات میں مسلمانوں کو سزا دینا چاہتا تھا۔ (بین السطور' کلدیپ نائر)

☆ مشرف جب آیا تھا تو کچھ جاننے والوں نے کہہ دیا تھا' اسے پاکستان کی تقسیم کا ایجنڈا دے کر بھیجا گیا ہے اور اس نے ثابت کر دیا کہ جاننے والے سچ کہتے تھے' بلوچستان میں مقامی' غیر مقامی اور کراچی میں پٹھان' مہاجر خانہ جنگی کی بنیاد اسی نے رکھی ہے۔ (عبداللہ طارق سہیل' ایکسپریس)

☆ کارگل سازش کے بعد مشیروں نے نواز شریف کو رائے دی تھی کہ وہ اس سازش کے چاروں مجرموں مشرف' عزیز' جاوید حسن اور محمود کو برطرف کردیں۔ لیکن نواز شریف نے یہ تجویز نہیں مانی۔ یہ تجویز مان لی ہوتی تو پاکستان پر وہ سیاہ ترین دور (دور مشرف) وارد نہ ہوتا جو ابھی تک چل رہا ہے اور جس نے پاکستان کو پتھروں اور غاروں کے دور میں دھکیل دیا ہے۔ (سعید مہدی)

باتیں کنور ارسلان سے

شاہین رشید

1 "اصلی نام؟"
"کنور ارسلان۔"

2 "پیار کا نام؟"
"کنور۔"

3 "سن پیدائش/شہر؟"
"27 اکتوبر 1985/اسلام آباد۔"

4 "مادری زبان/ستارہ؟"
"اردو/اسکارپیو (عقرب)"

5 "بہن بھائی/آپ کا نمبر؟"
"چھ/میرا نمبر تیسرا ہے۔"

6 "شادی کے کب ارادے ہیں- Arrange or Love-"
"ان شاء اللہ چار پانچ سال کے بعد اور لو میرج کروں گا۔"

7 "شوبز میں آمد؟"
"اپنے ٹیلنٹ سے آیا ہوں، کسی سفارش سے نہیں۔"

8 "پہلا پروگرام/وجہ شہرت۔"
"ڈرامہ "محبت تم سے ہے" اور وجہ شہرت ڈرامہ سیریل "طائر لاہوتی" بنا۔"

9 "پہلی کمائی کیا تھی؟/کیا کیا تھا۔"
"موبی لنک کا کمرشل کیا تھا۔ یاد نہیں کتنے پیسے ملے تھے اور کرنا کیا تھا، کھا پی لیے تھے۔"

10 "صبح اٹھ کر کیا دل چاہتا ہے؟"
"دل چاہتا ہے کہ کوئی نیا اور اچھا کام مل جائے آج۔"

11 "اپنے چہرے کے نقش و نگار میں کیا پسند ہے؟"
"آنکھیں اور ہونٹ۔"

12 "گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟"
"اپنے بیڈ روم میں اور خاص طور پر اپنے بیڈ پہ۔"

13 "شدید بھوک میں آپ کی کیفیت؟"
"میری ایک پرابلم ہے کہ مجھے اچانک ہی بھوک لگ جاتی ہے اور بہت شدید بھوک لگتی ہے۔ اس وقت کچھ نہ ملے تو مجھے غصہ آتا ہے۔"

14 "اپنے مسائل کس سے شیئر کرتے ہیں؟"
"کسی سے نہیں، اپنے آپ سے شیئر کرتا ہوں۔"

15 "کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو؟"
"اٹھ جاتا ہوں، غصہ نہیں کرتا۔"

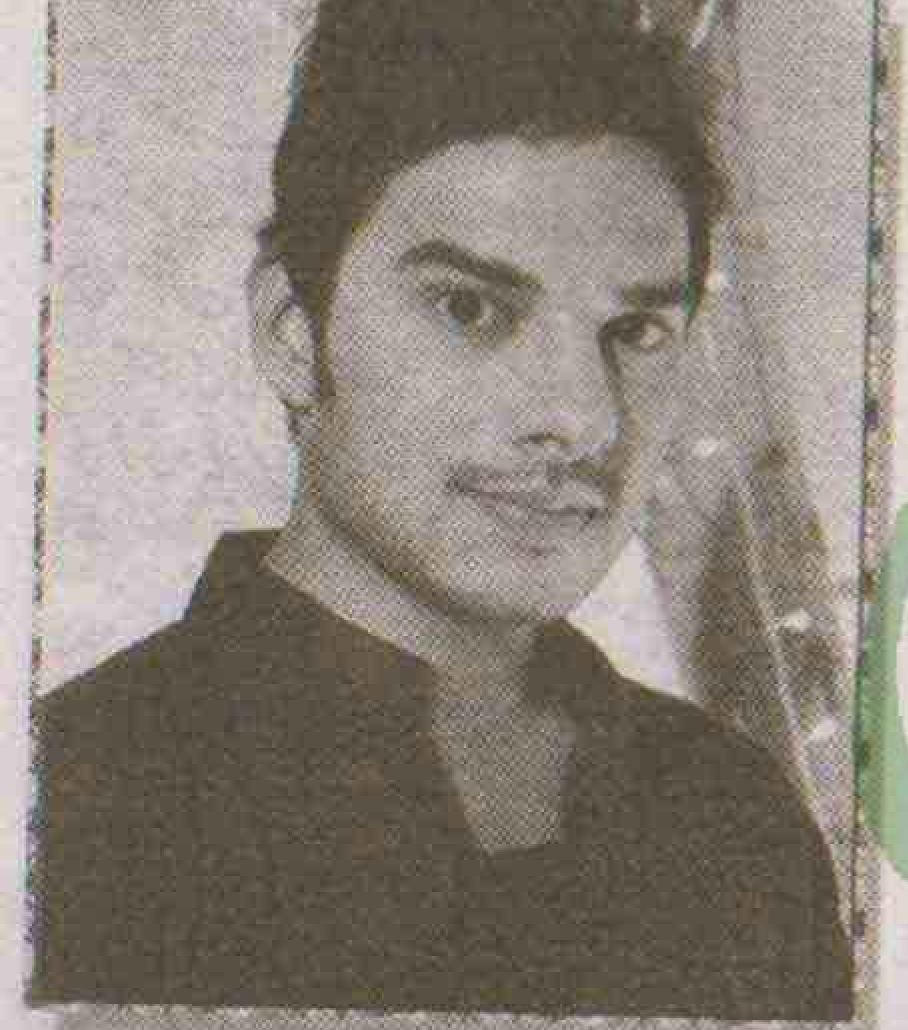
16 "پہلی ملاقات میں شخصیت میں کیا دیکھتے ہیں؟"
"بولنے کا طریقہ اور ڈریسنگ۔"

17 "آئینہ دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟"
(قہقہہ) "اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے اتنی اچھی شکل دی۔"

18 "کیا آپ اپنی مرضی کی زندگی گزار رہے ہیں؟"
"جی بالکل '100' فیصد اپنی مرضی کی زندگی گزار رہا ہوں۔"

19 "اپنے آپ کو کب بے بس محسوس کرتے ہیں؟"
"کوئی ایسا انسان جس سے میں بہت پیار کرتا ہوں اور وہ مجھ سے دور چلا جائے تو پھر میں اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتا ہوں۔"

20 "زندگی میں کس چیز کے لیے وقت نکالنا مشکل ہے؟"
"اپنے گھر والوں کے لیے 'یہ فیلڈ' ہی ایسی ہے۔"



21 "آپ کے لیے کون جان دے سکتا ہے؟"
"کوئی ایک نہیں ہے، کافی لوگ ہیں۔"

22 "اگر دعا سے کچھ مل سکتا تو کیا مانگتے؟"
"کیا مانگتا.... اللہ کا شکر ہے، سب کچھ ہے۔"

23 "کوئی شخص جس نے آپ کی زندگی بدل دی ہو؟"
"میری ایک دوست ہے، جس کا میں نام نہیں لینا چاہتا۔ اس نے میری زندگی کو کافی حد تک بدلا ہے۔"

24 "جب آپ پہلی مرتبہ نیا پین استعمال کرتے ہیں تو کیا لکھتے ہیں؟"
"اپنا نام۔"

25 "کوئی غلطی جس کو سوچ کر پشیمانی ہوتی ہو؟"
"میرا نہیں خیال کہ میں نے ایسی کوئی غلطی اب تک کی زندگی میں کی ہوگی۔"

26 "کبھی غصے میں کھانا چھوڑا؟"
"نہیں جی کبھی نہیں، کھانا بھی کوئی چھوڑنے والی چیز ہے۔"

27 "کبھی سوچا کہ چند سال بعد آپ کہاں ہوں گے؟"
"نہیں، کیونکہ میں پلاننگ نہیں کرتا۔"

28 "کھانا کس کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند ہے؟"
"امی کے ہاتھ کا۔"

29 "پسندیدہ ناشتہ؟"
"میرا روزانہ کا ناشتہ ایک جیسا ہوتا ہے، جس میں دودھ، دو انڈے اور ایک بریڈ۔"

30 "موڈ کب خراب ہوتا ہے؟"
"جب میں کچھ چاہ رہا ہوں اور وہ نہ ہو رہا ہو اور میں کچھ کر بھی نہ سکوں تو۔"

31 "الہ دین کا چراغ مل جائے تو کیا فرمائش کریں گے؟"
"ہالی وڈ کی فلم میں کام کرنے کی فرمائش کروں گا۔"

32 "ملک میں کون سی تبدیلی ضروری ہے؟"
"سیاست دانوں کی تبدیلی بہت ضروری ہے۔"

33 "کھیلوں میں آپ کا پسندیدہ کھیل؟"
"کرکٹ۔"

34 "بھروسے کے قابل کون ہوتا ہے، لڑکے یا لڑکیاں؟"
"ویسے تو لڑکے ہوتے ہیں لیکن میڈیا میں لڑکیاں ہوتی ہیں۔"

35 "کیا دعا سے قسمت بدل جاتی ہے؟"
"کہہ سکتے ہیں۔"

36 "قسمت پر کتنا یقین ہے؟"
"قسمت پر ہی یقین ہے۔"

37 "اپنی شخصیت میں کیا چیز بدلنا چاہتے ہیں؟"
"اپنے Attitude (رویہ) کو مزید اچھا کرنا چاہتا ہوں۔"

38 "ایک سوال جو خدا سے روزانہ کرتے ہیں؟"
"نہیں کوئی نہیں.... اس کا شکر ادا کرتا ہوں۔"

39 "کبھی الہامی کیفیت ہوئی؟"
"اکثر ایسا ہوتا ہے اور 80 فیصد باتیں ٹھیک بھی نکلتی ہیں۔"

40 "گھر آ کر پہلی خواہش؟"

"پہلی خواہش نہیں بلکہ پہلا سوال ہوتا ہے کہ امی آج کیا پکایا ہے۔"

41 "موت سے ڈر لگتا ہے؟"
"موت سے نہیں، قبر کا سوچ کر ڈر لگتا ہے۔"

42 "کون سی تقریبات میں جانا پسند نہیں؟"
"شادی کی تقریبات میں۔ دوسروں کی شادی میں لوگوں کی خوشی دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی ہے۔"

43 "سائنس کی بہترین ایجاد؟"
"موبائل فون۔"

44 "جھوٹ کب بولتے ہیں؟"
"جہاں جھوٹ بولے بغیر گزارہ نہیں ہوتا۔"

45 "تہوار جو شوق سے مناتے ہوں؟"
"ویلنٹائن ڈے۔"

46 "شوبز کی سب سے بڑی برائی؟"
"میرے خیال میں یہ فیلڈ کسی کی نہیں ہے۔"

47 "چھٹی کا دن کیسے گزارتے ہیں؟"
"دن اپنی فیملی کے ساتھ اور شام یا رات اپنے دوستوں کے ساتھ۔"

48 "موبائل فون کے بارے میں آپ کے تاثرات؟"
"یہ ایک بہت ہی اچھی ایجاد ہے جو ہمارا بہت سارا ٹائم بچاتی ہے۔"

49 "شہرت رحمت یا زحمت؟"
"فی الحال تو رحمت ہے، کیونکہ لوگ پہچان کر محبت کا اظہار کرتے ہیں۔"

50 "زندگی کب بری لگتی ہے؟"
"مجھے بری نہیں لگتی بلکہ مجھے زندگی بہت اچھی لگتی ہے۔ میں اپنی زندگی سے بہت خوش ہوں۔"

51 "انٹرویو میں کوئی سوال جو برا لگتا ہے؟"
"یہ کہ آپ شادی کب کر رہے ہیں۔"

52 "کوئی لڑکی مسلسل گھورے تو؟"
"تو جا کر پوچھ لوں گا کہ بات کرلیں، گھوریں نہیں۔"

53 "سارا دن میں آپ کا پسندیدہ وقت؟"
"رات کا۔"

54 "کس لمحے نے زندگی بدل دی؟"
"جب اس فیلڈ میں آمد ہوئی۔"

55 "کب چیخنے چلانے کو دل چاہتا ہے؟"
"جب بہت دیر تک کسی کو کوئی بات سمجھاتے رہو اور وہ آپ کی بات کو نہ سمجھے تب۔"

56 "زندگی میں کس چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے؟"
"فی الحال تو کسی چیز کی نہیں۔"

57 "نصیحت جو بری لگتی ہے؟"
"کوئی بھی ایسا انسان جس کے اپنے عمل اچھے نہ ہوں اور وہ دوسروں کو نصیحت کرے کہ یہ نہ کرو وہ نہ کرو۔"

58 "ایک رشتہ جس نے دکھ دیا ہو؟"
"بچپن سے گرل فرینڈ کا۔"

59 "غصہ کب آتا ہے؟"
"کبھی بھی آ سکتا ہے۔"

60 "غصے میں ردعمل؟"
"کسی ایسے انسان پر جس سے میں پیار کرتا ہوں، غصہ آجائے تو خاموش ہو جاتا ہوں۔"

61 "فقیر کو کم سے کم کتنا دیتے ہیں؟"
"کم سے کم 10، 20 روپے تو دے ہی دیتا ہوں۔"

62 "اپنی کن باتوں پر قابو نہیں؟"
"زبان پر..... میں ہر بات منہ پر بول دیتا ہوں۔"

63 "کیا محبت ایک بار ہوتی ہے؟"
"نہیں، مجھے تو دس بارہ بار محبت ہو چکی ہے۔"

64 "کبھی مانگ کر تحفہ لیا؟"
"ہاں جی..... اپنے ابو سے۔"

65 "پسندیدہ صحافی؟"
"آپ..... کیونکہ آپ کا تذکرہ بہت سنا ہے۔"

66 "کیا آپ اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتے ہیں؟"
"اپنے آپ سے ہی کر لیتا ہوں مگر بولتا نہیں ہوں۔"

67 "آپ کی کوئی انوکھی خواہش؟"
"کوئی انوکھی ہوگی تو آپ کو بتاؤں گا نہیں۔"

68 "ٹین ایج کا پیار سچا ہوتا ہے یا نادانی ہوتی ہے؟"
"میری نظر میں پیار کسی بھی ایج کا ہو، وہ نادانی ہی ہوتی ہے۔ اصل رشتہ تو شادی کا ہی ہوتا ہے اور شادی کے بعد ہی سچا پیار ہوتا ہے۔"

69 "گھر والوں کی کس بات سے موڈ آف ہو جاتا ہے؟"
"جب وہ کہتے ہیں کہ سب بہن بھائیوں کی شادیاں ہو گئی ہیں اب تم بھی کرلو۔"

70 "کن چیزوں پر بہت خرچ کرتے ہیں؟"
"کپڑوں پر، جوتوں پر۔"

71 "فٹ پاتھ پہ کھڑے ہو کر کن چیزوں کا جائزہ لیتے ہیں؟"
"ان بیچارے لوگوں کا جن کی زندگی فٹ پاتھ پہ ہی شروع ہوتی ہے اور وہیں پہ ختم ہو جاتی ہے۔"

72 "کس کے بغیر نہیں رہ سکتے؟"
"مجھے لگتا ہے کہ میری زندگی میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے کہ جس کے بغیر میں نہ رہ سکوں۔"

73 "کس شخصیت سے خوف زدہ رہتے ہیں؟"
"کسی سے بھی نہیں۔"

74 "اپنی کوئی اچھی اور بری عادت بتائیں؟"
"بری عادت یہ کہ مجھے غصہ بہت جلدی آجاتا ہے اور اچھی یہ کہ میں ہمیشہ یہ کوشش کرتا ہوں کہ لوگ مجھ سے خوش رہیں۔"

75 "آدھی رات کو آنکھ کھل جائے تو؟"
"کوئی مسئلہ نہیں، تھوڑی دیر بعد ہی نیند آجاتی ہے۔"

76 "کوئی ایسی شخصیت جس کے ساتھ ایک شام گزارنا چاہتے ہیں؟"
"میڈم Megan کے ساتھ۔"

77 "کس ملک کے لیے کہتے ہیں کہ کاش یہ ہمارا ہوتا؟"
"چائنا کے لیے۔"

78 "اچانک چوٹ لگنے پر بے ساختہ کیا کہتے ہیں؟"
"اوگاڈ۔"

79 "بستر پہ لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے یا کروٹیں بدلتے رہتے ہیں۔"
"میں تو لیٹتے ہی سوجاتا ہوں۔"

80 "انسان کا بہترین روپ، مرد یا عورت؟"
"عورت۔"

81 "کھانے کے لیے پسندیدہ جگہ چٹائی یا ڈائننگ ٹیبل؟"
"ڈائننگ ٹیبل۔"

82 "آپ کا ذریعہ معاش؟"
"شوبز۔"

83 "کون سے الفاظ بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں؟"
"کوئی خاص نہیں۔ میں نے کبھی غور نہیں کیا۔"

84 "خواتین کب بری لگتی ہیں؟"
"نہیں جی، خواتین ہمیشہ اچھی لگتی ہیں، کبھی بری نہیں لگتیں۔"

85 "پیسہ کس شکل میں جمع کرتے ہیں؟"
"بینک میں جمع کرتا ہوں۔"

86 "اگر مذہب میں ایک قتل کی اجازت ہوتی تو کس کو کرتے؟"
"کسی کو بھی نہیں۔"

87 "بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ کیا کیا چیزیں رکھتے ہیں؟"
"موبائل فون اور بس۔"

88 "آپ کی ایک عادت جو گھر والوں کو پسند نہیں؟"
"میری ٹائمنگ، گھر میں آنے جانے کی۔"

89 "اپنے لیے سب سے قیمتی چیز کیا خریدی؟"
"گاڑی۔"

90 "دوسرے ملک جا کر کیا باتیں نوٹ کرتے ہیں؟"
"سسٹم، کلچر اور لڑکیاں۔"

91 "کن چیزوں کے بغیر گھر سے نہیں نکلتے؟"
"ساری چیزیں گاڑی میں ہی پڑی ہوتی ہیں جیسے کہ کپڑے، جوتے گھڑیاں وغیرہ۔"

"اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"
"یہ سوچ کر چپ ہو جاؤں گا کہ اس میں بھی اللہ کی کوئی مصلحت ہوگی۔"

☆



خواتین ڈائجسٹ میں قارئین کی شرکت کے لیے ہم اس ماہ کے کچن کے حوالے سے ایک نیا سلسلہ شروع کر رہے ہیں' سوالات یہ ہیں۔

کھانا پکاتے ہوئے آپ کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟ پسند ناپسند' غذائیت' گھر والوں کی صحت۔

گھر میں اچانک مہمان آگئے ہیں' کھانے کا وقت ہے۔ کسی ایسی ڈش کی ترکیب بتائیں جو فوری تیار کر کے تواضع کر سکیں۔

کچن عورت کی سلیقہ مندی کا آئینہ دار ہوتا ہے' آپ کچن کی صفائی کے لیے کیا خصوصی اہتمام کرتی ہیں؟

صبح کا ناشتہ ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ آپ ناشتے میں کیا بناتی ہیں؟ ایسی خصوصی چیز کی ترکیب جو آپ اچھی بناتی ہیں۔

گھر سے باہر کھانا کھانا فیشن بنتا جا رہا ہے' آپ مہینے میں کتنی بار باہر کھانا کھانے جاتی ہیں؟ (1) جب کوئی لے جائے (2) کسی کی سالگرہ پر (3) یا کسی خوشی کے موقع پر۔

کھانا پکانے کے لیے ڈش کا انتخاب کرتے ہوئے موسم کو مد نظر رکھتی ہیں؟

اچھا پکانے کے لیے کتنی محنت کی قائل ہیں؟

کچن کی کوئی ٹپ' جو دینا چاہیں؟

ان سوالات کے جواب بھجوائیے [illegible]

تصویر ضروری نہیں ہے۔

آپ کا باورچی خانہ

ام ابوہریرہ

(1) میرا کنبہ ہم میاں بیوی اور ہمارے دو بچوں پر مشتمل ہے۔ کھانا پکاتے ہوئے میاں جی کی پسند کا سب سے پہلے خیال رکھتی ہوں۔ میاں جی ٹھہرے کھانے کے بہت شوقین اور میں ٹھہری پکانے کی بہت شوقین، اس لیے ان کی پسند کو اولیت دیتی ہوں، جس میں غذائیت اور صحت کے تمام اصول پائے جاتے ہیں۔

(2) ویسے تو گھر میں اچانک مہمان آج تک نہیں آئے۔ ہمیشہ پیشگی اطلاع ہوتی ہے۔ ہم بھی کہیں جاتے ہیں تو پہلے سے اطلاع کر دیتے ہیں کیونکہ میں کھانا پکانے کی شوقین ہوں تو میرے فریزر میں ہر طرح کا گوشت موجود ہوتا ہے۔

مچھلی کی ترکیب لکھ رہی ہوں۔ مچھلی نہایت لذیذ ڈش اور جلدی سے تیار ہو جاتی ہے اور سب کو بہت پسند آتی ہے۔

مچھلی گھٹالا

اجزا:

مچھلی	4 سے 5 قتلے
ادرک لہسن (پسا ہوا)	ایک کھانے کا چمچہ
سرخ مرچ	1/2 کھانے کا چمچہ
ہلدی	ایک چائے کا چمچہ
پیاز	ایک پاؤ
ہرا دھنیا	ایک گڈی
ہری مرچ	5 عدد
کالی مرچ	ایک چائے کا چمچہ

نمک	حسبِ ذائقہ
تیل	ایک کپ

ترکیب :

سب سے پہلے مچھلی میں ادرک لہسن، سرخ مرچ اور ہلدی لگا کر مچھلی کو کم تیل میں فرائی کرلیں اور اس کے بعد مچھلی میں سے کانٹے علیحدہ کرکے گوشت کا ہاتھ سے ہی قیمہ بنالیں جو کہ آرام سے ہاتھ سے مسلنے سے ہی بن جاتا ہے۔ اب ایک برتن میں پیاز کو چوپ کرکے کم تیل میں فرائی کرلیں "آدھی کچی" آدھی پکی یعنی پنک کرلیں؛ اس کے بعد اس میں ہرا دھنیا ہری مرچ کتر کر کالی مرچ نمک شامل کریں۔ مچھلی کا قیمہ شامل کریں، دو چار مرتبہ چمچے سے مکس کریں آنچ درمیانی رکھیں۔ لیجیے مزے دار مچھلی گھٹالا تیار ہے۔ جو لوگ مچھلی شوق سے نہیں کھاتے، وہ بھی اس ڈش کو شوق سے کھالیتے ہیں۔

(3) میرا باورچی خانہ سمٹا ہوا رہتا ہے۔ برتن ہاتھ کے ہاتھ دھو لیتی ہوں اور سب سامان ترتیب سے رکھتی رہتی ہوں۔ سلیب کے اوپر بہت کم سامان رکھتی ہوں۔ کپڑے سے سلیب ہر وقت صاف کرتی رہتی ہوں، کیبنٹ کے اندر بھی ترتیب وار سامان ہاتھ کے ہاتھ رکھتی رہتی ہوں۔ اس لیے کوئی خصوصی اہتمام کرنا نہیں پڑتا۔

(4) صبح کا ناشتہ ہمارے ہاں وہ ہی روایتی سا ہوتا ہے میاں جی پراٹھے کے ساتھ رات کا سالن لینا پسند کرتے ہیں۔ میں اور بچے دلیہ کھاتے ہیں۔ ہاں اتوار کو بازار سے ناشتہ آتا ہے۔

(5) شادی کے شروع دنوں میں ہم دونوں میاں بیوی نے بہت باہر کھانا کھایا۔ اب بچوں کے ساتھ مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے مہینے میں ایک مرتبہ باہر سے کھانا منگوا کر گھر میں کھالیا جاتا ہے۔ اس کے لیے کسی موقع کی ضرورت نہیں ہوتی۔

(6) جی جناب کھانا پکاتے ہوئے موسم کو ضرور مدِنظر رکھتی ہوں۔ گرمیوں میں کھانا سادہ ہوتا ہے اور ایسے کھانے ہوتے ہیں جو ٹھنڈی تاثیر والے ہوتے ہیں سردیوں میں پائے وائے خوب چلتے ہیں۔ برسات میں تلے ہوئے پکوان مزہ دیتے ہیں اور میرے میاں بڑے شوق سے بنوا کر کھاتے ہیں۔

(7) اچھا کھانا پکانے کے لیے محبت اور لگن کی بہت زیادہ قائل ہوں۔ میرے گھر میں الحمدللہ ہر چیز موجود ہے۔ اس کے باوجود سل پر مسالہ پیستی ہوں، سب مجھے ٹوکتے ہیں مگر میں اپنی دھن کی پکی سل پر ہی پیستی ہوں۔ سل پر مسالے پیس کر پکانے سے کھانے کے ذائقہ میں بہت واضح فرق ہوتا ہے۔ بہ نسبت مشین میں پسے ہوئے مسالے کے۔ میرے ہاتھ کے بہاری کباب بہت پسند کیے جاتے ہیں اس کے تمام مسالے میں سل پر پیس کر لگاتی ہوں۔ جس نے بھی کھایا، وہ انگلیاں چاٹتا رہ گیا۔ اگر محنت، لگن، شوق ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ کھانا خراب بنے ضرور اچھا بنے گا۔

(8) بچن کی ٹپ آپ کو یہی دوں گی کہ کھانا پکاتے ہوئے ذکر اللہ کرتی رہیں خاص طور پر تیسرا کلمہ اور درود شریف پڑھتی رہیں۔ کھانے میں شیطان کبھی شامل نہیں ہوگا اور کھانا بابرکت اور ذائقہ دار خود بخود ہو جائے گا اور گھر والوں میں آپس میں محبت بھی بڑھے گی اور ذکر کرنے سے آپ کو ثواب بھی ملتا رہے گا۔

اُمِ ابوہریرہ۔۔۔ نارتھ کراچی

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

بنانا سینڈوچ

ڈبل روٹی (چھوٹی)	ایک عدد
انڈے	دو عدد
کیلے	چار عدد
چینی	ایک کھانے کا چمچہ
کریم	چار کھانے کے چمچے

سلائس کے کنارے نکال کر ان کا چورا بنالیں۔ اب انڈے پھینٹ کر چورے میں ملالیں۔ تھوڑا سا دودھ شامل کرکے گوندھ لیں اور پھر روٹی کی طرح بیل لیں۔ اس کی موٹائی آدھ انچ ہونی چاہیے۔ چکنی کی ہوئی بیکنگ ٹرے میں رکھ کر پہلے سے گرم اوون میں 150c پر بیک ہونے رکھ دیں۔ 5 منٹ بعد نکال کر لمبے یا تکون ٹکڑے کاٹ لیں۔ کیلے مسل کر کانٹے سے خوب پھینٹیں۔ کریم اور چینی شامل کرکے دوبارہ پھینٹیں۔ اچھی طرح یک جان ہو جائے تو تیار شدہ ٹکڑوں پر لگائیں۔ دو ٹکڑوں کو آپس میں جوڑ دیں۔ سینڈوچ تیار ہیں۔

لیچی، لیموں اور کینو کے رس کی آئس لولی

اجزا :

لیچی کا رس	ایک کپ
لیموں کا رس	ایک کپ
کینو کا رس	تین چوتھائی کپ

ترکیب :

ایک پیالے میں لیچی، لیموں اور کینو کا رس ڈال کر مکس کرلیں۔ آئس لولی مولڈ یا آئس کیوبز میں ڈال کر فریزر میں رکھ کر جمالیں۔ جب اچھی طرح جم جائے تو پیش کریں۔

اسپیشل مینگو لسی

ضروری اجزا :

آم	4 عدد
دہی	آدھ کپ
دودھ	ایک کپ
چینی	آدھ کپ
نمک	ایک چٹکی
سیاہ مرچ پاؤڈر	آدھ چائے کا چمچہ
برف	حسبِ ضرورت
پودینہ	چند پتیاں

ترکیب :

آم چھیل کر ٹکڑوں میں کاٹ لیں۔ بلینڈر میں آم، دودھ، دہی، چینی، نمک، سیاہ مرچ پاؤڈر اور برف ڈال کر اچھی طرح بلینڈ کریں۔ گلاس میں نکال کر پودینے کی پتیوں سے سجاوٹ کرکے پیش کریں۔

مینگو کریم برولی

اجزا :

آم (بڑے)	دو عدد
کریم	دو کپ
دودھ	ایک کپ
چینی	ایک کپ
ونیلا ایسنس	ایک چائے کا چمچہ
انڈے کی زردیاں	آٹھ عدد

ترکیب :

آم کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرلیں۔ ایک برتن میں انڈے کی زردیاں، کریم، دودھ، چینی اور ونیلا ایسنس ڈال کر اتنا پھینٹیں کہ یکجان ہو جائیں۔ اب آم کے ٹکڑے شامل کرکے اچھی طرح مکس کریں۔ پیالوں میں نکال کر آم کے کچھ ٹکڑوں سے سجاوٹ کرکے اوون میں تھوڑی دیر کے لیے بیک کریں۔ مزے دار مینگو کریم برولی تیار ہے۔

عدنان

[illegible]

پریشانی سے نجات کیسے حاصل کی جائے؟! اس کا بہترین حل مصروفیت ہے' خود کو مصروف رکھیں۔ سارے رنج و غم پریشانیاں بھول جائیں گی

ڈیل کارینگی نے پریشانیوں سے نجات حاصل کرنے کے سلسلے میں ایک صاحب کی سرگزشت لکھی ہے. جن کے بارے میں ان کا بیان ہے کہ بالکل سچی ہے۔

گہرے صدمے کے باعث ایک صاحب کی بھوک اڑ گئی' نیند غائب ہو گئی۔ کسی پہلو چین نہیں آتا تھا۔ ان کے اعصاب بالکل جواب دے گئے اور خود اعتمادی ختم ہو گئی۔ ڈاکٹروں کے پاس گئے تو کسی نے سکون آور گولیاں دیں۔ کسی نے سیر و تفریح کی سفارش کی۔ انہوں نے دونوں کو آزمایا لیکن بالکل فائدہ نہ ہوا اور طبیعت اور حالت ویسی ہی رہی۔

وہ بیان کرتے ہیں کہ "ایک شام میں افسردہ اور غمگین بیٹھا تھا تو میرا چار سالہ بیٹا میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ اس کے لیے ایک کشتی بنا دوں۔

میں کشتی بنانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ دراصل میرا کوئی کام کرنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن میرا بیٹا اپنی ضد پر اڑا رہا اور مجھے شکست تسلیم کرنی پڑی۔

اس ننھی سی ناؤ بنانے میں میرے تین گھنٹے صرف ہو گئے۔ کام ختم ہونے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ میں نے کشتی بنانے میں جو تین گھنٹے لگائے ہیں' وہ انتہائی سکون اور اطمینان کی گھڑیاں تھیں اور یہ سکون اور اطمینان مجھے کئی مہینوں کے بعد پہلی بار حاصل ہوا تھا۔

اس انکشاف پر میں کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ کئی مہینوں کے بعد یہ پہلا موقع تھا جب میں نے کسی بات پر غور کرنے کی کوشش کی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ جب میں کسی ایسے کام میں مصروف رہوں' جس میں سوچ بچار اور منصوبہ بندی کی ضرورت ہو تو میرا پریشان' افسردہ اور غمگین رہنا مشکل ہے۔ مثلاً "اس کشتی کے کام کو لیجیے' اس نے میری ساری پریشانیوں کو یک قلم ختم کر دیا۔ چنانچہ میں نے مصروف رہنے کا فیصلہ کر لیا۔

اگلی صبح میں ہر کمرے میں جا کر ان چیزوں کی فہرست تیار کرنے لگا جو میری توجہ چاہتی تھیں۔ بے شمار اشیاء کتابیں رکھنے کا ریک' سیڑھیاں' کھڑکیاں' پردے' کنڈیاں' تالے' ٹونٹیاں مرمت طلب تھیں۔ میں نے دو ہفتوں کے دوران تمام مرمت طلب چیزوں کو درست کر لیا۔ اس کے علاوہ میں نے سماجی کام کرنے شروع کیے۔ محلے کے لوگوں کی تکالیف اور ان کی مدد کے لیے کام کرنا شروع کر دیا۔ کھاتے پیتے لوگوں کو محلے کے سفید پوش ضرورت مند لوگوں کی ضرورتوں سے آگاہ کرنا شروع کیا اور ان سے کار خیر میں حصہ لینے کے لیے کہا تو ان میں سے بیشتر اس کے لیے بخوشی تیار ہو گئے اور یہ سب کچھ کر کے مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ میں اپنے رنج و غم' پریشانیاں بھول گیا۔ ان کاموں میں جو گھر' رشتے داروں اور محلے والوں کے تھے' ایسا مصروف ہوا کہ پریشان اور افسردہ رہنے کے لیے میرے پاس وقت ہی نہیں تھا۔"

پ

جمن پ نے خط لکھا ہے۔

ہم چھ بہنیں' چھ بھائی ہیں۔ والدہ کا انتقال ہو چکا ہے۔ والد بیمار اور ضعیف ہیں۔ تین بہنوں اور چار بھائیوں کی شادی والد صاحب نے کی۔ والد صاحب نے ہم تین بہنوں کی شادی کے لیے بھائیوں کو معقول رقم دی لیکن دونوں بھائیوں نے اس رقم سے اپنی شادی کر لی۔ والد صاحب نے احتجاج کیا تو انہیں یہ کہہ کر بہلا دیا کہ جب بہنوں کا وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔ شادی کے بعد بھابھی نے گھر کے ساز و سامان فریج' واشنگ مشین' ٹی وی اور گھر کے برتنوں پر قبضہ کر کے انہیں بکوا دیا اور ہم تین بہنوں اور باپ کو ایک کمرے تک محدود کر دیا۔

گھر میں اس وقت تین بھائی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ وہ ہمیں گھر کا کوئی خرچ نہیں دیتے۔ ایک بھائی روزانہ سو روپے دیتا ہے اور جمعہ' اتوار کو وہ بھی نہیں دیتا۔ ماں کا زیور بھی بھائی لے کر اڑا چکے ہیں۔ ابا کا ایک پلاٹ تھا۔ اس کو دس لاکھ میں بیچا لیکن بہنوں کی شادی نہیں کی۔ اب بھائی موجودہ مکان جس میں ہم رہتے ہیں اسے بھی بیچ رہا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اسے بیچ کر سب کو حصے دے دیے جائیں۔ ہمیں ڈر ہے کہ اگر بھائی نے یہ بھی ہڑپ کر لیا تو ہم کہاں جائیں گے کیونکہ وہ پہلے دو دفعہ دھوکا دے چکا ہے۔

میں زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہوں۔ سلائی کڑھائی بھی نہیں آتی۔ سمجھ میں نہیں آتا' ہمارا کیا ہو گا۔

ج : آپ کے جو حالات ہیں ان میں بھائیوں پر بھروسا کرنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ گھر بیچ کر انہوں نے [illegible] ٹھکانا بھی نہیں رہے گا۔

موجودہ حالات میں مشورہ ہے کہ آپ اپنے بہنوئیوں اور خاندان کے دیگر بزرگ رشتہ داروں کو جمع کریں اور ان کے سامنے یہ مسئلہ رکھیں۔ آپ کے والد صاحب گھر کے مالک ہیں۔ ان کی مرضی کے بغیر یہ گھر نہیں بک سکتا اور گھر بیچ دیا تب بھی یہ اختیار والد صاحب کو ہے کہ وہ کس کو کتنی رقم دیتے ہیں۔ آپ کے بھائیوں نے آپ کے والد صاحب کو دباؤ میں لے لیا ہے۔ وہ مزاحمت نہیں کر سکتے جب انہیں خاندان کے لوگوں کی حمایت حاصل ہو گی تو ان کی ہمت بڑھے گی۔

آپ نے اپنے شہر کا نام نہیں لکھا' بڑے شہروں میں کام ملنے کے مواقع کافی ہوتے ہیں۔ لڑکیاں زیادہ پڑھی لکھی نہ ہوں تب بھی انہیں کوئی نہ کوئی کام مل سکتا ہے۔ بیوٹی پارلر کی ٹریننگ لے کر بیوٹی پارلر میں کام کیا جا سکتا ہے' کسی فیکٹری میں بھی پیکنگ گرلز کی جاب مل سکتی ہے' اسکول میں بھی کام مل سکتا ہے۔ اسکول میں صرف پڑھانے کا کام ہی نہیں ہوتا ایسے کام بھی ہوتے ہیں جن کے لیے زیادہ تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آپ کو ہمت کر کے اپنے لیے کچھ کرنا ہو گا۔ بھائیوں کے جو حالات آپ نے لکھے ہیں ان سے کوئی توقع کرنا عبث ہے۔

س

ج : اچھی بہن! آپ کا ذہن کافی الجھا ہوا ہے۔ آپ پہلی فرصت میں کسی اچھے ڈاکٹر سے مشورہ کریں یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے' کچھ دن کے علاج ——— سے آپ اپنی ذہنی کیفیت بہتر محسوس کریں گی۔

زبان سے نکلا ہر لفظ کسی کا بھی ہمیشہ پورا نہیں ہو سکتا' یہ سراسر آپ کا وہم ہے۔ اسے دل سے نکال دیں۔ شادی کے بعد کے لیے آپ کو جو خدشات ہیں۔ ان کا بھی حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ ناولوں اور ڈراموں میں جو کچھ لکھا جاتا ہے ضروری نہیں حقیقت میں بھی وہی ہو۔ چونکہ اس وقت آپ ذہنی طور پر یکسو نہیں ہیں اس لیے بہتر جاب حاصل کرنا بھی دشوار ہو رہا ہے۔ ذہنی کیفیت بہتر ہونے پر اچھی جاب بھی مل سکتی ہے

بیوٹی بکس

امت الصبور



پرنیاں تبسم...... راولپنڈی

س: میری عمر تیس سال ہے، میری جلد تقریباً چکنی ہے یعنی گرمیوں میں چکنی، سردیوں میں نارمل۔ شروع سے کیل مہاسوں کی شکایت ہے۔ میں جلد کی صفائی کے لیے بیسن استعمال کرتی ہوں۔ میری جلد پر مسام کے اندر سخت مواد بنتا ہے نکال دوں تو ٹھیک ورنہ کنارے موٹے ہو جاتے ہیں۔ چھیل دوں یا نہ چھیلوں اب سخت داغ بن جاتا ہے۔

دوسرا مسئلہ میری گردن پر گہری لائنیں پڑ گئی ہیں۔ دو تین سال سے میں نے کوئی توجہ نہیں دی، اب تین سے چار ہو گئی ہیں اس کی وجہ سے تیس کے بجائے چالیس کی لگتی ہوں، چہرے پر ہلکے بھورے تل بھی ہیں خدا کے لیے کوئی ٹوٹکہ بتا دیں میں سخت پریشان ہوں، مسام بھی کھل رہے ہیں۔

ج: کیل مہاسوں کے لیے دو باتیں بہت زیادہ اہم ہیں۔

(1) متوازن غذا کا استعمال۔ (2) جلد کی صفائی کا خیال۔ آپ پھلوں اور سبزیوں کا باقاعدہ استعمال کریں۔ قبض نہ ہونے دیں اور دن میں کم از کم اٹھارہ گلاس پانی پئیں، تیز مرچ مسالوں والی اشیاء انڈا، مرغی، خشک میوے ہرگز نہ کھائیں۔ سبزیاں کچی استعمال کریں یا ہلکے نمک مرچ کے ساتھ کم چکنائی میں پکی ہوئی ہوں۔ پھلوں میں پپیتا اور کینو آپ کے لیے بہترین ہیں۔

اگر ممکن ہو تو صبح کھلی ہوا میں چہل قدمی کریں۔ جلد کی صفائی کے لیے میڈیکیٹڈ صابن یا بغیر خوشبو والا صابن استعمال کریں۔ چہرے پر کسی قسم کی کریم نہ لگائیں، اگر ایام میں بے قاعدگی ہے تو اس کے لیے کسی ڈاکٹر سے مشورہ کریں کیونکہ عموماً ایام کی بے قاعدگی سے بھی کیل مہاسے نکل آتے ہیں۔

سر کی خشکی بھی مہاسوں کی وجہ سے ہو سکتی ہے۔ اس کا علاج کرنا بھی ضروری ہے۔

اگر آپ نے یہ احتیاطی تدابیر کیں تو مہاسے نکلنا بند ہو جائیں گے۔

(2) چہرے کے مہاسوں کے لیے روزانہ دن میں دو مرتبہ پانی سے چہرے کو دھو کر سفید پھٹکری کا ایک ٹکڑا چہرے پر ملیں۔ اس سے جو مہاسے ہیں وہ جلدی ٹھیک ہو جائیں گے۔

گردن کی لائنوں کے لیے آپ درج ذیل ماسک لگائیں۔

ملتانی مٹی — دس گرام
عرقِ گلاب — پانچ ملی لیٹر
شہد — پانچ گرام

ان تینوں چیزوں کو اچھی طرح ملا کر پیسٹ بنا لیں اور گردن پر لگائیں۔ خشک ہو جائے تو بیس منٹ بعد گردن صاف پانی سے دھو لیں۔ اس سے گردن کی لائنیں درست ہو جائیں گی۔